مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی
(بانی ومہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف، بہار)

شائع کردہ
مفتی ظفیر الدین اکیڈمی
جامعہ ربانی منوروا شریف، سمستی پور، بہار، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ

حضرت آہ مظفرپوریؒ

(مع کلیات آہ)

☆دارالعلوم دیوبند کے بطل جلیل ☆حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ رشید ☆تحریک ندوۃ العلماء کے عینی مشاہد ☆معقولات و منقولات کے بحر ذخار ☆علم وادب اور روایت و انفرادیت کے جامع ☆کانپور اور دیوبند دونوں دبستان علم وفکر کے مجمع البحرین ☆اگلی نسلوں کے لئے مینارۂ نور

حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفرپوریؒ کے حالات اور علمی وادبی خدمات

مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

بانی ومہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف بہار

شائع کردہ

مفتی ظفیرالدین اکیڈمی جامعہ ربانی منوروا شریف، سمستی پور بہار انڈیا

فہرست مضامین کتاب

صفحات	مضامین	ابواب	سلسلہ نمبر

صفحات	مضامین	ابواب	سلسلہ نمبر

فہرست حواشی کتاب

تاریخ وادب کا شاہکار

بقیۃ السلف، حجۃ الخلف خطیب الاسلام جانشین حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت

اقدس مولانا محمد سالم صاحب القاسمی دامت برکاتہم العالیہ سرپرست اعلیٰ

وصدر مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند ونائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

حق تعالیٰ نے انسان کو قدرت تحریر وتقریر کے ذریعہ علمی صلاحیت وافادیت کا ذریعہ بنایا ہے، جس میں تحریر کو زمانی وسعتیں عطافرماکر نہ صرف اس کے دائرۂ افادیت ہی کو عالمگیریت عطافرمائی ہے بلکہ بصورت تحریر صدیوں پہلے کے ارباب علم وفضل کے نوادرات علمی سے آج صدیوں بعد پیدا ہونے والے ارباب علم فیضیاب ہورہے ہیں اور یہی وہ ذریعہ ہے جو علم کو زمانی دائروں میں محدود نہیں کرتا بلکہ اس کو دوامی وسعتیں عطا کرتا ہے، جو کسی بھی زمانے میں محدود نہیں ہوتی۔

نیزبہ فحوائے فرمان نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام اذْکُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ (ابوداؤد وترمذی) وارشاد صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مَنْ کَانَ مُسْتَنًّا فَلْیَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْمَاتَ (جامع الاصول) سلف صالحین کا تذکرہ بعد والوں کے لئے موجب سعادت وبرکت بھی ہے اور اسوۂ عمل بھی، خود قرآن کریم نے بے شمار گذرے ہوئے لوگوں کا ذکر عبرت وموعظت اور نصح وتلقین کے لئے کیا ہے، حدیث پاک میں بھی ایسے بہت سے تذکرے موجود ہیں۔۔۔۔

گذرے ہوئے لوگوں کو یاد رکھنا اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوش کو نمونۂ عمل بنانا نہ صرف یہ کہ محمود ہے بلکہ تذکرہ اور تذکرہ نگار کے تحفظ وبقا اور حیات نو کا ضامن بھی ہے، اسی لئے ہر دور کے اصحاب توفیق علماء اور ارباب قرطاس وقلم نے اپنے سے پہلے کے لوگوں کے تذکرے اور ان کے احوال پر مشتمل کتابیں تحریر کی ہیں، محدثین نے رجال پر اور مؤرخین نے تاریخ پر جو کتابیں لکھیں وہ بھی اسی کا حصہ ہیں، اگر ان بزرگوں نے

اتنی محنت نہ کی ہوتی تو آج ہم ان کے حالات سے باخبر نہیں ہو سکتے تھے۔

محترم جناب مولانا اختر امام عادل قاسمی صاحب کی زیر نظر کتاب "تذکرہ حضرت آہؔ" بھی اسی کی ایک کڑی ہے، مؤلف علام ان باتوفیق اصحاب قلم میں ہیں جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل جلیل اور دیوبند کے قافلۂ قدس کے ایک رکن رکین حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوریؒ کے حالات زندگی، علمی کمالات، افکار و نظریات اور ان کی شعری وادبی خدمات کو ایک تذکرہ کی صورت میں مرتب فرماکر آنے والی نسلوں کے لئے ان کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور بلاشبہ ایک تاریخی اور تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے، مؤلف علام کی یہ عظیم علمی اور تاریخی پیشکش قابل صد تبریک و تحسین ہے۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی بھی دیوبند ہی کے فاضل ہیں اور کئی علمی کتابیں ان کے اشہب قلم سے صادر ہو کر مقبول عام وخاص ہو چکی ہیں، لیکن ان کی یہ کتاب ان کی علمی تحقیقات کے ساتھ تاریخ نگاری اور زبان وادب میں ان کی غیر معمولی صلاحیت کی شاہکار ہے، انہوں نے جس بصیرت اور ذوق تحقیق کے ساتھ حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ کی شاعری اور ان کے احوال وافکار کا تجزیہ کیا ہے، اور تاریخی وادبی مآثر کے ذریعہ ان کو مدلل ومبرہن کرنے کی قابل تحسین کوشش کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے ۔۔۔۔۔ اس کتاب میں علمی مسائل بھی ہیں ،تصوف کے رموز ودقائق بھی ہیں، تاریخی حقائق بھی ہیں، شعری ونثری ادب پارے بھی ہیں اور محققانہ ومبصرانہ تحلیل وتجزیے بھی ہیں ، ان گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے یہ کتاب بالیقین اس لائق ہے کہ یونیورسیٹیاں اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دیں، اور مصنف کو اعزازات سے نوازیں۔

حق تعالیٰ مصنف کی خدمات علیہ کو قبولیت تامہ اور مقبولیت عامہ عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

(حضرت مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)

صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

نابغۂ روزگار شخصیات اور اساتذۂ فن میں شمار کیا جانا چاہئے

نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی ابو القاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا عبد الشکور صاحب آہؔ مظفرپوری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ راقم الحروف نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا، لیکن جناب مولانا اختر امام عادل قاسمی صاحب کی مرتب کردہ کتاب "تذکرہ حضرت آہؔ مظفرپوریؒ" کے ذریعہ کسی حد تک ان سے واقفیت کا موقعہ ملا تو محسوس ہوا کہ حضرت مولانا مرحوم اپنی ذات، صفات، کمالات اور خصوصیات کے لحاظ سے نابغۂ روزگار شخصیات میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، علمی کمالات کے ساتھ ایسی نکھری ہوئی شاعری طبقۂ علماء میں کم افراد کو نصیب ہوتی ہے۔ مولانا اختر امام عادل صاحب قاسمی یقیناً شکر گذاری کے مستحق ہیں کہ ان کے ذریعہ حضرت مولانا مرحوم کی مفصل سوانح حیات تک رسائی حاصل ہوگی، بلکہ ان کے علمی وادبی کمالات اور فن پاروں سے بھی استفادہ کا موقعہ ملے گا۔

بندہ نہ شاعر ہے نہ شاعری کے رموز سے واقف ہے، لیکن اچھے اشعار سننے اور پڑھنے کا فطری ذوق ضرور رکھتا ہے اور اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ حضرت آہؔ مظفرپوریؒ کا شمار بلاشبہ اساتذۂ فن کی صف میں ہونا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ مصنف کی خدمت قبول فرمائے اور مزید علمی وادبی خدمات کی توفیق بخشے۔

ابو القاسم نعمانی غفرلہ

مہتمم دار العلوم دیوبند

۱۴/ ۱۱/ ۱۴۳۸ھ – ۸/ ۷/ ۲۰۱۷ء

ایک علمی و تحقیقی دستاویز اور ایک عہد کی تاریخ

ادیب کبیر مؤرخ شہیر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سیدالمرسلین وخاتم النبیین سیدنامحمدو علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وبعد !

ہندوستان میں دین کی بقا علماء اور مصلحین کے ذریعہ ہے، جنھوں نے اپنے اخلاق وکردار کے ذریعہ اس کے لئے کوششیں کیں اور اس کا ایک تاریخی تسلسل ہے جو برصغیر میں حضرت خواجہ لاہوریؒ اور حضرت خواجہ اجمیریؒ اور ان کے سلسلہ کے بزرگوں اور علماء، محدثین کے ذریعہ جس میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا نام زیادہ روشن ہے، اور مجددین و مصلحین کے ذریعہ جن میں حضرت امام مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے خلفاء، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے عالی مرتبت صاحبزادگان اور تلامذہ اور پھر حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے خلفاء اور ان کی جماعت کے افراد جن کی کوششوں کا فیضان مدارس کی شکل میں ظاہر ہوا اور علماء کی جماعت نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں دعوت وارشاد، تعلیم وتربیت کی راہ سے اصلاح امت کا کام کیا اور خطۂ بہار جب عیسائیت وقادیانیت کی لپیٹ میں آرہا تھا اس وقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ کے حکم پر حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے وہاں جاکر اس فتنہ کا مقابلہ کیا، اور مسلم عوام کو ارتداد سے بچایا۔

اسی زمانہ کے علماء میں ایک نام حضرت مولانا عبدالشکور مظفرپوری علیہ الرحمہ کا بھی ہے جو بہار کے مظفرپور کے رہنے والے تھے، دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد اور گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے، اور ادیب وشاعر بھی تھے، اور

آہ تخلص رکھتے تھے، ان کی دعوتی واصلاحی، علمی وادبی خدمات اور روحانی مقام اس کا متقاضی تھا کہ ان کے متعلق سوانحی کام سامنے آتا، یہ سعادت ان سے روحانی اور خاندانی انتساب رکھنے والے ایک دوسرے فاضل دیوبند مولانا اختر امام عادل قاسمی صاحب کے لئے اللہ نے مقدر کی تھی جو علمی اور تحقیقی اور ایک ضخیم کتاب کی شکل میں ایک دستاویز کے طور پر سامنے ہے جس سے نہ صرف ایک عہد کی تاریخ محفوظ ہوگئی بلکہ نئی نسل کی رہنمائی کے لئے ایک مشعل راہ سامنے آگئی ہے، اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس سے نفع پہونچائے اور قبول کرے، وماذلک علی اللہ بعزیز۔

محمد رابع حسنی ندوی

۷/ ۱۳ / ۱۴۳۸ھ

(بقیہ تعارفی پس منظر ص ۴۱ کا)

پہلی بار اس طریقۂ تعلیم کو متعارف کرایا اور باقاعدہ عملی تربیت دے کر اس طریقۂ تعلیم کے ماہرین کی ایک ٹیم تیار کردی، علاوہ تصحیح قرآن کا جو نورانی ماحول آج ہمارے یہاں پایا جاتا ہے وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ جامعہ ربانی ہی کا فیض ہے، اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔

میرے سامنے مولانا موصوف کی یہ علمی اور تحقیقی کتاب تیار حالت میں موجود ہے، یہ ان کی علمی اور تحریری صلاحیت کا بہترین نمونہ ہے، اللہ پاک اس کو قبول فرمائے، عزیز کے لئے مزید ترقیات کا ذریعہ بنائے، اور زندگی کی ہر شاہراہ میں لامحدود خوشیاں اور کامرانیاں نصیب فرمائے آمین فقط۔

سہیل احمد قاسمی

مفتی امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ پھلواری شریف پٹنہ

۳/ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۳/ نومبر ۲۰۱۷ء

بے مثال تصنیف، ایک انسائیکلوپیڈیا

ادیب شہیر رئیس القلم حضرت مولانا سعید الرحمن الاعظمی دامت برکاتہم

مدیر مجلہ "البعث الاسلامی" و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مفکر اسلام استاذی ومرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے محب گرامی منزلت مولانا سید محمد الحسنیؒ کی کتاب (سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ) کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسویں پورے عالم اسلام میں سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کی صدی ہے، اور اس صدی میں عالم اسلام میں نئے نئے دینی فتنے اور گمراہ کن تحریکیں پیدا ہوئیں، اس زمانے میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوا تھا اور انگریزی اقتدار نے اس کی جگہ لے لی تھی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس ملک کی علمی اور دینی روشن تاریخ کا سفر ہمیشہ کے لئے رک جائے گا، اور اہل علم ودانش اور اصحاب فکر ومعرفت اب ہندوستان کے تاریخی میدان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں گے، اور مستقبل کی تعمیر میں اب ان کو کوئی موقعہ نہیں مل سکے گا۔۔۔ مگر انہی مایوس کن حالات میں اللہ تعالیٰ نے علماء دین اور تاریخ ساز شخصیتوں کو ملک کے مختلف علاقوں میں پیدا فرمایا، جو دینی انقلاب اور علم وعمل کے امام بن کر نمودار ہوئے، اور انہوں نے بجھتے ہوئے چراغ کو اپنی قوت ایمانی سے آفتاب جیسی روشنی عطا کی"

اسی عہد میں سرحد کے علاقے سے بہت سے علماء علم ومعرفت ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور دہلی پہونچ کر انہوں نے ملک کے مختلف علاقوں کو اپنی قیامگاہ بنایا اور وہاں رہ کر علوم ظاہرہ وباطنہ کی نشر واشاعت میں زبردست حصہ لیا۔

حضرت مولانا عبدالشکور آہؒ کے جد امجد سید شاہ عبد اللہؒ اور والد گرامی حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؒ دہلی کے مضافات میں قیام کرتے ہوئے کلکتہ شہر آئے اور اپنے فیوض روحانی وایمانی سے لوگوں کو سیراب کرتے ہوئے صوبہ بہار کے مشہور اور تاریخی شہر مظفرپور میں مستقل قیام فرمایا، اور یہیں حضرت مولانا عبدالشکور آہؒ کی ولادت ہوئی، انہوں نے اپنے مایہ ناز والد گرامی سے تعلیم وتربیت پائی۔۔۔ پھر کانپور اور دیوبند

کے علماء اجلہ سے علم و عمل کی جامعیت کا درس لیا، اس کے بعد نہ صرف صوبہ بہار کے طلبائے علوم دینیہ نے آپ سے فیض حاصل کیا بلکہ دیگر علاقوں میں بھی آپ کے نامور شاگردوں اور علماء و صلحاء امت کی تعداد بے شمار ہے۔

جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار کے بانی و ناظم حضرت مولانا اختر امام عادل قاسمی مدظلہ نے یہ کتاب اس ملک کے ایک عظیم مثالی عالم و مربی اور ایک جامع کمالات شخصیت کا نہایت تفصیلی تذکرہ مرتب کر کے ملک کی علمی تاریخ کی تدوین میں زبردست کردار انجام دیا ہے۔

یہ کتاب ایک موسوعہ (انسائیکلوپیڈیا) ہے، جو تاریخ علم و عمل کی تدوین میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کو شخصیت سازی کے فن کا ایک بے مثال نمونہ کہنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کیا جاسکتا۔

میں چاہتا تھا کہ اس بے مثال تصنیف کے تذکرتی نمونے اس کتاب کے تاریخی شواہد سے پیش کرتا اور سوانح و تذکرہ کی تاریخ میں اعتراف قدر کا کسی حد تک ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتا مگر وقت کی کمی اور اپنی بے بضاعتی اور تنگ دامانی کے باعث بس انہی چند لفظوں پر معذرت کے ساتھ اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے تاریخی تذکرے اور مؤلف گرامی منزلت کی بیش قیمت تحریر و تصنیف سے تاقیامت امت کو فائدہ پہونچاتے رہیں۔

سعید الرحمن الاعظمی

مدیر "مجلہ البعث الاسلامی" ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

۱۹ / ۱۱ / ۱۴۳۸ھ

۱۲ / ۸ / ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے

جو اللہ والوں کے تذکرہ میں ہوتا ہے

حضرت مولانا محمد مظہر الحق کریمی قاسمی دامت برکاتہم

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و نبیرہ حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ

حامداً و مصلیاً:- امابعد، جناب مولانا مفتی اختر امام عادل صاحب قاسمی بانی و مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف کی عنایت سے ان کی تازہ تالیف "تذکرہ حضرت آہؔ مظفرپوری" پر ایک نظر ڈالنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو اللہ والوں کے تذکرہ میں ہوتا ہے، محبت کا نور، عشق کا سرور، ایمان کا جوش اور یقین کا خروش سطر سطر سے نمایاں ہے۔

حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوری ایک جید عالم، کہنہ مشق شاعر اور صاحب نسبت بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دل مطمئن اور چشم پرنم کی نعمت سے سرفراز کیا تھا، زیر نظر کتاب حضرت آہ مظفرپوری رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارکہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کے اس حسن عمل کو صدقۂ جاریہ کا شرف عطا فرما کر مقبول عام فرمائیں۔ ع این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد مظہر الحق کریمی قاسمی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
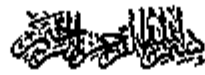
کتنوں کی نگاہ و نظر خیرہ ہو جائیں گی۔۔۔

امیر شریعت مفکر اسلام حضرت مولانا سید شاہ محمد ولی رحمانی صاحب
دامت برکاتہم العالیہ جنرل سیکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و سجادہ نشیں
خانقاہ رحمانی مونگیر (بہار)

بہار کی مٹی نے بھی اپنے اندر کیسے کیسے گوہر گراں مایہ سمو رکھے ہیں، کہ ان میں سے کسی کو بھی پردۂ خفا سے نکال کر منصۂ شہود پر رکھ دیا جائے تو ان کی روشنی سے کتنوں کی نگاہ و نظر خیرہ ہو جائیں گی۔۔۔ایسی ہی ایک ہستی انیسویں صدی کے معتبر عالم دین اور قادر الکلام شاعر حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ مظفر پوریؒ کی ہے، جو بیک وقت صاحب علم، صاحب قلم اور صاحب سخن تھے، جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خاص شاگردوں میں تھے، دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ، جامع العلوم مظفر پور کے سابق استاذ، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق معلم، حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ ایک علمی گھرانے کے چشم وچراغ تھے، آپ کی پوری زندگی علم دین، سلوک واحسان، سوزو گداز اور اللہ کے دین کی خیر خواہی سے عبارت تھی، علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ ساتھ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے، گرچہ شاعری کو آپ نے پیشہ نہیں بنایا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاعری کی کئی اصناف پر قدرت دی تھی۔

آپ کا خاندان علمی وروحانی قدروں کا امین ہے، علوم شریعت اور رموز طریقت دونوں کے چشمے اس خاندان سے جاری ہوئے ہیں اور خلق خدا سیراب ہوئی ہے۔

زیر نظر کتاب تذکرۂ حضرت آہؔ مظفر پوری (مع کلیات آہؔ) اسی خاندان کے چشم و چراغ مولانا اختر امام عادل صاحب نے مرتب کی ہے، مولانا اختر امام عادل مولانا عبد الشکور آہؔ رحمۃ اللہ علیہ کے پڑ پوتے اور حضرت مولانا حکیم احمد حسن منوروی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں، وہ مشہور عالم دین

ہیں، صاحب تصانیف ہیں،اس کتاب میں حضرت آہؔ کی شاعری اور فکر و فن پر آپ نے جو گفتگو کی ہے،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر بھی شعروادب کا بلند ذوق ہے،یہ کتاب مولانا عادل صاحب کے مطالعہ کی وسعت، اظہارخیال کی قدرت اور تذکرہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے،اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے اپنے خاندان کے علمی وادبی ورثہ کو بہت محنت وخلوص کے ساتھ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے،جو نہ صرف ان کا خاندانی ورثہ ہے بلکہ شعروادب کی وراثت اور قومی امانت ہے۔

چھ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب میں مرتب نے صاحب تذکرہ کے خاندانی پس منظر کو عمدہ اسلوب، آسان پیرایہ اور تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے، واقعات کو بیان کرنے میں حوالہ کا اہتمام کیا ہے،اگر کہیں ابہام محسوس ہوا ہے تو حاشیہ میں اس کی عمدہ وضاحت کی ہے،بعض مقامات پر واقعات کی دلائل کے ساتھ وکالت اور مدافعت بھی کی ہے۔دوسرا باب صاحب تذکرہ کے تعلیمی وخانگی حالات پر مشتمل ہے، تیسرے باب میں آپ کی روحانی زندگی اور سلوک واحسان کے مدارج طے کرنے کا ذکر کیا ہے۔چوتھے باب میں حضرت آہ کی علمی اورادبی خدمات کا ذکر ہے۔پانچویں باب میں کلام آہ کا فکری و فنی جائزہ لینے کے ساتھ اصناف شاعری پر بسیط گفتگو ہے۔چھٹے باب میں کلیات آہ کو جمع کیا گیا ہے۔

کلیات آہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے شاعری کی کئی صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے،کلیات کا آغاز عربی زبان کی نعت پاک سے ہوتا ہے،اس کے بعد ایک نعت پاک فارسی زبان میں بھی ہے۔اس کے علاوہ نظمیں،رباعیات اور قطعات بھی ہیں،بڑا حصہ غزل کا ہے۔

چونکہ حضرت آہؔ دین و شریعت کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ، سلوک و احسان اور تزکیہ وتصوف کے رموزواسرار سے بھی آگاہ تھے،اس لیے یہ دونوں رنگ جگہ جگہ آپ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔دنیا سے بے رغبتی اور فنائیت کا خاص جذبہ جو اہل اللہ کا خاصہ ہے،آپ کی شاعری میں خوب ابھر کر آتا ہے۔کلیات آہ کی پہلی نظم میں بے ثباتی عالم کا یہ شعر دیکھیں:

غرض ہونا یہاں کا اک نہ ہونے کی نشانی ہے
تم ہی دیکھو! کہاں وہ شوکت نوشیروانی ہے

اور یہ شعر بھی دیکھئے:

نظر آتے ہیں جو نقشے یہ سارے مٹنے والے ہیں
اجل نے دھکے دے دے کر ہزاروں کو نکالے ہیں

ایک عالم باعمل ہونے اوراکابر علماء کے صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے آہ کی شاعری فی کل وادیہیمون کی مصداق نہیں ہے،بلکہ وہ اگررازو نیازعشق کی باتیں بھی کرتے ہیں تو بھی دامن شریعت ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا،لیجئےان اشعار کو پڑھئے۔

آئے نظر کے سامنے احسان ہو گیا دل میں اگر سما گئے ایمان ہو گیا
تصویر کھینچ لی ہے رخ دل پسند کی سیپارۂ دل آج سے قرآن ہو گیا

لیکن حدودشریعت میں اپنے کو محدود کر لینے کے باوجود ان کے اشعار کی بے ساختگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اورفنی سقم نظر نہیں آتا،بلکہ شاعری کا فطری حسن اور نغمگی بعینہ برقراررہتی ہے۔

دیکھئے یہ اشعار:

جب لب بام مرا انجمن آرا ہو گا کوئی بےہوش کوئی انجمن آراہو گا
آپ ہوں گےوہ عدو ہو گا یہ بندہ ہو گا دیکھنا پھر جو سر حشر تماشا ہو گا

آپ کے اشعار شعراء کی غیر محتاط رنگینیوں کی ترجمان نہیں بلکہ عشق محمود کی تحریک ہیں۔حضرت آہ کوخود بھی اس کااحساس ہےاور برملااس کااعلان بھی کرتے ہیں:

فیض روح القدس سےاے آہ میں ہوں مستفیض
میری نظمیں کاشف اسرار قرآں ہو گئیں

آپ کی محبت ادب آموزہے،اس میں ہیجان نہیں اطمینان ہے،وہ محبت ایسی ہےجوخودآداب محبت سکھاتی ہے،یہ محبت محبت الٰہی ہے، جو محب کے اندر صفات محمودہ کے علاوہ کسی چیز کی تحریک نہیں کرتی۔ملاحظہ کریں یہ اشعار:

خوگر درد کو بے درد نہیں آتا چین
اک سکوں ہوتا ہے جب درد جگر ہوتا ہے

ادب آموز محبت ہیں ہماری آنکھیں
فرش ہوتی ہیں مقابل وہ اگر ہوتا ہے

غیر کی یاد جو کرتا ہوں کبھی بھولے سے
جلوۂ یار مرے پیش نظر ہوتا ہے

جذب کامل ہے تو رہتی ہے حضوری ہر دم
ربط والوں کے وہ خود پیش نظر ہوتا ہے

مولانا اختر امام عادل صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنے اجداد کی وراثت کو محفوظ کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے، یقیناً اصحاب علم وفضل کی وراثتیں مال و متاع نہیں ہوتیں بلکہ علم وفضل کے خزانے ہیں جن سے وہ اپنی زندگی میں خلق خدا کو فیضیاب کرتے ہیں اور اگر ان کے مرنے کے بعد یہ خزانے اگلی نسلوں کو منتقل کر دیئے جائیں تو آنے والی نسلوں کو بھی فیضیاب کرتے رہتے ہیں، یہ خزانے کتابوں، سوانحی خاکوں اور تذکروں کی صورت میں محفوظ ہوتے ہیں۔ مولانا اختر امام عادل صاحب نے بھی حضرت مولانا عبدالشکور آہ کی اس علمی وراثت کو اس تذکرہ کی صورت میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے، اس کے لیے آپ تبریک وتحسین کے مستحق ہیں، یہ کتاب سوانح نویسی اور تذکرہ نگاری میں بھی مولانا عادل صاحب کی قابلیت کی شہادت دیتی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے بہت سے لوگ فیضیاب ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو لوگوں کے لیے مفید اور صاحب کتاب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے (آمین)

محمد ولی رحمانی

خانقاہ رحمانی، مونگیر ۱۰/ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

اظہار مسرت

شیخ طریقت حضرت مولانا سید شاہ محفوظ الرحمن صاحب

قادری نقشبندی دامت برکاتہم سجادہ نشیں خانقاہ منورواشریف

حامداً و مصلیاًو مسلما-امابعد !

عزیزم میاں اختر امام عادل سلمہ کی بہت دنوں سے خواہش اور کوشش تھی کہ سیدی والدی حضرت مولانا الحاج حکیم سید احمد حسن علیہ الرحمۃ کے والد ماجد یعنی میرے دادا علیہ الرحمۃ حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ مظفر پوری کے کچھ حالات اور شاعرانہ کلام جمع کئے جائیں، جو الحمد للہ اب کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ جل شانہ اپنے فضل و لطف سے اس خانوادہ میں علمی ذوق و شوق کی نعمت عطا فرما کر دوام بخشے، بالخصوص میاں عزیز اختر سلمہ میں ورع و تقویٰ کی صفت پیدا فرمائے فقط۔

لاشے محفوظ الرحمن عفی عنہ

تعارفی پس منظر

بقلم حضرت مولانا مفتی سہیل احمد قاسمی صاحب مدظلہ

مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

بہار کی سرزمین ہر دور میں مردم خیز رہی ہے، اور ہر زمانہ میں یہاں نابغہ روزگار ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں، جن کی گرمی نفس نے بڑے بڑے انقلابات برپا کئے ہیں، مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے کہ یہاں کی مٹی میں کاموں کے جذب وقبول کی ایسی صلاحیت ہے کہ دور دراز سے اہل کمال دینی وعلمی خدمات کے لئے یہاں تشریف لاتے رہے ہیں، حضرت نوحؑ کے پڑپوتے نے یہاں آکر مدرسے اور عبادت خانے قائم کئے، حضرت امام محمد تاج فقیہؒ شام بیت المقدس سے یہاں اسلام کی اشاعت اور دین کی خدمت کے لئے مامور ہوئے، حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰ منیریؒ کے اجداد نے یہاں تجدیدی خدمات انجام دیں، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کو کانپور سے مونگیر بہار بھیجا گیا، حضرت مولانا مفتی سہول احمد عثمانیؒ کا خاندان عرب سے آکر بھاگلپور بہار میں اقامت گزیں ہوا اور اسی سلسلۂ زریں کی ایک شاہکار کڑی حضرت شاہ عبد اللہؒ کی شخصیت بھی تھی، جو ماوراء النہر سے دہلی ہوتے ہوئے براہ کلکتہ مظفر پور بہار میں جلوہ افروز ہوئی، پھر آپ کے فرزند استاذ الکل حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؒ کی نفوس قدسیہ اور فیوض علمیہ کی برکت سے ایسی ایسی عبقری اور نادرۂ روزگار شخصیات پیدا ہوئیں جن کی تجدیدی اور انقلابی کاوشوں نے پورے بہار بلکہ بیرون صوبہ پر بھی گہرے اثرات ڈالے، آپ ہی کے حلقۂ تلمذ وتربیت سے حضرت مولانا شاہ بشارت کریم گڑھولویؒ، حضرت مولانا عبد الاحد جالویؒ اور حضرت مولانا خدا بخش مظفر پوری جیسی ہستیاں تیار ہوئیں، جن کے تذکرے کے بغیر ہندوستان کی علمی اور روحانی تاریخ نامکمل رہے گی، حضرت نصرؔ ہی کے نامور فرزند حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ مظفر پوریؒ ہیں جن کی حیات طیبہ پر یہ پوری مفصل کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہمارے لئے خاص طور پر باعث مسرت یہ ہے کہ اس خاندان کی ایک اہم علمی اور روحانی شخصیت حضرت مولانا سید شاہ امیر الحسن قادریؒ ہمارے علاقے میں جلوہ افروز ہوئی اور پھر آپ کے توسط سے آپ کے

نواسے حضرت مولانا الحاج سید حکیم احمد حسن منوروی ؒ تشریف لائے اور ان دونوں بزرگوں نے اپنی روحانیت اور علمیت سے پورے خطہ کو بقعۂ نور بنادیا۔۔۔

اس کتاب کے مصنف مولانا اختر امام عادل قاسمی صاحب کا تعلق بھی اسی خانوادہ سے ہے، وہ اسی عظیم علمی وروحانی خاندان کے چشم وچراغ اور زریں روایات واقدار کے امین ہیں، وہ رشتہ میں میرے عزیز ہیں، ان کے خسر محترم اور خالو جان حضرت مولانا عزیز الرحمن قاسمی صاحب میرے چچازاد بھائی ہیں، لیکن انہوں نے اپنی علمی قابلیت اور تحریری وتقریری صلاحیت کے ذریعہ ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی اپنی انفرادی شناخت قائم کی اور اپنے خاندان کی عظمتوں میں چار چاند لگایا، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں ہیں، جن کو دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت معین المدرسین تدریسی خدمات کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، طالب علمی ہی کے زمانے ہی سے لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے، اسی دور میں "منصب صحابہ" جیسی معیاری اور معرکۃ الآراء کتاب لکھی، جس نے بے شمار اہل علم اور ارباب فکر و نظر سے خراج تحسین وصول کیا، دیوبند کی معین المدرسی ہی کے زمانے میں فقیہ العصر قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب ؒ کے کاروان فقہ سے وابستہ ہو گئے اور اپنے فقہی مقالات ومضامین کے ذریعہ علماء کے حلقہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، نئی عمر میں انہوں نے جس پختگی کے ساتھ فقہی موضوعات پر طبع آزمائی کی، وہ نئی نسل کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی اور ان کی زندگی بعد والوں کے لئے بہترین نمونۂ عمل بن گئی، انہوں نے بے شمار فقہی مقالات تحریر کئے، جن میں بہت سے مقالات مستقل کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں، ان کی کتاب "قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز" (جو دو ضخیم جلدوں میں ہے) نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، اس کتاب پر عزیز کو ایوارڈ بھی ملا، ماشاء اللہ عزیز موصوف کی کئی کتابوں کے انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں، بہت سی کتابیں انٹرنیٹ پر آن لائن بھی آچکی ہیں۔

مولانا موصوف کی طبیعت میں تحریکیت اور ذہن وفکر میں اخاذیت ہے، اور ہر میدان میں اپنی الگ پہچان بنانے کی کوشش کرتے ہیں، انہی کی تحریک وسعی سے ہمارے علاقے میں جامعہ ربانی جیسا معیاری اور مشہور ادارہ قائم ہوا۔

اس پورے خطہ میں نورانی قاعدہ کی تحریک مولانا موصوف ہی کی دین ہے، سب سے پہلے انہوں نے ضلع ہیڈ کوارٹر سمستی پور میں دارالعلوم سمستی پور کے ذریعہ پھر اپنے گاؤں منورواشریف میں جامعہ ربانی کے ذریعہ

(باقی ص ۱۳۱ پر)

مقدمہ

معروف عالم دین اور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

جنرل سیکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا و بانی و ناظم المعہد العالی حیدر آباد

اسلام کے اساسی اور بنیادی عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ مکمل ہوچکا، آپ قصر نبوت کی خشت آخریں ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کارہائے نبوت بھی ختم ہوچکے ہیں، چونکہ دین حق کو قیامت تک باقی رہنا ہے، اس لئے وارثین انبیاء کے ذریعہ دین ربانی کی اشاعت، اس کی فکری سرحدوں کی حفاظت، اس کی تشریح و توضیح، انسانی زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے متعلق اخذ و استنباط، تعلیم و تربیت، تزکیۂ نفوس اور تذکیر و اصلاح کا کام قیامت تک جاری رہے گا، اسی لئے امت میں دعاۃ و مبلغین، فکری انحراف سے بچانے والے مجددین و مصلحین، تزکیۂ و احسان کا فریضہ انجام دینے والے اہل قلوب، ہر دور کی ضرورت کے لحاظ سے اجتہاد و استنباط کا کام انجام دینے والے فقہاء اور تعلیم و تربیت اور علمی و فکری جہت سے کام کرنے والے اصحاب نظر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، تاکہ سلسلۂ نبوت کے تمام ہونے کے بعد بھی کار نبوت جاری رہے اور اس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔

امت محمدیہ میں تجدید و اصلاح کے اس تسلسل اور دوام و استمرار پر مسلمانوں کی گزشتہ پندرہ سو سالہ تاریخ گواہ ہے، غور کریں تو زمانہ کے اعتبار سے اسلام سے قریب ترین

مذہب عیسائیت ہے، جو چند سو سال بھی اپنے حقیقی وجود کو باقی نہیں رکھ سکی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنیادی تعلیم توحید کو تثلیث سے بدل دیا گیا، اور پوری عیسائی تاریخ میں کوئی ایسی مؤثر آواز نہ اٹھ سکی، جو اس تحریف کا تدارک کرے، اور عیسائیت کا اصل چہرہ انسانیت کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو، اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین اپنی آخری شکل میں نازل ہوا، یہ کسی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر آج بھی محفوظ ہے، باوجودیکہ ایسا نہیں ہوا کہ اس پر ایمان رکھنے والوں کے لئے ہمیشہ پھولوں کی سیج سجائی گئی ہو، اور ان کا استقبال کیا گیا ہو، بلکہ بار بار وہ بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرے، عالم اسلام کے مختلف حصے تباہ و تاراج کر دیئے گئے، مسلمانوں کے دارالخلافۃ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، اور دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کا خون کچھ اس طرح بہایا گیا کہ اگر ان کو جمع کر دیا جاتا تو استعارہ کی زبان میں نہیں، بلکہ حقیقت میں خون کا دریا بہنے لگتا، لیکن یہ بات حیرت انگیز اور حد درجہ تعجب خیز ہے کہ مشکل سے مشکل اور جاں گسل سے جاں گسل حالات میں بھی کبھی اسلام کی دعوتی اور علمی و فکری خدمت میں کوئی وقفہ نہیں آیا، تاتاریوں کا دور ماضی کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ المناک دور مانا گیا ہے، اس دور میں بھی ہمیں ایسے علماء و فقہاء اور مصلحین کی بڑی تعداد ملتی ہے، جو حالات سے قطع نظر اپنے کام میں لگی رہی، اور غالباً انہوں نے اپنے ذہن میں یہ بات رکھی کہ مسلمانوں سے زیادہ اہمیت اسلام کی اور زمینی سرحدوں کے تحفظ سے بڑھ کر اہمیت فکری سرحدوں کی حفاظت کی ہے۔

جیسے ہر عہد اور زمانہ میں علماء و مصلحین پیدا ہوتے رہے، ویسے ہی ہر علاقہ اور خطہ میں اللہ کی طرف سے ایسے رجال کار پیدا کئے گئے، جن کی روشنی سے پورا علاقہ روشن ہو گیا، اور جن کی حرارت ایمانی نے اپنے ماحول میں دل کی انگیٹھیوں کو گرم رکھا، ایسے

ہی بابرکت علاقوں میں ایک ہندوستان بھی ہے،جہاں مسلمانوں کی حکومت ایک زمانہ میں دنیاکی تیسری بڑی طاقت سمجھی جاتی تھی،اس خطہ کویہ شرف حاصل ہے کہ بعض تاریخی روایتوں کے مطابق خودعہد نبوی میں یہاں اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی،لیکن یہ بات توتاریخی طورپرثابت شدہ مانی گئی ہے کہ حضرت عمرفاروقؓ کے زمانہ میں ہندوستان کے جنوبی ساحل پراسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی،اورعرب تاجروں کی خوش اخلاقی اور دعوتی کوششوں کےذریعہ مالابارکےمختلف علاقوں میں لوگ اسلام قبول کرچکے تھے،اس کےکافی عرصہ بعدبنوامیہ کے دورمیں سندھ کے راستے سے مسلمان مجاہدین داخل ہوئے،انہوں نے زمینوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں کوبھی فتح کرنے کی کامیاب کوشش کی،اورہندوستان کے مغربی علاقہ میں جواَب پاکستان میں شامل ہے،بہت تیزی سے اسلام کی اشاعت ہوئی،افسوس کہ بعدمیں عجمی مزاج مسلمان بادشاہوں نے اس سے تغافل برتا،انہوں نے کشورکشائی اوراپنے سیاسی استحکام پرزیادہ توجہ دی،اوودعوتِ اسلام ---جس پردرحقیقت ان کے مادی اقتدارکابھی بقاء ودوام موقوف تھا---کی طرف سے عمومی طورپربے التفاتی برتی،اس لئے ہندوستان میں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے باقی رہے۔

جیسے مسلمان ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں آئے، ایسے ہی مشرقی ہندکی ریاست بہارمیں بھی خیمہ زن ہوئے،جس کوپہلےریاست "مگدھ" کہاجاتاتھا، اور موجودہ بہارشریف میں اس زمانہ میں بودھ راجہ گوپال نے ایک بڑاویہارہ(بودھوں کی عبادت گاہ)تعمیرکیاتھااوراس قصبہ کانام ہی"ویہارہ"رکھ دیاتھا،پھرچونکہ یہ پوری ریاست مگدھ کادارالحکومت تھا،اس لئے پوری ریاست ہی ویہارہ سے موسوم ہوگئی، اورویہارہ آہستہ آہستہ "بہار"ہوگیا۔

بہار میں اگرچہ مسلمانوں کی باضابطہ اور مستحکم حکومت اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی---جس کی حکومت کا زمانہ ۵۹۰ھ تا ۶۰۲ھ ہے---نے قائم کی؛لیکن اس سے پہلے شیخ یحیٰ منیریؒ کا جہاد کر کے منیر کو فتح کرنا،وہاں قیام پذیر ہونا اور وہاں سے ان کے چشمۂ فیض کا جاری ہونا تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے،گویا مسلمانوں کی چھوٹی موٹی حکومت بھی اس سے پہلے ہی قائم ہو چکی تھی،اور جہاں کہیں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوتی،وہاں شمشیر بکف فوج کے پیچھے پیچھے قلب و نظر کے فاتح علماء و صوفیاء کی فوج بھی اپنا پڑاؤ ڈالتی تھی،اور وہ اسلام کی دعوت واشاعت،تعلیم وتربیت اور تزکیۂ واحسان کا فریضہ انجام دیتی تھی،اس طرح اس عہد میں یہاں بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔

اسی لئے بہار ہندوستان کے ان علاقوں میں ہے، جسے مردم خیزی کے لحاظ سے نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے،اسی سرزمین سے حضرت مخدوم احمد یحیٰ منیریؒ،شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ، مخدوم سلطان احمد چرم پوشؒ،مخدوم شہاب الدین پیر جگجوتؒ،مخدوم عمادالدین قلندرؒ،حضرت مولانا شہباز محمد بھاگلپوریؒ،حضرت مخدوم منعم پاکؒ،حضرت مخدوم رکن الدین عشقؒ وغیرہ جیسے اہل دل اٹھے،یہیں انہوں نے اپنی مسند ارشاد بچھائی اور دور دور تک ان کا فیض پہنچا،قدیم دور میں بہار کے علمی مقام کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ فتاویٰ عالمگیری جیسی فقہ حنفی کی انسائیکلوپیڈیا کی تدوین وترتیب میں یہاں کے متعدد علماء کی شرکت رہی ہے،مولانا عبدالحیؒ حسنی نے اپنی تصنیف "نزہۃ الخواطر" میں بہت سی ایسی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے، جن کا تعلق بہار سے تھا،اور محب گرامی مولانا ابوالکلام قاسمی کے قلم سے "تذکرۂ علما بہار" پر دو جلدیں آچکی ہیں،اور تیسری متوقع ہے،برطانوی عہد اور اس کے بعد بھی علوم اسلامی کی مختلف جہتوں میں بہار سے بہت سی ایسی نمایاں اوراہم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں،کہ ملک ہی نہیں بیرون ملک بھی ان کے مقام ومرتبہ کو تسلیم

کیا گیا ہے، بہار کی علمی فتوحات میں خدا بخش لائبریری بھی ہے، جس کو بہار ہی کے ایک سپوت خدا بخش خان نے قائم کیا، اور جو مخطوطات کے اعتبار سے ایشیا کی دو تین بڑی لائبریریوں میں ایک ہے، اور ہندوستان میں کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے پہلے نمبر پر ہے۔

عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں جو دیگر مذاہب ہیں، ان کے لئے بھی بہار ایک مقدس مقام رہا ہے، مہاتما گوتم بدھ جو بودھ مذہب کے بانی ہیں، وہ بہار ہی میں پیدا ہوئے، اور یہیں "گیا" میں ایک درخت کے نیچے بودھوں کے عقیدہ کے مطابق ان کو نروان یعنی حق کی معرفت حاصل ہوئی، اور راجگیر کے علاقہ سے انہوں نے اپنی فکر کی اشاعت شروع کی،۔۔۔ جین مذہب کے بانی مہاویر جی بھی یہیں پیدا ہوئے، یہیں اپنا مذہب ایجاد کیا، اس کی اشاعت کی اور موجودہ بہار شریف کے قریب ان کا انتقال ہوا،

مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں جو حکمراں ہوئے، ان میں راجا چندر گپت موریا (۳۲۲ق م ت ۱۸۶ق م) اور مسلم عہد حکومت سے پہلے کے سب سے بڑا راجہ۔۔۔ جس کا چکر ہمارے قومی جھنڈے میں شامل ہے۔۔۔ اشوک (۲۷۱ق م تا ۲۳۲ ق م) کی حکومت بھی بہار ہی میں قائم ہوئی، پاٹلی پترا یعنی موجودہ پٹنہ کو اس نے اپنی راجدھانی بنایا، اس نے چالیس سال تک حکومت کی اور ہندوستان کی سرحدوں کو بڑی وسعت عطا کی، ہندوستان کے عہد قدیم کی سب سے قدیم دانش گاہ "نالندہ یونیورسٹی" بہار ہی میں تھی، جس سے کسب فیض کے لئے دور دراز ملکوں سے طلبہ آیا کرتے تھے۔

جس طرح بہار اسلامی علوم اور تزکیۂ وتصوف کے شعبوں میں امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے، اسی طرح زبان وادب اور شعر وسخن میں بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے، اردو شاعری تو بعد میں وجود میں آئی، لیکن فارسی شاعری میں بھی اس نے ایسا شہرہ

حاصل کیا، جس کی گونج دوردور پہونچ گئی، جیسے مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۱۳۳ھ) جن کے ذکر کے بغیر فارسی شاعری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، جن کا فارسی دیوان دوہزار اشعار پر مشتمل ہے، اور جن کے اسلوب بیان کی ندرت کا اعتراف کرتے ہوئے اردوشاعری کے درآبدار مرزا اسداللہ خاں غالب کو کہنا پڑا:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا

اسداللہ خاں قیامت ہے

اردوزبان میں بھی بہار کے شعراء اورادباء کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے، پڑوسی ملک سے چار جلدوں میں "تذکرہ شعراء بہار" شائع ہوچکی ہے، پروفیسر اختر اورینوی نے "۱۸۵۷ء تک بہار میں اردوزبان وادب کا ارتقاء" کا اپنی کتاب میں احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور پروفیسر کلیم عاجزؔ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے، یہ اس کی شہادت کے لئے کافی ہے، شاید یہ کہنا بے جانہیں ہوگا کہ اگر بہار نے اردوشاعری کو راسخؔ، شادؔ اور پروفیسر کلیم عاجزؔ کے سوا کوئی اور شاعر نہیں دیا ہوتا، تو یہی اس کے فخر کے لئے کافی ہوتا، لیکن معتبر اور مقبول شاعروں کی ایک پوری انجمن ہے، جو اس خاک سے اٹھی اوراس نے اردوشاعری پر گہرے اثرات ڈالے، اس لئے حمید عظیم آبادی کا یہ شعر پوری طرح حقیقت کا ترجمان ہے کہ:

بہار کی بھی ہے شرکت بہار گلشن میں

لہو سے ہم نے بھی سینچا ہے باغ اردو کا

اردوشاعری کو شروع سے خانقاہوں نے آب وتاب عطا کی ہے، اور علماء ومشائخ نے اس کو جلا بخشی ہے، ان میں بہت سی شخصیتیں وہ ہیں، جو تاریخ کے گمنام دفینوں میں رہ گئیں، نشرواشاعت کے سفینوں تک نہیں پہونچ سکیں، گزشتہ زمانہ میں چونکہ

نشرواشاعت کے ذرائع آج کی طرح نہیں تھے اور بالخصوص بہار وغیرہ کا علاقہ چونکہ مرکز سلطنت سے دور تھا، اس لئے اہل بہار ایسی سہولتوں سے اور بھی محروم تھے، اس وجہ سے اس دور کے بہت سے علماء اور ادباء وشعراء کی علمی وادبی کاوشیں منظر عام پر نہیں آسکیں، ایسی شخصیتوں کی خدمات کو لوح وقلم کی دنیا میں لانا اور عام لوگوں کے لئے قابل استفادہ بنانا بڑا کام ہے، اسی نوعیت کا ایک نہایت ہی قابل قدر کام اس وقت میرے سامنے ہے اور وہ ہے: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ کا تذکرہ اور ان کی کلیات۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ؒ اپنے زمانہ کے بڑے صاحب علم حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؒ کے صاحبزادہ تھے، جن کا روحانی تعلق اپنے عہد کے راہ سلوک کے سب سے بڑے مرجع حضرت شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادیؒ سے تھا، حضرت آہ نے اپنی ابتدائی تعلیم ان ہی کی آغوش تربیت میں حاصل کی، پھر اس زمانہ میں معقولات کے سب سے بڑے مرکز کانپور تشریف لے گئے اور امام المعقولات حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے کسب فیض کیا، معقولات کی تکمیل کے بعد منقولات کی طرف متوجہ ہوئے اور دیوبند کا رخ کیا، یہاں اس وقت استاذ الاساتذہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا چشمۂ فیض جاری تھا، ان سے اپنی علمی تشنگی بجھائی، اور پھر پوری زندگی علوم اسلامی کی تدریس، تزکیۂ واحسان اور ملی خدمات کی نذر کردی، یہ ان کی کسر نفسی اور نفی ذات کی اعلیٰ مثال ہے کہ انہوں نے راہ سلوک طے کرنے کے لئے اپنے ہی درسی معاصر حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کا ہاتھ تھاما، جو اپنے عہد کے بڑے اہل دل اور مصلحین ومربیین میں تھے، جن کی رہنمائی سے ہزاروں لوگوں نے ہدایت کی راہ پائی اور منزل مراد کو پہنچے۔

بہار کے بہت سے جلیل القدر علماء ہیں جن کے تصنیفی وتالیفی کارنامے مخطوطات کے مدفن سے باہر نہیں آسکے اورآہستہ آہستہ ضائع ہوگئے،ان ہی میں حضرت آہؔ بھی شامل ہیں،لیکن اللہ تعالیٰ مؤلف کتاب محبی فی اللہ جناب مولانااخترامام عادل صاحب قاسمی کوجزائے خیرعطافرمائے کہ انہوں نےان کے مجموعہ کلام کوڈھونڈھ نکالا، اس مجموعہ کو دیکھ کرزمانہ کی ناقدرشناسی پرحیرت ہوتی ہے کہ وہ تصوف کی چادرمیں چھپے ہوئےاس مایہ نازادیب کومنظرعام پرنہیں لاسکی،حالانکہ آہؔ صاحب کے کلام میں دریاکی سی روانی اورباد صباکی سی سبک خرامی نظرآتی ہے،اورتشبیہات اتنی لطیف ہیں کہ اصحاب ذوق سردھننے پرمجبورہوں۔

ان کی اس کلیات کاآغازعربی وفارسی زبان کی نعتوں سےہوتاہے،اُس زمانہ میں عام طورپرشعروسخن کاذوق رکھنے والے علماء عربی زبان میں بھی اپناکلام پیش کرتے تھے،اوراردوشاعری پرچونکہ فارسی شاعری کابڑااثررہاہے،اس لئے اردوکے شعراء فارسی میں بھی اشعارکہاکرتے تھے،فارسی شاعری میں تشبیہات واستعارات کی کثرت پائی جاتی ہے،آہؔ کی شاعری میں بھی یہ خوبصورت رنگ پوری آب وتاب کےساتھ موجودہے اور اس کےساتھ ساتھ چونکہ معقولات سے بھی آپ کابڑاتعلق تھا،اس لئےمعقولی اصطلاحوں (جن کاشعروادب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں) کوبھی انہوں نے اپنے مضمون کی وضاحت کے لئے بڑی خوبصورتی کیساتھ استعمال کیاہے،جیسے:

مثل یوسف گر تو آئی برسربازارعلم

خیزد از قبرکہن بقراط گرددمشتری

اے کہ ذاتت ہرنبی رانتج مقصودشد

اوبودصغری وتوکبری بچندیں اکبری

حضرت آہؔ نے قریب قریب اشعار کی تمام ہی صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے، اردو شعراء کے یہاں غزل گوئی پر زیادہ توجہ دی گئی ہے نظم پر کم، آپ کے یہاں بھی غزلیں زیادہ ہیں، مگر کئی نظمیں بھی اس کلیات کا حصہ ہیں، اگرچہ یہ کم ہیں؛ لیکن بڑے مؤثر اشعار ہیں، جیسے دنیا کی بے ثباتی پر ایک طویل نظم ہے، جس کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے:

جہان بے بقا کی دوستو! ہر چیز فانی ہے
تنفس کی طرح ہر شئی یہاں کی آنی جانی ہے
غرض ہونا یہاں کا ایک نہ ہونے کی نشانی ہے
تم ہی دیکھو! کہاں وہ شوکت نوشیروانی ہے؟

غور کیجئے "غرض ہونا یہاں کا ایک نہ ہونے کی نشانی ہے" میں کس خوبصورتی سے انسان کے فانی ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور "تنفس" کی تشبیہ زندگی کی بے ثباتی کو کس مؤکد انداز پر واضح کرتی ہے؟

یہ زمانہ چونکہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا تھا، اور وہ اپنے جس استاذ سے سب سے زیادہ متاثر تھے، وہ جنگ آزادی کے سپاہی ہی نہیں تھے، سالار تھے، یعنی حضرت شیخ الہندؒ اس لئے آپ کی بعض نظمیں انقلابی رنگ و آہنگ، جوش و خروش اور باغیانہ لب ولہجہ کی شاہ کار ہیں، جو اُس عہد کے حالات کا تقاضہ تھا، پوری نظم مخمس کی شکل میں ہے، جس میں مسلمانوں کی فاتحانہ تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی حمیت کو للکارا گیا ہے، اس کی ابتداء اس مخمس سے ہوتی ہے:

جلد اعداء وطن کا منہ عدم کو موڑ دو
کوہ بھی حائل اگر ہو بیچ میں تو توڑ دو

جو دکھائے آنکھ تم کو آنکھ اس کی پھوڑدو

موت سے اغیار کے رشتہ کو اٹھ کر جوڑدو

اے میرے پیروجواں! آگے بڑھو آگے بڑھو

حضرت آہؔ نے مرثیے بھی کہے ہیں، جو زبان وبیان کے حسن کا بہترین مظہر ہیں، خاص کر اپنی بہن کی وفات پر "مرثیۂ محبوب" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے، جو گویا خون جگر سے لکھی گئی ہے، جیسے اس نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو:

مانا کہ خلد میں ہے تمہیں عافیت ہزار

مانا کہ زیر حکم ہیں حوران گل عذار

مانا نظر فروز تمنا ہے سبزہ زار

مانا کہ دلفریب ہے لطف گل بہار

لازم تھا چھوڑنا مجھے تنہا، تم ہی کہو

آخر وفا ہے نام اسی کا، تم ہی کہو

حضرت آہؔ کو شعر گوئی کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا، انہوں نے مختلف حضرات کی وفات اور تاریخ وفات کو شعر کی شکل میں نظم کیا ہے، اپنے شیخ حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ کی وفات پر ان کی نظم اظہار جذبات کا بہترین مظہر ہے، جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

وہ درویش یکتا عطوف ورحیم

سراپا محمد بشارت کریم

اور اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

چوں رفتند آمد بگوشم ندا

مکیں شد معزز بخلد نعیم

اس میں اس دوسرے مصرعہ سے ۱۳۵۴ھ کا سنہ نکلتا ہے، جو حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ کا سنہ وفات ہے۔

حضرت آہؔ نے ڈھیر ساری غزلیں بھی کہی ہیں، اور اس میں غزل کا رنگ پوری شوخی اور دل آویزی کے ساتھ نمایاں ہے، ان غزلوں میں سارے ہی اشعار خوبصورت ہیں اور دل کے ساز کو چھیڑتے ہیں، اس لئے انتخاب دشوار ہے، تاہم یہاں چند اشعار کا پیش کرنا مناسب ہوگا:

- جب لب بام مرا انجمن آراء ہوگا
  کوئی بے ہوش کوئی محو تماشا ہوگا
  تیغ ابرو پہ ترے قتل کا دعویٰ ہوگا
  اور گواہی کو یہی خون کا دھبہ ہوگا
- اک سرمو نہیں ہے فرق اس میں
  چوٹیاں ہیں وبال کی صورت
  چشم و ابرو کو ہم سمجھتے ہیں
  کشتیٔ مے ہلال کی صورت
  مجھے جو دفن کیا رکھ کے دل کو سینے میں
  بنی مزار میں اک اور مزار کی صورت
  خوشا نصیب کہ بعد فنا ہوا پابوس
  تیرے قدم سے ملا میں غبار کی صورت

• جو پائی ہے خبراے نامہ بر!سچ ہے کہ جھوٹ؟
وہ ستم گر آگیا ہے راہ پر، سچ ہے کہ جھوٹ؟
بے حجابانہ تم آئے بام پر، سچ ہے کہ جھوٹ؟
حسن سے عالم ہوا زیروزبر،سچ ہے کہ جھوٹ؟
پوچھتے ہیں نامہ بر سے ہم کو جھوٹا جان کر
جو لکھی ہے حالتِ زخمِ جگرسچ ہے کہ جھوٹ؟

کیا نقل کیا جائے اور کیا چھوڑا جائے، حقیقت یہ ہے کہ آہؔ کی غزل فکروخیال کی بلند پروازی، تشبیہات واستعارات کی خوبصورتی اورروانی وسہل گوئی کاایک نمونہ ہے کہ مطلع پڑھنے کے بعد غزل ختم کئے بغیر طبیعت سیر نہ ہو، البتہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ بہت سی شوخ تعبیرات عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی پر مبنی ہوتی ہیں، اور محبوب حقیقی کی ذات اس کی مخاطب ہوتی ہے، صوفیاء کے کلام میں یہ رنگ بہت پایا جاتا ہے، مثلاً جس کی نظر میں حافظؔ شیرازی کا فکری پس منظر نہیں ہو، اس کو کون اس بات سے روک سکتاہے کہ وہ ان کو بادۂ وصبواور حسن وشباب کاشاعربلکہ اس کاپرستار سمجھے؟آہ کے کلام میں خاص کربعد کے زمانہ کی غزلوں میں کہیں کہیں شاعرکے محبوب حقیقی کااشارہ موجود ہے، فارسی شعروادب میں چونکہ اپنے سامنے ایک جان غزل رکھنے اوراس کے حسن وجمال پر طبع آزمائی کرنے کامزاج رہاہے، اس لئے فارسی شاعری کی میراث کے طورپر اردوشاعری میں بھی یہ رنگ پایاجاتاہے، اس سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے۔

فاضل گرامی جناب مولانااختر امام عادل قاسمی زیدت حسناتہ کوجتنی مبارک باد دی جائے کم ہے کہ انہوں نے گویامردہ کوزندہ کرنے کاکام کیاہے، جو شخصیتیں تاریخ کی روشنی میں ہوتی ہیں، جن کے حالات اور کارناموں پرپہلے سے لکھا گیاہوتاہے اور جن کی

تصنیفات موجود ہوتی ہیں، ان پر لکھنا آسان ہوتا ہے، آج کل ہماری یونیورسیٹیوں میں اقبال اور غالب پر نہ جانے کتنے لوگوں نے پی ایچ ڈی کی ہوگی، جن کے مقالات زیادہ تر پرانی لکیروں کو تازہ کرنے کے مترادف ہیں، اس میں لکھنے والا دوسروں کے اندوختہ کو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے، اور بعض دفعہ یہ تبدیلی اس کے حسن میں اضافہ کرنے کی بجائے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بن جاتی ہے، لیکن مولانا اختر امام عادل صاحب نے ایک ایسی شخصیت پر کام کیا ہے، جن کا تذکرہ بھی اس زمانہ میں خال خال ہی لوگوں نے سنا ہوگا۔

انہوں نے اس کام کو بڑی محنت اور علمی ریاضت کے ساتھ انجام دیا ہے، صاحب تذکرہ کے حالات کچھ رسائل وکتب سے، کچھ ان کی تحریروں سے اور زیادہ تر شخصیات سے سن کر مرتب کئے ہیں، پھر جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے، ان پر تعارفی نوٹ بھی لکھا ہے، ان میں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن کے حالات پر کوئی کتاب نہیں ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کی بعض تاریخی شخصیتوں اور تحریکوں کا بھی ذکر آگیا ہے، اور ان پر مختصر و جامع نوٹ سپرد قلم کئے گئے ہیں، واقعات کے پس منظر کو تلاش کرنے اور کتابوں کے تضادات کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے، اسی طرح کلیات آہؔ میں جمع وترتیب کے ساتھ ساتھ حاشیہ میں مشکل الفاظ کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، تاکہ قارئین کو سہولت ہو، اس طرح ایک بڑا مفید اور اہم کام ہے جو ان کے نوک قلم سے سرانجام پایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کام کو کرنے کا سب سے زیادہ استحقاق بھی ان ہی کو حاصل تھا، کیوں کہ صاحب تذکرہ ان کے خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں اور اس وقت تذکرہ نگار ہی اپنے خاندان کی علمی وراثت کے حامل وامین ہیں۔

مولانا اختر امام عادل صاحب دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل، صاحب ذوق قلم

کاراور خاص کر فقہ اسلامی کے غواص ہیں، ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں "اسلامی قانون کا امتیاز" بڑی اہم ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں ان کے مقالات قدروقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اوراکیڈمی کے فقہی مجلات میں ان کے جومقالات شائع ہوتے ہیں، اصحاب ذوق انہیں شوق کی آنکھوں پڑھتے ہیں، انہوں نے جنوبی ہند کی مختلف دینی جامعات میں ایک مقبول استاذ کی حیثیت سے منتہی کتابوں کا درس دیاہے، اوراب اپنے وطن مالوف میں "جامعہ ربانی" کےنام سے دینی درسگاہ قائم کی ہے، جوبہارمیں دینی تعلیم کاابھرتاہوامرکزہے، اوراس مرکزسے وہ کتابوں کی تصنیف کے ساتھ ساتھ افراد کی تصنیف کافریضہ بھی انجام دے رہے ہیں، دعاہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کوقبول فرمائے، کاش!اگروہ صاحب تذکرہ کی بخاری وترمذی سے متعلق یادداشتوں کوبھی کھوج نکالیں، (جن کااس کتاب میں ذکرہے) تویہ ایک بڑاکام ہوگا۔وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیرخلقہ محمدوعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین والحمدللہ رب العالمین۔

۱۸/محرم الحرام۱۴۳۹ھ — خالدسیف اللہ رحمانی

۹/اکتوبر۲۰۱۷ء — (خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حروف اولین

مؤلف کتاب

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمد المصطفیٰ امابعد

بہار ہندوستان ہی نہیں دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں سے ہے اور یہ ابتدا سے ہی علم ومعرفت کی سرزمین رہی ہے:

بہار کی سنگ بنیاد-علم ومعرفت کی سرزمین

تاریخ فرشتہ کے مطابق حضرت نوحؑ کے فرزند "حام "کے پوتے "کشن "[1] کے ایک لڑکا "مہاراج "نے اس کو آباد کیا، اور دور دور سے اہل علم کو بلا کر اس خطہ میں بسایا، بے شمار مدرسے اور عبادت گاہیں بنوائیں اور نواحی محاصل کی آمدنی کو ان کے مصارف کے لئے وقف کر دیا۔۔۔۔مہاراج نے سات سو(۷۰۰)سال تک ہندوستان پر حکومت کی، اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کے حالات بدل گئے، یہ راجہ ہندوستان کا جمشید اور فریدون تھا[2]"

اسی کی نسل میں منیر رائے کو بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی، اس نے بھی ہندوستان پر مضبوط حکومت کی، اور سپہ گری سے زیادہ علم وفلسفہ کو فروغ دیا، فرشتہ لکھتے ہیں:

1- یہ ہندوؤں کے گیتا والے سری کرشن نہیں ہیں، فرشتہ نے اس کی بھی صراحت کی ہے(تاریخ فرشتہ مصنفہ محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ عبدالحی خواجہ ج ا ص ۳۳ناشر: المیزان لاہور ط ۲۰۰۸ء)

2- تاریخ فرشتہ مصنفہ محمد قاسم فرشتہ، مترجم عبدالحی خواجہ ج ا ص ۳۳ناشر: المیزان لاہور ط ۲۰۰۸ء۔

"منیر رائے کو ہندوؤں کی علمی کتابوں یعنی شاستر وغیرہ سے بڑی دلچسپی تھی، اور وہ اہل علم ودانش کی محبت کو پسند کرتا تھا، اس بنا پر اس نے غیر علمی مشاغل یعنی سواری اور لشکر کشی وغیرہ کو بالکل ترک کر دیا تھا وہ اپنا بیشتر وقت علماء وفضلاء کی محفل میں گذارتا تھا، اس نے اہل ضرورت اور فقراء وغیرہ میں بے شمار دولت تقسیم کی اور بہار جاکر بہت زیادہ خیرات کی، منیر نامی شہر (اب پٹنہ کا ایک محلہ ہے) اسی راجہ کے عہد میں آباد ہوا"[3]۔

اسی لئے بہار اسلام کی آمد سے بہت قبل ہی سے علم وحکمت کا مرکز بن گیا تھا۔۔ مثلاً:

☆ مشہور مذہبی تحریکات بدھ مت اور جین دھرم کا مرکز بہار ہی تھا۔۔۔

☆ سنسکرت ادبیات میں آئینی وقانونی دستور جو "چانکیہ" کی طرف منسوب ہے، اس کا واضع بھی پاٹلی پترا (پٹنہ) ہی کا رہنے والا تھا۔

☆ ہندوستان کا سرمایۂ ناز کارنامہ "کلیلہ دمنہ" جس کا ترجمہ ہر علمی زبان میں کیا گیا، اس کا مصنف بھی بہار ہی کا تھا[4]۔

علم ومعرفت اور فقر وروحانیت کی یہی درسگاہیں بعد میں "ویہارا" یعنی خانقاہوں کے نام سے موسوم ہوئیں، جو خاص طور پر بدھ مت کے علمی اور روحانی مراکز کے لئے استعمال کئے جاتے تھے، اس طرح کی خانقاہیں ایک وسیع خطے میں پھیلی ہوئی تھیں، اس لئے اس پورے وسیع خطہ کا نام "ویہار" پڑ گیا اور پھر کثرت استعمال سے "بہار" بن گیا، اس کی مختصر تفصیل حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

---

[3]- تاریخ فرشتہ مصنفہ محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ عبدالحی خواجہ ج ا ص ۳۴، ۳۵ ناشر: المیزان لاہور ط ۲۰۰۸ء۔

[4]- محی الملۃ ص ۲۱، ۲۰ (مرتبہ حضرت مولانا شاہ عون احمد قادریؒ) مقدمہ حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ۔

"بہار جیسا کہ معلوم ہے لفظ وہار کی ایک مروجہ شکل ہے، اور وہار ابودھ مت کے علمی و عملی مرکزوں کی تعبیر تھی، اپنے انہی وہاروں کی وجہ سے جن کا جال اس صوبہ کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا اس پورے علاقے کا نام "بہار" ہو گیا، آج علمی حلقوں کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، پچھلے دنوں کوہ راجگیر کے دامن میں نالندا نامی بودھسٹ تعلیم گاہ کے جو پرانے آثار بر آمد ہوئے ہیں اور اس وقت تک ارباب تاریخ نے مختلف ذرائع سے نالندا کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اس سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے، کہ بہار کم از کم اس زمانہ میں جب بدھ متی کا اس ملک میں دور دورہ تھا، صرف ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ عام ایشیائی ممالک کا علمی مرکز سمجھا جاتا تھا، ایک طرف جاپان و چین سے اور دوسری طرف عراق وایران سے تشنہ کامان علم ان علمی مراکز کی طرف کھچے چلے آتے تھے تاریخی وثائق سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

دریائے گنگا کے جنوبی ساحل کا علاقہ جو مگدھ کے نام سے موسوم تھا اگر ایک طرف اس میں نالندا کی یہ یونیورسیٹی قائم تھی جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ اعلیٰ علوم کی تعلیم پانے والوں کی تعداد کبھی کبھی بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) تک پہونچ جاتی تھی۔

اور کچھ تعجب نہیں کہ اس مرکزی درسگاہ کے معاون مدارس و مکاتب مگدھ کے مختلف قصبات اور دیہاتوں میں بھی جاری ہوں۔۔۔۔۔۔اسی طرح صوبہ کا شمالی قطعہ جو دریائے گنگا کے شمالی ساحل پر ہمالیہ تک پھیلا ہوا ہے، کسی زمانہ میں جو میتھلا کہلاتا تھا، اور آج کل اسی کو ترہت کہتے ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری

میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ-"از دیر گاہ بن گاہ ہندی دانش"[5]-
"ہندی دانش" یعنی حکمت ہندی یا ہندی فلسفہ کی تعلیم کا زمانۂ دراز سے بہار کا شمالی علاقہ مرکز تھا، یہی ابوالفضل کے مذکورہ بالا فقرہ کا ماحصل ہے نہ صرف عہد قدیم میں جب گوتم رشی جیسے فاضل اور راجہ جنک جیسے عارف اس علاقہ میں جیسا کہ کہا جاتا ہے، پیدا ہوئے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ علم و فضل سے اس علاقہ کا ہر زمانہ میں خصوصی تعلق رہا ہے غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے افراد اس خطہ میں مسلسل پیدا ہوتے رہے، شاہجہاں کے زمانہ کا واقعہ ہے، بادشاہ نامہ (ج ا ص ۲۶۹) میں بیان کیا گیا ہے کہ (فارسی عبارت کا مطلب) :

"ترہت کے دو شریف آدمی جو جنیو پہننے والوں میں سے تھے غالباً برہمن یا بابھن ہونگے ان کو شاجہانی دربار میں یمین الدولہ نے پیش کیا دونوں میں سے ہر ایک کی یادداشت اور حافظہ کی قوت بھی عجیب تھی، اور اسی کے ساتھ شعر گوئی کا ملکہ بھی دونوں کا حیرت انگیز تھا، حافظہ اتنا قوی تھا کہ دس (۱۰) شاعروں کے ایک ایک شعر کو سننے کے ساتھ ہی صرف یہی نہیں کہ اسی وقت سنا دیا کرتے تھے، بلکہ جس ترتیب سے اشعار سنائے جاتے تھے اسی ترتیب کے ساتھ سناتے تھے، اور اسی کے ساتھ شعر گوئی میں یہ کمال تھا کہ کسی وزن و بحر میں شعر کہا گیا ہو مگر اس کو سنانے کے بعد ٹھیک انہی سنے ہوئے اشعار کے مضامین کو ان ہی اوزان میں نظم کر کے پیش کر دیتے تھے، بادشاہ کے سامنے دونوں کے کمالات کا مظاہرہ کیا گیا خلعت اور شاہانہ انعام واکرام کے ساتھ دونوں کو رخصت کیا گیا[6]۔

---

[5]- آئین اکبری ج ۲ ص ۶۷۔

[6]- اعیان وطن، مقدمہ حضرت علامہ مناظر احسن گیلانی ص ۶، ۷، شائع شدہ دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

بہار میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد

اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کی آمد بھی یہاں بہت قدیم ہے، عام طور ہندوستانی مورخین اختیارالدین محمد بختیار خلجی سے بہار میں مسلمانوں کی آمد کا آغاز مانتے ہیں، جس نے معروف روایت (مثلاً طبقات ناصری) کے مطابق ۵۹۵ھ مطابق ۱۱۹۹ء میں بہار کو فتح کیا تھا۔۔۔ لیکن بعض دوسری مستند تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے بہار کے پہلے مسلم فاتح امام محمد تاج فقیہ تھے[7]، جنہوں نے بختیار خلجی کی آمد سے ۱۹ برس قبل ہی ۵۷۶ھ مطابق ۱۱۸۰ء میں بہار کے ایک خطے (منیر) میں اسلامی ریاست قائم کر دی تھی، اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے:

---

[7]- امام محمد تاج فقیہ بن ابو بکر بن ابو محمد معروف بہ ابو الفتح بن ابو القاسم بن ابو الصائم بن ابو سعید معروف بہ ابو الدہر بن ابو الفتح بن ابو اللیث بن ابو اللیل بن ابو الدر بن ابو سہمہ بن ابو الدین امام عالم بن ابوذر عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) بن زبیر بن عبد المطلب۔ نسباً زبیری الہاشمی تھے۔

امام محمد تاجؒ کے نسب میں مذکور تمام بزرگ اپنے دور کے ائمہ وفقہا تھے۔ امام محمد تاج کا تعلق الخلیل (بیت المقدس) سے تھا۔ بعض نے مدینہ منورہ اور بعض نے مکہ مکرمہ بھی لکھا ہے، تاہم اکثر مورخین نے الخلیل ہی کو امام محمد تاج فقیہ کا وطن قرار دیا ہے۔۔ ممکن ہے کہ وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بکثرت آمد ورفت رکھتے ہوں۔ جو مورخین کے لیے وجہ التباس بن گیا ہو۔

شاہ محمد نور کی قلمی بیاض کے مطابق امام محمد تاج اور امام غزالیؒ ہم مکتب وہم درس تھے، اپنے شیخ کے حکم سے اشاعتِ اسلام کی غرض سے مدینہ منورہ سے باہر نکلے، شاہ محمد نورؒ کی قلمی بیاض سے مولانا عبد الرحیم صادق پوری نقل کرتے ہیں:

> "حضرت مولانا محمد تاج فقیہ قدس سرہ بوجہ تبحر در علم فقہ بمرتبۂ کمال امام محمد تاج الفقہا ملقب بودند آنحضرت وامام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہا بحکم مرشد خود برائے اجرائے اسلام از مدینہ منورہ وہم از محلہ قدس خلیل من محلات بیت المقدس تشریف میداشتند (از آنجا امام غزالیؒ بطرف ملک مغرب واز آنجا بطرف طوس تشریف بردند) حضرت مولانا محمد تاج فقیہ بطرف ہندوستان صوبہ بہار تشریف

ارزانی فرمودند)"   (الدر المنثور فی تراجم اہل الصاد قفور: ۱۱)

مولانا محمد کبیر داناپوری نے اپنی کتاب " تذکرۃ الکرام " میں لکھا ہے کہ امام محمد تاجؒ کے استاد " شیخ شہاب الدین سہروردی ہیں۔

تاہم یہ روایات درایتاً درست معلوم نہیں ہوتیں، کیوں کہ مستند تاریخی روایت کے مطابق امام محمد تاجؒ نے منیر کو ۵۷۶ھ میں فتح کیا۔ ان کے ساتھ ان کے جوان بیٹے بھی تھے، اس لئے یقیناً ان کی عمر اس وقت ۵۰ برس سے متجاوز ہوگی۔ جبکہ شیخ ابو حفص شہاب الدین سہروردی کی ولادت ۵۳۹ھ مطابق ۱۱۴۴ء میں ہوئی اور ان کی وفات ۶۳۲ھ مطابق ۱۲۳۴ء میں ہوئی۔ تاہم یہ امکان ہے کہ امام محمد تاجؒ کے استاد، شیخ ابو نجیب عبد القاہر سہروردیؒ ہوں کیونکہ ان کی ولادت ۴۹۰ھ مطابق ۱۰۹۷ء میں ہوئی اور وفات ۵۶۳ھ مطابق ۱۱۶۷ء میں ہوئی، اسلامی بہار کی قدیم تاریخ ویسے بھی اغلاط سے پُر ہے، ممکن ہے کہ کاتب کی مہربانی سے عبد القاہر سہروردی کو شہاب الدین سہروردی سمجھ لیا گیا ہو، اسی طرح یہ خیال بھی کہ امام غزالیؒ، امام محمد تاجؒ کے ہم مکتب و ہم درس تھے، درست نہیں، امام غزالی کا زمانہ حیات تو اس سے قبل کا ہے، ان کی ولادت ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء میں ہوئی جبکہ وفات ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء میں ہوئی، غرض نہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ امام محمد تاجؒ کے شیخ تھے اور نہ ہی امام غزالیؒ ہم مکتب، واللہ اعلم بالصواب۔

امام صاحب کی اہلیہ مکرمہ کا انتقال منیر ہی میں ہوا جس کے بعد امام محمد تاجؒ نے اپنی اہلیہ کی چھوٹی ہمشیرہ کو اپنے حبالۂ عقد میں لیا، ان سے ایک صاحبزادے مخدوم عبد العزیزؒ منیر ہی میں پیدا ہوئے، امام صاحب نے اہلیہ اولیٰ سے اپنے صاحبزادوں مخدوم اسرائیل اور مخدوم اسماعیل کو یہیں چھوڑا اور خود اپنی محل ثانی، چھوٹے صاحبزادے مخدوم عبد العزیز اور چند مخلصین کے ہمراہ منیر سے الخلیل کی طرف عازم سفر ہوئے، الخلیل بیت المقدس کا ایک محلہ ہے، وہیں امام صاحب کی وفات ہوئی۔ صاحب "الدر المنثور" مولانا عبد الرحیم صادق پوری کے مطابق امام تاج فقیہ" منیر سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا (الدر المنثور فی تراجم اہل الصاد قفور ص ۱۴)

امام تاج فقیہ کے چھوٹے صاحبزادے مخدوم عبد العزیز جب سنِ شعور کو پہنچے تو انہیں اپنے بھائیوں سے ملنے کا شوق منیر کھینچ لایا اور انہوں نے بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ یہیں اقامت اختیار کرلی۔

اس طرح گو ارضِ بہار نہ امام محمدؒ تاج فقیہ کا مولد و مدفن ہے اور نہ ہی انہوں نے اس سرزمین کو اپنی سکونت کے لیے اختیار فرمایا لیکن بہار کی اسلامی تاریخ امام محمد تاج فقیہ کے بغیر ادھوری ہے اور علومِ اسلامی کے ماہر علماء کے وجود کی ابتداء گویا آپ ہی کے حسنات میں سے ہے، بہار سے تعلق رکھنے والے مسلم اشراف کا شاید ہی کوئی گھرانہ ایسا ہو جو امام محمد تاج فقیہ کی ذریت سے نہ ہو۔

امام محمد تاجؒ ہندوستان وارد ہوئے تو اس وقت اسلامی عملداری کی حدود اودھ تک پہنچی تھی، اس زمانے میں ہندوستان کے مشرقی صوبوں- یوپی کے مشرقی اضلاع اور بہار و بنگال -میں طوائف الملوکی تھی، مختلف ہندو راجاؤں کی حکمرانی تھی، اثنائے سفر امام صاحب بہار کے ایک مقام منیر پہنچے، وہاں صرف ایک ہی مسلمان گھر آباد تھا، امام صاحب اسی کے گھر فروکش ہوئے جب نماز کا وقت ہوا تو چاہا کہ اذان دیں اور نماز پڑھیں، اس مسلمان نے اذان دینے سے منع کیا اور کہا کہ اذان کی آواز سنتے ہی راجا کے آدمی آکر ہمیں مار دیں گے یہاں اذان دینے کی اجازت نہیں ہے، یہ سن کر امام صاحب کو بہت دکھ ہوا اور وہیں سے واپس لوٹ گئے اور مدینہ منورہ یہ حسرت، تمنا اور آرزو لے کر حاضر ہوئے کہ اللہ پاک بہار میں اسلام پھیلانے کا کوئی سامان پیدا فرمادے۔

اسی اثنا ایک روز مسجدِ نبوی ﷺ میں سو رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ " اس کافر سے جاکر لڑو اللہ کامیاب کرے گا " بیدار ہوئے تو پریشان ہوئے کہ تن تنہا کس طرح لڑیں؟ اسی کشمکش میں چند دن نکل گئے کہ دوبارہ مسجدِ نبوی ﷺ ہی میں نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی اور وہی حکم صادر ہوا۔۔ اس بار بھی وہی کیفیت ہوئی تاہم یہ خیال بھی راسخ ہوا کہ جب حکم صادر ہوا ہے تو ان شاء اللہ اسباب بھی مہیا ہونگے، تا آنکہ تیسری مرتبہ بھی مسجدِ نبوی ﷺ ہی میں زیارت نصیب ہوئی اور اس بار نبی

بہار کے متعدد مشاہیر: مخدوم یحیٰ منیریؒ، شیخ شرف الدین احمد منیریؒ، مخدوم عزیز الدین پھلکیؒ، مولانا محمد عارفؒ، شاہ دولت منیریؒ، مولانا محمد سعیدؒ (شیر گھاٹی)، مولانا ولایت علی صادق پوریؒ، مولانا عنایت علی صادق پوریؒ، مولانا عبد الرحیم صادق پوریؒ (اسیر کالاپانی)، شاہ محمد اکبر داناپوریؒ، شاہ امین احمد ثبات فردوسیؒ اور شاہ محمد سلیمان پھلواریؒ وغیرہم امام محمد تاج سے براہِ راست نسبی تعلق رکھتے ہیں۔

(بشکریہ جریدہ "الواقعۃ" کراچی، شمارہ (5 / 6) شوال، ذیقعدہ 1433ھ / ستمبر، اکتوبر 2012 مضمون جناب محمد تنزیل الصدیق الحسینی)

کریم ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ فلاں فلاں لوگوں سے ملو وہ اس معاملہ میں تمہاری مدد کریں گے۔ جب بیدار ہوئے تو ان ناموں کو اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیا، ان میں سے بعض افراد تو مدینہ منورہ ہی میں مقیم تھے اور بعض دوسرے ممالک میں رہتے تھے۔۔۔ مدینہ منورہ میں جو افراد رہائش پذیر تھے وہ سنتے ہی امام صاحب کے ساتھ سفر جہاد میں نکل کھڑے ہوئے۔۔۔امام صاحب مع اہل وعیال ۳۰ /۳۵ /افراد کے ساتھ مدینہ پاک سے نکلے اور بخارا، کابل وغیرہ ہوتے ہوئے منیر (موجودہ پٹنہ) پہنچے۔۔۔ اس وقت تقریباً ساڑھے تین سو (۳۵۰)افراد ان کے ہمرکاب تھے۔۔۔۔۔

منیر کے راجا کو خبر ملی تو قلعے کی بلندی سے اس نے لشکرِ اسلامی کا معائنہ کیا، تعداد کی قلت دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے لشکر اسلامی پر حملہ کر دیا، مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور اللہ ربّ العزت نے لشکرِ اسلامی کو فتحیاب کیا، خود امام صاحبؒ ہی کے نیزے سے راجا مارا گیا، پھر امام صاحب کو منیر اور اس کے اطراف پر مکمل تسلط حاصل ہو گیا، آپ نے مکمل اسلامی نظام قائم کیا۔

بہار میں منیر کے مقام پر اس پہلی اسلامی ریاست کا قیام بقول مولانا مراد اللہ منیری مصنف "آثار منیر" ۲۷/رجب ۵۷۶ھ مطابق ۲۴/دسمبر ۱۱۸۰ء کو عمل میں آیا، لکھتے ہیں:

"آج سے آٹھ نو سو سال پہلے اللہ کے بندے، اس کے محبوب کی امت خاندان ہاشم کے جلیل القدر فرزند حضرت سیدنا امام محمد تاج فقیہ ہاشمی قدس خلیلی رحمۃ اللہ علیہ حسبِ بشارت حضرت رسالت مآب ﷺ ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیت المقدس سے صوبہ بہار کے مرکز عظیم یعنی سرزمین منیر شریف میں تشریف لائے اور پرچم اسلام نصب کر کے اس تیرہ و تار خطہ کو اپنی ضیائے ایمانی سے منور فرمایا، ۲۷/رجب روز جمعہ ۵۷۶ ہجری کی وہ مبارک ساعت تھی جب

آپ کے ہاتھ سے یہاں اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا"[8]۔

جبکہ پروفیسر معین الدین دردائی کے مطابق:

"حضرت مخدوم الملک (شیخ احمد منیریؒ) کے پردادا حضرت امام محمد تاج فقیہؒ بقصدِ جہاد ۵۷۶ھ میں بیت المقدس کے محلہ قدس خلیل سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور صوبہ بہار ضلع پٹنہ کے ایک قصبہ منیر شریف میں اقامت گزیں ہوئے۔ منیر کا راجہ بہت ظالم اور سرکش تھا، مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم توڑتا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت امام محمد تاج فقیہؒ نے اپنے آنے کے چھٹے سال اس سے جہاد کیا اور منیر فتح کر لیا"[9]۔

تاہم محققین کے نزدیک فتح منیر کی اوّل الذکر روایت ہی کو قبولیت عامہ حاصل ہے، پروفیسر صاحب کی روایت درست تسلیم نہیں کی گئی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

"مولانا محمد تاج فقیہؒ کی ذات سے منیر اور اس کے مضافات میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی، کچھ عرصہ آپ نے منیر میں قیام کر کے وطن مراجعت فرمائی اور زندگی کا بقیہ حصہ خلیل ہی میں بسر کیا[10]۔

مولانا ابوالبرکات عبد الروف داناپوری لکھتے ہیں:

"صوبہ بہار میں قصبہ منیر شریف قدیم اسلامی مرکز ہے حضرت امام محمد تاج

---

[8]- آثار منیر: ۸، ۹۔ بحوالہ جریدہ "الواقعۃ" کراچی، شمارہ (5 / 6) شوال، ذیقعدہ 1433ھ / ستمبر، اکتوبر 2012 مضمون جناب محمد تنزیل الصدیق الحسینی۔

[9]- تاریخ سلسلہ فردوسیہ ص ۳۹، بحوالہ مذکور۔

[10]- تاریخ دعوت وعزیمت: ۳ / ۱۷۸۔

فقیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دیار میں سب سے پہلے منیر کو اپنا اسلامی مرکز بنایا۔
آپ کی مجاہدانہ کوششوں سے اس دور دراز خطہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور کافی اشخاص نے راہ ہدایت اختیار کی[11]۔
امام محمد تاج فقیہؒ سلطانِ ہند شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے معاصر تھے۔
امام محمد تاج کی سن وفات سے متعلق بہت اختلاف پایا جاتا ہے[12]۔
اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہار کی ساری بہار بشارت مصطفٰے ﷺ کی دین ہے

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بہار میں صوفیا اور مشائخ

بہار میں اسلام صوفیاء اور مشائخ کے ذریعہ پہونچا، ان بزرگوں نے ملکوں کو بھی فتح کیا اور لوگوں کے قلوب بھی مسخر کئے، وہ میدان کارزار کے مجاہد بھی تھے اور عابد شب زندہ دار بھی۔۔۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ بہار ابتدا ہی سے اہل نسبت صوفیا اور کاملین کا مرکز رہا ہے، ساتویں صدی ہجری میں غالباً قطب الدین ایبک یا شمس الدین التمش کے زمانے میں بہار میں حضرت شیخ

11۔ آثار منیر ص ۵۔

12۔ اولاً کسی مستند کتاب میں امام محمد تاج فقیہ کی سن وفات مذکور نہیں، ثانیاً جن سنین وفات کا ذکر ملتا ہے نہ وہ روایتاً درست ہیں اور نہ ہی درایتاً۔ لیکن اس سے شخصیت کی عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کتنی ہی عظیم شخصیات ہیں جن کے سن ولادت و وفات کی دنیا کو خبر نہیں ہے۔

خضر دوزؒ کی خانقاہ شہرۂ آفاق تھی، ان کی شہرت روحانی سے متاثر ہو کر خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی بہاران کی خانقاہ میں بغرض بیعت حاضر ہونا چاہتے تھے (گو کہ ایسا نہ ہو سکا)[13]۔

عرب ملکوں میں حضرت مجدد الف ثانی کا سلسلہ نقشبندیہ حضرت خالد کردیؒ کے ذریعہ پہونچا اور خالد کردی کے پیر حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ تھے، لیکن حضرت خالد کردیؒ ہندوستان کیسے تشریف لائے؟، اور وہ سلسلۂ مجددیہ سے کیسے متعارف ہوئے؟ علامہ گیلانیؒ نے مقامات مظہری کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت خالدؒ کی ملاقات کردستان میں حضرت مرزا رحیم اللہ بیگ مسمّٰی بہ محمد درویش عظیم آبادیؒ سے ہوئی، اور ان سے آپ کو یہ ہدایت ملی کہ ہندوستان جاکر حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ سے وابستہ ہوں، اس طرح ایک بہاری شیخ کے ذریعہ یہ سلسلہ عرب اور دیگر ممالک میں متعارف ہوا[14]۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا سلسلۂ قادریہ بھی سوڈان میں ایک شیخ تاج الدین بہاریؒ کے ذریعہ متعارف ہوا، ان سے قبل سوڈان میں کوئی صوفیت یا سلسلۂ قادریہ کو جانتا بھی نہیں تھا، شیخ تاج الدین بہاریؒ سے سوڈان کے شیخ ادریسؒ بیعت ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا[15]۔

بہار کی مٹی میں آج بھی ان کی معرفت و روحانیت کی خوشبو موجود ہے، اس خاک سے اگنے والے گل و گلزاروں میں ایمان کی طاقت بھی ہے اور محبت کی مٹھاس بھی۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

13۔ سیر الاولیاء کرمانی ص ۱۱۲ بحوالہ محی الملۃ مقدمہ علامہ گیلانی ص ۲۱۔

14۔ محی الملۃ دیباچہ علامہ گیلانیؒ حاشیہ ص ۲۳۔

15۔ محی الملۃ دیباچہ علامہ گیلانیؒ ص ۲۳ بحوالہ تاریخ السودان ج ۱ ص ۷۵۔

بہار علم وعلماء کا مرکز

اس علاقہ کو جس طرح صوفیاء اور مشائخ سے نسبت حاصل رہی اسی طرح یہ اکابر اہل علم اور اصحاب تحقیق کا بھی مرکز رہا ہے، اسی منیر کی سرزمین پر ملابدھن حقانیؒ کی شخصیت پیدا ہوئی جو ہندوستان کے علمی افق پر روشن آفتاب کی طرح چمکی اور آفاق عالم پر چھاگئی۔

حضرت مولانا گیلانیؒ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ کی مآثرالکرام اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اخبارالاخیار کے حوالوں سے لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دودمان عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکربارؒ کے دادا شیخ طاہر ملتانیؒ نے تحصیل علم کے لئے ملتان سے بہار کا سفر کیا اور شیخ بدھ (یابودھن) حقانیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا[16]۔

ہندوستان کا عظیم معمار شیر شاہ سوری ان کی جوتیاں سیدھی کر کے فخر محسوس کرتا تھا۔

شیر شاہ کے جانشیں "اسلام شاہ "کے زمانہ میں بھی جب کوئی اہم مذہبی مسلہ پیش آتا تو گوالیار میں بادشاہ ملابدھن کو بہار سے طلب کرتا تھا[17]۔

بہار کی یہ علمی برتری مغلیہ عہد حکومت تک قائم رہی، شاہ جہاں نے اپنے قابل فخر صاحبزادہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تعلیم وتربیت کے لئے ملاموہن بہاریؒ کا انتخاب کیا، اورنگ زیب اپنے اساتذہ میں ملاموہن بہاری سے بہت زیادہ متاثر تھے[18]۔۔۔۔۔

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیبؒ کے زمانہ میں فتاویٰ ہندیہ کی ترتیب وتدوین کے لئے جو

16- اخبار الاخیار ص ۱۹۵، مآثرالکرام ص ۳۴۔

17- محی الملۃ مقدمہ علامہ گیلانی ص ۲۲۔

18- دیکھیے مآثر الکرام ص ۳۴ بحوالہ نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۴۸۔

مجلس فقہی بنائی گئی، اس میں کئی نام علماء بہار کے بھی تھے، مثلاً ملا فصیح الدین جعفری پھلواروی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری، قاضی عنایت اللہ مونگیری، مولانا محمد شفیع سرہندی / بہاری، اور ملا ابوالحسن دربھنگوی وغیرہ[19]۔

عالمگیر کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ (تمباکو کی حلت وحرمت کے مسئلہ) میں علماء دہلی میں شدید اختلاف ہوا، ہزار بحث ومباحثہ کے باوجود مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نہ نکل سکی، تو عالمگیر نے اس قضیہ کے حل کے لئے حضرت مولانا شہباز بھاگلپوری سے رجوع کیا اور کہا کہ وہ ابوحنیفۂ وقت ہیں، وہ جو فتویٰ دیں گے وہی قابل قبول ہوگا[20]۔

شاہ عالم بادشاہ کے استاذ مولانا سراج الدین صاحب بھی بہار ہی سے طلب کئے گئے تھے وہ پٹنہ سے قریب فرید پور کے رہنے والے تھے[21]۔

عہد مغلیہ ہی میں ملا محب اللہ بہاری کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، صدر الصدور اور قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز ہونے کے علاوہ علم وفن کی دنیا میں جو ریاست وامامت انہیں حاصل ہوئی کہ شاید ہندوستان کی علمی تاریخ میں کوئی دوسرا نام ان کے بالمقابل پیش کیا جاسکے، ان کی کتاب مسلم الثبوت اصول فقہ میں شہرۂ آفاق ہے، لیکن ان کی سلم العلوم (منطق میں) نے علمی دنیا میں وہ ہلچل پیدا کی کہ صدیوں تک مدارس اسلامیہ کے نصاب پر اسی ایک کتاب کی حکمرانی رہی، اسی کتاب کی تشریح وتدریس اور حاشیہ نویسی علم کی سب سے بڑی معراج مانی جاتی

---

[19]-اس حقیر کی کتاب "قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز" میں اس پر مفصل گفتگو موجود ہے، ملاحظہ کریں ج ا ص ۱۱۵تا۱۲۸۔

[20]-تذکرۃ الکرام ص ۵۴۸ مولانا شاہ ابوالحیوٰۃ پھلواروی مطبوعہ لکھنؤ۔

[21]-مجی الملۃ دیباچہ علامہ گیلانی ص ۲۲ بحوالہ گلشن زار ص ۱۵۔

تھی[22]، آج بھی مدارس کے نصاب میں یہی کتاب منطق کی منتہی کتاب تسلیم کی جاتی ہے، اس لحاظ سے پورے ہندوستان میں ملا محب اللہ بہاریؒ کا کوئی ہم سر نظر نہیں آتا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں بہار علم کا بڑا مرکز تھا، اور دور دراز سے لوگ تحصیل علم کے لئے یہاں آتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ابتدا سے لیکر انتہائی درجات تک کی مکمل تعلیم کا یہاں معقول انتظام تھا، اسی لئے یہاں کے طلبہ کو تحصیل علم کے لئے بہار سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

استاذ العلماء ملا موہن بہاریؒ کی پوری تعلیم بھی بہار ہی میں ہوئی تھی، تعلیم کی غرض سے وہ بہار سے باہر نہیں نکلے[23]۔

ملا احمد سعیدؒ مفتی عساکر شاہجہانی کے بارے میں معروف ہے کہ وہ بہار کے تھے اور ان کی پوری تعلیم بہار ہی میں ہوئی تھی، اپنے والد ملا سعدؒ سے تعلیم حاصل کی[24]۔

بہار کی اس علمی برتری کا اعتراف حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی کیا ہے، لکھا ہے کہ:

بہار مجمع علماء بود[25]۔

ترجمہ: بہار سربر آوردہ علماء کا مرکز تھا۔

بہار اب بھی اپنی علمی وروحانی روایات پر قائم ہے، ملک وملت کو آج بھی یہاں سے بیش قیمت افراد میسر ہو رہے ہیں، بعض حالات کی بنا پر یہ تسلسل کمزور تو ہوا ہے لیکن منقطع نہیں

22- پوری تفصیل اندرون کتاب باب دوم میں پڑھئے۔

23- دیکھئے مآثر الکرام ص ۲۳۴ بحوالہ نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۴۸۔

24- بادشاہ نامہ ج ۲۔

25- نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۴۸۔

ہوا ہے۔

اسلامی تاریخ میں سوانح وتذکرہ نویسی کی روایت

اسلامی تاریخ میں بزرگوں کے حالات لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے، اور شروع سے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین اور مشائخ کے احوال واقوال ضبط کرنے کا اہتمام کیا گیا، عربی زبان میں رجال اور تاریخ پر بے شمار کتابیں موجود ہیں، ان میں حافظ ابن حجرؒ کی الدرر الکامنہ، علامہ سخاویؒ کی الضوء اللامع، علامہ شوکانیؒ کی البدر الطالع، الحضرمیؒ کی النور السافر، المحبی کی خلاصۃ الاثر، المرادیؒ کی سلک الدرر کافی مشہور ہیں جن میں ہندوستانی شخصیات کو بھی جگہ دی گئی ہے، خود ہندوستان میں بھی عربی، فارسی، اردو اور مختلف زبانوں میں مستقل یا غیر مستقل بہت سے تذکرے لکھے گئے، ان میں شیخ سدید الدین محمد بن محمد العوفیؒ کی "لباب الالباب" اور "جوامع الحکایات ولوامع الروایات"، قاضی منہاج الدین عثمان بن محمد الجوزجانیؒ کی "طبقات ناصری"، قاضی ضیاء الدین برنیؒ (۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۷ء) کی "تاریخ فیروز شاہی"، رشید الدین فضل اللہ ہمدانیؒ (م ۷۱۸ھ مطابق ۱۳۱۸ء) کی "جامع التواریخ"، شیخ عبد القادر بن ملوک شاہ (۱۰۰۴ھ) کی "منتخب التواریخ"، شیخ محمد قاسم فرشتہ (۱۰۱۷ھ مطابق ۱۶۰۸ء) کی "تاریخ فرشتہ"، شیخ غلام حسین طباطبائیؒ (۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۶ء) کی "سیر المتاخرین"، شیخ عبد القادر محمد اکرم رامپوری" (۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء) کی "موج کوثر"، رود کوثر" وغیرہ، علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء) کی "الفاروق" اور "سیرت النعمان" وغیرہ، مولانا عبدالحی لکھنویؒ (م ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء) کی "نزہۃ الخواطر" اور سید محبوب علی رضوی کی "تاریخ دار العلوم دیوبند" خاص شہرت کی حامل ہیں۔

مشائخ کے تذکرے

بالخصوص صوفیا اور مشائخ کے حالات کثرت سے لکھے گئے، اس لئے کہ یہ بھی ان کی روحانی وراثت کا حصہ مانا جاتا تھا:

☆اس موضوع پر قدیم ترین کتاب حضرت ابوعبدالرحمن محمد بن حسین سلمیؒ (م ۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء) کی تصنیف "طبقات الصوفیاء" ہے، اس میں ایک سو چار (۱۰۴) مرد اور چوراسی (۸۴) خواتین صوفیاء کا تذکرہ ہے،۔۔۔

☆ابو نعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ مطابق ۱۰۳۸ء) کی :حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء "چار ضخیم جلدوں میں بزرگوں کی تاریخ پر کافی مبسوط کتاب ہے، جس کی تالیف ۴۲۲ھ مطابق ۱۰۳۱ء میں ہوئی،۔۔۔

☆صوفیانہ سیر وسوانح میں حضرت شیخ داتا گنج بخش علی بن عثمان الجلابی الہجویریؒ کی کتاب "کشف المحجوب "شہرۂ آفاق حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب دراصل تصوف کے حقائق ودقائق کے لئے لکھی گئی ہے لیکن اس میں جابجا صوفیائے کرام کے تذکرے بھی آئے ہیں اس میں پچاسی (۸۵) بزرگوں کے حالات ہیں، فارسی ادب میں صوفیاء کے حالات پر یہ غالباً پہلی کتاب ہے جو ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء میں لاہور (قدیم ہندوستان) میں تصنیف کی گئی، اس قدر قدیم ہونے کے باوجود اس کتاب کی اہمیت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے، تاریخ اور تصوف کی کوئی لائبریری اس کتاب سے مستغنی نہیں ہے،۔۔۔

☆تاریخی اعتبار سے "ترجمۂ طبقات الصوفیہ "بھی انتہائی قدیم ترین مجموعہ ہے جس کو ۴۸۱ھ مطابق ۱۰۸۸ء میں شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ الانصاری نے مرتب فرمایا، اسی کتاب کا مفصل فارسی ترجمہ حضرت شیخ عبدالرحمن جامیؒ (م ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۹۲ء) نے "نفحات الانس

من حضرات القدس" کے نام سے کیا، اس میں پانچ سو اڑسٹھ (۵۶۸) صوفیاء کا تذکرہ ہے، جامیؒ کی یہ کتاب ۸۸۳ھ مطابق ۱۴۷۸ء میں مکمل ہوئی ۔۔۔۔

☆ شیخ فرید الدین عطار کی کتاب " تذکرۃ الاولیاء " بھی کافی قدیم ہے جو ۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۱ء سے قبل کی تصنیف ہے، اس میں شیخ عطارؒ نے بہتر (۷۲) صوفیاء کا تذکرہ کیا ہے، اور ضمیمہ میں بیس (۲۰) صوفیاء کا ذکر ہے، جس کو میرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے تصحیح کر کے شائع کیا ہے ۔۔۔۔

☆شاہ ابراہیم لودھی کے استاذ ملا جمالی کنبوہؒ معروف بہ درویش جمالیؒ کی کتاب "سیر العارفین" بھی بہت مشہور ہے جو ۹۴۱ھ مطابق ۱۵۳۴ء کی تصنیف ہے ۔۔۔۔

☆اسی طرح حضرت شیخ چراغ دہلویؒ کے مرید خاص شیخ مبارک امیر خوردؒ کی "سیر الاولیاء فی محبۃ الحق جل وعلا (سن تصنیف ۹۳۸ھ اور ۹۴۱ھ کے مابین)، اور غوثی منڈوی شطاریؒ کی "گلزار ابرار (سن تصنیف ۱۰۱۴ھ اور ۱۰۲۲ھ کے مابین) بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔۔

☆حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء) کی کتاب "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" کافی مشہور اور مستند ہے، جس میں تقریباً تین سو (۳۰۰) مشائخ کا تذکرہ ہے ۔۔۔۔

☆شاہ جہاں کے دور میں شیخ الہدایا (اللہ دیا) نے بھی "سیر الاقطاب" کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کیا تھا ۔۔۔

☆شاہ جہاں کے بیٹے محمد دارا شکوہ قادریؒ نے "سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء" کے نام سے کتابیں لکھیں ۔

ان کے علاوہ کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں مونس الارواح، حضرات القدس، مخبر الواصلین، معارج الولایت، ریاض الاولیاء، مطلوب الطالبین، روضۃ اقطاب، انفاس

العارفین اور روضۃ الاولیاء مفتی محمد غلام سرور الہاشمی کی خزینۃ الاصفیاء، محمد حسین چشتی صابری کی انوار العارفین وغیرہ مشہور و معروف ہیں[26]۔۔۔۔۔

زمانہ مابعد کی کتابوں میں حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ کی حیات طیب (سوانح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)، مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی "تذکرۃ الرشید"، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کی "اشرف السوانح" اور حضرت مولا زید ابو الحسن فاروقی مجددیؒ کی "مقامات خیر" وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

بہار میں سوانح نگاری کی روایت

بہار میں اردو زبان میں سوانح نگاری کا آغاز ظہور الحق ظہورؔ کی کتاب "فیض عام کبیر" سے مانا جاتا ہے، جو ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۱۳ء میں شائع ہوئی، یہ سیرت پاک کے موضوع پر ہے، ۔۔۔اسی سال محمد شاہ صاحب شہرتؔ کی حدیقۂ شہبازیہ "شائع ہوئی، جو حضرت شہباز بھاگلپوری کے حالات پر مشتمل ہے، ان دونوں کتابوں کے بعد پروفیسر عبد الغفور شہباز نے نظیر اکبر آبادی کی سوانح "زندگانی بے نظیر" لکھی، جو نظیر کی زندگی پر اردو کی پہلی سوانح عمری ہے[27]۔

اس میدان میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو خاص امتیاز حاصل ہے، مشائخ کے حالات پر اس خانقاہ سے کئی وقیع کتابیں شائع ہوئیں جن میں خصوصیت کے ساتھ مولانا شاہ محمد ابو الحیوٰۃ قادریؒ (م ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۱ء) کی تذکرۃ الکرام (فارسی، سن تصنیف ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء، اردو ترجمہ بستان الاکرام کے نام سے شائع ہو چکا ہے)، مولانا حکیم محمد شعیب نیرؔ قادریؒ کی کتاب "اعیان وطن" اور مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری کی "سیرت پیر مجیب" بہت

26-مقدمہ بستان الاکرام (سید محمد اسد علی خورشید) ترجمہ تذکرۃ الکرام ص x مولانا شاہ ابو الحیوٰۃ القادریؒ۔

27-جدید تاریخ ادب اردو ص ۱۰ مصنفہ ڈاکٹر آصف اختر ناشر جاوید بک سینٹر پٹنہ ۲۰۱۰ء۔

ممتاز ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی "ارشاد رحمانی "۔۔۔ شاہ تجمل حسین صاحبؒ کی "کمالات رحمانی "۔۔۔۔۔علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی "سوانح قاسمی "۔۔۔۔۔علامہ سید سلیمان ندویؒ کی "سیرت عائشہؓ، حیات مالکؒ، خیام اور حیات شبلیؒ۔۔۔۔۔حضرت مولانا حکیم احمد حسن منورویؒ (م ۲۷/رجب المرجب ۱۳۸۷ھ مطابق ۲/نومبر ۱۹۶۷ء)"کی مختصر حالات مشائخ نقشبندیہ "اور "مختصر حالات مشائخ چشتیہ "، حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب گڑھولویؒ (رجب المرجب ۱۴۱۳ھ مطابق جنوری ۱۹۹۳ء) کی جنۃ الانوار، اور حضرت مولانا قاری محمد فخر الدین گیاوی صاحبؒ کی "درس حیات" وغیرہ بھی اسی سلسلے کی معیاری کتابیں ہیں۔

بہار اردو زبان وادب کا اہم مرکز

اردو زبان کی نشو ونما میں خانقاہوں کا بڑا حصہ رہا ہے [28]، صوفیاء اور مشائخ نے اردو زبان کو اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنا کر اس زبان کی معنویت اور حسن میں قابل قدر اضافہ کیا، اس سلسلے میں بہار کے کئی نام اردو کی پیشانی پر چمک رہے ہیں، مثلاً سید عماد الدین قلندر قادریؒ اردو کے شاعر تھے ان کی غزلیں اور رباعیات معرفت میں ڈوبی ہوئی ہیں، ملا محمد تحقیق عظیم آبادی فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے، قاضی عبد الغفار غفاؔ، اور غلام نقشبند سجادؔ بھی صوفی شاعر تھے، شاہ آیت اللہ جوہری ومذاقی پھلوارویؒ بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، فارسی میں شورشؔ تخلص کرتے تھے، انہوں نے مرثیہ وسلام میں طبع آزمائی کی ہے، ان کی مشہور مثنوی "گوہر جوہری " اردو ادب میں خاص مقام رکھتی ہے، اسی طرح شاہ نور الحق طپاںؔ

---

[28] - بابائے اردو مولوی عبد الحقؒ نے اپنی کتاب "اردو کے نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ "میں اس طرح کی چیزوں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

پھلواروی، غلام علی راسخ عظیم آبادی، شاہ ظہورالحق ظہور پھلواروی، شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی کی عارفانہ شاعری نے اردوزبان کے نشوو ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے[29]۔

حضرت سید شاہ امیر الحسن قادریؒ کی عارفانہ شاعری کے نمونے آپ خود اس کتاب میں آگے ملاحظہ کریں گے۔

علامہ ظہیر احسن شوق نیموی بھی بہار کے عظیم شعراء میں گذرے ہیں، بڑے مذہبی عالم ہونے کے ساتھ شعر وادب کا بھی کامل ذوق رکھتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے یگانہ روزگار نے آپ سے مشورۂ سخن لیا تھا، شوق کی غزل کا یہ مطلع کافی مقبول خاص وعام ہوا:

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا
ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا

عظیم آباد (پٹنہ) کے بارے میں علامہ شوق نیموی کی یہ رباعیاں مبنی بر حقیقت تھیں:

اب ملک سخن کی آبرو ہے پٹنہ — مشہور زمانہ چار سو ہے پٹنہ
شوق اہل کمال کا یہاں مجمع ہے — رشک دہلی و لکھنؤ ہے پٹنہ

ہے اہل کمال سے یہ پٹنہ آباد — شاگرد کے شاگرد یہاں ہیں استاد
کامل ہیں یہاں کے سیکڑوں اہل سخن — یہ ہیں وہ ہیں وہ شاد ہیں وہ آزاد

بہار کو کسی مستقل دبستان ادب کا مقام گو کہ حاصل نہ ہو سکا لیکن اس کی شاعری کا اپنا منفرد رنگ وروپ اور جداگانہ لب ولہجہ ہے، میر وغالب جیسے اساتذۂ فن نے یہاں سے استفادہ کیا ہے، میر تقی میر نے جعفر عظیم آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔۔۔۔۔ غالب نے بھی

29- جدید تاریخ ادب اردو ص ۶ مصنفہ ڈاکٹر آصف اختر ناشر جاوید بک سینٹر پٹنہ ۲۰۱۰ء۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی کا کلام سامنے رکھ کر مشق سخن کی، مرزا بیدلؔ عہد عالمگیر میں دہلی گئے، پھر عظیم شاہ کے زمانے میں پٹنہ واپس آئے، فارسی کے شاعر تھے لیکن اردو میں بھی شاعری کرتے تھے:

اس دل کے آستاں پر جب عشق آپکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم میں

شادؔ عظیم آبادی کا تو کہنا ہی کیا، اس آخری دور میں انہوں نے شاعری کو فن کی بلندیوں پر پہونچایا، اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔

حضرت آہؔ اور علامہ شوقؔ

یہی دور حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوری کا بھی ہے، حضرت آہؔ کی علمی وفنی سرگرمیوں کا زمانہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۵ء تک ہے، ان میں ابتدائی بیس (۲۰) سال انہوں نے اپنے آبائی وطن مظفرپور میں گذارے، دو سال مئو (یوپی) جیسے مرکز علم میں رہے اور پھر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۵ء تک مسلسل بہار کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) کا حصہ رہے اور پٹنہ (عظیم آباد) کے علم وفن کی آبرو بڑھائی۔۔۔۔

علامہ شوقؔ نیموی صرف ۴۴ / سال کی عمر میں (۱۹۰۴ء میں) اپنی بساط علم وادب لپیٹ کر دنیا سے جاچکے تھے، اس لئے پٹنہ میں ان کی معاصرت حاصل نہ ہو سکی، البتہ جب شوقؔ کے فکر وفن کی عظمتیں دنیا سے لوہا لے رہی تھیں اسوقت آہؔ کی طالب علمی کے دن تھے، اور کانپور اور دیوبند میں وہ معقولات ومنقولات کی تعلیم میں مشغول تھے، پھر فارغ ہو کر مظفرپور کے مدرسہ جامع العلوم میں صدرالمدرسین ہوئے اس کے دو تین سال کے بعد علامہ شوقؔ نیموی کا

انتقال ہوا، یقیناً حضرت آہ نے بھی علامہؒ کے فکر و فن اور علم کی شہرت ضرور سنی ہوگی، ممکن ہے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو، آہ کے کلام میں شوق کے طرز کی جھلک ملتی ہے اور آہ کا کلام بھی شوق ہی کی طرح بلند علمی حقائق اور تاریخی اشارات سے لبریز ہے، دونوں کے طریقۂ استدلال اور نتائج فن میں بھی بڑی حد تک مماثلت ہے۔۔۔ دراصل یہ دونوں ہی مدرسہ کی پیداوار تھے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شوق کے بعد پٹنہ (عظیم آباد) میں آہ جیسا صاحب علم و تحقیق اور مفکر و فلسفی شاعر دوسرا نہیں ہوا۔۔ شوق اپنے مطب میں بیٹھ کر شغل فن اور کار تصنیف انجام دیتے تھے۔۔۔ آہ یہی کام مدرسہ کے حجرہ میں بیٹھ کر کرتے تھے، عظیم آباد کے اصحاب فکر و نظر اور ارباب ذوق نے آپ کے علم و فن کا لوہا تسلیم کیا، اور کوئی بزم ہو کوئی انجمن، آہ کی گرمی نفس سے آباد رہی۔

آہ اور شاد

البتہ شاد عظیم آبادی سے آپ کو معاصرت حاصل رہی ہے، شاد عمر میں آپ سے بہت بڑے تھے، لیکن پٹنہ کے زمانہ قیام میں آہ نے شاد کا زمانہ عروج دیکھا ہے، شاد کا انتقال حضرت آہ کی پٹنہ آمد کے پانچ سال بعد ۱۹۲۷ء میں ہوا۔۔۔ آہ کے کلام میں جو فن کی بلندی ملتی ہے وہ اس بات کی مستحق تھی کہ دبستان عظیم آباد میں شاد کے بعد آہ کو وہ مقام حاصل ہو لیکن ایک تو آپ کی صوفیانہ وضع زندگی اور عالمانہ غیرت و شان اس طرح کی جد و جہد میں مانع رہی، دوسرے آپ تحریک حریت کے علمبرداروں میں تھے، آپ کا تعلق تحریک ریشمی رومال اور تحریک خلافت کے کاروان قدس سے تھا، عظمت فن منوانے کے لئے اقتدار وقت سے اتحاد ضروری ہے، آپ کو فکر و فن میں شاد سے بھی بلند مقام مل سکتا تھا، لیکن شاد کی سطح پر آنا آپ کے بس کی بات نہیں تھی۔۔۔

شاؔد قافلۂ حریت کے آدمی نہیں تھے، مذہبی طور پر وہ شیعہ اثنا عشری سے تعلق رکھتے تھے،۱۸۸۹ء سے مسلسل تیس (۳۰) برسوں تک وہ انگریزی سرکار کے آنریری مجسٹریٹ رہے،۱۸۹۱ء میں شاؔد کو سرکار انگلشیہ کی جانب سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا[30]، پھر پٹنہ شاؔد کا اپنا وطن تھا، حکومت کے عہدہ پر مسلسل رہنے کی وجہ سے بڑے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات بھی قائم ہوگئے تھے۔۔۔۔۔غرض فکر وفن کی عظمت کو تسلیم کرانے کے جو ظاہری محرکات ہیں تقریباً وہ سب شاؔد کو حاصل ہوگئے تھے، اسی لئے دبستان عظیم آباد میں جو شہرت شاؔد کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے نصیب میں نہیں آئی، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ فکر وفن کی عظمت میں فی الواقع بھی کوئی ان کا ہم پایہ نہیں تھا، جب کہ حضرت آؔہ کے کلام میں فن کی جملہ نزاکتوں اور بلندیوں کے ساتھ علم کی گہرائی وگیرائی اور خلوص کی طاقت مستزاد ہے۔۔۔بس یہ وقت کے تیور ہیں جو اکثر سچے مسافران علم وفن کا ساتھ نہیں دیتے۔

آؔہ کا تخلص

عجب نہیں کہ آؔہ کے تخلص کے پیچھے ان کا یہ درد اور احساس کرب بھی پوشیدہ ہو، اردو شاعری میں لفظ "آہ" اسی بے زبان کیفیت غم کی ترجمانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے:

آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے ترے زلف کے سر ہونے تک

(مرزا غالب)

مری آہ کا تم اثر دیکھ لینا وہ آئیں گے تھامے جگر دیکھ لینا

(داغ دہلوی)

[30] شاؔد عظیم آبادی ص ۶،۵ مرتبہ انجم فاطمی شائع کردہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۲۰۰۰ء۔

آہ جو دل سے نکالی جائے گی　　کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

(اکبر الٰہ آبادی)

اے حفیظ آہ آہ پر آخر　　کیا کہیں دوست واہ وا کے سوا

(حفیظ جالندھری)

درد دل کتنا پسند آیا اسے　　میں نے جب کی آہ اس نے واہ کی

(آسی غازی پوری)

ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے　　مسکراہٹ بھی آہ ہوتی ہے

(جگر مرادآبادی)

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

(مخدوم محی الدین)

دل پر چوٹ پڑی ہے تب تو آہ لبوں تک آئی ہے
یوں ہی چھن سے بول اٹھنا تو شیشہ کا دستور نہیں

(عندلیب شادانی)

میں نے جب تلاش کیا کہ آہ کا تخلص حضرت آہ کے علاوہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں بھی موجود ہے یا نہیں؟ تو اردو ادب کی تاریخ میں مجھے دو شخصیتیں ایسی ملیں، جنہوں نے اس تخلص کو اپنی شاعری کے لئے استعمال کیا تھا، ان میں ایک حضرت آہ کے پیشرو ہیں اور دوسرے متاخر۔

(۱) پیشرو شخصیت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہے، جو کانپور میں حضرت آہ کے زمانۂ تعلیم میں مدرسہ جامع العلوم کے صدر المدرسین تھے، حضرت تھانویؒ ایک بڑے عالم ربانی اور عظیم مصلح تھے، شعر و شاعری کا شغل نہیں تھا لیکن شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق

رکھتے تھے ، قیام مکہ معظمہ کے دوران توحید وجودی کے مضامین پر مشتمل آپ نے ایک غزل کہی تھی ، اس میں آہ کا تخلص استعمال کیا تھا، اشرف السوانح میں اس غزل کے دو اشعار نقل کئے گئے ہیں، اس سے ان کے کلام کی سلاست کا اندازہ ہوتا ہے:

خودی جب تک رہی اس کو نہ پایا	جب اس کو ڈھونڈھ پایا خود عدم تھے
حقیقت کیا تمہاری تھی میاں آہ	یہ سب امداد کے طلب وکرم تھے

آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے اس غزل کو بہت پسند فرمایا[31]۔

حضرت تھانویؒ کانپور میں کافی متعارف ومقبول تھے، اور بڑے واعظ وخطیب کی حیثیت سے بھی مشہور تھے، اپنے وعظ میں اشعار کا بر محل استعمال کرتے تھے، حضرت آہ جس دارالعلوم میں پڑھتے تھے اس کے سالانہ جلسوں میں بھی بحیثیت مقرروہ تشریف لاتے تھے۔۔۔ گو کہ حضرت تھانویؒ نے بعد میں شعر وشاعری ترک فرمادی اور اس طرح ان کا یہ تخلص بھی نسیاً منسیا ہو گیا۔۔۔۔ لیکن ممکن ہے کہ حضرت آہ کو حضرت تھانویؒ کے اس شاعرانہ تخلص کا علم ہو اوران کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے چھوڑے ہوئے تخلص کو اختیار کر لیا ہو۔

☆اور متاخر شخصیت صفدر آہ سیتاپوری (ولادت ۲۸ / اگست ۱۹۰۳ء -وفات ۲۹ / جولائی ۱۹۸۰ء) کی ہے، ان کی کتابوں اور کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئے لب ولہجہ کے منفرد شاعر تھے، ان کی شاعری پر مفکرانہ اور فلسفیانہ رنگ غالب ہے، ان کے چھ (۶) مجموعۂ کلام کا ذکر ملتا ہے محترمہ زرینہ ثانی نے ان کا جائزہ اور انتخاب مرتب کیا ہے اور انجمن ترقی اردو دہلی نے اس کو شائع کیا ہے:

---

[31]- اشرف السوانح ج ا ص ۲۵۹، مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ۔

آہ سیتاپوری کی کتاب "مثنوی نو بہ نو" (فلسفۂ الٰہیات ایک نئے زاویے سے[32]) سے ان کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

ان کی پہلی نظم کا عنوان ہے:- ازل الآزال۔

ہوئے لاہو کا ایک عالم تھا
لاوجود ایک وجود مبہم تھا

بے نشاں تھے تعدد و کثرت
سو رہی تھی دوشیزۂ وحدت

ڈھونڈھتا تھا ظہور کے پہلو
کلمۂ لا الٰہ الا ہو

مشورۂ سخن

مجھے یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ حضرت آہ نے شعر و سخن کی اصلاح کس سے لی؟ غالب گمان یہ ہے کہ حضرت آہ کو یہ چیز خاندانی ورثہ میں ملی تھی، آپ کے نانیہال اور دادیہال دونوں جگہ شعر و شاعری کا مذاق تھا، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا نصیر الدین احمد نصرؔ خود بڑے شاعر تھے، اور نصرؔ تخلص فرماتے تھے، اسی طرح آپ کے ماموں جان اور خسر محترم حضرت مولانا امیر الحسن قادریؒ بھی بڑے شاعر تھے، ان کی شاعری کے خوبصورت نمونے اس کتاب میں بھی موجود ہیں، یہ دونوں ہی حضرات آپ کے استاذ بھی تھے، علم و فن کی مختلف کتابیں ان سے پڑھی تھیں، اس لئے شاعری میں بھی ان سے مشورۂ سخن کرنا مستبعد نہیں۔

نیز کانپور کے زمانۂ تعلیم میں جن استاذ صاحب سے سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ

---

[32]-یہ ۱۱۲ صفحات کی کتاب ہے، کتابکدہ والکیشور روڈ ممبئی ٦ سے شائع ہوئی ہے، مجھے اس کتاب کی زیارت کا موقعہ ملا ہے۔

حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ تھے، وہ بھی اونچے درجہ کے شاعر تھے، اور فاضل تخلص کرتے تھے ان سے بھی اصلاح متوقع ہے۔

میری اس تالیف کی سرگذشت

یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے بڑی ریاضت ومجاہدہ کے بعد تیار ہوئی ہے، اولاً تو حضرت آہ کے ادبی مسودہ تک رسائی آسان نہیں تھی، وہ ہمارے جد اکبر ضرور تھے لیکن میرے جد امجد حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ (یعنی حضرت آہؒ کے بڑے صاحبزادے) نے ترک وطن کرکے والد مکرم کی حیات ہی میں مظفرپور سے تقریباً ایک سو تیس (۱۳۰) کلو میٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں "منورواخیرا" میں اقامت اختیار کرلی تھی، اور اسی وجہ سے "مظفرپوری" کے بجائے "منوروی" سے شہرت پائی۔۔

دوسرے صاحبزادے ماسٹر محمود حسن صاحب نے ملازمت کی نسبت سے شہر سمستی پور میں اپنی رہائش اختیار کرلی تھی اس طرح بہت سے کاغذات وہاں منتقل ہو گئے ۔۔۔۔علاوہ خاندان کے ایک حصہ میں انگریزی تعلیم کارواج غالب ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی اور ادبی چیزوں کی پہلی سی قدرشناشی باقی نہ رہی اور بہت سی چیزیں ضائع ہوگئیں۔۔۔۔۔۔

اور ایک بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ جد امجد حضرت منورویؒ کے بہت سے کاغذات و دستاویزات ۱۹۶۴ء کے سیلاب عظیم میں بہہ گئے۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ خاندان کے اس طرح بکھر جانے نیز پے بہ پے حادثات کے بعد خاندانی کاغذات اور دستاویزات کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا، وہ بھی جب کہ بُعدمکان اور دیگر اسباب کے تحت افراد خاندان کے درمیان ربط باہم بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔۔۔

میں نے اپنے قدیم خاندان سے بہت دور اسی گاؤں میں شعور کی آنکھیں کھولیں جہاں میرے داداجان (حضرت مولانا احمد حسنؒ) اوران کے ناناجان (حضرت مولاناسید امیرالحسنؒ)

اپنی نسل کو چھوڑ گئے تھے، میں نے اپنے گھر میں حضرت آہ کی شاعری، اور ان کے بعض علمی مآثر کے تذکرے سنے، حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ (امیر شریعت خامس) اور حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب گڑھولویؒ سے ملاقاتیں ہوئیں تو ان حضرات نے بھی احساس دلایا، لیکن ظاہر ہے کہ ان حالات میں اس مشکل کام کے لئے خود کو تیار کرنا بظاہر لاحاصل کوہ پیمائی کے سوا کچھ نہیں تھا، آخر روز و شب آتے رہے، وقت کی گاڑی تیزی کے ساتھ گذرتی رہی، میں دیوبند سے سیوان ہوتے ہوئے حیدرآباد پہونچ گیا، اور ان باتوں کا خیال بھی دل سے نکل گیا، قدرت نے لکھنے پڑھنے کے بہت سے سامان پیدا کر دیئے تھے، انجمنوں کی سرپرستی بھی میسر ہوئی اور رسالوں کی ادارتیں بھی حاصل ہوئیں، فقہی سیمیناروں اور اجتماعات میں لکھنے کے مواقع بھی ملے، نئے مسائل و موضوعات کا سامنا ہوا، نئی دلچسپیاں اور نئے تجربات سے آشنائی ہوئی، سیر و سوانح سے زیادہ فقہیات اور علمی مسائل پر لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔۔۔۔

لیکن پھر اپنے ہی خرید کردہ غم کا میں شکار ہوا، اور ایک علمی تحریک کے ضمن میں زندگی قلابازیاں کھاتے ہوئی منوروا شریف لوٹ آئی، اور یہاں سمتی پور محلہ کاشی پور (ماسٹر محمود حسن صاحب کے مکان) سے تقریرات بخاری و ترمذی کو تلاش کرتے ہوئے غیر متوقع طور پر حضرت آہ کا ایک ناقص ادبی مسودہ دستیاب ہوا۔۔۔کچھ عرصہ بعد منوروا میں حضرت منورویؒ کی بچی کچھی کتابوں اور ذخیرۂ کاغذات میں کسی دوسری جستجو کے ضمن میں لیکن اتفاقاً استاذ الکل حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؔ کا ایک تاریخی مکتوب مجھے ہاتھ آیا جس سے خاندان بالخصوص حضرت نصرؔ اور حضرت آہؔ کی زندگی کے بہت سے پہلو روشنی میں آئے، جد امجدؒ ہی کی بقیات میں حضرت امیر الحسن کے بعض قبالہ جات ملے، گھر میں والد گرامی کے پاس حضرت امیر الحسن کی بعض خود نوشت تحریرات اور کچھ نقلیں بھی حاصل ہوئیں وغیرہ۔۔۔۔

یکے بعد دیگرے ان حصولیابیوں سے میں نے محسوس کیا کہ قدرت مجھے اس کام

پر لگانا چاہتی ہے، یہ اتفاقات نہیں ہیں بلکہ منصوبہ بند محرکات ہیں۔۔۔۔ لیکن اس راہ میں مشکلات بھی بہت تھیں اس لئے کہ میسر سرمایہ میں پوری معلومات موجود نہیں تھیں۔۔۔۔ اس لئے بہت دنوں کشمکش رہی لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جو ہے اسی کو کم از کم مرتب کر دیا جائے میں نے خاموشی کے ساتھ کام شروع کر دیا۔۔۔۔۔۔ اپنی چھوٹی پونجی اور کھوٹا علم دیکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ ایک ہی کتاب میں خاندان کے سب بزرگوں کے مختصر حالات آجائیں گے، لیکن کام شروع کرنے کے بعد کام میں اتنا پھیلاؤ محسوس ہوا، اور ذرائع علم میں ایسی ایسی برکتیں رونما ہوئیں، کہ کام کو تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ حضرت شاہ عبد اللہؒ سے حضرت آہؔ تک کے لئے ایک جلد اور حضرت منورویؒ کے لئے الگ جلد تجویز کی گئی۔ اور پھر باقاعدگی کے ساتھ کام کا آغاز کر دیا گیا۔

شروعاتی دور میں عجیب ناقابل فہم ثقل کی کیفیت سے میں دوچار ہوا، جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ میں یہ کام نہ کر سکوں گا، اور شاید میرے خاندان کی پاک روحوں کو گمنامی کے خاموش اندھیروں سے نکلنا ابھی منظور نہیں ہے۔۔۔۔ یہ اضطراب میرے لئے ناقابل علاج تھا، اس لئے کہ اب دوسرے کام کے لئے بھی ذہن اور قلم چلنے کو تیار نہیں تھے، میں سخت مایوس ہوا کہ یہ کون سی منزل ہے پروردگار! جہاں نہ آگے بڑھنے کا راستہ ملتا ہے اور نہ پیچھے ہٹنے کا۔

نہ شکوہ بے وفائی کا نہ رونا کج ادائی کا
سزا ہے دل لگانے کی مزہ ہے آشنائی کا

لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور کام چل پڑا اور تقریباً ایک سال کے عرصہ میں مکمل ہو گیا۔

اس دوران متعدد علمی تحقیقات، مختلف دستاویزات اور کتابوں کی تلاش، مطلوبہ افراد و شخصیات سے براہ راست ملاقات، متعلقہ مقامات کے راست مشاہدات کے لئے بارہا قریب

وبعید کے اسفار کئے اور جہاں خود پہونچنا ممکن نہ ہوا وہاں اپنے نمائندے بھیجے، بہت سی مشہور لائبریریوں کے کیٹلکس دیکھے گئے اور چھوٹی چھوٹی مناسبتوں سے بڑے بڑے جوکھم اٹھائے گئے۔

ایک سفر کی روئیداد

اس میں سب سے دلچسپ اور طویل سفر بارہ بنکی، دیوہ، بانسہ، کانپور، گنج مرادآباد اور پٹنہ کا تھا، جو خاص اسی مقصد کے تحت کیا گیا تھا، اس سفر میں بے شمار تجربات ومشاہدات، علمی لذتیں اور روحانی مسرتیں حاصل ہوئیں، اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ آج سے ستر اسی (۸۰) سال قبل ہمارے اکابر ان علاقوں میں کس طرح سفر کرتے ہونگے، جب کہ سواری اور آمد ورفت کے موجودہ انتظامات کا کوئی تصور نہیں تھا۔۔۔

لیکن ان علاقوں سے میرے "تذکرہ" کے کئی بزرگوں کے واقعات وابستہ ہیں، اس لئے خود ان کی زیارت کرنی ضروری تھی، کئی چیزیں کتابوں کے صفحات پر سمجھ میں نہیں آتیں، اور وہ مشاہدات سے سمجھ میں آجاتی ہیں، اس کی واضح مثال مدرسہ فیض عام سے حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی علٰحدگی اور دارالعلوم کانپور کے قیام کا مسئلہ ہے، میں حیران تھا کہ کانپور کے عینی مشاہدین حضرت کانپوریؒ کی علٰحدگی اور ایک نئے مدرسہ کے قیام کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر بہار یا دور دراز مقات پر رہنے والے تذکرہ نویسوں کو اس معاملے میں التباس کیوں ہوا؟ اور وہ اصل حقائق تک کیوں نہیں پہونچ سکے؟ ان مقامات کے مشاہدے سے ان تذکرہ نگاروں کی معذوری سمجھ میں آئی، یہ تمام ادارے جن سے ہمارے اس تذکرہ کی کئی شخصیات کا تعلق تھا، بالکل قریب قریب واقع ہیں اور صرف چند گلیوں کا فرق ہے، آج آبادی کی کثرت کی بنا پر گو کہ الگ الگ محلے بن چکے ہوں، لیکن جس زمانہ کی تاریخ سے ہماری بحث ہے، اس زمانہ میں سب ایک ہی رہا ہوگا،

ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ایک ادارہ سے دوسرے ادارہ کی منتقلی کو اہل محلہ یا اہل شہر تو محسوس کرسکتے ہیں، لیکن بیرون شہر رہنے والے حضرات کو جب تک باقاعدہ اس کی خبر نہ ملے وہ اس کو محسوس نہیں کرسکتے تھے، وہ زیادہ سے زیادہ قیاسات کرسکتے تھے۔۔۔۔

یہاں پہونچ کر مجھے اس فارسی شعر کی معنویت کا احساس ہوا:

تو نہ دیدی گہہ سلیماں را   چہ شناشی زبان مرغاں را

واقعات جن مقامات سے وابستہ ہوں بہت سے عقدے بغیر کسی تاریخ کی مدد کے محض مشاہدہ سے ہی حل ہوجاتے ہیں، سیکڑوں صفحات کی ورق گردانی ان مسائل کو اتنی آسانی سے حل نہیں کرسکتی، جو چند لمحوں کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔۔۔۔ قرآن کریم کے ارشاد پاک۔فسیروا فی الارض الآیۃ ۔زمین کی سیر کرو۔کی اہمیت بھی خوب سمجھ میں آئی۔

☆ اس سفر سے مسلکی یا علاقائی عصبیت و تنگ نظری کے نقائص بھی سامنے آئے، میں نے محسوس کیا کہ کئی حقائق کو لوگ مسلکی تنگ نظری کی بنیاد پر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یا غلط طور پر پیش کرتے ہیں، جب تاریخ نویسی یا تاریخ بیانی میں ذاتی رجحانات شامل ہوجائیں تو اصل حقائق تک انسان کی رسائی مشکل ہوجاتی ہے،۔۔۔۔

☆ اسی طرح کئی چیزیں ایک کے لئے اہم ہوتی ہیں اور دوسرے کے لئے کچھ نہیں، لیکن انسان کو چاہئے کہ کسی بھی چیز کا مطالعہ حقیقی بنیادوں پر کرے نہ کہ اپنے تصورات کی بنیادوں پر، یہی ایمانی عدل اور تاریخی دیانت کا تقاضا ہے۔۔۔۔۔ ہمارے یہاں اس باب میں بڑی کمی پائی جاتی ہے۔

☆ اس سفر سے زمانۂ قدیم میں کانپور کی محبوبیت اور مرکزیت کا راز بھی واشگاف ہوا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کانپور کی تعریف میں ساری زندگی رطب اللسان رہے، اس شہر سے ان کو اتنی محبت تھی کہ اپنے برتنوں پر انہوں نے کانپور کندہ کرایا تھا اور اس شہر کو چھوڑنے

پر دل آمادہ نہیں تھا۔۔۔۔

ان کے علاوہ کتنے ہی علماء اور اصحاب فضل وکمال دوسرے علاقوں سے آئے اور اس شہر کی محبتوں کے اسیر ہو کر رہ گئے، میری اس کتاب میں آپ کو ایسے کئی لوگوں کے تذکرے ملیں گے مثلاً، حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ، حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ، حضرت مولانا محمد عادل کانپوریؒ وغیرہ کئی ایسے بڑے نام ملتے ہیں جنہوں نے اس شہر کی محبت پر اپنے وطن کی محبتیں قربان کر دیں۔۔۔۔۔

میں نے محسوس کیا کہ محبت کی خوشبو آج بھی اس مٹی میں موجود ہے اور کانپور کے اصل باشندوں میں جو طبعی ملائمت، خوش خلقی اور حسن تعاون کا پاک جذبہ پایا جاتا ہے، وہ آج بھی اصحاب علم وکمال یا ارباب محبت کے لئے باعث کشش ہے۔

☆اس سفر میں میرے رفیق محترم جناب مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی صاحب تھے، ہم دونوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ہمارے تمام مطلوبہ مقامات پر مطلوبہ افراد وشخصیات اس طرح موجود اور میسر ملے جیسے کہ وہ ہماری آمد ہی کے منتظر ہوں، جب کہ ہم لوگوں نے ایک آدھ جگہ کا استثناء کر کے کسی کو بھی اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی اور نہ ان کے رابطہ نمبرات ہمارے پاس موجود تھے بلکہ اکثر سے پہلے کوئی شناشائی بھی نہیں تھی، مزارات ہوں یا علم وتحقیق سے وابستہ شخصیات، ہر جگہ توجہات کاملہ کا احساس ہوا، پتہ نہیں یہ ہماری محبت وطلب کی کشش تھی یا بزرگوں کا فیض، لیکن بہرحال اس کی وجہ سے ہمارا سفر کافی دلچسپ، نتیجہ خیز اور آسان ہو گیا، کم وقتوں میں زیادہ کام ہو گئے، مآخذ تک پہونچنے میں آسانیاں ہوئیں، دس دن کا سفر اس طرح گذرا کہ جیسے کہ دس گھنٹے کے لئے ہم گھر سے نکلے ہوں:

یہ سب انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

خاص طور پر بانسہ شریف (ضلع بارہ بنکی)، گنج مرادآباد، دلاری مسجد خانقاہ حضرت مولانا غلام حسینؒ کانپوریؒ (کانپور)، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف اور خانقاہ شاہ ارزاں سلطان گنج پٹنہ کے سجادگان اور مدرسہ فیض عام، مسجد رنگیان، حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے اہل خاندان اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے جس محبت واکرام کی سوغات ملی وہ ساری زندگی فراموش نہ ہوگی، جہاں لذت کام ودہن کے ساتھ دل ودماغ اور قلب وروح کے لیے بھی لطف حسن ومعنٰی موجود تھا، اگر زندگی نے موقعہ دیا تو اس سفر کی پوری روئیداد الگ سے تحریر کروں گا، میں اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ جناب جیلانی میاں صاحب (سجادہ نشیں درگاہ سرکار بانسہ شریف)، حضرت مولانا قاری غلام حسین صاحب (سجادہ نشیں خانقاہ حضرت مولانا شاہ غلام حسین کانپوریؒ)، جناب مصباح الحق صاحب (منیجر فیض عام کانپور)، جناب حافظ قاری نیر صابری صاحب (نبیرۂ حضرت مولانا احمد حسن کانپوری)، جناب مولانا شاہ مشہود احمد قادری ندوی صاحب (پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ)، جناب شاہ انظار حسین صاحب (سجادہ نشیں درگاہ حضرت شاہ ارزاںؒ)، حضرت مولانا شاہ بدر احمد مجیبی صاحب (خلف صالح وجانشین حضرت مولانا شاہ عون احمد قادریؒ)، حضرت مولانا شاہ آیت اللہ قادری صاحب (سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف) اور جناب مولانا شاہ منہاج احمد مجیبی صاحب (صدر رویت ہلال کمیٹی خانقاہ مجیبیہ) کی محبت وخلوص کا شکر گذار ہوں، ان حضرات نے اپنی بے پناہ شفقتوں سے ہمیں سرفراز کیا اور ہمارے علمی مشن میں ہر ممکن تعاون فرمایا **فجزاہم اللہ احسن الجزاء**۔

کلمات تشکر

اس موقعہ پر میں اپنے ان احباب، رفقاء اور بزرگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی تالیف میں میرا ہاتھ بٹایا، دلچسپی لی، وقت دیا، اور اپنے تعاون

اور حوصلہ افزائی سے نوازا، اللہ پاک ان سب کو اپنی شایان شان بدلہ نصیب فرمائے اور اس حصہ داری کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے آمین۔۔۔۔ان کی ایک لمبی فہرست ہے، لیکن ان میں سے چند خاص لوگوں کے اسماء گرامی ذکر کئے جاتے ہیں:

☆برادر عزیز مولانا رضوان احمد قاسمی جنہوں نے حضرت آہ کے شعری مسودہ کی حصولیابی میں پہلی قابل قدر کوشش کی، جو اس کتاب کی تالیف میں سنگ میل ثابت ہوئی، نیز حضرت آہؒ کے بعض حالات وواقعات کی فراہمی میں بھی حصہ لیا، پھر کتاب تیار ہونے کے بعد کتاب پڑھ کر کئی مفید مشورے دیئے۔

☆جناب مولانا شکیل احمد قاسمی کانپوری سابق استاذ مدرسہ جامع العلوم کانپور جن کی عنایت سے "تاریخ کانپور" اور "شہر ادب کانپور" جیسی اہم کتابوں تک ہماری رسائی ہوئی، مولانا موصوف نے ازراہ تلطف ان کے ضروری صفحات ہمیں ارسال فرمائے، یہ دونوں کتابیں پاکستان میں شائع ہوئی ہیں اور ہندوستان میں عام طور پر دستیاب نہیں ہیں، ان کے ذریعہ ایک الجھے ہوئے تاریخی مسئلہ کو حل کرنے میں کافی مدد ملی۔

☆جناب مولانا شاہ بدر احمد مجیبی ندوی صاحب خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ، جن کی توجہ اور سعی جمیل سے حضرت شاہ عبدالرزاق بے کریانسویؒ کے حالات زندگی پر ایک معتبر اور مفصل کتاب "تذکرہ حضرت سید صاحبؒ" حاصل ہوئی، یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے، آپ کے ایما پر فرنگی محل کے سجادہ نشیں جناب مولانا حسن میاں صاحب نے اپنی لائبریری سے پوری کتاب (صفحات:۴۲۴) کی فوٹو کاپی کرائی اور اس کو کتابی صورت میں مجلد کرا کے ہدیۃً پیش فرمایا، میں ان دونوں حضرات کا شکر گذار ہوں۔

☆حضرت مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، آپ نے ازراہ عنایت مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی تاریخ پر اپنی مرتب کردہ

کتاب "بہار مدرسہ بورڈ–تاریخ و تجزیہ" کے ضروری صفحات مجھے ارسال فرمائے اور مجھے ان صفحات سے مدرسہ شمس الہدیٰ کے حالات لکھنے میں بہت مدد ملی۔

☆جناب مولاناشاہ مشہوداحمد قادری ندوی صاحب پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ، آپ کی توجہ سے بزرگان پھلواری شریف کے حالات پر ایک نایاب کتاب "اعیان وطن" حاصل ہوئی، علاوہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے تذکرہ اور تاریخ پر بھی خاصی کتابیں آپ نے عنایت کیں۔

☆حضرت صوفی سید شاہ منظورالحق صاحب بانی خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ احمدیہ کریمیہ موتیہاری (نبیرۂ مولوی عبدالحمید وکیلؒ برادر خورد حضرت آہؒ)۔ آپ کو کتاب کی تالیف اور طباعت سے بڑی دلچسپی رہی، مسلسل فون کے ذریعہ کتاب کے بارے میں دریافت فرماتے رہے ---خاندان کی کئی معلومات بھی آپ سے حاصل ہوئیں۔

☆جناب مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی صاحب (بھتورہ مدھوبنی) جوسفر وحضر میں ساتھ رہے، اور اس سلسلے میں مسلسل ساعی رہے، کتاب پر بزرگوں کی آراء کے حصول میں بھی مددگار رہے۔

☆جناب پروفیسر محمد علی صاحب (پیغمبر پور دربھنگہ) مقیم حال مظفرپور اور جناب سید عبدالناصر صاحب نبیرۂ حضرت آہؒ (مظفرپور)۔ ان دونوں حضرات نے مظفرپور اور خاندان کے تعلق سے بعض معلومات کے حصول میں دلچسپی لی، اور اپنے قابل قدر تعاون سے نوازا۔

☆جناب مولانا نعیم اختر قاسمی (بھتورہ مدھوبنی) اور جناب مفتی جاوید اختر قاسمی (برداہا دربھنگہ) اساتذۂ جامعہ ربانی منوروا شریف نے کتاب کے تعلق سے دیوبند، لکھنؤ اور پٹنہ وغیرہ مقامات کے اسفار کئے۔

ان تمام حضرات کے لئے دل کی گہرائی سے ایک بار پھر ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

بات نامکمل رہے گی اگر میں اپنے ان اکابر واعیان امت کی عنایات عالیہ کا تذکرہ نہ کروں، جن کی سرپرستی اور خورد نوازی میری ہر تالیف وتصنیف اور علمی کوششوں میں قدم بہ قدم شامل حال رہی ہے، اور ہمیشہ چھوٹے سے چھوٹے کام پر بھی اس حقیر کا ان بزرگوں نے حوصلہ بڑھایا ہے، اللہ پاک ان بزرگوں کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے اور ساری امت کو ان سے مستفید ہونے کا موقعہ عنایت فرمائے آمین۔

میں نے اپنی حقیر کوشش حسب معمول اپنے ان بزرگوں کی خدمت میں پیش کی ۔۔۔یہ ان حضرات کی عظمت اور وسیع النظری ہے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود کتاب کو ملاحظہ فرمایا، اور اس پر اپنی گراں قدر آراء تحریر فرماکر مؤلف کا حوصلہ بڑھایا،

استاذ الکل، خطیب الاسلام، جانشین حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت مولانا محمد سالم صاحب القاسمی دامت برکاتہم صدر مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند نے اپنے ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود ایک مبسوط تحریر عنایت فرمائی، جس کا ایک ایک حرف میرے لئے سند کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت امیر شریعت مولانا سید شاہ محمد ولی رحمانی صاحب دامت برکاتہم سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر وجنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا میں خاص طور پر شکر گذار ہوں کہ آپ نے اپنی نوع بہ نوع بے پناہ مصروفیات کے باوجود ایک بسیط علمی تحریر عنایت فرمائی، جو اس حقیر کے لئے بے حد حوصلہ افزا اور اس کتاب کے علمی استناد کی ضمانت ہے، حضرت والا کی اس تحریر میں پوری کتاب کا جامع خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔

معروف محقق اور ممتاز فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے بھی اپنے گوناگوں مشاغل کے درمیان ایک مفصل اور وقیع مقدمہ تحریر فرمایا، جو ان کے علم وکمال، تاریخ دانی اور تجزیہ نگاری کا شاندار نمونہ ہے۔

ان کے علاوہ نمونۂ سلف حضرت مولانا مفتی محمد ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مؤرخ کبیر حضرت مولانا محمد رابع الحسنی الندوی ناظم اعلیٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ادیب شہیر حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، حضرت مولانا مظہر الحق کریمی قاسمی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور میرے والد ماجد اور مرشد و مربی حضرت مولانا سید شاہ محفوظ الرحمن قادری نقشبندی دامت برکاتہم نے بھی اپنی تقریظات اور آراء سے کتاب کی وقعت و استناد میں اضافہ فرمایا، میں ان تمام بزرگوں کا تہ دل سے ممنون اور شکر گذار ہوں۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقعہ پر اپنے مشفق و کرم فرماحضرت مولانا مفتی سہیل احمد قاسمی مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ اور بزرگ دوست معروف شاعرونقاد جناب مولانا قاری طارق بن ثاقب قاسمی (ارریہ) کا ذکر نہ کروں، مفتی صاحب موصوف نے ازراہ محبت اس حقیر کو اپنی تاثراتی تحریر سے سرفراز کیا، اور قاری طارق صاحب نے اپنے منظوم تاثرات کے ذریعہ اس کتاب کے ادبی استناد میں اضافہ فرمایا، ان کی یہ نظم مسدس کی ہیئت میں ہے اور فکر وفن کی شاہکار ہے، انہوں نے بڑی فنی مہارت کے ساتھ حضرت آہ کی شاعرانہ عظمت وکمال، ان کی علمی وفنی حذاقت اور معاصر شعراء میں ان کی انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے، کچھ کتاب اور مؤلف کتاب کے بارے میں بھی اپنے حسن تعلق کو خوبصورت تعبیرات دی ہیں، میں ان دونوں شخصیتوں کا بھی بے حد شکر گذار ہوں۔

کچھ کتاب کے متعلق

گوکہ اس کتاب کا موضوع ایک خاص شخصیت ہے، اور وہ بھی ایسی شخصیت جس پر گمنامی کی گرد پڑی ہوئی ہے اور جس سے بظاہر ایک محدود طبقہ کے علاوہ عام امت کا کوئی فائدہ

محسوس نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

کسی شخصی سوانح کاعام تصور یہی ہے کہ اس کے خاندانی احوال کے ساتھ کچھ کرامات ومکاشفات وغیرہ بیان کر دیئے جاتے ہیں،اس معیاراور تصور کے ساتھ ظاہر ہے کہ عام لوگوں کواس سے کیادلچسپی ہوسکتی ہے۔۔۔۔۔

لیکن میری یہ کتاب عام تصور سوانح سے ہٹ کر خالص علمی اور تاریخی بنیادوں پر لکھی گئی ہے،اس کو ایک تحقیقی دستاویز کے طور پر مرتب کیا گیا ہے،یہ ایک علمی وادبی دفینہ ہے جو برسوں کی محنت وریاضت کے بعد سامنے آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔یہ کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ پوری جماعت کی اور ایک خاندان کی نہیں بلکہ پورے عہد کی تاریخ ہے،یہ نظر وفکر کے مختلف دبستانوں کا ایک کہکشاں ہے اور تعلیم وتربیت کے بیش قیمت تجربات وہدایات کا مرقع ہے،یہ شاعر کا دیوان بھی ہے اور تعمیر شخصیت کا نگار خانہ بھی۔۔۔۔۔اس میں زبان وادب کی علمی وفنی بحثیں بھی ہیں،اور تاریخی تحلیل وتجزیہ بھی،اس کتاب میں بہت سے علمی اور تاریخی تضادات کے قابل قبول حل بھی پیش کئے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

یہ کوئی کراماتی کتاب نہیں ہے،جس میں مافوق الادراک واقعات جمع کئے گئے ہوں، بلکہ پوری کتاب میں صاحب تذکرہ کی ایک بھی کرامت ذکر نہیں کی گئی ہے،ہاں ان کی سب سے بڑی کرامت راہ حق پر ان کی شدید استقامت اور رضائے الٰہی کے لئے ان کی بے نظیر فنائیت اور عبدیت ہے،جو قابل رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

یہ کتاب چھ ابواب میں منقسم ہے:

☆باب اول میں حضرت آہ کے عہد اور خاندان کا تفصیلی تذکرہ ہے،اور ایک مکمل عہد کی تاریخ اس میں آگئی ہے،بہت سے ایسے بزرگوں کا بھی اس میں تفصیلی ذکر ہے جن پر اب تک تاریخ کا قلم خاموش رہا تھا،بعض بزرگوں کا پورا ادبی سرمایہ بھی اسی باب میں سما گیا ہے۔

☆باب دوم میں آپ کی تعلیم وتربیت سے نکاح واولاد تک کا ذکر ہے، یہ اس کتاب کا سب سے اہم اور معرکتہ الاراء باب ہے، یہ باب بہت سی تحریکات وشخصیات کا آئینہ ہے، اس میں تاریخ بھی ہے اور فن تاریخ بھی، اس نگار خانے میں فکر وتعلیم کے مختلف دبستانوں کا بھی ذکر ہے اوران کا علمی تجزیہ بھی، اس میں ہندوستان کی بہت سی ایسی بڑی شخصیات اور اداروں کا تفصیلی ذکر آگیا ہے جن پر اب تک بہت کم یا بالکل نہیں لکھا گیا تھا۔

☆باب سوم میں آپ کے تزکیہ واحسان اور صوفیانہ زندگی کے احوال کا ذکر ہے، اس باب میں بھی بہت سے صوفیا اور مشائخ کے حالات معتبر کتابوں کے حوالہ سے آگئے ہیں۔

☆باب چہارم میں آپ کی علمی وادبی خدمات کی تفصیلی روئیداد ہے، آپ کی تدریسی خصوصیات اور تعلیمی انفرادیت کا بھی ذکر ہے، نیز اس میں آپ کے بعض نامور تلامذہ اور علمی تصنیفات کا بھی تذکرہ موجود ہے۔

☆باب پنجم میں کلام آہ کا فکری وفنی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور زبان وادب کے مختلف اصناف وانواع کے تناظر میں تفصیل کے ساتھ کلام آہ کا فنی جائزہ لیا گیا ہے، یہ اس کتاب کا خالص ادبی اور تنقیدی حصہ ہے، مصنف گوکہ ادب کے فنی شعور سے نابلد ہے لیکن اس کو محض گائڈ لائن تصور کرنا چاہئے اور ارباب فکر وفن کو اس پر خاص توجہ دینی چاہئے۔

☆باب ششم "کلیات آہ" ہے جو حضرت آہ کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے، یہ حصہ حضرت آہ کا تحریر کردہ ہے البتہ ترتیب وتعلیق اور تحشیہ کا کام اس حقیر نے انجام دیا ہے، غزلوں اور نظموں پر عنوان بندی کچھ پہلے سے تھی اور کچھ پر اس حقیر نے اضافہ کیا ہے۔

اللہ پاک اس حقیر سی علمی کاوش کو قبول فرمائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے

آمین

اختر امام عادل قاسمی

۱۵/ صفر المظفر ۱۴۳۹ھ مطابق ۶ / نومبر ۲۰۱۷ء بروز سوموار

باب اول

عہد اور خاندان

(آپ کے عہد اور خاندان کے بعض بزرگوں کے حالات)

حضرت مولانا عبد الشکور آہ مظفر پوریؒ اپنے عہد کے بلند پایہ عالم دین، مشہور و معروف خطیب، صاحب نسبت ولی، اور نامور شاعر و ادیب تھے۔

مولانا کا زمانہ

مولانا نے جس عہد میں شعور کی آنکھیں کھولیں وہ سخت سیاسی انتشار، امت مسلمہ کے زوال، مسلمانوں کی مختلف طبقاتی جنگوں اور قدیم اقدار کی تبدیلیوں کا دور تھا، اس عہد کی تصویر ایک انتہائی معتبر تاریخ نویس اور مستند عالم دین کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ رقمطراز ہیں:

"تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی پورے عالم اسلام میں سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کی صدی ہے، اسی صدی میں عالم اسلام کے نہایت اہم زرخیز و مردم خیز ملک مغربی اقوام کے غلام بنے، ہر جگہ اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو موت و زیست کی کشمکش سے سابقہ پڑا، عالم اسلام میں نئے نئے دینی فتنے، گمراہ کن تحریکیں یہاں تک کہ مدعی نبوت تک پیدا ہوئے، عیسائی مبلغین نئے جوش و خروش کے ساتھ میدان میں آئے، نئے نظام تعلیم نے جو خالص مادی بنیادوں پر قائم تھا، سارے اسلامی ممالک پر اپنا سایہ پھیلایا، عالم اسلام کے یہ حالات اس بات کے لئے بالکل کافی تھے کہ ذہانت و جرأت کے سب سوتے خشک اور اسلامی فکر و حیات کا درخت خزاں رسیدہ اور بے برگ و بار ہو جائے۔۔۔۔۔۔

ہندوستان کا حصہ اس عالمگیر سیاسی زوال اور فکری اضمحلال میں

دوسرے اسلامی ممالک سے زیادہ ہی ہونا چاہئے تھا، یہاں سلطنت مغلیہ اور درحقیقت مسلمانوں کے آخری سیاسی اقتدار کا چراغ ابھی گل ہوا تھا اور اس پر براہ راست انگریزی تسلط قائم ہوا تھا، جو مسلمانوں کی آخری قوت مقابلہ کا زخم کھا کر مسلمانوں کے لئے ہمدردی ورواداری بلکہ حاکمانہ عدل وانصاف اور مساویانہ سلوک کے جذبات سے بھی خالی، اور جذبۂ انتقام سے بھرپور تھا، یہ سخت اضطراب وانتشار، تحیر وسرگشتگی، تذبذب وتردد، اور بے کسی وکسمپرسی کا دور تھا، ایسی حالت میں اگر ہندوستان عظیم اور منفرد شخصیتوں سے خالی اور یہاں قحط الرجال کا دور دورہ ہوتا، تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، مگر اس کے برعکس یہ دور اکابر رجال ومردان کار کی حیثیت سے بھی، ماہرین فنون، اہل تصنیف اور اصحاب فکر کے لحاظ سے بھی، اہل قلوب اور اصحاب باطن کے نقطۂ نظر سے بھی، اور تعلیمی واصلاحی تحریکوں کے اعتبار سے بھی، اور اس حیثیت سے بھی، کہ اس دور میں بعض عظیم ترین تعلیمی مراکز اور ادارے (جو صرف درسگاہیں نہیں، بلکہ مدارس فکر اور مستقل دبستان ہیں) قائم ہوئے، سارے عالم اسلام میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے[33]۔

یہ اس عہد کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جو درد ورنج، یاس وقنوط اور خطرات اور اندیشوں سے لبریز ہے، مگر جیسا کہ حضرت مولانا ندویؒ نے تجزیہ فرمایا کہ عام دستور سے الگ اس عہد زوال میں توقع سے زیادہ رجال کار، شخصیتیں اور ادارے وجود میں آئے، جن سے اس ملک میں دین وملت کے تحفظ کی راہ آسان ہوئی، اور دین اور علم دین کی توسیع واشاعت کا تسلسل برقرار رہا،

33۔ مقدمہ سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (مرتبہ مولانا سید محمد الحسنیؒ) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۷ تا ۱۹ ناشر مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۰ء)

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک خوبصورت کڑی حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ مظفر پوری کی شخصیت بھی تھی۔

نام و نسب اور خاندانی پس منظر

اسم گرامی "عبد الشکور" ہے، شاعرانہ تخلص "آہؔ" اور تاریخی نام "ظفر احسن" ہے جس سے تاریخ پیدائش ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء نکلتی ہے، ایک نظم میں انہوں نے خود اپنے معروف نام، تاریخی نام اور شاعرانہ تخلص کا ذکر کیا ہے:

کون! یعنی مولوی عبد الشکور

تھا تخلص شاعروں میں جن کا آہؔ

نام تاریخی تھا ظفر احسن (۱۲۹۹ھ)

ربط تھا قطب زماں سے دل سے چاہ[34]

☆ آپ نسباً سادات سے ہیں، جیسا کہ خود آپ نے اپنے کلام میں اپنے چھوٹے فرزند ماسٹر سید محمود حسن مرحوم کے سہرے پر اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے:

"سہرا بتقریب شادی عزیزم سید محمود حسن سلمہ"[35]۔

☆ نیز آپ کے بڑے فرزند حضرت مولانا حکیم سید احمد حسن منورویؒ (جو حقیر راقم الحروف کے حقیقی دادا ہیں) نے مظفر پور ترک وطن کرنے کے بعد منوروا شریف میں جو اراضی خریدیں ان کے قبالہ جات میں بھی نسب کی صراحت موجود ہے:

"سید احمد حسن پسر سید عبد الشکور"۔

34۔کلیات آہ ص

35۔کلیات آہ ص

یہ اس منظوم سہرے کا عکس ہے جو حضرت مولانا سید عبدالشکور آہ مظفرپوریؒ نے اپنے صاحبزادے ماسٹر سید محمود حسنؒ کی شادی کے موقعہ پر تحریر فرمایا تھا، اور خود حضرت آہ کے قلم سے ہے۔

[illegible]

یکم جون ۱۹۳۷ء کے ایک دستاویز کا عکس
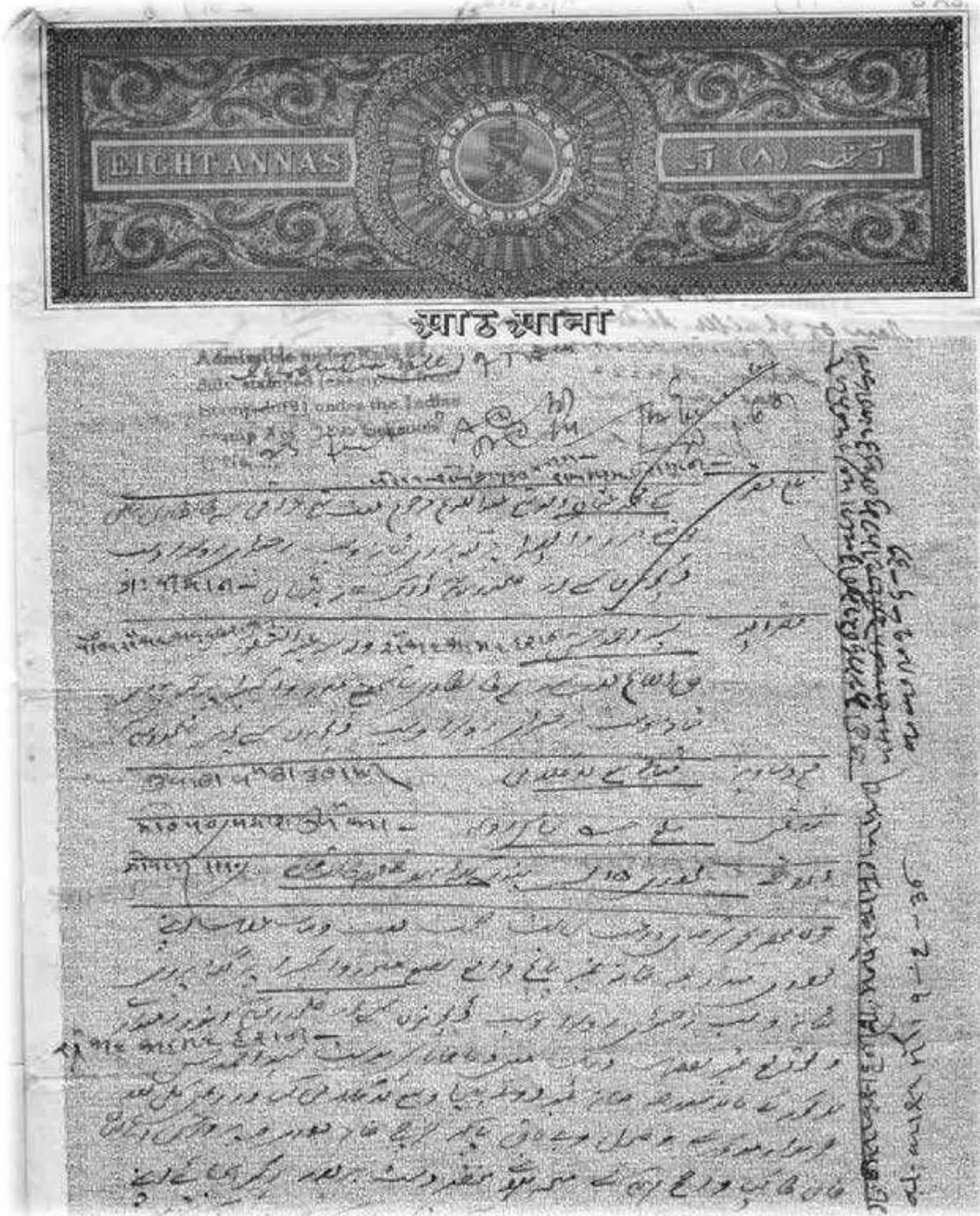
☆اسی طرح حضرت آہؒ کے چھوٹے صاحبزادے جناب ماسٹر سید محمود حسن مرحوم نے اپنی یادداشت (ڈائری) میں متعدد مقامات پر خود کو اور اپنے والد ماجد کو سید تحریر کیا ہے[36]۔

جد امجد حضرت سید شاہ عبد اللہؒ

والد ماجد کا اسم گرامی " حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؒ "اور جد امجد کا "حضرت سید شاہ عبد اللہ " ہے، حضرت شاہ عبد اللہؒ کے تفصیلی احوال کا علم نہیں ہے، اجمالی طور پر صرف اس قدر معلوم ہے کہ شاہ صاحبؒ دہلی سے کلکتہ اور پھر کلکتہ سے مظفر پور تشریف لائے اور یہیں مستقل اقامت اختیار کرلی۔۔۔۔۔۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا خاندانی تعلق سرحد کے علاقے سے تھا وہیں سے ان کا خاندان ہجرت کر کے دہلی آیا تھا اور ایک زمانہ تک دہلی کے مضافات میں یہ خاندان آباد رہا، جب دہلی میں انگریزوں کی شورش برپا ہوئی، تو اس خاندان کے لوگ دہلی چھوڑ کر مختلف مقامات پر منتقل ہوگئے، انہی میں شاہ عبد اللہ بھی تھے، یہ دہلی سے کلکتہ چلے گئے، جو اس وقت کسی قدر پر امن علاقہ تھا، یہ کپڑوں کے تاجر تھے اور اسی ضمن میں قیام کلکتہ کے دوران مظفر پور شہر سے بھی ان کے روابط قائم ہوئے، کیونکہ مظفر پور کو شمالی بہار میں قدیم زمانے سے کپڑے کی تجارتی منڈی

---

[36]-حضرت آہؒ کے نسب کے سلسلے میں بعض مصنفین اور اہل قلم سے غلطی ہوئی ہے مثلاً: عرصہ ہوا میں نے ماہنامہ رفیق (پٹنہ) کے علماء بہار نمبر میں حضرت مولانا عبد الشکور آہؒ مظفر پوریؒ کا تذکرہ پڑھا تھا، اس میں مضمون نگار نے حضرت کو نسباً صدیقی لکھا تھا، وہ شمارہ میرے پاس محفوظ نہیں ہے، اس لئے اس کے صفحہ اور شمارہ نمبر کی تعیین نہیں کی جاسکتی، اگر کسی صاحب کے پاس وہ شمارہ موجود ہو تو براہ کرم اس سے مقابلہ کرلیں اور ممکن ہو تو حقیر مرتب کو بھی اس سے آگاہ فرمادیں۔

اسی طرح جناب حامد علی خان صاحب نے اپنی کتاب "مظفر پور علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز" میں جناب سید ابوالمحفوظ محمد محمود حسن تعلق شمسی مصنف "نور الہدیٰ" کے حوالے سے حضرت مولانا عبد الشکور آہؒ کو "نسباً صدیقی" تحریر کیا ہے (ص ۱۷)۔ یہ قطعی طور پر غلط ہے، صحیح بات وہی ہے، جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔

کی حیثیت حاصل رہی ہے ، لیکن جب کلکتہ کا امن وامان بھی خطرے میں پڑ گیا اور انگریزی طاغوت نے پوری طرح بنگال کو جکڑ لیا، تو آپ نے غالباً تجارتی رشتے سے مظفر پور کو اپنا وطن ثانی بنانے کا فیصلہ کیا، اس زمانے میں "کلیانی" ایک مسلم اکثریتی محلہ تھا، یہاں آپ نے بود وباش اختیار کی، اور ایک وسیع خطۂ اراضی حاصل کر کے مکان تعمیر کرایا، کہتے ہیں کہ یہ تیرہ (۱۳) کٹھہ (یعنی تقریباً اٹھاون۔ ۵۸ ۔ڈسمل) کا رقبہ تھا، جس پر یہ عبد اللہی خاندان ابتداء میں آباد ہوا۔۔

حضرت مولانا سید نصیر الدین کی پیدائش اسی سرزمین پر ہوئی، غالباً حضرت شاہ عبد اللہ کے زمانے میں مکان پختہ نہیں تھا، جیسا کہ ماسٹر سید محمود حسن مرحوم نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ:

" اس زمین پر پختہ مکان حضرت مولانا نصیر الدین نے بنوایا، جس میں حضرت مولانا عبد الشکور وغیرہ کی رہائش رہی، ۱۹۳۴ء م ۱۳۵۳ھ کے زلزلہ میں یہ مکان منہدم ہو گیا، تو ۱۹۳۶ء م ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا عبد الشکورؒ نے اس کو دوبارہ تعمیر کرایا۔۔ پھر حضرت نصرؔ نے یہ مکان اپنی بڑی اولاد کے حوالہ کر کے اسی محلہ میں اپنی رہائش کے لئے ایک دوسرا مکان بنوایا جو بعد میں ان کے دوسرے محل کے صاحبزادے جناب مولوی عبد الحمید وکیل وغیرہ کے استعمال میں رہا[37]۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[37] ۔ڈائری ماسٹر سید محمود حسن، تاریخ تحریر ۱۰/ اکتوبر ۱۹۶۷ء م ۷/ رجب المرجب ۱۳۸۷ھ بروز بدھ۔

استاذالکل حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؔ

حضرت نصرؔ کی ابتدائی زندگی تاریخ کی نگاہوں سے مستور ہے، آپ کی تاریخ ولادت بھی کہیں مرقوم نہیں ہے لیکن قرائن سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت تقریباً ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں ہوئی، اور وفات ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔

حضرت نصرؔ کی شادی اور اولاد

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت نصرؔ کی پہلی شادی مظفرپور محلہ سعد پورہ میں حضرت سید شاہ فرزند علیؒ کی صاحبزادی سے ہوئی، جو شہر کے رؤسا اور معززین میں شمار کئے جاتے تھے، تقوی، دینداری اور سخاوت وفیاضی میں خاص شہرت رکھتے تھے، اور ان کا حلقۂ یاراں بھی بہت وسیع تھا۔۔۔۔۔۔شاہ فرزند علیؒ کے فرزندارجمند "حضرت مولانا سید شاہ امیرالحسن قادریؒ "سلسلۂ قادریہ کے صاحب نسبت اور صاحب حال اولیاء اللہ میں گذرے ہیں، ان کا مستقل تذکرہ آگے آئے گا ان شاءاللہ۔

محل اولیٰ

اس محل سے حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ اور حکیم عبدالغنی صاحب پیدا ہوئے، مولانا عبدالشکور صاحبؒ بڑے تھے، وہ اپنے آبائی مقام پر رہے، حکیم عبدالغنی صاحب آپ سے چھوٹے تھے، انہوں نے آبائی پیشہ اختیار کیا، باضابطہ حکمت کی تعلیم حاصل کی اور پٹنہ میں اپنا مطب قائم فرمایا، غالباً یہیں آپ کی سسرال بھی تھی، محلہ لال املی میں ان کا ذاتی مکان تھا، ان کو کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، صرف ایک بیٹی تھی جس کی شادی پٹنہ ہی میں ہوئی، حکیم عبدالغنی کا انتقال ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں ہوا۔

محل ثانیہ

پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد حضرت نصرؔ نے دوسری شادی کی (جگہ کا علم نہیں ہے)
اس محل سے مولوی عبدالحمید وکیل صاحب اور مولوی محمد سعید صاحب پیدا ہوئے ،مولوی عبدالحمید وکیل نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی،اور شہر مظفرپور اپنے آبائی مکان میں رہے۔ ۔وکیل صاحب آخری عمر میں اپنے بھتیجے قطب الہند حضرت مولانا الحاج حکیم احمد حسن صاحب منورویؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے تھے ،مظفرپور ہی میں مدفون ہیں۔

☆ان سے چھوٹے مولوی محمد سعید تھے ،انہوں نے بھی ایم اے تک تعلیم حاصل کی ،انگریزی اور ریاضی میں ان کی لیاقت اس قدر اعلیٰ تھی کہ بہت کم لوگ ان کی برابری کر سکتے تھے ،وہ اینگلو مسلم اسکول (پٹنہ) میں ٹیچر تھے ،پٹنہ ہی میں انتقال کیا،ان کو کوئی اولاد نہیں تھی [38]

حضرت نصرؔ کو دونوں محل سے کوئی لڑکی پیدا ہوئی یا نہیں اس کی صراحت نہیں ملتی ، البتہ حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ کے کلام میں ایک غمناک مرثیہ موجود ہے جس میں ایک بہن کے لئے بھائی کا غم جھلکتا ہے،اس سے متبادر ہوتا ہے کہ غالباً پہلے محل سے کوئی لڑکی بھی پیدا ہوئی تھی،جو کنوارپن ہی میں آخرت کو سدھار گئیں،حضرت آہؔ کے مرثیہ کا یہ بند ملاحظہ فرمایئے :

آئی تھی عمر کیا ابھی جانا نہ تھا تمہیں
پیک اجل کے فقروں میں آنا نہ تھا تمہیں

---

[38] ڈائری خود نوشت ماسٹر سید محمود حسن صاحبؒ مظفرپوری صاحبزادۂ خورد حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوریؒ-اس حقیر کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے،ان کی ڈائری سے یہ نقول ایک بار میرے برادر خورد عزیزم مولانا رضوان احمد قاسمی نے حاصل کی تھیں،اس کے بعد خود مجھے بھی ماسٹر صاحب مرحوم کے مکان (واقع محلہ کاشی پور سمستی پور) جانے کا موقعہ ملا تو دوبارہ میں نے بھی یہ چیزیں نقل کیں،دونوں نقلیں اس حقیر کے پاس موجود ہیں۔

میرا ابھی پاس چاہیے تھا یا نہ تھا تمہیں
بیڑا ابھی سفر کا اٹھانا نہ تھا تمہیں

تعجیل کیا تھی بھائی کا سہرا تو دیکھتیں
شادی میں دھوم دھام کا جلسہ تو دیکھتیں

حضرت نصرؔ کا علمی وروحانی مقام

حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؔ آپنے وقت کے ممتاز عالم دین، صاحب دل استاذ معروف حکیم اور اردو زبان کے قد آور شاعر و ادیب تھے، قرآن وحدیث، فقہ واصول فقہ، منطق وفلسفہ، علم کلام، علم طب اور اردو زبان وادب کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی ان کو کامل عبور حاصل تھا۔

علم ظاہر میں آپ کے اساتذہ کی خبر نہیں ہے البتہ علم باطن آپ نے حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ سے حاصل کیا[39]، اور سلسلۂ نقشبندیہ میں مدارج سلوک کی تکمیل فرمائی

---

[39] -علامۂ کبیر، محدث جلیل قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ فضل رحمن اپنے عہد کے انتہائی ممتاز اور صاحب کرامات بزرگ گذرے ہیں، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی "اھل اللہ" اور جد امجد کا "محمد فیاض" تھا، ولادت ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء میں "ملانواں" کے مقام پر ہوئی، ابتدائی تعلیم مولانا نور بن انوار الانصاری لکھنویؒ وغیرہ علماء سے حاصل کی، پھر دہلی کا سفر کیا، شیخ محدث حسن علی لکھنوی کی صحبت میں رہے، اور آپ ہی کے ذریعہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ، حضرت شاہ آفاق وغیرہ بزرگوں تک رسائی ہوئی، اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے حدیث مسلسل بالاولیۃ اور مسلسل بالمحبۃ اور بخاری شریف کے ایک حصہ کی اجازت حاصل کی، اور وطن واپس ہوئے، دوسرا سفر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے وصال کے بعد کیا، اور شاہ اسحاق سے صحاح ستہ پڑھی، فراغت کے بعد حضرت شاہ آفاق دہلوی نقشبندی سے طریقۂ صوفیاء کی تعلیم حاصل کی، اور مجاز بیعت ہوئے، اس کے بعد وطن واپس ہوئے، ایک عرصہ تک "ملانواں" میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے چار میل کی دوری پر گنج مرادآباد میں سکونت اختیار کی، یہیں شادی بھی کی، شروع میں لکھنؤ، بنارس، کانپور اور قنوج مختلف علاقوں کا بکثرت سفر فرماتے تھے، لیکن بڑھاپے میں سفر بالکل موقوف کردیا،

، اپنے شیخ سے بے پناہ عشق رکھتے تھے، بکثرت گنج مرادآباد تشریف لے جاتے تھے، اور غالباً انہی اسفار کی برکت سے کانپور کے علماء واعیان سے آپ کے مراسم قائم ہوئے، آپ کے مکتوب کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ کانپور کی علمی مجالس میں بھی گاہے گاہے آپ کی شرکت ہوتی تھی، ندوہ تحریک کے پروگراموں سے بھی آپ کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کی مظفرپور تشریف آوری

حضرت شاہ فضل رحماں صاحبؒ بھی آپ سے بے انتہا محبت فرماتے تھے، حضرت کے

اور خانقاہ میں گوشہ نشیں ہوگئے۔۔۔گوشہ نشینی کے بعد عوام وخواص کا رجوع عام ہوا، لوگ اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے پیاسے کنویں پر ٹوٹ پڑتے ہیں، ایسی قبولیت ومحبوبیت حاصل ہوئی، اور بکثرت ایسی کرامات صادر ہوئیں کہ بقول صاحب نزھۃ الخواطر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں ملتی۔۔۔

سیدھی سادی بے تکلف زندگی گذارتے تھے، ہدایا اور تحائف کی کمی نہیں تھی مگر وہ سب خلق خدا کے لئے استعمال ہوتے تھے، خانقاہ میں ہی قرآن کریم اور حدیث شریف کا درس دیتے تھے، آپ سے بے پناہ فیض پہونچا، ہزاروں بندگان خدا کو خدا تک رسائی ملی، ۲۲ / ربیع الاول ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۲ / ستمبر ۱۸۹۵ء میں گنج مرادآباد میں وفات پائی، نماز جنازہ حسب وصیت صاحبزادہ محترم جناب احمد میاں صاحبؒ نے پڑھائی، اور مقبرہ مرادخان میں مدفون ہوئے، یہ مقبرہ بالکل قبر کی شبیہ ہے اور مسجد کے صحن میں واقع ہے اس کو دیوان مرادخان نے تیار کرایا تھا، اور انہوں نے ہی یہ مسجد بھی بنوائی تھی، ان کے اور بھی رفاہی کام اس علاقے میں تھے، مرادخان اپنے اسی مقبرہ میں مدفون ہیں، دائیں جانب صحن مسجد سے متصل حضرت شاہ فضل رحمانؒ کی قبر مبارک ہے اور مرادخان کے بائیں جانب حضرت کے صاحبزادہ جناب احمد میاں صاحبؒ مدفون ہیں، مرادخان بھی بڑے خوش نصیب ہیں دوولیوں کے بیچ لیٹے ہوئے ہیں، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ۔حضرت شاہ صاحب کے اقوال وملفوظات کو آپ کے متعدد خلفاء نے جمع کیا ہے، مثلاً حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ نے "ارشاد رحمانی" کے نام سے، سید تجمل حسین بہاریؒ نے فضل رحمانی" اور کمالات رحمانی" کے نام سے اور مولوی عبدالغفار آسیونی نے "ہدیۂ عشاق رحمانی کے نام سے وغیرہ (الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام "المسمیٰ بنزهة الخواطروبهجة المسامع والنواظر ج۸ص۱۳۲۶،۱۳۲۷مرتبہ حضرت مولانا عبدالحی الحسنی الکھنویؒ (م۱۳۴۱ھ) مطبوعہ دارابن حزم بیروت ۱۴۲۰ھ م ۱۹۹۹ء ،وتذکرہ حضرت مولانا فضل رحماں گنج مرادآبادیؒ مصنفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ص۹۶ ناشر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بار دوم)

چہیتے اور مخصوص مریدین میں شمار ہوتے تھے ،اور حضرت کو آپ کی دلجوئی کا بہت خیال رہتا تھا، چنانچہ ایک بار آپ کی دعوت پر حضرت شاہ صاحبؒ شہر مظفرپور بھی تشریف لائے، اور آپ کے مکان پر قیام فرمایا، اس سے حضرت نصرؒ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اس وقت حضرت شاہ فضل رحمانؒ کی شخصیت پورے ملک میں شہرۂ آفاق حیثیت رکھتی تھی اور گنج مرادآباد مرجع خلائق تھا۔۔۔۔۔

شاہ صاحبؒ کی تشریف آوری شہر کے لئے باعث رحمت وبرکت ثابت ہوئی ، اور حضرت نصرؒ کے ذریعہ شہر کے عوام وخواص کو حضرت سے قریب ہونے کا موقعہ ملا، حضرت نے کئی دن قیام فرمایا اور شہر کے بہت سے علماء واعیان حضرت سے بیعت ہوئے ، غالباً اسی موقعہ پر جناب حافظ رحمت اللہ صاحبؒ (بانی مدرسہ جامع العلوم مظفرپور) بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، حضرت نصرؒ سے ان کو خاص انس تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تشریف آوری کے بعد حضرت نصرؒ کا مکان ایک مرکز علمی اور مرجع روحانی میں تبدیل ہوگیا تھا، شہر کے اکثر حضرات آپ کے علم وحکمت سے پہلے ہی متاثر تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کی آمد کے بعد آپ کی روحانیت کے بھی قائل ہوگئے اور آپ کا گھر علم اور روحانیت دونوں کا مسکن بن گیا۔۔۔۔۔اکثر اہل علم اور صوفیا یہاں تشریف لاتے تھے، شہر کے مشہور مجذوب اور صاحب حال وقال صوفی مولانا اصغر علی خان عرف داتا کمبل شاہؒ (متوفی ۷/شوال المکرم ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۷/دسمبر ۱۹۰۳ء) بھی بکثرت آپ کے مکان پر تشریف لاتے تھے، ان کو آپ سے اور آپ کے اہل وعیال سے گہرا ربط تھا۔

اس تعلق کا قصہ بھی بہت عجیب ہے، اور اس کا ذریعہ بھی حضرت شاہ فضل رحمان صاحبؒ ہی کی شخصیت بنی:

داتا کمبل شاہ سے ملاقات کا دلچسپ قصہ

داتا کمبل شاہ سلسلۂ چشتیہ قادریہ کے صاحب حال اور مجذوب بزرگوں میں تھے، وہ حضرت مولانا نصیر الدین نصرؒ کے معاصر تھے، کہتے ہیں وہ حضرت حاجی شاہ وارث علیؒ (دیوہ شریف) سے بیعت تھے [40]، ان کو ایک کمبل اپنے پیر و مرشد سے ملا تھا جو سفر و حضر میں ہر وقت

---

[40] -الحاج حافظ و قاری حضرت سید وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ وارثیہ کے بانی اور بلند پایہ بزرگ تھے اور درویشانہ صفت رکھتے تھے، مورث اعلیٰ جناب سید اشرف علی ابی طالبؒ نیشاپور سے ہجرت کر کے قصبہ رسول پور، بارہ بنکی میں ۶۷۰ھ م ۱۲۷۵ء میں آباد ہوئے، آپ کے والد بزرگوار کا نام سید قربان علی شاہ تھا، وہ دیوہ میں بڑے زمیندار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں حضرت سید وارث علی شاہ صاحب کی ولادت ہوئی، پانچ سال کی عمر میں رسم مکتب نشینی انجام دی گئی، سات برس کی عمر میں قرآن پاک کا حفظ مکمل کیا، حفظ قرآن سے آگے کی تعلیم کے لئے والد صاحب نے ایک مولوی صاحب کو مقرر کیا، لیکن آپ نے قرآن کریم کے علاوہ کوئی درسی کتاب نہیں پڑھی۔

اس کے بعد اپنے رشتے کے بہنوئی حضرت مولانا سید خادم علی شاہؒ (متوفیٰ ۱۳/ صفر المظفر ۱۲۵۲ھ مطابق ۷/ جون ۱۸۳۶ء) کے پاس لکھنؤ تشریف لے گئے، جو سلسلہ قادریہ و چشتیہ کے سربر آوردہ صوفی اور صاحب نسبت بزرگ تھے، ان سے بیعت ہو کر مراحل سلوک کی تکمیل کی، سید صاحب کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشیں ہوئے۔

اس کے بعد جے پور سے پاپیادہ سفر کیا اور وہاں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضری دی اور روحانی دولت سے مالامال ہوئے۔ اجمیر کے بعد گجرات، بمبئی اور پھر وہاں سے مکہ معظمہ پہنچے۔ وہاں قیام کے دوران ایک مدت تک روضہ رسول ﷺ پر حاضری دیتے رہے۔ اس کے بعد بیت المقدس، شام دمشق، بیروت، کاظمین، نجف اشرف، کربلا معلٰی کے سفر کے علاوہ ترکی، روس اور افریقہ کی سیر بھی کی، پھر وطن واپس ہو گئے۔۔۔

کم و بیش دس سال ممالک غیر کے اسفار کرنے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہونچے کہ دنیا کا عیش و آرام فنا ہو جانے والا ہے۔۔۔۔۔

وطن واپسی کے بعد بھی برسوں ہندوستان کے چپہ چپہ کی سیر کی، بہار میں دربھنگہ، مظفر پور، پٹنہ، آرہ وغیرہ بھی ان کے نقش قدم پہونچے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب کی عجیب کیفیت تھی، حالت حج میں جو احرام باندھا تھا وہ تا عمر آپ نے نہیں اتارا۔ ننگے پاؤں رہتے تھے، جوتہ اجمیر میں پاؤں سے نکالا تو تاحیات نہیں پہنا، اپنے جد امجد حضرت سرور کائنات ﷺ کو قبر اطہر میں

آرام کرتے ہو دیکھا تو عہد کرلیا کہ آج سے پلنگ یا تخت پر سونا حرام ہے، ترک لذات کا عہد کرلیا، ساری زندگی شادی نہیں کی،

آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ نماز نہیں پڑھتے تھے، مگر یہ درست نہیں ہے:

☆ آپ کی درگاہ کے احاطہ میں ایک تختی لگی ہوئی ہے، جس میں احرام کی شرائط میں سے یہ لکھا ہے کہ نماز روزہ اور جملہ احکام شریعت کی پابندی لازم ہے۔

☆ مرزا محمد منعم بیگ نے حیات وارث میں جو چشم دید واقعات جمع کیے ہیں، ان میں نماز کی بہت تاکید ملتی ہے "مثلاً ایک موقعہ پر کسی مریدنے عرض کیا کہ حضور! نماز بے حضوری قلب قبول نہیں ہوتی، تو ہم لوگوں کی نماز ہی گویا بیکار ہے، آپ نے فرمایا یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہئے، نماز برابر پڑھتا رہے، تمام عمر میں اگر ایک سجدہ بھی قبول ہو گیا تو تمام عمر کی نماز قبول ہے (حصہ اول ص۵۷)

☆ قاسم جان صاحب انسپکٹر پولیس ساکن مرزاپور جو حضرت مولانا شاہ فضل رحمن صاحب قبلہ ؒ کے مریدین میں سے ہیں، راوی ہیں کہ ایک مرتبہ آدھی رات سے زائد گذر گئی ہو گی کہ میں مولانا کے حضور میں تھا، ایک شخص نے عرض کیا کہ جناب حاجی صاحب قبلہ نماز نہیں پڑھتے، اتنا کہنا تھا کہ مولانا کو وہ غضب وجلال طاری ہوا کہ کسی نے یہ جلال کبھی نہ دیکھا تھا اور فرمایا دور ہو مردود، تو کیا جانے حاجی صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ ہیں، خبردار! کسی نے کبھی کوئی کلمہ خلاف شان کہا تو گویا مجھ کو روحی صدمہ دیا (حصہ اول ص۵۵)

آپ نے لکھنؤ کے آس پاس کے وسیع وعریض علاقہ کو اپنی تبلیغی واصلاحی خدمات سے متاثر کیا آپ کے دست حق پرست پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ممتاز اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔

آپ کے کئی مریدین نے بھی بہت شہرت پائی، جن میں بیدم شاہ وارثی، حیرت وارثی، عنبر شاہ وارثی، نمایاں حیثیت کے حامل ہیں، وارثی طریقۂ درویشی انہی سے منسوب ہے۔ ان کے پیروکاروں کی بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ عام طور پر زرد رنگ کا احرام باندھتے ہیں۔۔۔۔

آپ نے سخت مجاہدانہ زندگی گذار کر یکم صفر المظفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۷/ اپریل ۱۹۰۵ء بروز جمعہ صبح صادق کے وقت چار بج کر پندرہ منٹ پر ضلع بارہ بنکی کے قصبہ دیوہ شریف میں اس جہانِ فانی سے پردہ فرمایا، آپ کا مزار اقدس دیوہ شریف میں مرجع خلائق ہے (حیات وارث حصہ اول ص۹ تا ۶۰ وحصہ دوم ۳۹، ۴۰ مرتبہ مولوی مرزا محمد منعم بیگ صاحب وارثی

ان کے کندھے پر ہوتا تھا اس لئے وہ کمبل شاہ کے نام سے مشہور ہوگئے، مظفرپور میں ایک محلہ تاڑی خانہ کے لئے مشہور تھا جہاں شہر کے شرابیوں اور طوائفوں کی بڑی تعداد آباد تھی، اکثر یہ وہاں نظر آتے تھے، غالباً انہی کی اصلاح کے لئے آپ تشریف لے جاتے ہونگے، آپ کا گھر کہاں تھا؟ اور رات کہاں گذارتے تھے؟ کسی کو اس کی خبر نہیں تھی، اکثر وہ ادھر ادھر مستانہ وار گھومتے ہوئے ملتے تھے۔۔۔ ان کے پاس ایک تاڑی والی لبنی (صراحی) تھی، جس میں وہ کوئی (غالباً) جائز مشروب بھر کر رکھتے تھے، کبھی کسی نے ان کو تاڑی یا شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا، البتہ تاڑی والی لبنی ان کے ساتھ دیکھ کر اکثر حضرات کا گمان یہ تھا کہ وہ بھی میخواروں میں شامل ہیں۔۔۔۔

مولانا نصیر الدین نصر بھی یہی سمجھتے تھے، ایک بار وہ حسب معمول گنج مرادآباد تشریف لے گئے، حضرت شاہ فضل رحماں صاحبؒ نے ان سے دریافت فرمایا کہ:

"مولوی اصغر علی کو آپ جانتے ہیں؟ کبھی ان سے ملاقات ہوئی؟

مولانا نصیر الدین کمبل شاہ کے اصل نام سے واقف نہیں تھے، اس لئے انہوں نے نفی میں جواب دیا،

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: وہ مستان ہیں اور کمبل شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔

مولانا نصیر الدین صاحب نے ان کے تاڑی خانے میں رہنے اور تاڑی وغیرہ پینے کی شکایت کی اور کہا کہ وہ تو کوئی مولوی معلوم نہیں ہوتے، شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

فتح پوری ناشر زبیری بک ڈپو آستانہ روڈ دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی، مصنف مرحوم حاجی وارث علی صاحبؒ کے خادموں میں تھے، انہوں نے اس کتاب میں اکثر واقعات دیکھے ہوئے لکھے ہیں اور کچھ دیکھنے والوں سے سنے ہوئے بھی ہیں)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ پوری کتاب میں داتا کمبل شاہ کا ذکر مجھے نہیں ملا، جب کہ بہار کے دیگر کئی متوسلین کا ذکر اس میں موجود ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے، ان پر جذب کا غلبہ ہے، وہ بڑے صاحب مقام بزرگ ہیں،

۔۔۔اس بار جایئے تو ان سے مل کر میرا سلام پہونچا یئے"

حضرت نصرؒ مظفر پور پہونچ کر سوچتے رہے کہ کمبل شاہؒ کی تو اپنی کوئی منزل نہیں ہے، ان تک سلام پہونچانے کی صورت کیا ہو گی؟ تاڑی خانہ والے ٹھکانے پر جانے میں حجاب محسوس ہوتا تھا، اس پس وپیش میں کئی دن گذر گئے تو مجبوراً حضرت نصرؒ نے ان کے تاڑی خانہ والے ٹھکانے ہی پر جانے کا فیصلہ کر لیا، وہاں پہونچے تو دیکھا کہ کمبل شاہ میکدہ میں شراب کی صراحی سامنے رکھے رندوں کے درمیان بیٹھے ہیں، ان کو اس حال میں دیکھ کر واپس چلے آئے، آپ نے مناسب نہ سمجھا کہ عالم دین ہو کر شراب خانہ میں داخل ہوں۔۔۔

دوسرے دن پھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ جام وساغر لئے سامنے ہی بیٹھے ہیں، ایک صراحی آگے رکھی ہے اور کچھ مست بلانوش ارد گرد موجود ہیں، دور سے دیکھتے ہی کمبل شاہ نے پکار لگائی:

خوب مولانا! امانت پہونچانے میں اتنی دیر کی؟، ویسے میں نے سلام کا جواب بھیج دیا ہے۔

یہ حیران رہ گئے کہ ان کو کیسے خبر ہو گئی؟ قریب پہونچے تو رندخوار لوگ وہاں سے دور ہٹ گئے۔۔۔ حضرت نصرؒ ان کے روبرو بیٹھ گئے، کمبل شاہ پھر گویا ہوئے، کہ مولانا! شریعت میں کسی کی پیٹھ پیچھے غیبت کرنا گناہ ہے، اور کسی پر الزام دھرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے، حضرت نصر نے ان کی تائید کی، کمبل شاہؒ نے کہا کہ یہ جانتے ہوئے بھی آپ نے میری شکایت کی، کیا آپ نے یا آپ کے کسی آدمی نے مجھے تاڑی یا شراب پیتے ہوئے کبھی دیکھا تھا؟۔۔۔

یہ دوسرا کشف تھا جس کا حضرت نصرؒ نے کمبل شاہؒ میں تجربہ کیا، ان کو اپنی غلطی پر ندامت محسوس ہوئی اور ادب سے معافی مانگی، کمبل شاہ نے مسکراتے ہوئے اپنی لبنی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ محترم! یہ تاڑی یا شراب معصیت نہیں ہے بلکہ یہ شراب طہور ہے، آپ بھی اگر پی لیں تو ایک ہی کش میں ساری منزلیں طے ہو جائیں گی اور یہ کہتے ہی بے شان وگمان جام حضرت نصرؒ کے ہونٹ سے لگا دیا۔۔۔۔۔۔

حضرت نصر لاحول پڑھتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، آپ پر شریعت غالب تھی، حقیقت جاننے کے باوجود وہ اس خوف سے لرز گئے کہ کہیں دیکھنے والے مجھے بھی رندخوار نہ سمجھ بیٹھیں اور میری وجہ سے علماء کی جماعت پر بدنامی کا داغ لگ جائے، انہوں نے ہونٹ پر لگی شراب کو کئی بار پانی سے صاف کیا۔۔۔۔

گھر پہونچنے کے کچھ دیر کے بعد ان کو اپنے ہونٹوں سے انتہائی نفیس خوشبو کا احساس ہوا ،کہتے ہیں کہ تقریباً چالیس (۴۰) روز تک اس خوشبو کے اثرات باقی رہے، اور اس دوران عبادت وریاضت میں بھی خاص حلاوت و کیفیت محسوس ہوئی[41]۔۔۔۔۔۔

غالباً حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی شراب معرفت کے لئے آپ کو ان کے پاس بھیجا ہوگا، مگر ظاہری شریعت ان کے دامن گیر ہوگئی، شاید ایسی ہی شراب کے لئے حافظ شیرازیؒ نے کہا تھا:

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

41۔ حضرت شاہ فضل رحماں اور داتا کمبل شاہؒ سے متعلق حضرت نصرؒ کے یہ واقعات میں نے اپنے رشتے کے چچا حضرت صوفی سید شاہ منظور الحق نقشبندی دامت برکاتہم بانی خانقاہ نقشبندیہ احمدیہ کریمیہ موتیہاری بہار سے سنے ہیں، اور انہوں نے ان کو اپنے نانا جان جناب مولوی عبدالحمید وکیلؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا، جو حضرت نصرؒ کے چھوٹے فرزند اور حضرت مولانا عبدالشکور آہؒ کے علاتی بھائی تھے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب نقشبندی قادری دامت برکاتہم نے بھی ان واقعات کی تائید فرمائی۔

علمی گیرائی و گہرائی

حضرت نصر کا علم بہت پختہ اور مستحضر تھا، اس کا اندازہ ان کے واحد دستیاب غیر مطبوعہ قلمی مکتوب سے ہوتا ہے، جو آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت مولانا عبد الشکور آہ کو تحریر فرمایا ہے اور بڑے سائز کے دو صفحات پر مشتمل ہے، اس سے ان کے علم کی پختگی اور کتابوں پر ان کی گہری نظر کا پتہ چلتا ہے اور واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک محقق اور صاحب نظر عالم دین تھے اور کتابوں کے ساتھ ان کا مسلسل علمی و تدریسی اشتغال بھی قائم تھا، اور طلبہ کی تعلیم و تربیت اور نگرانی کا خداداد ملکہ انہیں حاصل تھا، مکتوب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"تمہاری طبیعت چونکہ معقولات کی طرف بہت مائل ہے
اس وجہ سے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ معقولات ختم کرو اور قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ معقولات میں اور ہدایہ، توضیح تلویح دینیات میں اور ممکن ہو تو شرح چغمنی بھی اس سال مقام درس تک ختم کرو کیونکہ یہ سب کتابیں مشہور درسی ہیں۔۔۔
(چند سطروں کے بعد) غرض میں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کے سبق کا خیال کرو، اور مشکوٰۃ اور تفسیر جلالین تو تم یہاں پڑھ چکے ہو دوبارہ سماعت کا وقت ملے تو خیر مضائقہ نہیں۔ ترمذی کو میں کیا کہوں جب خاطر نہ ہو تو کیا جیسا موقعہ ہو کرو[42]۔

---

[42] ۔مکتوب حضرت نصر (قلمی) ص ا۔

عکس مکتوب حضرت نصر بنام حضرت آہ۔ صفحہ اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ضلع ہائی اسکول میں ملازمت اور سبکدوشی

حضرت نصرؔ کو کسی دینی مدرسہ میں باقاعدہ تدریسی خدمت کا موقعہ نہیں ملا، کہ شہر مظفر پور میں کوئی دینی مدرسہ ہی نہیں تھا، آپ نے کسب معاش کے لئے ضلع ہائی اسکول مظفر پور میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کر کے ہیڈ مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے، پھر ایک اتفاقی واقعہ کی بنا پر آپ قبل از وقت ملازمت سے سبکدوش ہوگئے، اس واقعہ کی تفصیل بھی بڑی دل چسپ ہے، جو میں نے اپنے خاندان کے متعدد بزرگوں سے سنی ہے:

انگریزی سامراج کا دور تھا، انگریز انسپکٹر کلاسوں کے جائزہ کے لئے آیا، آپ کسی انگریزی مضمون کا درس دے رہے تھے، اس نے اپنی رپورٹ میں بعض الفاظ کی تفہیم و تشریح پر اعتراض کیا، آپ نے کہا: میں نے جو پڑھایا ہے وہی درست ہے، ۔۔۔۔جب لغت (ڈکشنری) سے موازنہ کیا گیا تو آپ ہی کی بات صحیح ثابت ہوئی، اس بحث و تکرار سے بددل ہو کر آپ نے استعفا دے دیا، حالانکہ افسر کی شان میں آپ کی طرف سے بظاہر ڈسپلن شکنی ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود اسکول انتظامیہ نے آپ کا استعفاء واپس لینے پر اصرار کیا، یہ حضرات آپ کی صلاحیت و قابلیت اور دیانت وراستبازی سے کافی متاثر تھے، اور بحیثیت ہیڈ مولوی آپ کی قیادت میں ضلع اسکول روبترقی تھا، لیکن آپ پھر انگریزی ملازمت کے لئے راضی نہ ہوئے[43]۔

طبابت کا شغل

اسکول کی ملازمت ترک کرنے کے بعد ذریعۂ معاش کے طور پر آپ نے طبابت کا

---

[43] ۔ماسٹر سید محمود حسن مرحوم کی ڈائری میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود نہیں ہے، صرف اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے، لیکن انہوں نے یہ قصہ زبانی طور پر اپنے صاحبزادگان نیز میرے والد ماجد اور دیگر اہل تعلق کو سنایا تھا، میں نے یہ واقعہ اپنے والد ماجد کے علاوہ ماسٹر صاحب مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے جناب عبد الناصر صاحب سے بھی سنا ہے۔

شغل اختیار کیا اور اس پیشہ کی وساطت سے بھی بے شمار بندگان خدا کو فیض پہونچایا۔۔۔

آپ باضابطہ حکیم تھے اور ایک طبیب حاذق کی حیثیت سے آپ کو دور دور تک شہرت حاصل تھی۔۔۔ آپ کے مکتوب سے آپ کی طبی لیاقت، فنی مہارت اور حکیمانہ مزاج ومذاق کا بھی پتہ چلتا ہے، خط میں آپ نے حضرت مولانا حافظ بشارت کریم گڑھولویؒ اور حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوریؒ دونوں کے لئے دوا کے الگ الگ نسخے تجویز کئے ہیں، جس زمانہ میں یہ دونوں حضرات کانپور میں زیر تعلیم تھے:

حضرت گڑھولویؒ نے غالباً ضعف دل ودماغ کی شکایت کی تھی، اس لئے ان کے واسطے تحریر فرمایا کہ:

"مولوی بشارت کریم صاحب کے واسطے نسخہ مقوی دل ودماغ یہ ہے۔ برگ گاؤزبان، گل گاؤزبان، کشنیز خشک مقشر، ابریشم خام مقرض، بہمنی سفید، صندل سفید، تخم مالنگو، تخم مرنجمیر شب در آب تر نمائند، صباح جوش دہند، ہرگاہ سوم حصہ آب بماند، فرود آوردہ صاف نمودہ نبات یک آماد وعسل سفید خالص باو آماد انداختہ بقوام خمیرہ آرند و در ظرف چینی خواہ زجاجی بدارند و از سہ (۳) ماشہ تانہ (۹) ماشہ بعرق گاؤزبان وکیوڑا ہم وزن چار تولہ صبح وشام بخورند نافع باد فقط[44]۔"

اور حضرت آہؔ کے لئے تجویز فرمایا کہ:

"تمہارے واسطے مناسب ہے کہ شیرۂ مغز بادام شیریں مقشر عرق

---

44 ۔مکتوب نصر ص ۲۔

کیوڑا ملا کر ناپ سے بشری کر کے صبح پیا کرو"[45]

خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ تجویز و تشخیص کے ساتھ دواسازی بھی کرتے تھے، اور اس کے لئے مختلف مقامات سے جڑی بوٹیاں اور مفردات منگواتے تھے، صاحبزادے کو تحریر فرماتے ہیں:

> "وہاں کوئی معتمد راستباز عطر والا ہو تو دریافت کرو کہ ہاتھرس کا گلاب کس قیمت سے کس قیمت تک کا وہ منگا کر بھیج سکتا ہے، کسی دوافروش راستباز پنساری کو بھی دریافت کر کے اور اس سے ملاقات کر کے اس کا نام و نشان لکھ بھیجو، تا کہ میں کچھ منگواؤں اور خط و کتابت سے اور باتیں طے کروں[46]۔"

اس طرح عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ ضلع اسکول کی ملازمت میں اور جو بچ گیا وہ طبابت کے مشغلے میں گذرا، اور دینی تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے لئے بظاہر کسی عربی مدرسہ میں ملازمت اختیار نہیں کی، لیکن انہوں نے اس عظیم دینی فریضہ کو حسبتاً للہ اپنے گھر میں بیٹھ کر انجام دیا، محلہ چھوٹی کلیانی شہر مظفرپور میں آپ کا آبائی مکان تھا، جہاں ذہین طلبہ اور فضلاء کی قابل لحاظ تعداد نے آپ سے استفادہ کیا۔

مدرسہ جامع العلوم مظفرپور کی تاسیس

یہی وہ زمانہ تھا (۱۳۰۷ھ م ۱۸۸۹ء) جب مظفرپور میں مدرسہ خادم العلوم (موجودہ مدرسہ جامع العلوم) کی بنیاد پڑی جس نے تھوڑے عرصے میں ہی ملک گیر شہرت حاصل کرلی،

---

45 -مکتوب نمبر ص ۲۔

46 -حوالۂ بالا۔

بڑے ممتاز علما اور اساتذۂ فن کی خدمات اس مدرسہ کو حاصل ہوئیں ، قریب وبعید سے علم کے طلبگاروں کا رجوع عام ہوا، حضرت نصرؒ نے بھی اپنے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالشکورؒ کو حصول تعلیم کے لئے اس مدرسہ میں داخل فرمایا، جن کے ذریعہ بہت سے دیگر طلبہ بھی تعلیم وتربیت کی غرض سے حضرت نصرؔ سے وابستہ ہوئے، اور حضرت نصرؔ نے اپنے تدریسی ذوق کی بنا پر ان کو قبول فرمایا، اس طرح حضرت نصرؔ کی رہائشگاہ ایک مستقل تعلیم گاہ اور بافیض تربیت گاہ میں تبدیل ہوگئی۔۔۔۔۔

نیز اس مدرسہ کے بانی اور مہتمم اول جناب حافظ رحمت اللہ صاحبؒ آپ کے پیر بھائی تھے، علاوہ ذاتی طور پر بھی حضرت نصرؔ سے ان کے گہرے روابط تھے، حضرت نصرؔ کے یہاں ان کی آمد ورفت تھی، آپ ہی کے ذریعہ وہ حضرت فضل رحماں تک پہونچے تھے، اور حضرتؒ کے بعد آپ ہی کو اپنا بڑا اور مرشد ورہنما تصور فرماتے تھے، اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل میں بھی آپ سے مشورہ کرتے تھے، ظاہر ہے کہ مدرسہ جیسے عظیم الشان اور منصوبہ بند کام میں وہ حضرت نصرؔ سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔۔۔۔۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ گو کہ حضرت نصرؔ نے گورنمنٹ ملازمت کی مصروفیات کی بنا پر مدرسہ کی کوئی باقاعدہ ذمہ داری قبول نہ کی ہو، لیکن مشورہ اور سرپرستی کی حد تک وہ ضرور اس میں شامل تھے، اور آپ کا مدرسہ سے گہرا ربط تھا، ۔۔۔ مدرسہ آمد ورفت بھی رہی ہوگی، امور مدرسہ میں مشورہ بھی دیتے ہونگے، طلبہ کی تعلیم وتربیت کی نگرانی بھی فرماتے ہونگے، کبھی استاذ کی کمی کی بنا پر طلبہ کو پڑھانے بھی بیٹھ جاتے ہونگے، اس طرح طلبہ اور اساتذہ پر آپ کے علم وقابلیت کے جوہر کھلے، اور وہ متاثر ہو کر کاشانۂ نصر سے وابستہ ہوئے ، اس لئے کہ وہاں دماغ کی طرح دل وروح کی غذائیں بھی میسر تھیں، محلہ چندوارہ سے محلہ کلیانی کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا، اور شہر میں کم ہی ایسے علماء تھے جو علمی لیاقت، خاندانی نجابت، روحانی عظمت وتمکنت، اور فضل وکمال میں حضرت نصرؔ کی ہم سری کرسکتے

تھے، بالخصوص حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کی مظفر پور آمد کے بعد حضرت نصرؔ کا دولت کدہ مرجع علماء وصوفیاء بن چکا تھا، اور شہر و اطراف کا کوئی عالم وعابد آپ کی شخصیت سے مستغنی نہیں رہ سکتا تھا۔

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جب اس مدرسہ کی مستقل عمارت بنانے کا پروگرام بنایا گیا تو حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ ہی کے ایک خلیفہ حضرت مولانا سید عبدالغنی صاحبؒ (جو آبائی طور پر بہار شریف کے رہنے والے تھے اور اپنی سسرال محی الدین نگر (ضلع سمستی پور) میں مقیم ہوگئے تھے) کا انتخاب کیا گیا اور سنگ بنیاد کے لئے آپ کو زحمت دی گئی، جیسا کہ قاری عبدالمجید صاحبؒ مہتمم مدرسہ کے خطبۂ استقبالیہ سے ظاہر ہوتا ہے[47]۔

تاریخ کی ان مختلف کڑیوں کا باہمی ارتباط اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ کوئی ایک شخصیت تھی جو اس پردۂ زرنگار کے پیچھے نقطۂ ارتکاز بنی ہوئی تھی، جو ہر منظر میں موجود تھی لیکن کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔

بلاشبہ حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؔ جس خاندان کے فرد فرید تھے اس نے ۱۸۵۷ء م ۱۲۷۳ھ اور اس سے پہلے کے انقلابات دیکھے تھے، دہلی اور اس کے مضافات میں علم وفن کی گرم بازاری اور پھر اس بازار کے اجڑنے اور سرد ہونے کا مشاہدہ کیا تھا، اس لئے بجا توقع یہی ہے کہ یہی خاموش چنگاری مظفر پور کی سرزمین پر علمی تحریک کا باعث ہوئی ہو۔۔۔۔

لیکن ایک تو ہمارے خاندان کی خاموش مزاجی اور فنائیت، دوسرے مدرسہ جامع العلوم کی تاریخ کی گمشدگی کہ کبھی ان بزرگوں کا نام تاریخ کے روشن اوراق پر نہیں آسکا[48]۔

---

47 - جنۃ الانوار مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحبؒ ص ۴۳، حاشیہ نمبر ا، طبع ثالث۔

48 - اس ضمن میں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جناب پروفیسر محمد علی صاحب پیغمبر پور ضلع دربھنگہ (جو آج کل مظفر پور شہر میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں اور زمین خرید کر اپنا مکان بھی بنوالیا ہے، زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں،

ان کے آباء واجداد کی زمینداری دربھنگہ اور مظفرپور کے بڑے حدود تک پھیلی ہوئی تھی، میرے جد امجد حضرت مولانا حکیم سید احمد حسن منورویؒ سے بیعت ہیں، صاحب حال اور بڑی اچھی کیفیات کے مالک ہیں، تاریخ پر بھی اچھی نگاہ ہے، گرم دم جستجو کا جیسا تجربہ مجھے ان کی شخصیت میں ہوا کم کسی میں ہوا، اللہ ان کو سلامت رکھے اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے آمین،۔۔۔۔) میں نے ایک باران سے درخواست کی کہ آپ مدرسہ جامع العلوم جاکر حضرت مولانا عبدالشکور آہؒ کے عہد طالبعلمی کی جستجو کریں، پروفیسر صاحب نے مدرسہ کے ذمہ داروں، بانی خاندان کے افراد اور دیگر واقف حضرات سے رابطہ کیا، اور مسلسل کئی ماہ تک اس کے لئے سرگرداں رہے، مگر کوئی واضح چیز سامنے نہیں آسکی، آخر ایک دن انہوں نے مدرسہ جامع العلوم کے استاذ اور مفتی حضرت مولانا اقبال احمد صاحب دامت برکاتہم سے فون پر میرا رابطہ کرایا، ان سے جو گفتگو ہوئی وہ حد درجہ مایوس کن تھی، انہوں نے بتایا کہ ۱۹۷۵ء م ۱۳۹۵ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ مدرسہ میں موجود نہیں ہے، اس لئے اس سے قبل کی کوئی معلومات حاصل ہونا بہت مشکل ہے۔۔۔۔۔۔

اسی ضمن میں انہوں نے بتایا کہ:" جس زمانہ میں حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب ذکا گڑھولویؒ "جنت الانوار" لکھ رہے تھے، میں کتب خانہ کا ذمہ دار تھا، ایک دن کتب خانہ کی صفائی کے دوران مدرسہ کی قدیم مطبوعہ روئداد کا ایک نسخہ ملا، جس پر ۱۸۹۳ء م ۱۳۱۰ھ کی تاریخ درج تھی، اس میں حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی کے حفظ کا قصہ مذکور تھا اور اس ضمن میں حضرت مولانا عبدالواسع سعدی پوریؒ کی کہی ہوئی ایک تہنیتی نظم بھی چھپی ہوئی تھی، میں نے سوچا یہ تو حضرت مولانا ادریس صاحبؒ کے کام کی چیز ہے، اس روئداد میں مدرسہ کے اصول، مسلک اور اس کی سنگ بنیاد وغیرہ کا بھی تذکرہ تھا، حضرت مولانا ادریس صاحب اس روئداد کو دیکھ کر کافی مسرور ہوئے، اسی کے حوالے سے انہوں نے حضرت مولانا بشارت کریمؒ کی تعلیم اور حفظ کا پورا قصہ جنت الانوار میں نقل فرمایا اور وہ پوری نظم بھی انہوں نے جنت الانوار میں محفوظ فرمادی، لیکن وہ روئیداد حضرت ہی کے پاس رہ گئی، وہ صدر المدرسین اور ہمارے بزرگ تھے، میں نے ایک دوبار بہت ادب کے ساتھ حضرت کو یاد دلایا، لیکن اس روئیداد کا پتہ نہ چل سکا، اس روئیداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ابتدائی ادوار میں ہر سال اس طرح کی روئیداد شائع ہوتی تھی جس میں مدرسہ کی سال بھر کی کارکردگی وغیرہ کا تفصیل سے ذکر ہوتا تھا" (تم کلامہ)

حضرت مولانا مفتی اقبال صاحب کی اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامع العلوم اپنی تاریخ قدیم کھو چکا ہے، کاش کہ اس کی تاریخ تک پہونچنا ممکن ہوتا تو کئی حقائق سامنے آتے، حضرت مولانا نصیر الدین اس وقت شہر کے سب سے معتبر اور متقی عالم دین تھے، ان کی افتاد طبع اور خاندانی روایات کے پیش نظر یہ ناممکن تھا کہ علم دین کی کوئی شمع جلائی جائے اور ان کا خون جگر اس میں شامل نہ ہو۔

بہار کے تاریخی مدرسہ جامع العلوم مظفرپور کی مرکزی عمارت اور مسجد

حضرت نصرؔ کے فیوض وبرکات

اس دور کے طلبہ میں جو عزمِ راسخ اور جذبہ صادق ہوتا تھا وہ اس مدرسہ کے توسط یا مولانا عبدالشکور کے رفیقانہ رشتے سے ان کو حضرت نصرؔ کے آستانہ تک لے گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ذہین اور سعادت مند طلبہ کی ایک قابل لحاظ تعداد حضرت نصرؔ سے مربوط ہوگئی ۔۔اور آپ کی خاموش تربیت کے نتیجے میں بڑے بڑے لعل وگہر پیدا ہوئے۔

چند فیض یافتہ شخصیات

یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ انہوں نے کون کون سے ہیرے تراشے اور کیسے کیسے لعل وگہر تیار کئے، البتہ اوپر حضرت نصرؔ کے جس مکتوب کا ذکر آیا ہے اس میں کئی شخصیات کا تذکرہ ہے جنہوں نے آپ سے باقاعدہ استفادہ کیا تھا، اور مدارج تعلیم کی تکمیل راست آپ کی رہنمائی میں کی تھی، کتابوں سے لیکر ضروریات زندگی تک ہر چیز کی آپ نگرانی فرماتے تھے، بلکہ مکتوب میں جس طرح آپ نے ہر ایک کے اسباق کی تفصیل دریافت کی ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے کتابی تعلیم بھی آپ سے حاصل کی تھی، اسی لئے اگلی کتابوں، اسباق اور متعلقہ اساتذہ کی تفصیلات جاننے کے آپ خواہشمند رہتے تھے۔

مذکورہ خط بظاہر فرزند ارجمند حضرت مولانا عبدالشکورؒ کے نام ہے لیکن روئے خطاب ان تمام رفقاء کی طرف بھی ہے جو حضرت کے زیر تربیت رہ کر مظفرپور سے کانپور گئے تھے، اس مکتوب میں جن زیر تربیت شخصیات کے اسماء گرامی درج ہیں، وہ یہ ہیں:

حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ

آپ کا اسم گرامی: بشارت کریم، کنیت: ابوالانوار، والد ماجد کا نام: عبد الرحیم، سن ولادت جنۃ الانوار میں حضرت مولانا محمد ادریس ذکا گڑھولویؒ (متوفی ۱۹۹۳ء م ۱۴۱۳ھ صاحبزادہ حضرت گڑھولویؒ صدر المدرسین وصدر مفتی مدرسہ جامع العلوم مظفرپور بہار)) نے قرینہ وقیاس سے ۱۲۹۴ھ م ۱۸۷۷ء لکھا ہے، موضع بازید پور گڑھول شریف موجودہ ضلع سیتامڑھی میں آپ کی پیدائش ہوئی، جنۃ الانوار (اول ایڈیشن جولائی ۱۹۷۲ء) میں آپ کو "نسباً شیخ صدیقی" بتایا گیا ہے، اس کے بعد اس کتاب کے دوایڈیشن شائع ہوئے، دوسرا ایڈیشن حضرت مولانا محمد ادریسؒ کی حیات ہی میں شائع ہوا جو اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، البتہ اس کا تیسرا ایڈیشن آپ کے بھتیجے فاضل محترم مولانا باقی باللہ کریمی القاسمی صاحب مدظلہ العالی نے ۲۰۱۴ء میں شائع کیا ہے یہ میرے پیش نظر ہے، اس کے دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ یہ بعینہ دوسرے ایڈیشن کے مطابق ہے، اس ایڈیشن میں حضرت کے نسب کا خانہ حذف کر دیا گیا ہے،۔۔۔۔حضرت کے اہل خانہ سے تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ پہلے ایڈیشن کے بعد کچھ دوسری روایات بھی سامنے آئیں اس لئے اس باب میں خاموشی کو ترجیح دی گئی، ۔۔۔۔اس کتاب کے علاوہ حضرتؒ کے حالات وواقعات پر جتنی کتابیں میری نظر سے گذری ہیں، کسی میں بھی حضرت کے نسب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔۔۔۔

آپ چھ (۶) سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا، اور تقریباً دس (۱۰) سال کی عمر میں شفقت پدری سے بھی محروم ہو گئے، والد کے انتقال کے بعد اپنے بہنوئی کے زیر تربیت رہے، فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم دربھنگہ میں حکیم مولانا علی حسن چھپرویؒ سے حاصل کی اور متوسطات تک تعلیم مدرسہ جامع العلوم (قدیم نام خادم العلوم) مظفرپور میں ہوئی، یہیں آپ

نے شرح جامی کے سال (۱۸۹۲ء م ۱۳۱۰ھ میں) قرآن کریم کا حفظ مکمل کیا، اس وقت جناب حافظ رحمت اللہ صاحبؒ مدرسہ کے مہتمم تھے، حفظ مکمل کرنے بعد آپ نے تراویح میں پورا قرآن سنایا، رمضان کے بعد آپ کی دستار بندی عمل میں آئی جس میں آپ کے استاذ گرامی قدر حضرت مولانا عبدالواسع سعدی پوریؒ (سعدی پور موضع الماس پور ضلع سمستی پور کے قریب ایک گاؤں ہے) نے ایک طویل تہنیتی نظم پیش فرمائی، اور وہ نظم روئیداد مدرسہ میں شائع ہوئی، یہ ترجیع بند نظم مسدس کی ہیئت میں ہے، اس کا ایک بند بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

اے مرے حافظ بشارت نو گل باغ کمال
ہے بجاہوں جس قدر آپ اس مسرت پر نہال
آپ کو بخشا ہے حق نے کیا ہی گنج لازوال
ہو رہا ہے جس کے باعث بزم میں یہ قیل وقال
یوں تو ہر شب کی جہاں میں شان ہی کچھ اور ہے
آج کی شب کا مگر فیضان ہی کچھ اور ہے

آپ کے حفظ کے استاذ کا نام حافظ عبد الحلیم ہے، جن کا تذکرہ تہنیتی نظم میں موجود ہے[49]۔

مظفرپور ہی کے زمانۂ تعلیم میں آپ حضرت مولانا نصیر الدین احمد نصرؔ سے مربوط ہوئے، اور ان سے تعلیمی، تربیتی اور دینی وفکری استفادہ کیا، اس کے بعد غالباً آپ ہی کے ایما پر متوسطات اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور تشریف لے گئے (۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں) اور وہیں دارالعلوم کانپور مسجد رنگیان میں حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا

49 جنۃ الانوار مرتبہ حضرت مولانا محمد ادریس ذکا گڑھولوی ص ۵ تا ۳۰۔

اور متوسطات سے فضیلت تک کی کتابیں اسی دارالعلوم میں پڑھیں اور یہیں سے فراغت حاصل کی۔

جنت الانوار (مرتبہ :حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب گڑھولویؒ)وغیرہ میں حضرت گڑھولویؒ کی تعلیم و فراغت کو مدرسہ فیض عام کانپور سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ حضرت کانپوریؒ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء) میں ہی مدرسہ فیض عام سے علٰحدہ ہو چکے تھے اور مسجد رنگیان نئی سڑک (چھوٹا بوچڑ خانہ) میں اپنا مدرسہ "دارالعلوم کانپور" کے نام سے قائم کر لیا تھا، جہاں وہ زندگی کے آخری لمحات تک مدرس رہے۔

ان کے بعد مدرسہ فیض عام میں چندماہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ان کے بعد مولانا غلام یحیٰ ہزارویؒ اور پھر ان کے بعد مولانا فاروق چڑیا کوٹی (اعظم گڑھی) وغیرہ علماء اس منصب پر فائز ہوئے، حضرت گڑھولویؒ کے زمانہ تعلیم میں مدرسہ فیض عام میں اس منصب پر حضرت مولانا فاروق چریا کوٹیؒ تھے......

دور دراز کے اکثر طلبہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی شہرت علمی سن کر کانپور آتے تھے، حضرت کانپوریؒ کے نکلنے کے بعد مدرسہ فیض عام کی پرانی شان بھی زوال پذیر ہونے لگی تھی ،اس لئے اگر حضرت گڑھولویؒ نے مدرسہ فیض عام میں داخلہ لیا بھی ہوگا تو جلد اس کو چھوڑ کر دارالعلوم رنگیان (چھوٹا بوچڑ خانہ) حضرت کانپوریؒ کے پاس آگئے ہونگے، جو اس وقت کانپور کا سب بڑا مدرسہ تھا، اس زمانے میں مدرسہ فیض عام یا جامع العلوم وغیرہ میں داخلہ ملنا آسان تھا لیکن مولانا کانپوریؒ کے مدرسہ میں آسان نہیں تھا، اس لئے کہ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور جگہ کی تنگی کی بنا پر نئے داخلے بہت مشکل سے لئے جاتے تھے جیسا کہ جنت الانوار کی اس عبارت سے بھی فی الجملہ مترشح ہوتا ہے:۔

"والد علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ جب میں کانپور پہونچا تو معلوم ہوا کہ

یہاں سب سے بڑے عالم۔مدرسہ فیض عام میں۔استاذ زمن مولانا
احمد حسن ہیں، میری خواہش ہوئی کہ میرے اسباق خاص ان ہی کی
درسگاہ میں ہوں، مگر وہ تو بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے، بھلا میرا گذر
وہاں کیسے ہو سکتا تھا، خیر رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔۔۔۔[50]"

اس میں مدرسہ فیض عام کا لفظ تو اس ذہنی تحفظ اور شہرت کی بنا پر آگیا ہے جو بہت سے لوگوں کو مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے تعلق سے تھا، ورنہ تناظر یہ بتاتا ہے کہ حضرت نے مدرسہ فیض عام میں داخلہ لینے کے بعد حضرت کانپوریؒ کی درسگاہ تک پہونچنے کی کوشش کی تھی۔

اس پر مدلل تحقیق حضرت مولانا عبدالشکور آہؒ کی تعلیم وتربیت کی بحث میں آئے گی انشاء اللہ۔

"روحانی تعلیم شیخ المشائخ حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ (متوفی ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء) سے حاصل کی اور آپ کے مجاز بیعت ہوئے، علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل کے بعد ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں تقریباً تیس (۳۰) سال کی عمر میں آپ کی شادی موضع محی الدین نگر ضلع سمستی پور (قدیم ضلع دربھنگہ) میں حضرت مولانا سید عبدالغنیؒ (تلمیذ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ وخلیفۂ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ) کی صاحبزادی سے ہوئی[51]۔

آپ کا سلسلۂ رشد وہدایت آپ کے وصال کے بعد آپ کے نامور صاحبزادگان۔ حضرت مولانا حافظ محمد ایوبؒ (تاریخی نام محفوظ رحمن (ولادت ۱۳۳۲ھ م ۱۹۱۴ء۔وفات ۱۳۶۳ھ م ۱۹۴۴ء)، حضرت مولانا مفتی محمد ادریس ذکاءؒ، تاریخی نام منظور الحق (وفات جنوری ۱۹۹۳ء م ۱۴۱۳ھ)، حضرت مولوی محمد ذاکر الرحمن (وفات ۱۱/ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۴/ اکتوبر

50-جنت الانوار ص ۲۳ طبع ثالث۔

51-جنۃ الانوار مرتبہ حضرت مولانا محمد ادریس ذکا گڑھولوی ص ۵ تا ۳۰۔

۱۹۷۸ء)، اور حضرت حافظ حکیم محمد سلمان صاحب (وفات ۹/شوال المکرم ۱۴۰۶ء مطابق ۱۷/جون ۱۹۸۶ء)--اور خلفاء میں حضرت شاہ نور اللہ عرف حضرت پنڈت جیؒ (متوفی ۲۲/ربیع الاول ۱۳۷۸ء مطابق ۲۷/ دسمبر ۱۹۵۸ء) سے جاری ہوا۔

لیکن ۱۹۴۸ء میں حضرت پنڈت جیؒ کی ہجرت پاکستان کے بعد یہ روحانی سلسلہ آپ کے خلفاء ومجازین میں سب سے زیادہ قطب الہند حضرت مولانا حکیم سید احمد حسن منورویؒ (ولادت ۱۹۰۱ء م ۱۳۱۸ء-وفات ۲۸/رجب المرجب ۱۳۸۷ء م ۲/نومبر ۱۹۶۷ء بروز جمعرات) کے نفوس قدسیہ سے فروغ پایا، آج حضرت گڑھولویؒ کا سلسلۂ زریں بہار سے بیرون بہار تک بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت منورویؒ کے ہی چشمۂ روحانی سے جاری وساری ہے۔فرحمہ اللہ۔

حضرت گڑھولویؒ کا سانحۂ وفات ۱۹/محرم ۱۳۵۴ء م ۲۲/اپریل ۱۹۳۵ء روز چہار شنبہ گذار کر بیسویں محرم کی شب قریب دو بجے پیش آیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت گڑھولویؒ تین بھائی تھے، بڑے بھائی کا نام "محمد فرخ حسین" تھا، آپ درمیان میں تھے، اور چھوٹے بھائی کا نام "محمد لطافت کریم" تھا[52]۔

حضرت مولانا عبد الاحد صاحب جالوی در بھنگویؒ

اسم گرامی عبد الاحد، والد ماجد کا نام: سرکار ارادۃ اللہ، آپ ۱۲۹۸ء مطابق ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۸/مارچ ۱۹۴۷ء مطابق ۲۵/ربیع الثانی ۱۳۶۶ء کو وفات پائی، "جالہ" آپ کا مولد ومدفن ہے،

ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اس کے بعد عربی تعلیم کے لئے مدرسہ امدادیہ در بھنگہ میں داخل ہوئے[53]۔

---

[52] حاشیہ ۲ جنت الانوار ص ۲۲۵ طبع ثالث۔

حضرت نصرؒ کے مکتوب میں مولانا عبدالاحد کا ذکر آیا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ انہوں نے مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں بھی تعلیم حاصل کی تھی ،اور اسی زمانے میں حضرت نصر سے بھی خصوصی استفادہ کیا تھا، اس لئے کہ خط میں ان کا ذکر آنا ان کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے، مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں اس وقت متوسطات تک ہی تعلیم ہوتی تھی، اس لئے اس کے بعد حضرت نصرؒ ہی کی ہدایت کے مطابق آپ کانپور تشریف لے گئے، کیونکہ خط کانپور ہی کے لئے لکھا گیا تھا، پھر آپ ہی کے ایما پر کانپور سے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، اس لئے کہ حضرت نصرؒ، شیخ الہندؒ کو اس زمانہ میں دینیات کا سب سے معتبر اور مستند استاد تسلیم کرتے تھے اور اپنے خاص طلبہ کو زور دے کر دورۂ حدیث کے لئے دیوبند بھیجتے تھے[54]۔

۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، دوسرے سال آکر فنون کی تکمیل کی[55]، ڈیڑھ سال حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں رہے، کچھ دنوں حضرت تھانویؒ کی صحبت میں بھی رہ کر استفادہ کیا، طب آپ نے مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی اور اسی کو ذریعۂ معاش بنایا، مدرسہ احمدیہ مدھوبنی (جو اس وقت علاقہ کا ممتاز مدرسہ تھا) میں آپ شیخ الحدیث تھے، کچھ دنوں آپ نے کلکتہ میں بھی تعلیمی خدمات انجام

---

[53] ۔مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند ص ۶۲ مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ مفتی دارالعلوم دیوبند ناشر دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند، ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء۔

[54] ۔ مکتوب حضرت نصر ص ۲۔

[55] ۔حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ نے مشاہیر دارالعلوم دیوبند میں مولانا عبدالاحدؒ کی فراغت (دارالعلوم) کا سن ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء تحریر کیا ہے، لیکن ہم نے اصل کتاب میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی تحریر کے مطابق ۱۳۱۸ھ اختیار کیا ہے، اس لئے کہ مولانا خالد سیف اللہ صاحب مولانا عبدالاحدؒ کے پوتے ہیں اور صاحب البیت عموماً اپنے گھر سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔

دیں ،وہاں آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی ، امارت شرعیہ بہار کے اولین معماروں میں ہیں، علم غیب اور بشریت رسول وغیرہ کے موضوعات پر آپ کے بعض غیر مطبوعہ رسائل بھی تھے افسوس کہ وہ محفوظ نہ رہ سکے [56]۔

عصر حاضر کے فقیہ بے نظیر حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ قاضی القضاۃ امارت شرعیہ پٹنہ ،بانی اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی وآل انڈیا ملی کونسل دہلی سابق صدر عالی قدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ(ولادت ۱۹۳۶ء م ۱۳۵۴ھ - وفات ۴ /اپریل ۲۰۰۲ء م ۲۲/ محرم ۱۴۲۳ھ)آپ کے نامور فرزند تھے ، جنہوں نے اس عہد زوال میں ہندوستان میں ایک بڑا علمی ،تحقیقی اور فقہی انقلاب برپا کیا، فقہ اسلامی کے احیاء وتدوین جدید، کتب فقہیہ کی ترتیب واشاعت ،نسل نو کی تعمیر ،جرأت رندانہ ،ہمت مردانہ ،شان قلندرانہ ،غیرت مؤمنانہ ، فقہی وقانونی بصیرت اورافتاء وقضا کی عالمگیر اور بے نظیر صلاحیت کے لئے ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا،اس حقیر بے شعور نے جب سے شعور کی آنکھیں کھولیں اس وقت سے لے کر آج تک کوئی عالم وفقیہ آپ کا ہم پایہ نظر نہیں آیا۔

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا:

"اگر کوئی شخص اپنے وقت کا امام اعظم ابو حنیفہ کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمی کو دیکھ لے [57]۔

اسی طرح موجودہ وقت میں ہندوستان کے ممتاز عالم وفقیہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی،وسکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل

56۔حیات مجاہد مرتبہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ص ۲۹ تا ۳۱، طبع ۲۰۰۲ء،۲۰۰۳ء حیدرآباد۔

57۔حیات مجاہد ص ۳۷۔

لاء بورڈ وبانی وناظم المعہد العالی حیدرآباد بھی اسی شجرۂ طوبیٰ کی یادگار ہیں، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا زین العابدین صاحب حضرت مولانا عبد الاحد صاحبؒ کے بڑے فرزند تھے، اور ممتاز علماء میں شمار کئے جاتے تھے، انہوں نے ابتدا سے انتہا تک پوری تعلیم اپنے والد ماجد سے ہی حاصل کی، البتہ طب کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی[58]۔

حضرت مولانا خدابخش مظفرپوریؒ

اسم گرامی: خدا بخش، والد کا نام: محمد حسن، مظفرپور محلہ اسلام پورہ کے باشندے تھے، سن پیدائش ۱۸۶۹ء م ۱۲۸۵ھ ہے، سن وفات ۱۹۳۶ء م ۱۳۵۵ھ ہے، رائیں برادری سے تعلق تھا، ابتدائی سے لیکر متوسطات تک کی تعلیم جامع العلوم مظفرپور میں حاصل کی، اور اسی زمانہ میں حضرت مولانا نصرؒ کے حلقۂ تعلیم وتربیت میں داخل ہوئے، ان کے خاندان میں پہلے سے علم دین بالکل نہیں تھا، تھوڑی بہت ہندی اور انگریزی تعلیم ضرور تھی، ان کے بڑے بھائی منشی رحیم بخش ڈاک خانہ کے پوسٹ ماسٹر تھے، غالباً اسی لئے بڑی عمر میں جاکر انہوں نے تعلیم شروع کی، حضرت نصرؒ نے ان کی سرپرستی قبول فرمائی، مظفرپور کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور تشریف لے گئے، یہاں سے بھی حضرت نصرؒ سے مراسلت جاری رکھی، کانپور کے بعد دیوبند میں داخل ہوئے، اور شعبان المعظم ۱۳۱۸ھ م نومبر ۱۹۰۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مسلکاً حنفی المذہب تھے، عقیدہ بہت پختہ تھا، مزاج میں تھوڑی سختی تھی، آپ نے مظفرپور میں فیض عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم فرمایا، مدرسے کے سلسلے میں اکثر رنگون اور کلکتہ وغیرہ کا سفر کرتے تھے، مدرسہ تقریباً بیس (۲۰) سال جاری رہا اور مولانا کی وفات کے بعد بند ہوگیا، آپ نے دوشادیاں کیں، مگر کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوئی، پہلی بیوی سے ایک لڑکی اور دوسری سے دو لڑکیاں ہوئیں

---

[58]- حیات مجاہد، ص ۳۱۔

،بڑی لڑکی کی شادی جناب محمد اسمٰعیل صاحب محلہ اسلام پور سے ہوئی، باقی دو لڑکیوں کی شادیاں مولانا کے انتقال کے بعد ہوئیں۔

مولانا کے بڑے داماد جناب اسمٰعیل صاحب کا بیان ہے کہ مولانا ریاض احمد بتیاویؒ فرماتے تھے کہ: مولانا خدا بخش میرے ساتھیوں میں تھے ، اور مولانا عبد الشکور آہ مظفرپوری سابق صدر مدرس مدرسہ جامع العلوم مظفر پور بعدہ مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ اور مولانا بشارت کریم گڑھولوی بھی مولانا کے معاصر ورفیق تھے[59]۔۔۔۔جمعیۃ علماء ہند کے قیام میں آپ نے بنیادی رول ادا کیا تھا، آپ جمعیۃ علماء ہند کے اولین قائدین اور بانیوں میں تھے[60]۔

حکیم عبد الغنی صاحب

یہ مولانا عبد الشکور کے حقیقی بھائی ہیں، حکیم تھے، پٹنہ میں مطب کرتے تھے، محلہ لال املی میں اپنا مکان تھا اور اسی میں ان کی رہائش تھی ۱۹۶۰ء م ۱۳۷۹ھ میں انتقال فرمایا، کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی پٹنہ ہی میں ہوئی[61]۔

مولوی محمد سعید صاحب

مولوی محمد سعید صاحب یہ حضرت مولانا عبد الشکور آہ کے سوتیلے بھائی ہیں جو حضرت نصر کے دوسرے محل سے تھے ،دینیات کے علاوہ ایم اے تک تعلیم تھی ،ان کی انگریزی اور ریاضی کی لیاقت اس قدر اعلیٰ تھی کہ بہت کم لوگ ان کی برابری کرسکتے تھے، پٹنہ میں اینگلو مسلم اسکول کے ٹیچر تھے، پٹنہ ہی میں انتقال ہوا، کوئی اولاد نہیں تھی[62]۔

59-کانپور کے زمانہ تعلیم میں معاصر ورفیق تھے ،دیوبند کی فراغت کے لحاظ سے مولانا عبد الشکور ایک سال مقدم ہیں۔

60-جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ، مؤلفہ مولانا حفیظ الرحمن واصف مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی ص ۱۱۴،۱۱۵۔

61-ماخوذ از ڈائری ماسٹر سید محمود حسنؒ۔

مولوی عبدالحمید وکیل صاحب

یہ بھی حضرت مولانا عبدالشکور کے دوسرے سوتیلے بھائی ہیں، انہوں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی، اور مظفرپور ہی میں رہائش اختیار کی، عمر کے آخری حصے میں انہوں نے اپنے بھتیجے حضرت مولانا احمد حسن منوروی ؒ سے روحانی تعلیم حاصل کی ماشاء اللہ بہت اچھی حالت تھی۔

آپ کے نواسے حضرت صوفی سید شاہ منظور الحق صاحب (موتیہاری) ایک صاحب حال اور صاحب دل بزرگ ہیں، موتیہاری میں ان کی مستقل خانقاہ ہے، جہاں واردین وصادرین آپ سے فیض حاصل کرتے ہیں، اس حقیر کو بھی ایک بار آپ کی خانقاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ پر جمالی رنگ غالب ہے، آپ کا آستانہ ہر خاص وعام کے لئے کھلا رہتا ہے۔۔

حضرت مولانا سید شاہ حکیم احمد حسن منوروی ؒ (جو ان کے ماموں ہوتے تھے) سے روحانی تعلیم حاصل کی، اور ان کے مجاز وخلیفہ ہوئے، اپنے پیر کے عاشقوں میں ہیں، اللہ پاک آپ کے فیض کو جاری وساری رکھے، آمین[63]۔

---

[62]۔ماسٹر سید محمود حسن ؒ کی ڈائری۔

[63]۔صوفی سید شاہ منظور الحق صاحب کی ولادت ۲۰ / رمضان ۱۳۵۲ھ مطابق ۶ / جنوری ۱۹۳۴ء کو بتیا شہر محلہ نیا ٹولہ میں ہوئی، والد ماجد کا نام "سید مصباح الحق" ہے، وہ بتیا راج میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے، والدہ ماجدہ کا نام "حسنیٰ خاتون" ہے، یہ مولوی عبدالحمید وکیل کی صاحبزادی تھیں۔۔۔۔۔۔ بتیا ہی میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی، ۱۹۵۵ء مطابق ۱۳۷۴ھ میں زمین کی پیمائش کے محکمہ میں "سرویر" کے پوسٹ پر ملازم سرکار ہوئے، ۴ / رجب المرجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۹ / جنوری ۱۹۹۲ء کو ملازمت سے ریٹائر ہوئے، اور اب اپنی خانقاہ احمدیہ مجددیہ نقشبندیہ کریمیہ میں مستقل مقیم ہیں۔۔۔۔۔۔ اہلیہ محترمہ "شکیلہ خاتون" طویل علالت کے بعد ۳ / رجب المرجب ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۴ / مئی ۲۰۱۲ء میں وفات پاچکی ہیں،

تقریباً ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں اپنے ماموں جان حضرت مولانا حکیم احمد حسن منوروی ؒ سے جناب ادریس وکیل صاحب کی رہائش گاہ پر بیعت ہوئے، اس کا قصہ یہ ہوا کہ: حضرت منوروی ؒ ایک بار اپنے چچا جناب مولوی عبدالحمید وکیل کے یہاں تشریف لائے، جو حلقۂ بیعت میں داخل ہو چکے تھے، صوفی منظور صاحب اس زمانے میں اپنے نانا (مولوی

مولانا شاہ وارث حسن صاحب

کوڑا جہان آباد کے رہنے والے تھے ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اور ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور ایک مدت تک حضرت کی خدمت میں رہ کر خلافت سے سرفراز ہوئے پھر حجاز مقدس تشریف لے گئے، وہاں کچھ عرصہ حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں رہے، حجاز سے واپسی پر کچھ دنوں بنارس میں اور کچھ عرصہ مظفرپور کے مدرسہ میں صدر مدرس رہے، بنارس کے کس مدرسہ میں رہے معلوم نہیں ہے، البتہ مظفرپور میں تو ایک ہی بڑا مدرسہ تھا "جامع العلوم" اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ مدرسہ جامع العلوم میں صدر مدرس رہے۔۔۔ پھر ملازمت ترک کر کے لکھنؤ میں اقامت اختیار کرلی، اور رشد وہدایت میں مشغول ہوگئے، انگریزی داں طبقہ ان سے بہت زیادہ مستفید ہوا، استفادہ کرنے والوں میں جج، وکیل اور بڑے بڑے افسر اور روساء شامل تھے۔

عبدالحمید) کے مکان کے ایک حجرہ میں رہتے تھے، چائے پلانے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی، جب حضرت منورویؒ واپسی کے لئے رکشہ پر بیٹھے اور یہ مصافحہ کے لئے آگے بڑھے تو حضرت نے فرمایا: منظور! سب آتے ہیں، تم کیوں نہیں آکر اپنا حصہ لے لیتے۔۔۔ حضرت کے ارشاد پر وہ ادریس وکیل صاحب کے یہاں حاضر ہوئے، وہاں دیکھا: کہ حضرت تخت پر لیٹے ہیں، باقی احباب کی بڑی تعداد نیچے کارپیٹ پر بیٹھی ہے، یہ بھی نیچے بیٹھنے لگے، مگر حضرت نے اپنے پائتانے میں تخت پر بیٹھنے کا حکم دیا، اور سب سے آپ کا تعارف کرایا کہ: " یہ میرے بھانجے ہیں، ان کو آج ہم کچھ دینا چاہتے ہیں"۔۔۔ پھر آپ نے ان کو بیعت فرمایا اور یہ حضرت کی ہدایات وتعلیمات پر گامزن ہوگئے، چار پانچ سال کی صحبت حاصل رہی، آخر ایک دن حضرت نے فرمایا: "منظور! اگر کوئی اللہ کا نام پوچھے تو بتادینا"۔۔۔ اس طرح حضرت منورویؒ کی اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے،

(یہ معلومات حقیر مرتب کو خود حضرت صوفی سید شاہ منظور الحق صاحب دامت برکاتہم سے حاصل ہوئی ہیں)۔

۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ مطابق ۴ / اگست ۱۹۳۶ء میں وفات پائی، جامع مسجد ٹیلہ شاہ پیر محمد لکھنؤ کے قریب مدفون ہوئے[64]۔

حضرت مولانا نصیر الدین کے مکتوب میں ان کا ذکر بڑی فکر مندی کے ساتھ کیا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"تم نے پہلے لکھا کہ مولوی وارث حسن کی کیفیت جو خدا بخش سے معلوم ہوئی پیچھے لکھوں گا وہ لکھو[65]"

حضرت نصرؔ کا یہ مکتوب ۱۳۱۵ھ کا ہے، اس وقت تک مولانا وارث حسن صاحب دیوبند سے فارغ ہو کر حضرت گنگوہیؒ سے منسلک ہو چکے تھے، اس زمانہ میں وہ بعض روحانی، باطنی یا ذہنی کیفیات سے دوچار ہوئے جن کا تذکرہ پہلے کسی خط میں حضرت آہؔ نے والد ماجد کو لکھا تھا، جن کو سن کر حضرت نصرؒ بے چین ہو گئے تھے، یہ بغیر سابقہ تعلق کے ممکن نہیں، حضرت نصرؔ کی فکر مندی ان کی محبت کی دلیل ہے اور اس میں ان کے خصوص اور رشتۂ تلمذ کی جھلک بھی موجود ہے اور غالباً اسی تعلق کی کشش نے ان کو مدرسہ جامع العلوم مظفر پور کی ملازمت کے لئے آمادہ کیا۔-----

خط کے ایک جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نصر کو ان کی آمد کا انتظار بھی تھا، یہ ان کی شدت محبت کا عکاس ہے، رقمطراز ہیں:

"مولوی وارث حسن آج تک یہاں نہیں آئے ہیں"

آخری عمر میں گو کہ وہ مستقل لکھنؤ کے ہو کر رہ گئے تھے، لیکن اپنے مربی و محبوب

---

[64] مشاہیر علماء دار العلوم دیوبند ص ۴۹ مرتبہ حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ۔ وماہنامہ تجلی، دیوبند دار العلوم دیوبند نمبر ص ۲۳۲ شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء۔

[65] مکتوب نصر ص ۱۔

حضرت نصرؒ کے گھرانے سے اپنے تعلقات استوار رکھے، حضرت آہؔ سے وہ عمر میں بڑے اور فراغت میں متقدم تھے اس لئے حضرت آہؔ ان کا بے حد احترام کرتے تھے،ان کی وفات پر حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ مظفرپوری نے جو تعزیتی نظم لکھی وہ ان کی محبت وعقیدت کا مظہر ہے، اس نظم میں حضرت آہؔ نے ان کی روحانی شخصیت کا بطور خاص ذکر کیا ہے،پوری نظم کلیات آہؔ میں موجود ہے،یہاں اس نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

کہیں کوئی درویش کیا چل بسا — اندھیرا ہوا جس سے سارا زمن

غلط ہو الٰہی جو افواہ ہے — کہ مرشد نہیں زیر چرخ کہن

دعا میں یہ کہتا ہے آہؔ حزیں — خدا سے ملیں شاہ وارث حسن

مکتوب میں مذکور شخصیات کا ذکر-چند اقتباسات

حضرت نصرؔ کے مکتوب میں مولانا بشارت کریمؒ کا ذکر چار جگہ،مولانا عبد الاحدؒ، مولانا خدا بخشؒ اور مولانا وارث حسنؒ کا نام دو جگہ، باقی حضرات کا ایک ایک جگہ آیا ہے۔

ان حضرات کے تعلق سے مکتوب نصرؔ سے کچھ اقتباسات پیش ہیں،جن سے حضرت نصرؔ کے طریقۂ تعلیم وتربیت اور ان کی دردمندی وفکرمندی پر روشنی پڑتی ہے ، اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرد درویش نے خاموشی کے ساتھ ملک وملت کے لئے کیسے کیسے افراد تیار کئے، کہ آج اکثر شاخوں کی اونچائیاں ناپنے والے ان کی جڑوں کی گہرائیوں سے بے خبر ہیں:

"مولوی بشارت کریم اور عبد الاحد سلمہما اللہ کو اللہ سعادت دارین عطا فرماوے-تم نے پہلے لکھا کہ مولوی وارث حسن کی کیفیت جو خدا بخش سے معلوم ہوئی پیچھے لکھوں گا وہ لکھو"

☆"مولوی وارث حسن آج تک یہاں نہیں آئے ہیں"

☆ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"مولوی بشارت کریم صاحب کے واسطے نسخۂ مقوی دل ودماغ یہ ہے"

☆ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"تمہاری والدہ دعائے خیر اور عبد الغنی ومحمد سعید وعبد الحمید تسلیم کہتے ہیں، مولوی حافظ بشارت کریم صاحب اور مولوی عبد الاحد اور خدابخش کو سلام مسنون پہونچے، اور خدا بخش کے سبق کی کیفیت اور مولوی بشارت کریم کے سبق وکتاب کو لکھو، میرے اس خط کو سامنے رکھ کر ہر بات کا جواب لکھو"

☆مکتوب سے تعلیم اور صحت دونوں کے لئے ان کی فکر مندی ظاہر ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

"جو کتاب جس استاذ سے متعلق ہو اس کا نام لکھا کرو اور جو شروع کرو اس کو کم سے کم مقام درس تک پڑھنے کی کوشش کر کے پڑھو، کھانے پینے سونے جاگنے میں، اپنی صحت و تندرستی و قوت کی حفاظت کا خیال ہمیشہ رکھو کبھی غفلت نہ کرو، اس خط کا جواب لفافہ میں بھیجو اور ہر ہفتہ برابر اپنی خیریت اور وہاں کے سبقوں کی کیفیت لکھا کرو کہ میں پریشان نہ ہوں"

☆آپ تعلیمی ہدایات کے ساتھ باطنی اور اخلاقی اصلاحات پر بھی نگاہ رکھتے تھے، دیکھئے کیسی دلسوزی اور خلوص کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

"تم خدا کا بھروسہ رکھو، اور محض اللہ کے واسطے علوم دینیہ میں کمال پیدا کرو، تاکہ ان پر عمل کر کے سعادت دارین حاصل

کرو—اتقیاء اور صلحاء کی صحبت رکھو ، اور اشقیاء اور بے دینوں
سے الگ رہو، اللہ مددگار ہے، یہاں کے اشقیاء سے جب اللہ نے
تم کو الگ کیا ہے تو خدا کا شکر کرو اور ہمیشہ استغفار پڑھو اور تقویٰ
کو معمول کرو، بری صحبت سے نفرت رکھو"

ان اقتباسات میں صرف ایک والد کی نہیں بلکہ معلم، مربی اور مرشد کامل کی بھی پوری عکاسی موجود ہے، اور اتنی سخت نگرانی اور ایک ایک بات پر توجہ، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان سب حضرات کی تعلیم و تربیت کا یہ تسلسل مظفر پور کے زمانۂ قیام ہی سے جاری تھا ـــــ

اگر حضرت نصرؔ کے کچھ اور مکاتیب یا تحریرات دستیاب ہو جاتیں تو تعلیم و تربیت کے مزید گوشے سامنے آتے، اور آپ کے دیگر تلامذہ و منتسبین کا بھی سراغ ملتا، لکن قدر اللہ ماشاء۔

والدہ ماجدہ

حضرت آہؔ کی والدہ ماجدہ بھی انتہائی خدا رسیدہ خاتون تھیں، تقویٰ و روحانیت ان کو اپنے والد حضرت شاہ فرزند علیؒ سے ورثہ میں ملی تھی، ہر طرح انہوں نے صبر و شکر کی زندگی گذاری، اور اپنے پروردگار پر توکل ان کا خاص شعار رہا، باقی تفصیلی حالات کا علم نہیں ہے۔

نانا محترم حضرت سید شاہ فرزند علیؒ

حضرت سید شاہ فرزند علیؒ محلہ سعد پورہ کے رہنے والے تھے، نسباً سادات سے تھے اور وہاں کے امراء میں شمار ہوتے تھے، شہر سے باہر دور دراز تک ان کی زمینات پھیلی ہوئی تھیں، بہت سے ملازمین اور خدام کار میسر تھے، علماء، فضلاء، شعراء اور اصحاب فن ہر طرح کے لوگوں

سے روابط تھے ،اور کاشانہ فرزند گہوارۂ علم وادب بنا ہوا تھا،ان کے شخصی اور تعلیمی احوال کی زیادہ خبر نہیں ہے ،البتہ آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا سید شاہ امیر الحسن قادریؒ اور آپ کے داماد حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؔ کے ذریعہ جس طرح ہندوستان میں علم وفن ، روحانیت وللّٰہیت اور خدمت انسانی کی آبیاری ہوئی اس سے آپ کے مقام بلند اور مقبولیت عند اللہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا امیر الحسن قادریؒ کی خرید کردہ زمین کا قبالہ۔(۲۶/جون ۱۹۱۳ء)

حضرت مولانا سید شاہ امیر الحسن قادریؒ

حضرت سید شاہ فرزند علیؒ کی کئی اولاد تھی ، جن کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی، البتہ حضرت مولانا امیر الحسن قادریؒ آپ کے نامور فرزند ہوئے ہیں ، حضرت امیرؒ کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی، کن اساتذہ اور مشائخ سے انہوں نے اکتساب فیض کیا، یہ سب کچھ پردۂ خفا میں ہے ، بظاہر شاہ فرزند علی ایک نیک صالح رئیس اور امیر و کبیر شخصیت کے مالک تھے ، مگر با قاعدہ عالم دین نہیں تھے، شہر مظفر پور میں اس وقت کوئی قابل ذکر مدرسہ بھی نہیں تھا، اس لئے قدرتی طور پر انہوں نے کہیں باہر جاکر تعلیم حاصل کی ہوگی ،۔۔۔ البتہ روحانی تعلیم کے لئے انہوں نے بانسہ شریف کا انتخاب کیا اور حضرت سید شاہ اسحاق حسینی قادری بانسویؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، اور پھر آپ کے مجاز اور خلیفہ بھی ہوئے۔

سلسلۂ بانسہ سے وابستگی

بانسہ شریف سے ان کا عشق دیدنی تھا، اپنے آپ کو پیر کی محبت میں فنا کر دیا تھا، اپنی تمام آرزوئیں اور نیک خواہشات بانسہ شریف کی چوکھٹ پہ قربان کر دی تھیں، یہاں کی روحانی تجلیات کے وہ ایسے اسیر تھے کہ دنیا کے ہر منظر میں ان کو ایک ہی جلوہ نظر آتا تھا، اس کا اندازہ ان کے منظوم خراج عقیدت اور اس "بارہ ماسہ " سے ہوتا ہے جو انہوں نے ہندی، اردو اور علاقائی زبانوں کی ترکیب سے تیار کی تھی ، اس میں ان کی ہر آرزو کی تان بانسہ شریف پر جاکر ٹوٹتی ہے، اپنے پیر طریق کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

ہے پی میرا حسینی شاہ اسحاقؒ

میرا کعبہ ہے اس کا ابروئے طاق

مٹادے گا وہی ہستی کا ساماں

پھر ہو گا جلوہ گر خود ماہ تاباں

امیرؔ اب ختم کر غم کی کہانی

رہے گی تیری دائم یہ نشانی

کچے دھاگے میں بندھے آئیں گے سرکار چلے

☆جب تک حیات سے رہے، باصحت رہے، ہر سال بانسہ شریف حاضری دیتے تھے، حالات خواہ کیسے ہی ہوں، عشق ان کی رہبری کرتا تھا، ایک بار کا ذکر ہے کہ صلحا بزرگ سے بانسہ کے لئے روانہ ہوئے، قریبی ریلوے اسٹیشن حسن پور روڈ پہونچے، آپ کے شریک سفر آپ کے تلمیذ جناب مولوی محمد عابد حسین صاحب ؒ (موضع منور ضلع سہرسہ بہار) تھے، ان سے آپ نے فرمایا کہ بارہ بنکی اسٹیشن کا ٹکٹ بنوا کر لے آؤ، اس زمانے میں ہاتھ سے ہی ٹکٹ بنتا تھا، مولوی عابد صاحب ٹکٹ لینے کے لئے ٹکٹ ماسٹر کے پاس پہونچے، وہ اپنی بات ٹکٹ ماسٹر کو سمجھا نہیں سکے اس نے کہا: کہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے حضرت ہی کو بلا کر لے آؤ تاکہ میں اچھی طرح سمجھ کر ٹکٹ کاٹ دوں، مولوی عابد صاحب نے حضرت سے آکر عرض کیا کہ: "آپ کو بڑے بابو بلارہے ہیں"۔۔۔۔

"بڑے بابو" کا لفظ سن کر آپ پر جذب طاری ہو گیا، فرمایا:

"بڑے بابو بلارہے ہیں؟ کون بڑے بابو؟ بڑے بابو تو بس ایک ہی ہیں، چلو!

جب بلایا ہے تو چلتے ہیں، دیر کس بات کی؟"

پھر پیدل ہی روانہ ہوگئے، پاپیادہ سمستی پور پہونچے، مولوی عابد صاحب بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے، ہمت نہیں کہ کچھ عرض کر سکیں، سمستی پور کی منزل بھی گذر گئی، اور

بڑے بابو کے بلاوے پر ان کا سفر جاری رہا، یہاں تک کہ بانسہ شریف پاپیادہ پہونچ گئے ، وہاں پہونچے، کچھ قرار آیا:

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

اور کچھ ہوش وحواس بحال ہوئے تو مولوی عابد صاحب نے ہمت کر کے عرض کیا کہ:

"حضرت! آپ نے تو تھکا دیا، آپ نے ٹکٹ لانے کے لئے بھیجا تھا اور پیدل ہی چل پڑے"

حضرت نے فرمایا:

"مگر تم ہی نے تو کہا تھا کہ بڑے بابو بلا رہے ہیں، تو جب ان کا بلاوا آ گیا تو ہم کس طرح رک سکتے تھے جس حال میں تھے چل پڑے اور آ کر قدموں پہ گر پڑے"

مولوی عابد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! بڑے بابو ٹکٹ ماسٹر کو کہتے ہیں،

حضرت نے فرمایا:

"استغفر اللہ، میں کیا جانوں ٹکٹ ماسٹر کو، "بڑے بابو" تو صرف سرکار بانسہ ہیں، میں تو سمجھا کہ وہی بلا رہے ہیں، پھر مجھے ہوش ہی نہیں رہا اور سرکار کی محبت کے دھاگے میں بندھے چلے آئے۔

سبحان اللہ! کیا شان ہے اس عشق و وارفتگی کی، دور جدید میں اس کی مثال تو کیا اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے[66]۔

---

[66] یہ واقعہ میرے والد ماجد نے جناب مولوی طالب حسین شاہ صاحب (موضع سکھاسن ضلع سستی پور بہار) کے حوالے سے بیان فرمایا، یہ منور ہی کے رہنے والے تھے اور مولوی عابد حسین صاحب کے شاگرد رشید تھے، منور سے سکھاسن آکر آباد ہو گئے تھے اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ انہوں نے یہ قصہ اپنے استاذ سے ہی سنا ہو گا۔

مولوی طالب حسین بڑے نیک، دیندار، فارسی زبان کے ماہر، صوفیانہ مسلک ومشرب کے حامل، متواضعانہ روش رکھنے والے، اخلاق ومحبت کے پیکر، ہر قالب میں اپنے کوڈھالنے کی صلاحیت رکھنے والے اور جہانیاں جہاں گشت انسان تھے، بڑے بزرگوں کی زیارت وصحبت سے مشرف تھے، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ، حضرت مولانا الحاج حکیم احمد حسن منورویؒ سب کی زیارت سے فیضیاب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، والد صاحب سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن بزرگوں کی طرح احترام کرتے تھے، صحبت میں باادب بیٹھتے تھے، بلکہ ہمارے گھر کے ہر چھوٹے بڑے کا احترام کرتے تھے اور شفقت فرماتے تھے، میرے فارسی کے استاذ تھے، ہمارے گھر کے بچوں کے لئے وہ ایک طرح سے اتالیق تھے، والد صاحب کی غیر موجودگی میں وہ ہمیں سبق یاد کرایا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔

دل میں گداز اور لہجہ میں سوز تھا، ہزاروں فارسی اشعار نوک زبان تھے، اور نہایت خوش گلو تھے، سماع اور قیام کے قائل تھے، اکثر جب مجلس میں بعد نماز مغرب ہوتے تو سماع کے نام پر فارسی یا اردو کلام سناتے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، میری شادی (موضع لادہ کپسیا ضلع سمستی پور) کے موقعہ پر بھی انہوں نے ایک یادگار سہرا پڑھا تھا، بہت ضعیف ہوچکے تھے، لیکن آواز میں وہی تان تھی، پورا مجمع جھوم رہا تھا۔۔۔۔۔۔ایک بار جلکوڑہ ضلع کھگڑیا بہار میں حاجی ابراہیم صاحب مرحوم کے صاحبزادہ جناب طفیل احمد مرحوم کی شادی کے موقعہ پر ان کی شاعری اور گلوکاری کی دھن شروع ہوئی تو مجلس شادی مجلس منقبت میں تبدیل ہوگئی۔۔۔ آواز اور انداز پر اتنی قدرت رکھنے والا خوش ترنم اور بوڑھا گلوکار میں نے نہیں دیکھا، وہ ڈاکٹری بھی کرتے تھے، اور ہومیوپیتھ کی کچھ دوائیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، ہم لوگ مٹھائی سمجھ کر ان سے دوا کا مطالبہ کرتے تھے، اور وہ اپنی جھولی کے تحفظ کے لئے فکر مند رہتے تھے۔۔۔۔۔۔

میں نے کبھی ان کو غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا، روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رلانا ان کی چٹکیوں کا کھیل تھا، وہ ہر وقت گشت پر ہوتے تھے، اس لئے ہر علاقے کی تازہ خبر ان کے پاس ہوتی تھی، وہ فون اور موبائل کا زمانہ نہیں تھا، اور نہ سواریاں ہر جگہ کے لئے میسر تھیں، مگر وہ اکثر پاپیادہ سفر کرتے تھے، پوری زندگی سفر ہی میں گذاردی، گھر میں بیوی بچے سب تھے، مگر شب دوشب سے زیادہ اقامت کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔۔۔۔۔۔ دبلے پتلے ہڈیوں کا ڈھانچہ، لیکن ان ہڈیوں میں استادم تھا کہ ہر وقت کاندھے پر کوئی نہ کوئی بوجھ لادے ہوئے نظر آتے تھے،

تقریباً ۱۹۹۳ء میں ان کا انتقال ہوا، اور سکھاسن کے قبرستان میں مدفون ہوئے میرے والد مکرم نے جنازہ کی نماز پڑھائی، جنازہ میں اتنا ہجوم تھا کہ کم ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔

مرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ مسافر فقیر محبوب خدا بھی ہے اور محبوب خلائق بھی، آج برسوں بیت گئے لیکن ان کا ایک ایک نقش میرے ذہن ودماغ پر تازہ ہے، ان کی یاد میرے قلب وجگر میں ایک حلاوت بخش حرارت پیدا کرتی ہے، اور اس بھری دنیا میں مجھے کوئی دوسرا طالب حسین نظر نہیں آتا، جس نے سب سے محبت کی ہو، جس کی لغت

سلسلۂ بانسہ

حضرت سید شاہ اسحاق حسینی بانسویؒ کا سلسلہ قادریہ ہے اور یہ حضرت سید شاہ عبدالرزاق بے کمر بانسویؒ (متوفیٰ ۵/ شوال المکرم ۱۱۳۶ھ م ۶/ جولائی ۱۷۲۴ء)[67] کے واسطے

حیات میں نفرت وغصہ کے الفاظ ہی موجود نہ ہوں، نہ وہ کمالات، نہ انسانیت سے پیار، نہ وہ رشتوں کی پہچان سب کچھ وہ اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

[676767] ۔حضرت سید شاہ عبدالرزاق بے کمر بانسویؒ سلسلۂ قادریہ کے اکابر مشائخ میں گذرے ہیں، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی عبدالرحیم ہے، حسینی سادات سے ہیں، آپ اپنے والد کے تیسرے فرزند ہیں، ولادت عہد شاہجہانی ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء میں (تقریباً۔عمر کے بارے میں اختلافات کے پیش نظر) موضع رسول پور متصل موضع محمود آباد (مضافات قصبہ دریاباد ضلع بارہ بنکی) میں ہوئی، والدین کی وفات کے بعد اپنے نانیہال بانسہ شریف میں بود و باش اختیار کی، جہاں ترکہ میں کچھ زمینداری ان کی والدہ کے حصے میں آئی تھی، آپ کے چھوٹے بھائی سید محمد یسین اپنے دادیہال رسول پور ہی میں رہے، جہاں ان کے والد کی زمینداری تھی، آپ کا گھرانہ علمی یا روحانی گھرانہ نہیں تھا، اور نہ آپ کے آباء واجداد میں کسی کو روحانیت سے کوئی رابطہ تھا، زمیندارانہ ماحول تھا، کبھی علاقے کے بڑے زمینداروں اور کبھی سرکاری اہلکاروں سے آویزشیں بھی رہا کرتی تھیں، ظاہر ہے کہ اس ماحول میں بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف دھیان دینا بہت مشکل امر تھا، اسی لئے آپ کے پوتے شاہ غلام حسن رزاقی رودولوی کا بیان ہے کہ:

"حضرت سید صاحب نے قرآن شریف سورۃ الہاکم التکاثر (پارۂ عم) تک بس پڑھا تھا۔

الغرض اسی دنیاوی ماحول میں آپ نے قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم گاؤں رسول پور کے مقامی مکتب میں حاصل کی، بقیہ تعلیم کے لئے "رودولی شریف" (ضلع بارہ بنکی۔رسول پور سے چودہ (۱۴) کوس کی دوری پر واقع ہے) کا سفر کیا، جو آپ کی معتبر سوانح کے مطابق تعلیم سے زیادہ خاندان کے دشمنوں سے آپ کی حفاظت کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔آپ کے والد نے ایک خادم ساتھ کر دیا تھا ابھی راستے ہی میں تھے کہ رجال غیب میں سے ایک شخصیت نمودار ہوئی، جن کا اسم گرامی معتبر تذکروں کے مطابق شاہ عنایت اللہ سیاح تھا، انہوں نے دریافت کیا کہ تمہارے ہاتھ میں کون سی کتاب ہے؟ ان کے ہاتھ میں اس وقت "یوسف زلیخا" تھی، انہوں نے کتاب کا نام بتایا، اس غیبی شخصیت نے کہا کہ تم کو اس سے کیا کہ یوسف کا معاملہ کیا تھا اور زلیخا کا حال کیسا تھا؟۔۔۔۔

سید صاحب درویش کے چلے جانے کے بعد ملازم کے ہمراہ گھر واپس آگئے، مگر اس شخصیت کے جلوں اور تھوڑی دیر کی مصاحبت کا اثر ان پر باقی رہا؟(تذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی ص ۴۰ تا ۵۴ مرتبہ محمد رضا انصاری)

کچھ دنوں کے بعد ان کے قلب میں تصوف واحسان کا رجحان بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا، اور وہ کسی مرد کامل کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے، اسی درمیان معاشی مقاصد کے تحت انہوں نے دکن کا سفر اختیار کیا، اور وہاں سات سال مقیم رہ کر بانسہ واپس ہوئے، پھر شادی کی، کچھ دنوں کے بعد احمد آباد گجرات کا سفر کیا، وہاں ایک بزرگ حضرت سید عبدالصمدؒ (خدانما) سے ملاقات ہوئی، ان سے بیعت ہوگئے، اور طریقۂ صوفیا کی تعلیم حاصل کی اور مشرف بخلافت ہو کر بانسہ تشریف لائے، اور یہاں اپنی مسند ارشاد قائم کی۔

بڑے صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، اس لئے خلق خدا کا کافی رجوع ہوا، متعدد اکابر علماء بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مثلاً ملا نظام الدین بن قطب الدین سہالویؒ (بانی درس نظامی)، مولانا محمد رضا، شیخ احمد عبدالحق، شیخ کمال الدین بن محمد دولت فتحپوری اور شیخ اسماعیل بن ابراہیم الحسینی البلگرامی وغیرہ،

آپ کی وفات اٹھاسی (۸۸) سال کی عمر میں (علیٰ اختلاف الروایت) ۵/شوال المکرم ۱۱۳۶ھ م ۶/جولائی ۱۷۲۴ء کو محمد شاہ دہلوی کے عہد حکومت میں ہوئی، اور بانسہ ہی میں مدفون ہوئے (الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام للعلامۃ السید عبدالحی بن فخرالدین الحسنی (متوفی ۱۳۴۱ھ م ۱۹۲۳ء) ج ۶ ص ۴۷۶ ط دار ابن حزم بیروت ۱۴۲۰ھ م ۱۹۹۹ء۔ وتذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی ص ۴۰ تا ۵۴ مرتبہ محمد رضا انصاری)

آپ کو "بے کمر" آپ کی ایک مشہور کرامت کی بنا پر کہا جاتا ہے، جس کا ذکر آپ کے اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، آپ کے سب سے معتبر اور مشہور مرید وخلیفہ حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ بانی درس نظامی تحریر فرماتے ہیں:

> "ایک عالم دین کی مجلس میں معجزات زیر بحث تھے، اس معجزے پر جو حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہراؓ سے (صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کی سماعت کے ذریعہ) منقول ہے کہ:
> حضرت بی بی فاطمہؓ نے مشاہدہ فرمایا کہ پیغمبر خدا صلوات اللہ علیہ وآلہ کی چادر مبارک پیچھے سے سامنے کھینچتے تو جسم اطہر حائل نہ ہوتا، بلا تکلف ایک طرف سے دوسری طرف چلی آتی، لوگ حیرت کا اظہار کر رہے تھے، (یقین نہیں کر رہے تھے) حضرت شیخ قدس سرہ الاصفیٰ نے (حضرت سید صاحبؒ نے جو اس محفل میں تشریف فرما تھے) فرمایا:
> "حضرت رسول خدا صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الطاہرین کے فیض سے آج بھی آپ کی امانت کے حاملین سے جو آپ کے باطنی خلفاء ہیں ایسا ہونا ممکن ہے، پھر فرمایا کھینچو میری چادر! لوگوں نے (حضرت کی کمر میں لپٹی چادر کو) کھینچا اور ایسا ہی انہوں نے پایا۔

چادر کے دونوں سرے کو لوگوں نے پکڑ کر کھینچا اندام مبارک رکاوٹ ثابت نہیں ہوا

(مناقب ۵۲،۵۳)

یہ واقعہ کہاں اور کس پس منظر میں پیش آیا ملا صاحب ؒ نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن "کرامات رزاقیہ" میں یہ واقعہ تھوڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے:

"حضرت موہان (ضلع اناؤ) میں تشریف رکھتے تھے، ندی کے کنارے پر (سئی ندی پر حسب صراحت ملفوظ رزاقی) وضو کر رہے تھے، کہ اتنے میں حضرت کو الہام ہوا، کہ امت محمد ﷺ میں ایک شخص معجزۂ پیغمبر کا انکار کرتا تھا، اس سبب سے اس کا ایمان تلف ہو سکتا ہے، جاؤ اور اس کے ایمان کی حفاظت کرو۔

حضرت بموجب حکم کے وہاں تشریف لے گئے، ابوالفتح (ایک عالم دین ساکن قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ) ایک طالب علم کو پڑھاتے تھے، حضرت مولوی سے ملے، اور ان کی مجلس سے علیحدہ بیٹھ گئے، اور مولوی اس طالب علم کو حدیث پڑھانے لگے، اور اس کے معنٰی کئے (ارواحنا اجسادنا و اجسادنا ارواحنا) کہ جسد (جسم) میرا مثال روح کے ہے۔۔۔۔ تو اس طالب علم نے کہا: جسد اور گوشت اور پوست تو یہی آنجناب میں تھا اور روح منزہ چیز ہے، جسد اس کے برابر نہیں۔۔۔۔

حضرت نے فرمایا: میاں طالب علم! جس طرح مولوی کہتے ہیں اسی طرح ہے، کہ ذات پیغمبر ایسی ہو گذری ہے، کہ بیان سے باہر ہے،

طالب علم نے کہا: میاں سپاہی! تم اپنی سپاہ گری کی باتیں کرو،

حضرت چپ رہے، پھر مولوی اس کو سمجھانے لگے،

حضرت نے پھر فرمایا: میاں طالب علم! جو مولوی کہتے ہیں، سچ ہے،

پھر اس نے وہی جواب دیا۔۔۔ پھر اس کو مولوی پڑھانے لگے، پھر وہ طالب علم وہی کہتا۔

تب حضرت نے فرمایا: میاں طالب علم! ان کی توجہ سے ان کی امت میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ ان کا جسد اور روح یکساں ہے۔

طالب علم نے کہا: تم بھی ان کی امت میں ہو، تمہارا جسد و روح یکساں ہے؟

حضرت نے فرمایا: ہاں! ان کی توجہ سے ہمارا جسد اور روح برابر ہے۔

تو وہ طالب علم اٹھا، حضرت کی چادر جو گوٹ (کمر، پنڈلیوں اور بازو کے اوپر ڈالے) مارے بیٹھے تھے، کھینچ لی، (اور بے روک نکل آئی)

سے حضرت قطب العالم پیران پیر شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ (۵۶۱ھ م ۱۱۶۶ء مزار شریف بغداد) تک پہونچتا ہے، اس سلسلے میں جذب اور حال و قال بہت ہے، عشق و محبت کی بھی بے پناہ فراوانی ہے، اس سلسلے کے اکثر صوفیاء پر فنائیت کا غلبہ ہوتا ہے، دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے قطعی بے تعلق ہوتے ہیں، نہ انہیں دنیا بننے کی فکر اور نہ بگڑنے کا غم، جو میسر ہے اسی پر شاکر وصابر رہتے ہیں، ان سے کشف و کرامات کا صدور بھی بکثرت ہوتا ہے، جس کی وجہ سے خلائق کا رجوع بڑھ جاتا ہے، اور فیض عام شروع ہو جاتا ہے، اور ہر مذہب وملت کے لوگ رجوع ہوتے ہیں اور اپنی مراد پاتے ہیں۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو۔۔۔

حضرت مولانا سید شاہ امیر الحسنؒ اس کی زندہ مثال تھے، حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے تخت طاؤس چھوڑا تھا، انہوں نے اپنا گھر بار سیکڑوں بیگھہ اراضی، نوکر چاکر اور بھرا پرا خاندان چھوڑ دیا، اور ساری زندگی مسافرانہ گذاری۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو بخش دی روشنی زمانے کو

آپ پر دنیا بیزاری اور جذبی کیفیت غالب تھی، اپنا گھر مکان، جائیداد اور زمینداری

اس کے جی میں آیا کہ خدا جانے انہوں نے کس طرح چادر ڈالی ہوگی، تب حضرت نے فرمایا: تمہارے جی میں شبہ ہوگا، تم اپنی چادر ڈالو اور کھینچو،

اس نے اپنی چادر ڈالی اور کھینچی چادر نکل آئی تو طالب علم کو یقین ہو گیا۔۔۔۔۔

مولوی ابو الفتح اٹھے اور پکار کے کہا، جس کو مرید ہونا ہو سو ہوے، پھر ایسا شخص نہیں ملے گا، اور میں خیر آباد کے رہنے والے قطبی میاں ہیں، ان سے بیعت کر چکا ہوں، مگر پیر ارشاد کا ان کو کروں گا۔

۔۔۔ اور اپنے گھر گئے اور اپنے بیٹے کو لے آئے اور مرید کرا دیا"

(تذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی ص ۱۵۰ تا ۱۵۲ بحوالہ کرامات رزاقیہ ص ۲۵، ۲۶ نواب محمد خاں شاہجہاں پوری، مطبع مرقع عالم ہردوئی ۱۳۱۹ھ)

سب کچھ اپنے بھائی بہنوں کے لئے چھوڑدی اور پوری زندگی شہر شہر ، قریہ قریہ اور صحرا صحرا فقیرانہ گذاردی ، حضرت شاہ فرزند علیؒ کے وصال کے بعد خاندان کے دوسرے لوگوں نے موروثی زمینیں اور جاگیریں سنبھالیں اور یہ مرد درویش اپنے غم کی دنیا آباد کرتا رہا، خلق خدا میں عشق و محبت کی سوغات بانٹتا رہا، گھر مکان کے وارثوں کو دنیائے فانی کی حقیقت سے آشنا کرتا رہا ،بقول شاعر

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق

او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

انہوں نے زندگی کا وہ راز پالیا تھا جس کے سامنے زندگی کی ساری رعنائیاں بے لطف ہوچکی تھیں ، انہوں نے کہیں مستقل ٹھکانہ نہیں بنایا، مختلف علاقوں میں وہاں کی دینی ضرورت کے مطابق قیام کیا، اور ضروری اسباب زندگی بھی اختیار کئے، تاکہ دوسروں پر بار نہ بنیں، اور اہل وعیال کی کفالت بھی ہوسکے ،۔۔۔۔ مگر پھر اچانک اس طرح وہاں سے رخصت ہوجاتے جیسے کہ کمان کٹ چکی ہو، پھر کسی نئی منزل کا سفر شروع ہوجاتا تھا۔

ان میں یہ کیفیت ایک تو سلسلۂ بانسہ کا فیض تھا، دوسرے بعض اتفاقی حادثات نے نظام زندگی کو درہم برہم کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا، اکلوتے جواں سال بیٹے کی موت نے جذب کی کیفیت کو انتہاتک پہونچادیا تھا ۔۔۔۔۔

اہلیہ محترمہ بھی جوانی میں ہی آخرت کو سدھار چکی تھیں ۔۔۔۔

صلحا منور وا میں ورود مسعود

نہیں معلوم وہ کون سی مبارک ساعت تھی جب اس بے وطن مسافر نے اصلاح اور خدمت دین کی نسبت سے اس علاقہ میں ورود فرمایا جہاں ہم جیسے بدنام کنندۂ نیکونام پیدا ہوئے

والے تھے، نہ معلوم کس طرح اور کہاں کہاں سے گذرتے ہوئے یہاں تشریف لائے، نہ اسباب کا پتہ ہے اور نہ صحیح تاریخ کا۔۔۔بس عشق کی مستی اور محبت الٰہی کی آتش جوالہ تھی جو ان کی طبیعت کو سیماب کیئے رکھتی تھی۔۔۔۔۔

کبھی اِن کا در، کبھی اُن کا در کبھی در بدر
غمِ عاشقی ترا شکریہ میں کہاں کہاں سے گذر گیا

آپ نے اس علاقہ میں اپنی ضروریات کے لئے کچھ زمینیں خریدی تھیں ان میں ایک قدیم ترین قبالہ ۲۶/جون ۱۹۱۳ء (۲۲/رجب المرجب ۱۳۳۱ھ) کا ہے، اس میں آپ نے اپنی سکونت "سلہا بزرگ[68]" تحریر فرمائی ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس سے قبل آپ اس علاقے میں تشریف لے آئے تھے[69]۔

---

68 ۔"سلہابزرگ" کا اصل نام یہی ہے، بعد میں ان بزرگوں کی آمد کی برکت سے یہاں کے کچھ اہل شعور نے لفظی ترمیم کرکے اس کو "صلحابزرگ" بنادیا، اس خاک کی سرشت میں صلاح ودینداری ہے، یہ غیور مسلمانوں کی بستی ہے، یہاں کے لوگ سب کچھ برداشت کرسکتے ہیں، لیکن اپنی غیرت قومی سے سمجھوتا نہیں کرسکتے، یہ سب انہی بزرگوں کے فقر غیور کا فیض اور انہی کے خون جگر کا کرشمہ ہے۔

لیکن اب وہ پہلے والی بات باقی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ سمجھ نصیب فرمائے آمین۔

69 یہ تو صرف ایک زمین کا قبالہ ہے جو آپ کے نواسے حضرت منورویؒ کے وصال کے بعد تک ہمارے خاندان کی ملکیت میں رہی ہے، اس کے علاوہ اور زمینات کب خریدیں؟ سب سے اول زمین کون سی تھی؟ اور یہاں تشریف آوری کے کتنے عرصے کے بعد آپ نے زمینوں کی خرید کی طرف توجہ کی؟ ان میں سے کسی سوال کا جواب ملنا مشکل ہے، البتہ ان کی جذبی کیفیت اور فقیرانہ حالت کو دیکھتے ہوئے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں مستقل اقامت کے ارادے سے تو نہیں آئے تھے، کہ آتے ہی زمینیں خریدنی شروع کردیتے، وہ تو ایک مرشد روحانی کی حیثیت سے غیبی اشاروں کے تحت روئے زمین کا سفر کرتے تھے، کب ان کی کمان کٹ جائے یہ خود ان کو بھی معلوم نہیں ہوتا تھا، اس لئے یہاں آنے کے بعد بھی ان کا ارادہ زمینوں کے حصول کا بالکل نہیں ہوگا، اہلیہ محترمہ پہلے ہی داغ مفارقت دے چکی تھیں، بیٹا جواں سالی میں پڑھنے کے دوران ہی فوت ہوچکا تھا، بڑی بیٹی "بی حلیمہ خاتون" آپ کے بھانجے مولانا عبدالشکورؒ سے شادی ہوکر سسرال میں بس

پورے خطہ کے معلم و مرشد

یہاں آپ نے ظاہری طور پر معلمی کا پیشہ اختیار کیا، اور اسی کے ساتھ رشد وہدایت اور روحانی تعلیمات کا سلسلہ بھی جاری رہا، تقریباً پندرہ (۱۵) سال آپ اس علاقے میں مقیم رہے ، جس میں آخری تین سال آپ کا قیام "منورواخیرا[70]" میں رہا، اس دوران پورے خطے میں آپ نے احیاء دین کی لہر پیدا کردی اور ایک علمی ورحانی انقلاب برپا کردیا۔۔۔۔

آپ کی شخصیت سراپا فنائیت وروحانیت اور ایثار واخلاص اور جاذبیت و تاثیر کا مرقع تھی ، آپ کے نفوس قدسیہ کی بدولت اس علاقے میں علماء اور اصحاب تقویٰ کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی ، آج اس پورے خطہ میں علم وروحانیت کی جو بہار نظر آتی ہے وہ سب اسی مرد درویش کے خون جگر کا کرشمہ ہے [71]۔

رہی تھیں ، ایک کنواری بیٹی تھی ، اس کو بھی اپنی بہن اور بیٹی کے پاس چھوڑ آئے تھے ، کہ جب شادی کے لائق ہوگی شادی کردی جائے گی ، ان حالات میں ظاہر ہے کہ کسی درویش صفت انسان کو زمین وغیرہ کی کیا حاجت ہوسکتی تھی ، ۔۔۔۔

لیکن جب بڑی بیٹی کا معاملہ اپنے شوہر کے ساتھ کشیدہ رہنے لگا ، اور مولانا عبدالشکور نے بالآخر (تقریباً ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں) دوسری شادی کرلی ، اور دونوں بیٹیوں کا بہن کے گھر میں رہنا نگونہ مشکل ہوگیا تو ان کو زمینوں کی خرید کا خیال پیدا ہوا ، جہاں ان بچوں کو باشارۂ غیبی آباد کیا جاسکے ۔۔۔۔

حضرت امیرؒ کا قیام صلحابزرگ میں تقریباً بارہ (۱۲) سال اور آخر میں تین (۳) سال منورواشریف میں رہا ، اور اس علاقے سے آپ کی ہجرت تقریباً ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں ہوئی ہے ، اس لحاظ سے اس خطہ میں آپ کی تشریف آوری کا سن تقریباً ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء بنتا ہے ، واللہ اعلم بالصواب۔

70۔ منوروا کا اصل نام یہی ہے ، بعد میں جد امجد قطب الہند حضرت مولانا سید شاہ حکیم احمد حسنؒ کی برکت سے اس کی شہرت "منورواشریف" کے نام سے ہوئی۔

71۔ آپ کے تلامذہ میں جناب حاجی بدھو صاحب اور حاجی اسحاق امین صاحب (منورواشریف) ، مولوی عابد صاحب (منور ضلع سہرسہ) ، جناب حاجی جمیل احمد صاحب (صلحابزرگ وفات ۲۷ / مارچ ۱۹۹۰ء) ، جناب حاجی غلام حسین صاحب ، سابق مکھیا صلحا پنچایت (صلحابزرگ) ، مولوی حنیف صاحب (بردونی ، ضلع سستی پور) اور حنیف صاحب ٹھٹھروا ضلع سستی پور)

یوں آپ کے علم وروحانیت کی سب سے بڑی یادگار آپ کے نواسے حضرت قطب الہند مولانا سید شاہ حکیم احمد حسن منورویؒ کی شخصیت تھی جو آپ کے جملہ کمالات علمیہ وعملیہ کے کامل نمونہ تھے۔

رعب وجلال

آپ کی زبان مبارک بڑی باتاثیر اور پُر اجابت تھی، زبان مبارک سے جو نکلتا وہ رونما ہو جاتا تھا، رعب وجلال آپ کا مشہور تھا، جلال میں ہوتے تو بڑے بڑے رؤساء واعیان سامنے آنے سے گھبراتے تھے، جذبی کیفیت طاری ہوتی، تو کسی کو نہ پہچانتے تھے ،اس کی وجہ سے یہاں کے لوگ اپنی مقامی زبان میں آپ کو پیار سے "بتھو مولی صاحب "کہتے تھے۔یعنی مجذوب مولانا۔

صلحابزرگ قدیم زمانہ میں رؤساء، امراء اور اہل دانش کی بستی تھی، جھکنا ان کے مزاج کے خلاف تھا، لیکن دینی عقیدت نے ان کو نرم کر دیا تھا، کیا مجال تھی کہ حضرت کی کسی بات کا انکار کر دیں، اس زمانے کے کئی قصے آج بھی ورد زبان ہیں، مثلاً:

جاؤ! تم بھول گئے تو ہم بھی بھول گئے

☆صلحابزرگ کے ایک رئیس ــــــ حضرت سے وابستہ تھے، ان کو کوئی اولاد نہیں تھی حضرت کی دعا سے اللہ پاک نے اولاد عطا فرمائی ،اس سے ان کی عقیدت دوچند ہوگئی ــــ ایک دن حضرت کے گھر میں چولہا جلانے کے لئے لکڑی نہیں تھی، اتفاق سے یہ صاحب آگئے ،انہوں نے کہا کہ حضرت !میرے یہاں جلاون کی کمی نہیں ہے، میں ابھی بھیجتا ہوں، لیکن

وغیرہ قابل ذکر ہیں، مریدین کی تعداد بھی بہت تھی، مگر ان کے نام معلوم نہیں ہوسکے، تلامذہ چونکہ چھوٹی عمر کے ہوتے ہیں اس لئے چند کے نام معلوم ہو پائے۔

گھر پہونچنے کے بعد وہ دوسرے کاموں میں لگ گئے، جلاون بھیجنا یاد نہ رہا۔۔۔۔۔۔ اور حضرت کے گھر میں شام کا کھانا نہیں پک سکا، خیر کسی طرح گذر اوقات ہوئی، حضرت کو سخت ملال ہوا، ۔۔۔۔۔۔ دراصل حضرت ان سے جتنی محبت رکھتے تھے اس کی بنا پر ان کو ہرگز توقع نہ تھی کہ کھانا جیسے حساس مسئلے میں وہ ایسی لاپرواہی برتیں گے، ملاقات پر حضرت نے دریافت فرمایا: توانہوں نے کہا کہ: حضرت! میں تو بھول ہی گیا تھا۔۔۔۔۔۔

حضرت نے رنج کے ساتھ فرمایا کہ: "جاؤ! تم بھول گئے تو ہم بھی بھول گئے"۔۔

تکلیف بھولنے پر نہیں لاپرواہی پر ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔

بزرگوں کی زبان ننگی تلوار ہوتی ہے مگر وہ بیچارے حضرت کی اشاراتی زبان کیا سمجھتے۔۔۔۔۔۔

حضرت تو کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئے، لیکن حضرت کے ساتھ ہی رئیس صاحب کی زندگی کی ساری بہار بھی رخصت ہو گئی، اس کے بعد ان کے یہاں کوئی دوسری اولاد پیدا نہیں ہوئی، اور ایک صاحبزادے جو حضرت کی دعا سے پیدا ہوئے تھے، آئندہ زندگی میں وہ بھی لاولد رہے، البتہ بچپن میں وہ حضرت کے شاگرد رہ چکے تھے، اور حضرت کی دعائیں بھی حاصل ہوئی تھیں، اس لئے علم وفضل میں وہ صاحب مقام ہوئے، اور علاقہ میں ان سے علمی ودینی فیوض بھی پہونچے، لیکن ان کی نسل منقطع ہو گئی اور پوری جائیداد دوسروں کے ہاتھ لگ گئی۔

محرم میں تعزیہ داری

حضرت امیرؒ پر گو کہ غلبۂ حال رہتا تھا لیکن شرعی مسائل میں اس کا اثر ظاہر نہ ہوتا تھا، مثلاً: محرم میں تعزیہ داری کے وہ خلاف تھے، اور عام بیانات میں لوگوں کو اس سے سختی کے ساتھ

روکتے تھے۔۔۔۔ لیکن محرم کے دنوں میں خود ان کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جب دسویں تاریخ آتی وہ اپنے قابو میں نہ رہتے، گھر کے آنگن میں ایک چھوٹا سا تعزیہ تیار فرماتے، اور پوری شب چاندنی رات میں اس کو سامنے رکھ کر نہایت محویت واستغراق کے عالم میں بیٹھے رہتے۔۔ مگر دوسروں سے اپنے اس حال کا اخفا فرماتے تھے۔۔ لیکن عشق راز میں کہاں رہ سکتا تھا ۔۔ایک بار اتفاق سے اسی شب کچھ علماء ملنے کے لئے حاضر ہوئے، غالباً ان لوگوں کو حضرت کی اس حالت کی خبر ملی تھی۔۔۔۔

حضرت سکر اور محویت کے عالم میں بیٹھے تھے،۔۔۔۔۔۔

علماء نے دریافت کیا کہ: حضرت! تعزیہ بنانا کیسا ہے؟

حضرت کی زبان حق ترجمان سے صادر ہوا کہ: "جائز نہیں ہے"۔۔۔۔۔

ان لوگوں نے عرض کیا، حضرت! پھر آپ کا یہ عمل؟۔۔۔۔ حضرت نے ان کو ٹالنا چاہا لیکن وہ جواب لینے پر مصر تھے۔۔۔۔۔۔

حضرت نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ چاند کی طرف دیکھو، سب نے دیکھا کہ چاند پر بھی حضرت اسی طرح بیٹھ کر تعزیہ سازی فرما رہے ہیں۔۔۔۔

وہ حضرات سخت شرمندہ ہوئے، ان علماء ظاہر کو حضرت کے مقام بلند کا اندازہ نہیں تھا ، انہوں نے آپ سے معافی مانگی اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل گئے،۔۔۔

اس طرح حضرت نے ان کو جواب دے دیا کہ قال (حکم شریعت) یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اور حال (غلبۂ عشق) یہ ہے کہ ساری کائنات شہادت حسینؓ کا غم منا رہی ہے:

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنیدؒ و شبلیؒ و عطارؒ ہم مست

تعزیہ کے بارے میں حکم شریعت اور صوفیاء کا موقف

یہاں رک کر یہ بتاتے چلیں کہ حضرت امیرؒ میں یہ رنگ ان کے اپنے سلسلۂ بانسہ کے امام الطریق حضرت سید شاہ عبد الرزاق بے کمر بانسویؒ سے وراثتاً آیا تھا۔۔۔۔

حضرت سید عبد الرزاق صاحبؒ کے معاصر اور قدیم تذکروں میں تو نہیں البتہ بعد کے ملفوظات میں تعزیہ داری کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے، اس کا ذکر جناب محمد رضا انصاری صاحب نے "تذکرۂ حضرت سید صاحب بانسویؒ" میں کیا ہے، اور اس پر غیر جانبدارانہ اچھی بحث کی ہے، اس سے حکم شریعت اور صوفیاء کا موقف دونوں اعتدال کے ساتھ سامنے آجاتا ہے، اس لئے اس مسئلہ پر میں اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے وہیں سے یہ بحث مستعار لیتا ہوں:

"عرف عام میں جسے "تعزیہ" کہا جاتا ہے وہ شہید کربلا سیدنا حضرت امام حسینؓ کے "روضہ" کی شبیہ (نقل) ہے، غیر ذی روح (وہ چیزیں جن میں جان نہیں ہوتی) کی نقل یا عکس یا تصویر بنانا اصول شرع کے پیش نظر جائز اور مباح (باباحت اصلیہ) ہے، جیسے کعبۃ اللہ کی تصویر یا شبیہ اور مسجد نبوی کی تصویر یا شبیہ وغیرہ میں کوئی حرج شرعی کبھی نہیں سمجھا گیا، البتہ شبیہ یا نقل کے ساتھ جس قسم کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اس پر شریعت کی رو سے احکام دیئے جاتے ہیں، شبیہ یا نقل کو سواد اعظم کے نزدیک از روئے شرع وہی مرتبہ نہیں دیا جا سکتا جو اصل کا ہے:

۔۔۔۔کسی شی متبرک کی شبیہ و صورت پر حکم اس شی کا دینا اور اس سے طلب حصول ثواب کا کرنا امر باطل ہے، اور یہ گمان کرنا کہ جس طرح اصل کی تعظیم و تکریم سے ہم کو ثواب حاصل ہوتا ہے تعظیم نقل و شبیہ سے بھی

حاصل ہوتا ہے گم راہی ہے۔۔۔۔۔[72]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفس شبیہ یا نقل بنانے کا حکم اور ہے یعنی جائز کا ہے اور شبیہ کو اصل کا درجہ دے کر انہیں نتائج کی نیت سے جو اصل سے مترتب ہوتے ہیں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرنا ناجائز اور غلط ہے، اسی لئے باعتبار حکم کے "تعزیہ" (شبیہ) جداگانہ امر ہے اور تعزیہ داری امر دیگر۔۔۔۔۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ" نے "تعزیہ داری" کی توضیح:

ترک لذات اور ترک زینت کرنا محزون اور غمگین صورت بنانا اور عورتوں کی طرح سوگ منانا۔۔۔۔[73]

سے کی ہے، اور اس کو بدعت سئیہ قرار دیا ہے، ضریح بنانے کا بھی یہی حکم شاہ صاحب نے دیا ہے، اس لئے کہ ضریح یا شبیہ اور امور مذکورہ باہم اس درجہ مدغم ہوگئے ہیں، کہ جداگانہ حکم دینا آسان نہیں رہا ہے۔۔۔

بدعت سیئہ کے تحت آنے والے امور سے نفوس قدسیہ محفوظ اور مصئون ہیں، ان کا عمل ان کے حق میں خاص معاملہ کا حکم رکھتا ہے، جس کی اتباع دوسروں کے لئے لازم نہیں ہے۔

نفوس قدسیہ کا معاملہ شبیہ روضۂ سیدنا امام حسینؓ کے ساتھ محض ادب کا ہے، (اس لئے کہ نقل اور شبیہ کے ساتھ بے ادبی کہیں منقول نہیں ہے) تعزیہ داری کا نہیں ہے۔

صوفیائے کرام اور عرفائے ذوی الاحترام کے "معاملات خصوصی"

72۔ مجموعۃ الفتاویٰ از امام لکھنوی مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی فرنگی محلیؒ ج ۲ ص ۱۲۳ طبع دوم۔

73۔ فتاویٰ عزیزیہ ص ۲۷۔

امت کے لئے حجت اور سند نہیں ہیں، امت کے لئے علماء حق کے فتاویٰ ہی سند اور حجت ہیں۔

شبیہ روضہ کے ساتھ صوفیا کا ادب حضرت سید صاحب تک ہی محدود نہیں ہے، شیخ وقت، عالم فاضل اور محدث شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی (۱۳۱۳ھ م ۱۸۹۵ء) شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بارے میں ان کے مرید نواب سید نورالحسن (فرزند اکبر نواب سید صدیق حسن خان بھوپالی) نے لکھا ہے:

"تعزیہ یعنی نقل روضۂ مقدسہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی بنانے اور ذوالفقار اور علم کے اٹھانے کا استفتا حضرت کی خدمت میں بعض لوگوں نے بھیجا تھا، آپ نے اس پر تحریر فرمایا:
از فضل رحمن سلام و دعا برسد، دریں باب گفتگو نہ باید کرد، مقام ادب است،
(فضل رحمن کی طرف سے سلام و دعا پہونچے، اس معاملے میں گفتگو کرنا اچھا نہیں ہے، ادب کا مقام ہے)[74]

حضرت شاہ فضل رحمن کا یہ جواب استفتاء اس وقت کا ہے جب وہ مدارج سلوک طے فرما کر مرتبۂ اعلیٰ پر فائز ہو چکے تھے، نوجوانی میں ان کا معاملہ تعزیہ کے ساتھ مختلف تھا:

"مسجد میں ایک طرف تعزیہ رکھا تھا، آپ نے (شاہ فضل رحمن نے) تعزیہ کو جدا کرنا چاہا، خوانین مرادآباد (گنج مرادآباد ضلع اناؤ) نے یورش کی، نواب وقت کے یہاں درخواست دی کہ مولانا فضل رحمٰن نے تعزیہ کو پھینک دیا ہے، اور بڑی بے ادبی کی ہے، ۔۔۔۔۔ (گرفتار کر لئے گئے) اور

---

[74] سوادی الفت ص ۳۸۲ مطبوعہ مطبع شاہجہانی واقع بھوپال (رسائل تصوف کا مجموعہ)۔

لوہے کی بیڑی پائے مبارک میں ڈالی گئی۔۔۔۔ محمد جعفر خان ایک صاحب سندیلہ کے جو اس وقت راجہ گوالیار کے میر منشی تھے، انہوں نے لکھنؤ کے نواب کو خط لکھا کہ: مولوی فضل رحمن صاحب ہمارے تمہارے استاد کے نواسے ہیں، ان کو چھوڑ دیجیے، نواب نے منظور کر کے آپ کی رہائی کا حکم بھیجا[75]۔

یہ واقعہ شاہ صاحب کی نوجوانی کا ہے، اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی تھی اور گنج مراد آباد میں آکر مقیم ہوئے تھے۔

شاہ صاحب کے معاصر اور وفات میں مقدم حافظ شاہ محمد علی خیر آبادیؒ (م ۱۲۶۶ھ م ۱۸۴۹ء) سے بھی اسی نہج کا استفتا کیا گیا تھا، انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا:

حدیث از مطرب ومئے گو و راز دہر کم تر جو

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا (حافظ شیرازی)

(مطرب ازلی اور بادۂ معرفت کی گفتگو کرو اور راز دہر کی جستجو میں کم پڑو کہ عقل وحکمت کے ذریعہ اس معمے کو کسی نے نہ حل کیا ہے نہ کر سکتا ہے)[76]

غیر ذی روح کی شبیہ یا نقل کے سلسلے میں شرعی حکم کا دار و مدار اس رویے پر ہے، جو اس کے ساتھ روا رکھا جائے، "تعزیہ داری" اس تشریح کے مطابق جو اوپر مذکور ہوئی سواد اعظم کے نزدیک بلا اختلاف ناجائز ہے، لیکن شبیہ اور نقل کا حکم دیگر امور لاحقہ کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔

75۔تذکرہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی ص ۳۴ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناشر مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

76۔ترجمہ مشاہدۂ حافظی مناقب حافظیہ از مولانا بادی علی خان سیتاپوری مطبوعہ ص ۱۶۵۔

حقیقت یہ ہے کہ "امور جدیدہ" اور نوازل و حوادث" کے سلسلے میں شرعی احکام اس پس منظر کے مطابق ہوتے ہیں، جو ان امور جدیدہ کے وقوع میں مضمر ہے، اس لئے ان امور کے بارے میں فقہاء اور علماء کی رائیں بھی مواقع اور زمانے کے پیش نظر مختلف ہو جایا کرتی ہیں، مروجہ تعزیہ داری جو ایک فرقے کے مسلک کا جزو لاینفک بن گئی ہے، سواد اعظم کے نزدیک بے اصل شرعی ہے

جہاں تک صوفیاء کا معاملہ ہے وہ سوختہ جان گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے معاملات کو اسی پہلو سے دیکھنا چاہیے، جس پہلو سے حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام اور گلہ بان کا واقعہ۔۔۔۔۔ مثنوی مولانا روم میں مذکور ہے۔

موسیا آداب دانا دیگر اند

سوختہ جاں وروان دیگر اند [77]

رفتید ولے نہ از دل ما

بہر حال حضرت امیرؒ کے اس طرح کے واقعات کی صدائے بازگشت آج بھی اس فضا میں موجود ہے، اور حضرت کے وصال کو تقریباً ایک صدی ہونے جارہی ہے، لیکن ان کی یادوں کی خوشبو اب بھی یہاں کی آب وہوا میں رچی بسی ہے۔

بے مثال صبر واستقامت

منورواشریف میں تین (۳) سال قیام کرنے کے بعد اپنا تمام ترعلمی، اصلاحی اور روحانی مشن اپنے نواسہ حضرت سید شاہ حکیم احمد حسنؒ کے حوالے کیا، دو بیٹیاں شامل تھیں، ایک نے صلحابزرگ میں باپ کی موجودگی میں ہی کنوارپن کی موت پائی، اور صلحابزرگ کے قبرستان

77۔تذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی ص ۳۱۴ — ۳۲۰ مرتبہ محمد رضا انصاری مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۶ء۔

میں پیوند خاک ہوئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون،

جواں سال بیٹے کے بعد جوان سال بیٹی کی موت کا یہ دوسرا صدمہ تھا، اہلیہ محترمہ پہلے ہی الوداع کہہ چکی تھیں، ایک بیٹی (بی بی حلیمہ خاتون) زندہ تھیں جو حضرت مولانا عبد الشکور آہ کی زوجیت میں رہ چکی تھیں، اور صاحب اولاد تھیں، حضرت مولانا حکیم احمد حسنؒ آپ ہی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، ان کو اپنے بیٹے کے سپرد کیا، اوران سب کو اللہ کے حوالے کر کے (تقریباً ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں) ایک نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئے، اور جو زمین جائیداد یہاں رہتے ہوئے حاصل کی تھی سب اپنی بیٹی اور نواسے کے لئے چھوڑ دی۔۔۔۔

ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ساغر نواسے کے حوالے اور خود بارگاہ مخدومؒ کی طرف روانہ

حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ آپ کے اکلوتے نواسے تھے، شروع سے ہی آپ پر شفقت کی نظر تھی، بہت لڑکپن سے آپ کو پالا تھا، اور دادا اور والد کا سایہ چھوٹ جانے کے بعد کبھی یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا، تعلیم ظاہری سے تعلیم باطنی تک اور پھر ولایت کی ابتداء سے لیکر انتہاء تک کی تمام منزلیں آپ ہی کی شفقت کریمانہ اور توجہ باطنی کی بدولت طے ہوئیں، حضرت منورویؒ نے بھی تا عمر اپنے نانا جانؒ کی شفقتوں کو فراموش نہیں کیا، ان کے سلسلۂ روحانی کو آگے بڑھایا، اور جس زمین پر چھوڑ کر وہ چلے گئے تھے، ہزار آزمائشوں کے باوجود اس کھونٹے سے اپنے کو الگ نہ کیا۔۔ بلکہ اپنی اولاد کو بھی وصیت کی کہ اسی سرزمین پر رہ کر اپنا کام کرنا ہے ،۔۔

میرے والد بزرگوار اس علاقے میں رہنے پر ہرگز رضامند نہ تھے، ۔۔۔۔۔

۔۔ حضرت منورویؒ نے فرمایا "اس دیوار پر چپت مارو، ۔۔۔۔۔۔

والد صاحب نے حکم کی تعمیل کی،۔۔۔۔۔

حضرت نے پوچھا! دیوار سے تمہاری چپت کا کیا جواب ملا؟۔۔۔

والد صاحب نے عرض کیا: کچھ بھی نہیں،۔۔۔۔

فرمایا: اسی طرح خاموشی کے ساتھ یہاں زندگی گذار لو، اس سوختہ جاں پروانے کی مانند جس کے جلنے اور مرنے پر کوئی آواز نہیں آتی [78]۔۔۔۔۔۔

---

[78]-یہ واقعات میں نے خود والد ماجد سے سنے ہیں، میرے والد ماجد کا اسم گرامی "حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب" ہے ،اپنے نام کے ساتھ آبائی نسبت" قادری "لگاتے ہیں، یوں دیگر سلاسل نقشبندیہ، چشتیہ، شاذلیہ سے بھی نسبت حاصل ہے، اور نقشبندیت کا رنگ غالب ہے، آپ کی ولادت ۲۷/ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۳/دسمبر ۱۹۴۴ء کو اپنے نانیہال لادھ کپسیا، پوسٹ صلیابزرگ ضلع بستی پور میں ہوئی، آپ کا اسم گرامی "محفوظ الرحمن" تاریخی ہے جس سے تاریخ ولادت ۱۳۶۳ھ نکلتی ہے، اسی سال حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا ایوب صاحب گڑھولویؒ کی وفات ہوئی تھی، جو بڑے کامل اور صاحب مقام تھے، ان کا تاریخی نام "محفوظ رحمن" تھا، ممکن ہے حضرت جد امجدؒ نے اسی مناسبت سے نیک فال کے طور پر اپنے صاحبزادے کے لئے یہ نام تجویز فرمایا ہو کہ ایک چاند غروب ہوا تو دوسرا طلوع ہوا (انشاء اللہ)۔۔۔۔۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد قطب الہند حضرت مولانا حکیم احمد حسن منورویؒ سے حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم مجیبیہ خانقاہ پھلواری شریف میں داخل ہوئے، اور چھ سات برسوں تک وہاں کا نصاب پڑھا، اس کے بعد کچھ دنوں مدرسہ مظہر علوم (بنارس) میں بھی تعلیم حاصل کی، اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں بھی رہے۔۔۔

روحانی تعلیم اپنے والد ماجد نور اللہ مرقدہ سے حاصل کی اور آپ کے زیر تربیت رہ کر تمام سلاسل طریق میں مدارج سلوک کی تکمیل فرمائی اور اپنے والد ماجدؒ کے حقیقی جانشین ہوئے۔

حضرت جد امجدؒ کے وصال کے بعد ممتاز محقق و مصنف اور خانوادۂ مجددی کے چشم و چراغ حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مجددیؒ خانقاہ مظہریہ دہلی اور حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب ذکا گڑھولویؒ (فرزند ارجمند قطب الاقطاب حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ) سابق صدر المدرسین و مفتی مدرسہ جامع العلوم مظفر پور نے بھی اپنی اپنی نسبت و اجازت سے آپ کو سرفراز فرمایا، ابھی منوروا شریف میں آپ کی خانقاہ مرجع خاص و عام ہے، اللہ پاک آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

آج بھی ان کی نسل اس کوردہ ویرانے میں خاموش دیوار کی طرح اپنا یہ دینی، علمی اور روحانی مشن جاری رکھے ہوئی ہے، نہیں معلوم اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کے لئے کوئی خضر طریق پردۂ غیب سے برآمد ہوتا ہے یا نہیں۔۔۔

بے وطن مسافر اور شہید محبت کا جنازہ

حضرت امیرؒ کی ہجرت دفعۃً پیش آئی تھی اس لئے اس وقت کسی کو پتہ نہ چل سکا، اس کا انکشاف بہت بعد میں حضرت مولانا احمد حسن منورویؒ کے ذریعہ ہوا کہ یہ ان کا دم واپسیں تھا اور اشارۂ غیبی کے تحت وہ یہاں سے بہار شریف حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ (ولادت ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء -وفات ۷۵۶ھ مطابق ۱۳۵۵ء) کی بارگاہ میں تشریف لے گئے، اور چند دنوں کے بعد وہیں وصال فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس وقت نہ خاندان کا کوئی فرد آنسو بہانے کے لئے موجود تھا اور نہ جنازہ کو کاندھا دینے کے لئے، ایک مشت مٹی کا احسان بھی اہل خاندان کا نہ لیا۔۔۔اسی بارگاہ مخدومؒ کے خدام اور زائرین نے اس بے وطن مسافر اور شہید محبت کا جنازہ اٹھایا اور ان کے آخری سفر میں آخر تک ساتھ رہے، یہ تقریباً ۱۹۲۱ء م ۱۳۳۹ھ کی بات ہے۔

پھول کیا ڈالوگے تربت پہ مری　　　　خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

وہ حضرت مخدومؒ کے مزار کے قریب ہی کہیں مدفون ہیں، لیکن مدفن پر کوئی نام ونشان نہیں ہے۔

میرے والد بزرگوار نے جناب عبدالرحمن صاحب (منوروا شریف)[79] کے حوالے

---

[79] یہ منوروا شریف کے معزز لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے، حضرت مولانا احمد حسن منورویؒ سے گہرا ربط رکھتے تھے، ان کے تعلق اور دینی حالت کے پیش نظر حضرت منورویؒ ان کو خود لے کر حضرت شاہ نوراللہ عرف حضرت پنڈت جیؒ (مہدولی، دربھنگہ) کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کے سلسلۂ بیعت میں داخل کرایا، لیکن روحانی تعلیم حضرت منورویؒ ہی

سے بتایا کہ ایک مرتبہ حضرت حکیم صاحب ؒ (حضرت مولانا حکیم احمد حسن ؒ) سفر سے واپس آئے تو ہم لوگ حسب معمول حاضر خدمت ہوئے، دیکھا کہ بہت افسردہ ہیں، ہم لوگوں نے اس کی وجہ جاننا چاہی تو آپ نے فرمایا کہ:

"اس بار بہار شریف حاضری ہوئی تو دیکھا کہ میرے نانا کی قبر کو لوگوں نے پختہ کر دیا ہے، کتنا وزن ڈال دیا میرے نانا کے سینے پر"

اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بہار شریف میں بارگاہ مخدوم کے احاطے میں آرام فرما ہیں[80]۔

آسماں ان کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت امیر ؒ کی عارفانہ شاعری

حضرت مولانا امیر الحسن قادری ؒ علم وفضل اور معرفت وروحانیت کے ساتھ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے، ان کی شاعری صوفیانہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے، جس میں ہندی، اردو اور فارسی الفاظ کا سنگم ہونے کے علاوہ فکر وخیال کی بلندی اور عارفانہ لب ولہجہ کی لذت وحلاوت محسوس ہوتی ہے، ان کے کلام میں برجستگی ہے، گہری معنویت اور تاثیر ہے، "از دل ریزد بر دل

سے حاصل کی، خانقاہ کے حاضر باشوں میں تھے، ۱۶/ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۵/ مئی ۱۹۸۷ء ۹/ بجے دن میں انتقال کیا، منورواشریف کے قدیم قبرستان میں مدفون ہیں۔

80 - ایک بار پٹنہ سے واپسی پر یہ حقیر بھی زیارت کی غرض سے بہار شریف حاضر ہوا تھا، اہل وعیال بھی ہمراہ تھے، میں نے ان کو بتایا تھا کہ ہمارے جد اکبر ؒ اسی بارگاہ عالی کی خاک قدس میں آرام فرما ہیں، وہاں بھی حاضری دینی ہے۔۔۔ میں نے حضرت مخدوم ؒ کے مزار پر فاتحہ کے بعد ایک ایک قبر پر جاکر آواز لگائی مگر میری آواز کی بازگشت میرے ہی کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی، آج وہاں کوئی نہیں جو اس شہید محبت کی قبر کا نام ونشان بھی بتا سکے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خیزد "والی کیفیت ہے، گم گشتگی اور فنائیت ہے، سچے جذبات کی حرارت ہے، اظہار آرزو کا خوبصورت سلیقہ ہے، ان کے کلام کی سلاست ان کی پر گوئی کی عکاسی کرتی ہے، مگر افسوس ہے کہ آپ کے عارفانہ کلام کا اکثر حصہ ہم تک نہیں پہونچ سکا، ہمارے گھر کے بوسیدہ اوراق میں ان کی کچھ چیزیں بچ گئی ہیں، جن میں کچھ تو ان کے اپنے قلم سے ہیں، اور کچھ ان کے تلامذہ و متعلقین کے ذریعہ نقل در نقل پہونچی ہیں، جو چیزیں خود ان کے اپنے قلم سے تحریر شدہ ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

حضرت امیرؒ کے قلمی سرمایے کی تفصیلات

☆ حمد باری تعالیٰ۔ جس میں کلمہ لا الٰہ الا ھو کی تفہیم و تشریح اور اس کی قوت و تاثیر کا تذکرہ ہے، زبان اور لب و لہجہ فصاحت و سادگی کا نمونہ ہے۔

☆ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ایک تفصیلی نذرانہ منقبت ہے، اس میں کئی چیزیں تاویل کے خانے میں جاتی ہیں، مگر اہل معرفت کے لئے اس کلام میں بڑی روحانی غذا ہے، اس لئے اس کو شامل کیا گیا ہے۔

اس میں کئی اشعار کاغذ کی بوسیدگی اور تحریر کی شکستگی کی بنا پر پڑھے نہ جا سکے اس لئے ان کو چھوڑ دیا گیا ہے، نظم کی زبان بہت صاف ستھری اور اسلوب میں بڑی چاشنی ہے، نظم بہ ہیئت مسدس ترجیع بند ہے۔

☆ ایک مختصر خوبصورت نذرانۂ عقیدت سیدنا حضرت امام حسینؓ کے حضور میں ہے، جس میں عشق و وارفتگی کی حرارت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔

اور دو چیزیں میرے والد بزرگوار کی یادداشت والی کاپی سے حاصل ہوئیں، اس کاپی

کی ابتدا میں ۲۲/جولائی ۱۹۷۱ء م ۲۹/جمادی الاولی ۱۳۹۱ھ کی تاریخ درج ہے [81]۔ اس کاپی میں حضرت امیرؒ کے تحریری سرمایہ سے دو چیزیں محفوظ کی گئی ہیں:

☆ پیر طریق حضرت سید شاہ اسحاق الحسینی بانسویؒ کی شان میں ایک مختصر سا منظوم خراج عقیدت، جو غالباً ان کے دولت کدہ پر تشریف آوری کے موقعہ پر حضرت امیرؒ نے پیش کیا تھا، جیسا کہ اشعار کے لب ولہجہ سے اندازہ ہوتا ہے۔

☆ اور ایک آخری مگر تفصیلی چیز ان کی نظم "بارہ ماسہ" ہے [82]، جو انہوں نے ہندی (فصلی) مہینوں کے حساب سے کہی ہے، جس میں محبوب کے ہجر و فراق میں مختلف موسموں کے لحاظ سے دل پر گذرنے والی کیفیات کی ترجمانی کی گئی ہے، اس میں اس اکیلی عورت کی

---

[81] والد صاحب نے یہ نقل جناب حاجی غلام حسین مرحوم (صلحا بزرگ) سے حاصل کی تھی، اور ان کو یہ چیز براہ راست اپنے استاذ محترم حضرت امیرؒ کے ذریعہ حاصل ہوئی۔

واضح رہے کہ میرے والد گرامی حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب دامت برکاتہم کو حضرت امیرؒ سے خاص مناسبت اور شغف ہے، اپنے والد ماجد کے بعد سب سے زیادہ تعلق ان کو حضرت امیرؒ ہی سے محسوس ہوتا ہے، اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے، جو میری دادی مرحومہ جمیلہ خاتونؒ نے بیان کیا (اور خود والد صاحب نے بھی عبیدن حجن صاحبہ مرحومہؒ اور دیگر بوڑھی خواتین جو کہ حضرت امیرؒ کی صاحبزادی حضرت بی بی حلیمہؒ سے خاص تعلق رکھتی تھیں کے حوالے سے نقل فرمایا) اور ان سے یہ بات مرحومہ بی بی حلیمہ خاتونؒ نے بیان کی کہ مجھے میرے ابا حضورؒ نے ایک کمبل حوالے کیا تھا کہ میرے بُوّا (یعنی حضرت مولانا حکیم احمد حسنؒ) کو ایک بیٹا پیدا ہوگا، یہ اس کی امانت ہے، اس کو دے دینا، جب کہ اس وقت تک میری دادی مرحومہ میرے دادا حضورؒ کی زوجیت میں بھی نہیں آئی تھیں۔۔۔۔۔۔

اسی طرح حضرت امیرؒ کے معمولات میں ایک کتاب حزب البحر تھی اس پر ایک تحریر ثبت تھی کہ یہ کتاب عزیزم مولوی احمد حسنؒ اور ان کی اولاد اور اولاد در اولاد کے لئے ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کتاب برسوں والد صاحب کے معمولات میں شامل رہی۔۔۔۔۔۔ لیکن ایک حادثہ میں وہ کتاب ضائع ہوگئی، اسی طرح وہ کمبل بھی ختم ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

[82] -بارہ ماسہ "اس ہندی گیت کو کہتے ہیں جو ہندی کے بارہ مہینوں کے اعتبار سے بارہ ٹکڑوں میں لکھی گئی ہو، اس میں عورت بارہ مہینوں کے فراق کی مصیبتوں کا ذکر کرتی ہے۔۔۔۔ "ماس" کے معنی مہینے کے ہیں۔

تمثیلی زبان استعمال کی گئی ہے جس کا پیا پردیس میں ہو اور ہر شب اس کے انتظار میں گذرتی ہو، اس طرح یہ خلوت میں جلوۂ محبوب کے انتظار اور مراقبہ کی کیفیت ہے جو صوفیاء کے نزدیک بلند ترین مقامات قرب میں سے ہے۔۔۔۔ جس میں حضرت موسیٰؑ کے اس چرواہے کی جھلک ہے، جو سارے زمانے سے الگ تھلگ اپنے خدا سے ہم کلام ہے۔۔۔۔ اس میں تمنائے وصال کے ساتھ محبت کی بے پناہ گہرائی ہے۔۔۔۔ بظاہر یہ ایک فرقت زدہ عورت کی اپنے بچھڑے ہوئے خاوند کے نام داستان فراق ہے لیکن حقیقت میں یہ محبت روحانی اور عشق حقیقی کی کیفیات ہیں جو اس راہ کے سالکوں کو پیش آتی ہیں، واقعہ میں نہ یہاں کوئی زن ہے اور نہ خاوند، یہ پوری کہانی پیر طریق کے ساتھ مرید با اخلاص کے تعلقات کے گرد گھومتی ہے، جیسا کہ بارہ ماسہ کے آخر میں صاحب کلام نے خود وضاحت کی ہے:

سنو مجھ سے میرے بھائی گیلانی
نہیں سمجھو اسے قصہ کہانی

کہاں کس کا پیا ہے کون زن ہے
سبھی فانی ہے باقی پنجتن ہے

اگر ہے تو فقط اک پیر پی ہے
تصدق اس پر سب یہ جان و جی ہے

پوری نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے، اور ہندی مہینوں کے لحاظ سے عنوان بندی کی گئی ہے۔

ذیل میں بالترتیب یہ تمام چیزیں پیش کی جارہی ہیں:

عکس تحریر حضرت سید شاہ امیر الحسنؒ

نذرانہ عقیدت بحضور سیدنا امام حسینؑ
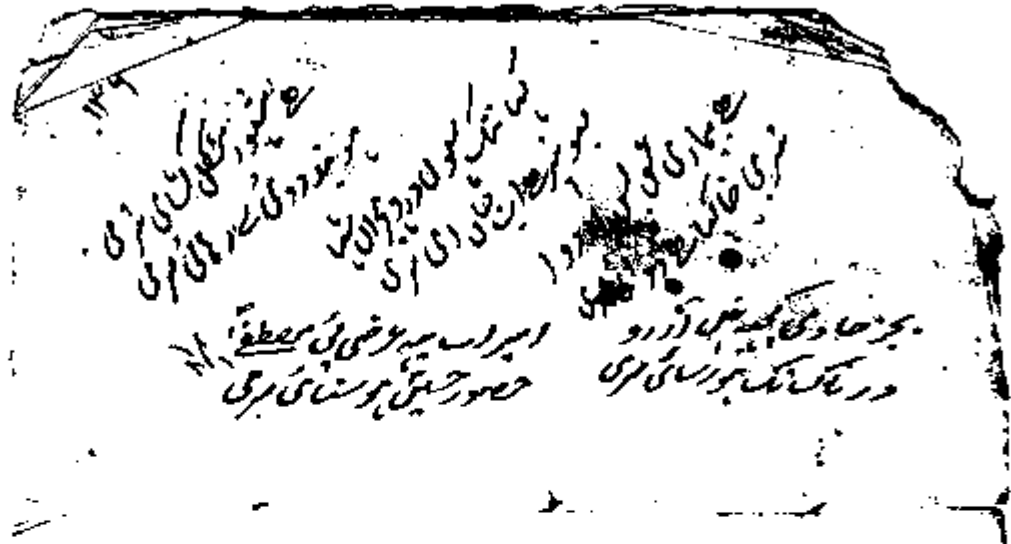
عکس تحریر حضرت امیر —نذرانہ عقیدت بحضور حضرت علیؓ، و حضرت غوث الاعظم
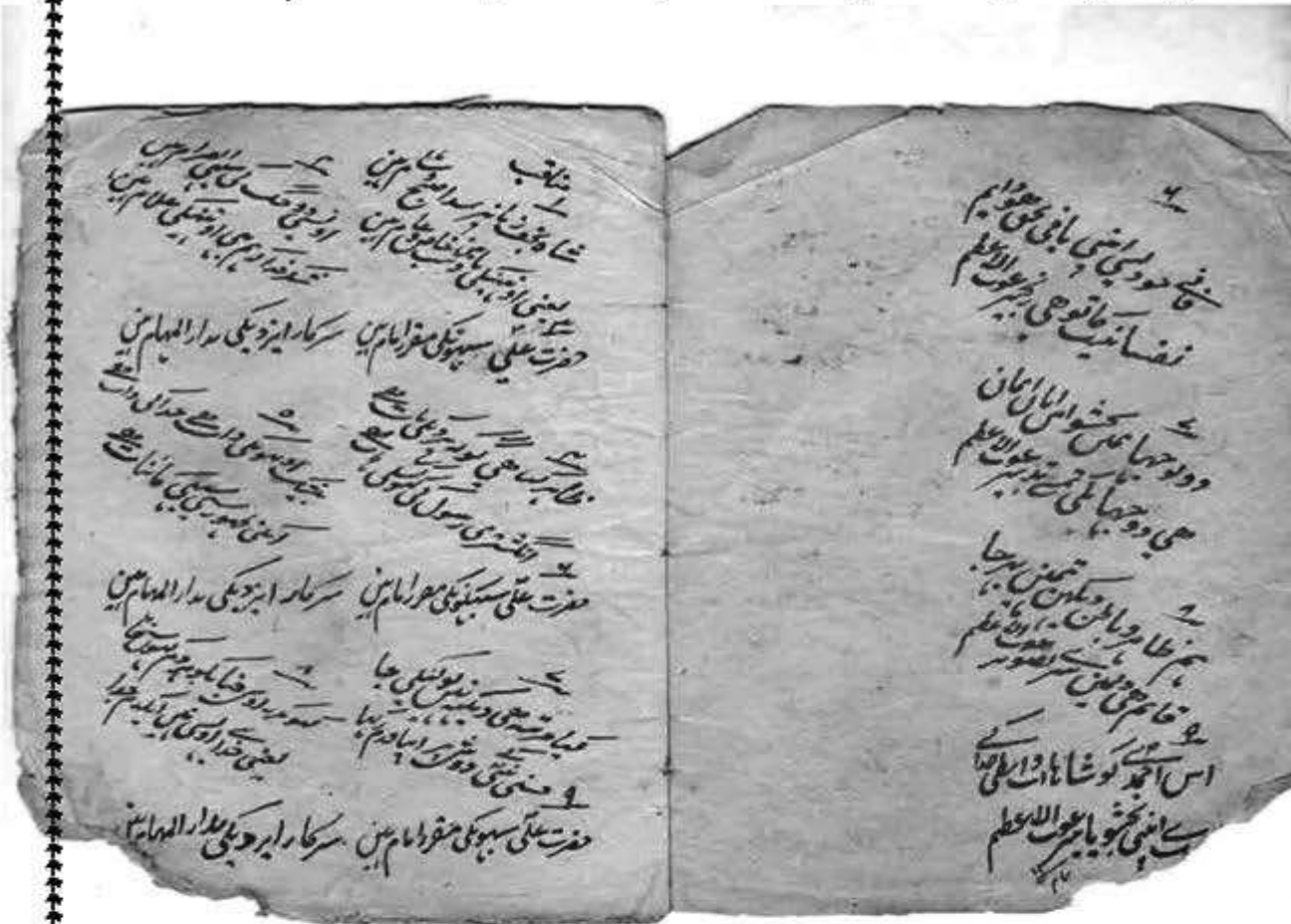
مالک الملک لا شریک لہ — وحدہ لا الہ الا ھو

مصطفےٰ یافت در شب معراج — خلعت لا الہ الا ھو

مرتضیٰ یافت فتح بر خیبر — مدد لا الہ الا ھو

آسماں بے ستوں معلق شد — قوت لا الہ الا ھو

خوش درختے درخت طوبیٰ الست — ثمرۂ لا الہ الا ھو

طوق قمری و طوطیٔ بلبل — نغمۂ لا الہ الا ھو

صوفیاں را بہشت مطلبند — ذکر شاں لا الہ الا ھو

خواب بر عاشقاں بگشت حرام — سبب لا الہ الا ھو

باغبان قدیم لم یزلی — صفت لا الہ الا ھو

طوق لعنت بگردن ابلیس — ہیبت لا الہ الا ھو

شمس تبریز گر خدا خواہی — خوش بگو لا الہ الا ھو

منقبت بہ بارگاہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ

شاہ نجف زماں پر سدا صبح و شام ہیں یعنی انہی کی یاد میں سب خاص وعام ہیں
ان سے دو جگ کے سبھی انصرام ہیں شکر خدا کہ ہم بھی انہی کے غلام ہیں

حضرت علیؓ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

کیا مرتبہ ہے دیکھ نہیں لوں ان کی جا جس نے نبیؐ کے دوش پر اپنا قدم رکھا
کیوں کر نہ اس جناب کو ہر دم کہوں سخا یعنی خدا ہے ان سے نہیں ایک دم جدا

حضرت علیؓ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

مقصد جو چاہے سو کہو بو تراب سے یعنی مراد دل کی براوے شتاب سے
ہم منتظر ہیں آج انہی کی جناب سے توجھے ہے یہ سند ام الکتاب سے

حضرت علیؓ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

کیا جلوہ گر ہوا ہے گل جعفری کا پھول کاظم کی یاد کر کے سبھی غم گیا ہے بھول
موسیٰ رضا کے دین کو دل سے کیا قبول ایمان کی طلب ہے تو کر لے یہاں وصول

حضرت علیؓ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

اوروں کی گفتگو سے نہیں کچھ یقیں مجھے مومن حرف شناس ہوں بھی دلنشیں مجھے
میں بوالحسن کا دوست ہوں کچھ غم نہیں مجھے بخشیں گے سب گناہ مرے شاہ دیں مجھے

حضرت علیؑ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

کہتا ہوں صدق دل سے محب خدا کہوں　　اس میں تو کچھ خلاف نہیں مصطفےٰ کہوں
میں معتقد ہوں تجھ کو شہ کربلا کہوں　　جس پر ہو اعتقاد اسے رہنما کہوں

حضرت علیؑ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

پیر مغاں کی یاد میں دل بادہ نوش ہے　　یعنی نقی تقی کی محبت کا جوش ہے
کر وصف عسکری کا یہاں کیوں خموش ہے　　آ اس طرف رجوع ہو گر تجھ کو ہوش ہے

حضرت علیؑ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

اہل دل سے زر کی تمنا نہ کیجئے　　دونوں جہاں میں آپ کو رسوا نہ کیجئے
مہدی سوائے غیر کا مجرا نہ کیجئے　　فدوی یہ دل سے تو بھولا نہ کیجئے

حضرت علیؑ سبھوں کے مقرر امام ہیں
سرکار ایزدی کے مدار المہام ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۲)

ہفتاد اور دو تن شہدائے کربلا ہیں — معصوم آل حیدر جو کشتۂ جفا ہیں

اہل حرم علیؑ کے جو غم میں مبتلا ہیں — جتنے محب مولا با صدق اور صفا ہیں

مولا ہو پیشوا ہو ، تم میرے رہنما ہو

مانگوں ہوں اس کا صدقہ جو شاہ سے گدا ہو

حضرت رضا کے صدقے اب میں قرار پاؤں — حضرت نقی تقی کے اوپر میں وارے جاؤں

حاتم کی التجا میں کب دل میں اپنے لاؤں — چاہوں اسی سے مطلب جس کا میں کہلاؤں

مولائے مرتضی کے ہاتھوں کی بھیک پاؤں — تو فخر سارے جگ کے عیسیٰ ادھر لیجاؤں

جو تیرے در کے اوپر بیٹھا بے نوا ہو

ممکن نہیں کہ سائل محروم رہ گیا ہو

عاصی ہوں مبتذل ہوں مفلوک ہوں بیچارا — ہر چند پر گناہ ہوں بندہ تو ہوں تمہارا

احوال دیکھ میرے ہنستا جہان سارا — میری مدد کرو تم باشاہ دیں خدا را

اس کو عطا کرو تم جو کچھ میری خطا ہو

تم درد کی دوا ہو اور موجب شفا ہو

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نذرانۂ عقیدت بحضور سیدنا حضرت امام حسینؓ

ہے مشہور مشکل کشائی تری
ہو بند دوئی سے رہائی مری

کہاں تک سہوں درد ہجراں شہا
لبوں پر ہے اب جان آئی مری

ہے بیماری عشق بس لا دوا
تری خاک پا ہے دوائی مری

بجز خادمی کچھ نہیں آرزو
در پاک تک ہو رسائی مری

امیر آب یہ عرض ہے مصطفےٰ
حضور حسینؓ ہو سنائی مری

منظوم خراج عقیدت

(بخدمت حضرت شیخ طریقت سید شاہ محمد اسحاق حسینی قادری بانسویؒ)

نئے شان سے دلربا آج آیا

میرے گھر میں میرا خدا آج آیا

عیاں دیکھ لو خانہ زاد خدا کو

خدائی میں اپنے خدا آج آیا

مکاں کو نہ کیوں رتبۂ لامکاں ہو

شہ تخت لاہوت ہے آج آیا

امیرؔ الحسن کام کیا دو جہاں سے

غلامی کا میرے خطاب آج آیا[83]

---

[83] یہ نظم بظاہر پیر طریق کے ساتھ حضرت امیرؒ کی غالیانہ عقیدت کا مظہر ہے، لیکن دراصل یہ مقام وحدۃ الوجود کا فیض اور عکس ہے،۔۔۔سالک جب مقام قلب پر ہوتا ہے تو ساری کائنات میں خدا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، وہ دنیا کے ہر منظر میں خدا ہی کا عکس دیکھتا ہے، اس طرح وہ ہر موجود کا انکار کر کے صرف موجود مطلق یعنی اللہ پاک کا اقرار کرتا ہے، اس لئے جس شے کو خدا سے جتنا انتساب واختصاص حاصل ہوتا ہے، اس میں خدا کا عکس اس کو اتنا ہی گہرا نظر آتا ہے، "ہمہ اوست" کا نظریہ یہیں سے پیدا ہوا ہے۔۔۔۔

پیر طریق کے ساتھ تعلق اور مشاہدہ میں انہی وجودی کیفیات نے حضرت امیرؒ سے یہ نظم کہلوائی، جو بظاہر شریعت کے حدود سے تجاوز ہے، لیکن اس باب میں ان کو اسی طرح معذور رکھا جائے گا جیسا کہ اس سے قبل کے بہت سے صوفیاء کی شطحیات کو نظر انداز کیا گیا، مثلاً حضرت منصورؒ کا نعرۂ انا الحق، اور حضرت بایزیدؒ کا سبحانی ما اعظم شانی وغیرہ۔۔۔۔

حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ نے ان کی وجودی تشریحات کی ہیں، جو ان کے مشاہدات وادراکات پر مبنی ہیں، جبکہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے ان کی شہودی تعبیرات وتطبیقات پیش فرمائی ہیں، جن میں ان کے مکاشفات اور مشاہدات کے علاوہ شرعی نصوص کے ساتھ تطبیق وتوفیق بھی مطمح نظر ہیں، اور اصل سلوک اور مقام کی توضیح وتشریح بھی،۔۔۔۔۔۔اوران دونوں ہی بزرگوں نے ان اکابر متقدمین کو ان مسائل میں معذور قرار دیا ہے، اور ان پر تنقید کرنے سے روکا ہے۔

حضرت مجدد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ دراصل سالک جب مقامات قرب کا سفر کرتا ہے، اور انفس وآفاق کے مختلف لطائف سے گذرتے ہوئے مقام قلب پر پہونچتا ہے تو اس طرح کے وجودی مشاہدات ہوتے ہیں، لیکن یہ مقام آخر نہیں ہے، بلکہ جب اس منزل سے سالک گذر جاتا ہے تو یہ عارضی کیفیات مندمل ہونے لگتی ہیں، اور آہستہ آہستہ انسان سکر سے صحو کی طرف آجاتا ہے، حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے کئی مکاتیب میں اس مسئلہ پر دقیق علمی بحثیں کی ہیں اور ان میں اصل شرعی موقف کو بھی واضح فرمایا ہے، ان کے مکتوب نمبر ۲۹۱ دفتر اول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں، جس کا ترجمہ حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مجددیؒ خانقاہ مظہریہ چتلی قبر دہلی نے کیا ہے:

"اکثر افراد کے لئے توحید وجودی کے ظہور کا سبب توحیدی مراقبات اور کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کی بہ کثرت مزاولت بہ معنیٰ" لاموجود الا اللہ "ہوا کرتی ہے، کیوں کہ اس معنیٰ کے ساتھ کلمہ توحید کی مزاولت سے سلطان خیال میں یہ نقش جم جاتا ہے، لہذا اس بنا پر جو توحید ظاہر ہوتی ہے، وہ معلول ہے، اور اس کا صاحب، ارباب احوال میں سے نہیں ہے، ارباب احوال اصحاب قلوب ہیں، اور اس طرح کی توحید والا مقام قلب سے بے خبر ہے، اس کی توحید علمی توحید ہے اور علم کے بھی درجات ہیں بعضہا فوق بعض اور بعض افراد کے لئے توحید وجودی کے ظہور اور منشاء کی وجہ انجذاب اور قلبی محبت ہے ابتدا میں یہ لوگ اذکار ومراقبات کا شغل کرتے ہیں، لیکن بلا تخیل معنیٰ توحید اور پھر اپنی جدوجہد کی وجہ سے یا محض عنایت ازلیہ کی وجہ سے مقام قلب کو پہونچ جاتے ہیں اور ان میں جذب پیدا ہوجاتا ہے، اب اس مقام میں اگر ان پر توحید وجودی کا جمال ظاہر ہوجاتا ہے، تو اس کی وجہ محبوب کی محبت کا غلبہ ہے، غلبۂ محبت نے اس کی نظر سے بجز محبوب کے سب کو پوشیدہ کردیا ہے، اب جب کہ یہ لوگ محبوب کے سوا نہ کسی کو دیکھتے ہیں اور نہ کسی کو پاتے ہیں، تو لامحالہ وہ محبوب کے سوا کسی کو موجود نہیں سمجھ سکتے، یہ توحید تخیل اور توہم کے شائبہ اور علت سے پاک وصاف اور از توحید احوال ہے، اور اس توحید کے اصحاب ارباب قلوب ہیں اگر یہ افراد اسی مقام سے عالم کو رجوع کریں تو عالم کے ذرہ ذرہ میں اپنے محبوب کو دیکھیں گے، اور موجودات کو اپنے محبوب کے حسن وجمال کے لئے مثل آئینہ کے پائیں

گے، اگر حضرت مقلب القلوب جل وعلا کے فضل وکرم سے ان افراد کا مقام مقام قلب سے عبور ہو جائے، تو یہ کیفیت روبہ زوال ہو جائے گی، جتنا عروج زیادہ ہو تا جائے گا اسی قدر یہ کیفیت کم ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ اس کیفیت سے مناسبت تک باقی نہ رہے گی، بلکہ بعض افراد اس حد پر پہونچ جاتے ہیں، کہ وہ اس جماعت پر انکار اور طعن کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ رکن الدین ابو المکارم علاء الدولہ سمنانیؒ نے کیا ہے، اور بعض افراد اس کیفیت کے زائل ہونے کے بعد کچھ نہیں کہتے، نہ وہ اس کیفیت کی نفی کرتے ہیں، اور نہ اثبات یہ کاتب سطور ارباب توحید وجودی پر انکار کرنے اور ان پر طعن کرنے سے اپنے کو بچاتا ہے انکار اور طعن کی گنجائش اس وقت ہو سکتی ہے کہ اس مقام اور کیفیت رکھنے والوں کا اپنا کوئی مقصد یا کسی قسم کا اختیار ہو جبکہ یہ کیفیت بلا اختیار ظاہر ہوتی ہے، تو یہ لوگ مجبور و معذور ہیں ، اور مجبور و معذور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔"

یہ مسئلہ بہت قدیم سے معرکۃ الآراء رہا ہے، اسی ضمن میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا نظریہ" وحدۃ الوجود" اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ "وحدۃ الشہود" عرصہ تک علماء، صوفیاء، اصحاب تحقیق اور ارباب مقام کے یہاں موضوع بحث رہا، اور اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔۔۔۔۔

اس موضوع پر ایک رسالہ ملک العلماء بحر العلوم علامہ عبد العلی (ولادت ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء-وفات ۱۲/رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۳/اگست ۱۸۱۰ء) نے بھی عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں "وحدۃ الوجود و شہود الحق فی کل موجود" تحریر فرمایا تھا، وہ رسالہ حضرت مولانا زید ابو الحسن فاروقی مجددی دہلویؒ کے اردو ترجمہ اور حاشیہ کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوا، اس کی دوسری اشاعت حضرت شاہ ابو الخیر اکیڈمی دہلی سے ہوئی، اس رسالہ پر ناظم ندوۃ المصنفین حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی تعارفی تحریر کا یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"متقدمین مشائخ چشت کے یہاں اگرچہ مسئلہ "وحدۃ الوجود" کی غیر معمولی اہمیت تھی، بلکہ جذبۂ خدمت خلق اور روحانی ترقی کے لئے وہ اس کو ایک درجے میں اجزائے ایمان میں شامل کرتے تھے، لیکن عوام میں اس کی تشہیر کو وہ بھی ضرر رساں خیال کرتے تھے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر نازک اور پیچیدہ ہے، کہ ہر کس و ناکس اس کو نہیں سمجھ سکتا، بلکہ الٹا گمراہی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اس مسئلہ پر شاید یہ مثل صادق آتی ہے کہ ایک شخص کی خوراک دوسرے کے لئے زہر ہے۔ صوفیا کے لئے وحدۃ الوجود پر اعتقاد مراتب روحانی اور مدارج ایمانی کے ارتقاء کے لئے ناگزیر تھا، لیکن عوام میں اس کی تعبیریں کفر والحاد کا ذریعہ بن گئیں، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اس فلسفے کے بڑے شارح سمجھے گئے ہیں ان کے نظریہ کا مفہوم

بارہ ماسہ

(قطب دوراں حضرت مولانا سید شاہ امیر الحسن قادریؒ)

خدا کا نور ہر شے میں عیاں ہے
نمونہ اس کا قدرت کا جہاں ہے

ہوا اپنے پر جب وہ آپ عاشق
کیا پیدا تب اس نے عشق صادق

محمدؐ کو کیا پھر اس نے پیدا
دو عالم کو بنایا ان کا شیدا

یہ ہے کہ خدا کے علاوہ کائنات میں کوئی چیز موجود نہیں یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے لا موجود الا ہو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اہل ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل علاحدہ ایک جداگانہ ذات ہے،..........کان الله ولم یکن معہ شئ ۔صوفیا کے یہاں خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں یعنی:

با وحدت حق ز کثرت خلق چہ باک
صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگادی جاتی ہیں، ان کا وجود اگرچہ دھاگے سے ممتاز نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں دھاگے کے سوا گرہ کوئی زائد چیز نہیں ہے، صرف صورت بدل گئی ہے، علماء ظاہر اس تعبیر کو احتیاط کے خلاف خیال کرتے ہیں"

(رسالہ وحدۃ الوجود مع ترجمہ وحاشیہ حضرت مولانا زید ابو الحسن فاروقی ص ۴، اشاعت مئی ۱۹۷۱ء)

بنا عالم کی قائم عشق سے ہے
نہیں ہے عشق سے خالی کوئی شے

کلام خوب طرز عاشقانہ
ہوں لکھتا ایک برہن کا فسانہ[84]

شبانہ روز غم دوری سہے ہے
زبان حال سے اپنے کہے ہے

ماہ اساڑھ[85]

اساڑھ آیا تپش ہوتی ہے ایسی
پھرا اب تک نہیں میرا بدیسی

تپ ہجراں جلائی ہے شب و روز
کہوں کس سے میں احوال جگر سوز

تڑپتی سیج پر رہتی ہوں دن رَین[86]
گیا دل سے میرے خواب و خور و چین

پیا جب سے گئے ہو تم سفر کو
نہیں پھر کر کبھی دیکھا ادھر کو

---

84 - برہن، ہندی لفظ ہے، فرقت زدہ عورت، جو برسوں سے اپنے محبوب کے فراق میں تڑپ رہی ہو۔

85 - اساڑھ: ہندی کا چوتھا مہینہ، برسات کا پہلا مہینہ، یہ عموماً نصف جون سے نصف جولائی تک رہتا ہے۔

86 - رَین، ہندی لفظ ہے، رات۔

بھلا کب تک سہوں درد جدائی

نہیں جز وصل اس کی کچھ دوائی

رسول پاکؐ کے صدقے میں پیارے

ملو مجھ سے ذرا دلبر ہمارے

ماہ ساون[87]

اب آیا ہے جو ساون کا مہینہ

قلق سے ہجر کے پھٹتا ہے سینہ

کسانوں نے کیا آباد کھیتی

کہوں میں کس سے اپنے من کی بیتی

جہاں میں باغ و صحرا سب ہرے ہیں

میرے دل میں غم دلبر بھرے ہیں

لگے ہر روز ساون کی جھری ہے

تڑپتا دل اکیلا ہر گھڑی ہے

گھٹا چھائی ہے ہر سو ابر برسے

پیا بن ہر گھڑی دل میرا ترسے[88]

نظر آتا نہیں اپنا یگانہ

کروں کیونکر ادھر کس کو روانہ

---

[87] ۔ساون: بکرمی سال کا چوتھا مہینہ، برسات کا موسم، ۱۵/ جولائی سے ۱۵/ اگست تک۔

[88] پیا: شوہر، محبوب ☆ بن: بغیر۔

مجھے تم بن نہیں کوئی سہارا

کہاں تک اب کروں یہ دکھ گوارا

پیا بے پَر نہ ایسا مجھ کو چھوڑو

نہیں اس طرح مجھ سے منہ کو موڑو

خدارا اک ذرا صورت دکھاؤ

جوانی مفت مت میری گنواؤ

ماہ بھادوں[89]

غضب بھادوں کی آئی رات کالی

تڑپتا دل پیا بن گھر ہے خالی

اکیلی سیج پر پیو پیو جیوں میں[90]

تن نازک پر لاکھوں دکھ سہوں میں

گھٹا کالی میں جب بجلی ہے کڑکے

اکیلا ہر گھڑی دل میرا دھڑکے

سناؤں کس کو میں اپنی کہانی

عبث برباد جاتی ہے جوانی

رہی میکے میں جب تک میں کنواری

سبھی کرتے تھے میری جاں نثاری

---

89 -بھادوں: ہندی سال کا پانچواں مہینہ جو نصف اگست سے نصف ستمبر تک رہتا ہے،

90 -پیو: پیارا، محبوب، خاوند۔

نہ جانی تھی مقدر کے لکھے کو
لکھا مالک نے میرے دکھ سہے کو

کرو للہ مجھ پر مہربانی
گئی برباد میری زندگانی

دکھادو چاند سی وہ اپنی صورت
اٹھادو اپنے دل سے سب کدورت

ہو مولٰی کے لئے مشکل کشائی
شہ کرب و بلا کی ہے دوہائی

ماہ آسن[91]

گیا بھادو اب آسن مانس آیا
غم دوری نے سارا مانس کھایا[92]

رہا کرتا ہے یہ دن رات کا کوفت
رہی باقی ہوں میں بس استخواں پوست[93]

نہیں کچھ زیست کی امید میرے
فقط دل انتظاری میں ہے تیرے

---

91 - آسن: ہندی سال کا چھٹا مہینہ، جو نصف ستمبر سے نصف اکتوبر تک رہتا ہے۔

92 - مانس: انسان، ہندی لفظ ہے۔

93 - استخواں پوست: ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

ہوئی ہے کون سی تقصیر مجھ سے

جو یوں منہ موڑ کر بیٹھے ہیں مجھ سے

سبھی اپنے پرائے چھوڑ بیٹھے

پیا الفت کا رشتہ توڑ بیٹھے

نہیں کوئی ہے مجھ کو بھر کے تاکے

بھلا جاؤں کہاں تیری کہا کے

پیا جب سے گئے خط بھی نہ بھیجے

ہمیں کاہے تم ایسا من سے تیجے[94]

نہیں قاصد ہے کوئی پاس ایسا

جو بھیجوں اپنے دل کا کچھ سندیسا[95]

بس اب عازم پیا سوئے وطن ہو

رحم مجھ پر بپئے مولا حسنؓ ہو

ماہ کاتک[96]

سکھی لگتا ہے کاتک کیا سہانا[97]

ہوا برسات کا ختم اب زمانا

---

94 ۔تیجے: اس کا مصدر تیجنا ہے، یعنی چھوڑنا، تیاگ دینا۔

95 ۔سندیسا: ہندی لفظ ہے، پیغام، خبر۔

96 ۔کاتک: ہندی سال کا ساتواں مہینہ، تقریباً ۱۵/ اکتوبر سے ۱۵/ نومبر تک کا زمانہ۔

97 ۔سکھی: سہیلی، ہم جولی ☆ سہانا: بھلا معلوم ہونا، پسندیدہ۔

جہاں میں خشک ہر سو ہو گئی راہ

نہ آیا پیو میرا افسوس صد آہ

دیوالی سے ہوا گھر گھر منور[98]

مجھے بس پیو کا رہتا ہے تصور

ہوئے روشن ہیں ہر اک شہر قصبات

میرا دل شمع سا جلتا ہے دن رات

کیا پردیس میں جا تم نے ڈیرا

پیا تم بن ہے میرا گھر اندھیرا

تلطف سے ترے ہرگز نہیں دور

کہ تیرے دید سے آنکھیں ہوں پر نور

نہ ہو غافل پیا میری طرف سے

اِدھر کو رخ کرو ٹک اُس طرف سے[99]

بہت غفلت میں گذرا دن ہمارا

پیا کیسا کلیجہ ہے تمہارا

تیری خاک قدم ہے مجھ کو اکسیر

پیا ہو رحم مجھ پر بہر شبیر

---

98 -دیوالی: ہندوں کا ایک تہوار جس میں یہ لوگ لکشمی کی پوجا کرتے ہیں اور خوب چراغاں کرتے ہیں۔

99 -ٹک: (ہندی میں یہ صفت اور تابع فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے) ذرا سا، کچھ، تھوڑی دیر کے لئے۔

ماہ اگہن[100]

پیاری کیسی اگہن کی فصل ہے
پیا بن دل میرا ابھی مضمحل ہے

سبھی کاٹے ہیں اپنے دھان کا کھیت
پیا اب بھی تو اپنے دل میں کچھ پیت[101]

کسانوں کو ہمیشہ ہے یہ رہتی
صبح اٹھ دیکھتے ہیں اپنی کھیتی

گئی برباد اس کی سب مشقت
کیا کھیتی میں اپنے جس نے غفلت

سمجھتا اس کو سب پیر و جواں ہے
کہ بس لاریب غفلت میں زیاں ہے

کٹی افسوس غفلت میں عمر سب
کہاں تک میں سہوں رنج و تاب اب

لکھا دائم رہا ہے مجھ کو رونا
عبث منہ آنسوؤں سے اپنا دھونا

سناؤں حال کس کو اپنا سکھیا
جہاں میں کون ہو گی مجھ سی دکھیا

100۔ اگہن: ہندی سال کا نواں مہینہ، جو تقریباً نصف نومبر سے نصف دسمبر تک رہتا ہے۔

101۔ پیت: محبت، عشق، دوستی۔

میرے بالم ہمارا دکھ نوارو[102]

نہ مجھ دکھیا کو اب دل سے بچھاڑو[103]

ماہ پوس[104]

یہ پڑتی پوس کی ہے کیسی سردی

سکھی مشہور ہے چلہ کی سردی

جڑاور ہیں سبھی گھر گھر بناتے[105]

مرے گھر بھی پیا گر مرے آتے

بناتی میں رضائی لال سوہی[106]

بچھونے پر بچھاتی اپنے جوہی[107]

پلنگ کیسی مری خوشبو مہکتی

پیا کے ساتھ کس دن میں بھی بستی

ہزار افسوس آیا پی نہ میرا

رہا ارمان جی کا جی میں میرے

---

102 ۔* بالم: خاوند، عاشق، محبوب ☆نوارو: دور کرو، سہارا دو، آسرا دو۔

103 ۔بچھاڑو: جدا کرو۔

104 ۔پوس: فصلی سال (بکرمی) کا نواں مہینہ جو تخمیناً دسمبر کی ۱۵ تاریخ سے ۱۵ / جنوری تک رہتا ہے۔

105 ۔جڑاور: جاڑے کے کپڑے، گرم کپڑے۔

106 ۔رضائی: رنگے ہوئے کپڑے کی روئی والی دلائی، چھوٹا لحاف۔

107 ۔جوہی: چنبیلی جیسے خوشبودار پھول جو اس سے ذرا چھوٹے ہوتے ہیں۔

پیا اپنی کنیزک مجھ کو جانو[108]

ذرا کچھ بھی تو کہنا میرا مانو

نہیں گھر جس کے ہو لڑکا سیانا[109]

اُسے لازم ہے کب پردیس جانا

یہ کب وعدہ تھا ہم سے تم سے ایسا

کیا پردیس جا کر تم نے جیسا

نہیں آؤ تو خط بھی یار بھیجو

ذرا قاصد کوئی دلدار بھیجو

ماہ ماگھ[110]

سکھی ہے ماگھ میں بھولے کنول پھول[111]

پیا بن ہے مرا مرجھا گیا پھول

ہے چھایا رنگ عالم میں بسنتی

بنا ہے باغ و صحرا سب بسنتی[112]

---

108 ۔کنیزک: کنیز کی تصغیر، چھوٹی لونڈی۔

109 ۔سیانا: عقلمند، ہوشیار، سمجھدار۔

110 ۔ماگھ: ہندی سال کا دسواں مہینہ، ۱۵ جنوری سے اخیر فروری تک۔

111 ۔کنول: ایک قسم کا پھول، گل نیلوفر۔

112 ۔بسنتی: زرد، پیلا، زعفرانی، بہار کا رنگ۔

قبا بند و بسنتی پہنے دستار[113]

کھڑا گیندا ہے کیا مستی سے سرشار[114]

بہار اب پھول کی جاتی چلی ہے

ہمیں تم بن ہمیشہ بے کلی ہے[115]

خدا جانے وہ ہوگی کون سی رات

میسر جس میں ہو تم سے ملاقات

جگر جلتا ہے مدت سے ہمارا

سلگتا رہتا ہے دائم انگارا

بجھائے کون تم بن آگ میری

کہاں جاؤں کہاکے اب میں تیری[116]

ذرا تو دل سے اپنے آکے دیکھو

ہوئی تم بن ہے حالت کیسی دیکھو

نہیں ہے خواب راتوں کو نہ دن چین

سدا تم بن رہا کرتی ہوں بے چین

---

113 ۔دستار: پگڑی، عمامہ۔

114 ۔گیندا: گل صد برگ، زرد رنگ کا ایک پھول۔

115 ۔بے کلی: بے چینی، بے قراری۔

116 ۔کہاکے یعنی کہلا کر، تیری نسبت سے مشہور ہو کر۔

بعید ہے کچھ نہیں تیرے کرم سے
ملو پھر خود ہی گھر آ کے ہم سے

ہوں کرتی عرض با صد آہ و زاری
کہ ہو مقبول یہ عرضی ہماری[117]

ماہ پھاگن[118]

فصل پھاگن کی ہے کیسی سجیلی[119]
بنی ہے لال سوہی سب سہیلی

ملے ہنستے سکھی گوٹا کناری[120]
لگے کیسی صورت پیاری پیاری

خوشی میں مست اپنے پی کے سنگ ہے
معطر کر کے چھینٹے سبز رنگ ہے

پیا بن میں ہوں جلتی جیسے ہُوری[121]
کہو بالم سے جا کوئی سکھی ری

---

117 ۔عرضی: درخواست، التماس۔

118 ۔پھاگن: ہندی سال کا گیارھواں مہینہ، اخیر فروری سے وسط مارچ تک کا زمانہ۔

119 ۔سجیلی: سجی سنوری، آراستہ و پیراستہ۔

120 ۔گوٹا کناری: چاندی سونے کے تاروں کی لیس جو ریشم کے بانے کی بنی جاتی ہے۔

121 ۔ہوری: ہولی۔

سبھی گاتے ہیں گھر گھر شادیانہ
گذرتا ہے میرا غم میں زمانہ

سجا ہر ہر جگہ کیا میکدہ ہے
میرا دل بن رہا حسرت کدہ ہے

بہار ہے کیسی کیا ہولی کا دن ہے
بھلا غم سہنے کا کیا میرا سن ہے

گیا گذرا بس اب ہولی کا دن بھی
پیا پردیس سے آئے نہ اب بھی

پیا صدقہ جناب پنجتن کا
کرو تک قصد دلبر اب وطن کا

ماہ چیت[122]

مہینہ چیت کا فصل بہاری
بھری پھولوں سے جیسی ہے کیاری

نیا سارا جہاں ہے، کیسی خوشبو
ہمیں تم بن ملے کس گل میں وہ بو

---

122 -چیت: ہندی سال کا بارہواں مہینہ، وسط مارچ سے وسط اپریل تک کا زمانہ۔

پپیہیا ہر طرف پیو پیو پکارے [123]

میں خود موئی ہوں کیا ہی مجھ کو مارے [124]

صبح کو سنتی ہوں کوئل کی جب کوک [125]

تو اٹھتی سینۂ سوزاں میں ہے ہوک [126]

پیا جب سے گئے ہو تم سفر میں

تب ہی سے مبتلا ہوں درد سر میں

کہاں چھائے رہے ہو کون بن میں [127]

ہوا جو مجھ کو دکھ یہ نالہ پن میں

ابھی تو کھیلنے کھانے کے دن تھے

بھلا کب غم اٹھانے کے یہ سن تھے

ہوئی تیرے لئے رسوا جہاں میں

عمر گذری میری آہ وفغاں میں

سہاتا کچھ نہیں ہے دانہ پانی

خلائق ہیں سبھی کہتے دیوانی

---

123 ۔پپیہیا: زرد رنگ کا ایک خوش آواز پرندہ جو پی پی کی صدا لگاتا ہے۔

124 ۔موئی: مردہ۔

125 ۔کوئل: کالے رنگ کا سریلی آواز والا ایک پرندہ جو اکثر آموں کے موسم میں نظر آتا ہے، ☆کوک: سریلی آواز ، کوے اور فاختہ کی آواز۔

126 ۔ہوک: وہ درد جو دل یا سینے میں ٹھہر ٹھہر کر یا یکایک اٹھے،

127 ۔چھائے: گھرا رہنا، غالب ہونا☆بن: جنگل، اجنبی مقام۔

بھلا ہوتا اگر پیدا نہ ہوتی

تیری صورت پہ میں شیدا نہ ہوتی

میری یہ زیست مجھ کو شاق ہے اب

سہوں کب تک بھلا درد و فراق اب

تصدق میں شہ ہر دو سرا کے

ملو پیارے ہمارے ہم سے آ کے

ماہ بیساکھ[128]

نہایت سخت ہے بیساکھ کا تاؤ

بھلا اب بھی تو بالم میرے گھر آؤ

بدیسی جتنے تھے سب گھر آ گئے

رہے بالم میرے کس دیس چھائے

فقط درشن کی تیری ہوں بھکاری

مری پھرتی ہوں جگ میں ماری ماری

ذرا صورت جو تیری دیکھ پاؤں

تو لے پلکوں سے آنکھوں میں چھپاؤں

نہیں پھر دیکھنے دوں میں کسی کو

ہمیشہ ہر گھڑی بہلاؤں جی کو

---

128 -بیساکھ: سمت بکرمی کا مہینہ جو ۱۳/ اپریل سے شروع ہوتا ہے،

پیا ہوں میں اسی صورت کی داسی[129]

شراب وصل کی کب سے پیاسی

پیاس اب میرے پی میری بجھاؤ

مئے وصلت بس اب بھر جی پلاؤ

رہوں دائم اسی مستی میں مدہوش

ہو اک دم دین و دنیا سب فراموش

نہ آنے پائے پھر ایام دوری

رہے ہر لحظہ بس حاصل حضوری

ماہ جیٹھ[130]

سکھی جب سے چڑھا ہے جیٹھ کا ماس[131]

پیا ملنے کی کچھ کچھ دل کو ہے آس

جو ایسے بھاگ ہوں پی میرا مل جائے[132]

خوشی سے غنچۂ دل میرا کِھل جائے

---

[129] ۔داسی: لونڈی، باندی، کنیز، خادمہ۔

[130] ۔جیٹھ: ہندی سال کا دوسرا مہینہ جو ۱۵ / مئی سے ۱۵ / جون تک رہتا ہے۔

[131] ۔ماس: مہینہ۔

[132] ۔بھاگ: نصیب۔

چڑھاؤں جا کے میں بانسہ میں چادر[133]
ہے میرا امن و ملجا وہی در
اسی چوکھٹ پہ جا کر سر دھروں میں
بھلا کیوں در بدر ماری پھروں میں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

انہی سوچوں میں تھی جو نیند آئی
ذرا غفلت سی کچھ آنکھوں میں چھائی
نہیں وہ نیند تھی بیدار تھی میں
مئے وصلت سے بس سرشار تھی میں
ہوا آنکھوں میں دلبر کا گذارا
چمک اٹھا وہیں وحدت کا تارا
ملی اپنی جو میں اس گلبدن سے
معطر ہوگئی سارے بدن سے
بہت دن پر جو صورت دیکھ پائی
خوشی سے پھر نہ میں پھولی سمائی

---

133 چادر چڑھانا دراصل عشق و محبت کے اظہار کی علامت ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے جذبات آستانۂ بانسہ پر نچھاور کردوں، جس طرح کہ نظم میں مختلف جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے ہندوستان کے مشہور قومی تہوار "ہولی" کا ذکر علامتی طور پر کیا گیا ہے، صاحب نظم چونکہ بانسہ شریف سے روحانی تعلق رکھتے تھے، اور وہاں انہی رسوم وروایات کے ذریعہ اظہار عقیدت کیا جاتا تھا، اس لئے حضرت بھی ان کے تعلق سے عشق و محبت کے اصول پر نرم گوشہ رکھتے تھے۔

بس اب بانسہ میں چل چادر چڑھاؤں
مبارک کباد میاں کو سناؤں

☆☆☆☆☆☆☆☆

سنو مجھ سے میرے بھائی گیلانی
نہیں سمجھو اسے قصہ کہانی

کہاں کس کا پیا ہے کون زن ہے
سبھی فانی ہے باقی پنجتن ہے

اگر ہے تو فقط اک پیر پی ہے
تصدق اس پر سب یہ جان و جی ہے

وہ بام لامکاں کی جڑ وہاں ہے
بغیر اس کے گذر کس کو کہاں ہے

غلط ہے یہ سمجھ ہے جڑ وہاں کی
وہی ہے خاص صورت لامکاں کی

اگر یہ ہستی موہوم مٹ جائے
وہیں پھر صورت جاناں نظر آئے

ہے پی میرا حسینی شاہ اسحاقؒ
میرا کعبہ ہے اس کا ابروئے طاق

مٹادے گا وہی ہستی کا ساماں
پھر ہوگا جلوہ گر خود ماہ تاباں

امیرؔ اب ختم کر غم کی کہانی
رہے گی تیری دائم یہ نشانی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
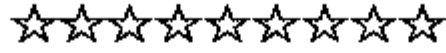
یہ حضرت آہؔ کے خاندان کے چند بزرگ تھے جن کے مختصر احوال اس باب میں ذکر کیے گئے، اب اگلا باب میں ان کی تعلیم وتربیت کے احوال سے متعلق ہے۔

باب دوم

تعلیم و تربیت

اور

خانگی حالات

حضرت آہؒ کی تعلیم - ابتدائی سے متوسطات تک

آپ کی ابتدائی تعلیم شہر مظفرپور میں ہوئی، اس دور کے دیگر اساتذہ کا حال معلوم نہیں ہے، لیکن بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی سے لیکر متوسطات تک کی بیشتر کتابیں اپنے والد ماجد حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ سے پڑھیں، جو اپنے وقت کے جید الاستعداد عالم دین تھے، اور افراد سازی کا بہترین ملکہ رکھتے تھے......

اسی طرح آپ کے حقیقی ماموں حضرت مولانا سید امیر الحسن قادریؒ بھی بڑے عالم اور سلسلۂ قادریہ کے انتہائی قوی النسبت اور صاحب تاثیر بزرگ تھے، درس و تدریس ہی زندگی بھر ان کا مشغلہ رہا، جو شہر ہی کے دوسرے محلہ "سعد پورہ" میں مقیم تھے، نانیہالی تعلق کی بنا پر قرین قیاس یہی ہے کہ اپنے ماموں جان سے بھی ضرور استفادہ کیا ہوگا۔

مدرسہ خادم العلوم (موجودہ نام جامع العلوم) مظفرپور

نیز مدرسہ خادم العلوم مظفرپور بھی انہی دنوں قائم ہوا تھا، جس کا نام بعد میں بدل کر جامع العلوم کر دیا گیا، حافظ رحمت اللہ صاحب (متوفی ۱۹۲۲ء م ۱۳۴۰ھ) مدرسہ کے بانی اور مہتمم تھے[134] اور شہر کے اہل علم اور اصحاب خیر اس ادارہ کے فروغ کے لئے کافی پرجوش تھے، قریب و بعید سے طلبہ کا رجوع عام تھا......

حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ بھی اسی زمانے میں داخل مدرسہ ہوئے، ظاہر ہے کہ حضرت مولانا عبد الشکورؒ تو اسی شہر کے رہنے والے تھے، وہ بھلا اس مدرسہ کے فیض عام

---

134 جنۃ الانوار ص ۶، مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب ذکاؔ گڑھولویؒ سابق صدر المدرسین مدرسہ جامع العلوم مظفرپور، طبع اول ۱۹۷۲ء۔ حافظ رحمت اللہ صاحب حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے بیعت تھے، اس طرح وہ حضرت مولانا نصیر الدین احمد نصرؔ کے پیر بھائی تھے۔

سے محروم کیوں رہتے، اسی مدرسہ سے ان دونوں بزرگوں کی پاکیزہ رفاقت کا آغاز ہوا، اور یہیں سے مولانا بشارت کریم صاحبؒ بھی حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ کے حلقۂ تربیت میں داخل ہوئے، جس کی تفصیل پہلے عرض کی جاچکی ہے۔

مدرسہ خادم العلوم کا معیار تعلیم

اس وقت مدرسہ خادم العلوم صوبۂ بہار کا ایک معیاری اور ممتاز ادارہ تھا، حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحبؒ نے اپنی کتاب جنۃ الانوار میں حضرت گڑھولویؒ کی تعلیم کے ذکر میں مدرسہ جامع العلوم مظفرپور کی بالکل ابتدائی روئیداد (جس کو بانی مدرسہ و مہتمم حافظ رحمت اللہ صاحب نے مرتب کیا تھا) کے حوالے سے شرح جامی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور اسی سال حضرت گڑھولویؒ کے حفظ مکمل کرنے کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد متوسطات اور اعلیٰ تعلیم کے لئے حضرت گڑھولویؒ کانپور تشریف لے گئے:

"حافظ رحمت اللہ صاحب مرحوم اس وقت کی روئیداد مدرسہ میں لکھتے ہیں،۔ "حافظ محمد بشارت کریم جنہوں نے اس سال حفظ ختم کیا ہے ان کی یہ خاص خصوصیت ہے، کہ شرح جامی وغیرہ بھی پڑھتے تھے اور حفظ بھی کرتے تھے" ۔۔۔ اسی موقعہ پر مولانا عبد الواسع علیہ الرحمہ نے آپ کے حافظ ہونے کی تاریخ میں یہ شعر کہا تھا: ؎

با بشارت لفظ حافظ را اگر منظم کنی

سال حفظ او بر آید از سنین عیسوی

"حافظ بشارت" سے آپ کے حفظ کی تاریخ ۱۸۹۲ء نکلتی ہے اسی روئیداد میں لکھا ہے، اب جس وقت کہ یہ روئیداد چھپ رہی ہے، حافظ صاحب

کانپور میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں"[135]۔

جلالین سے آگے یعنی متوسطات سے آخر تک کی تعلیم حضرت گڑھولویؒ نے کانپور میں حاصل کی، جیسا کہ جنۃ الانوار میں اس کا ذکر ہے[136]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۳ء وغیرہ میں مدرسہ جامع العلوم مظفرپور کا تعلیمی معیار شرح جامی سے آگے نہیں تھا، اس کے بعد طلبہ بالعموم دوسرے بڑے اداروں کا رخ کرتے تھے۔

جبکہ دوسری طرف حضرت مولانا نصیر الدین احمد نصرؔ نے اپنے صاحبزادے مولانا عبد الشکورؒ کو جو خط تحریر فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عبد الشکور نے تفسیر جلالین اور مشکوٰۃ تک کی تعلیم مظفرپور ہی میں حاصل کی تھی، اس کے بعد کانپور تشریف لے گئے اور کانپور میں بھی دوبارہ ان کی سماعت کی، خط کے الفاظ ہیں:

> "اور مشکوٰۃ اور تفسیر جلالین تو تم یہاں پڑھ چکے ہو، دوبارہ سماعت کا وقت ملے تو خیر مضائقہ نہیں"[137]

شرح جامی سے مشکوٰۃ تک کی تعلیم میں آج کے مروجہ نصاب کے مطابق عام طور پر کم از کم تین سال کی مدت درکار ہوتی ہے۔۔۔۔۔

ایک تاریخی عقدہ کا حل

یہاں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جامع العلوم میں متوسطات کی تعلیم کا

---

[135]-جنت الانوار ص ۹ - ۱۰، اول ایڈیشن۔

[136] -جنت الانوار ص ۱۲، اول ایڈیشن۔

[137]-مکتوب (قلمی) حضرت نصرؔ ص ا۔

انتظام نہیں تھا (جیسا کہ جنۃ الانوار سے ظاہر ہوتا ہے) تو مولانا عبد الشکورؒ نے یہ تعلیم کس سے حاصل کی؟ اور اگر مولانا عبد الشکور نے جامع العلوم ہی میں مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کی تو پھر یہاں تعلیمی انتظام رہتے ہوئے مولانا بشارت کریم صاحبؒ کو کانپور جانے کی ضرورت کیوں پڑی؟ جبکہ کانپور کی شہرت زیادہ تر اعلیٰ تعلیم کے لئے تھی۔

مدرسہ کے ابتدائی احوال کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مدرسہ کا معیار تعلیم شرح جامی تک ہی تھا، اس کے بعد طلبہ اپنے اپنے رجحان کے مطابق دوسرے بڑے اداروں میں چلے جاتے تھے، اسی لئے حضرت گڑھولویؒ بھی کانپور چلے گئے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ وہ حضرت نصرؔ کی سرپرستی میں تھے اس لئے بالیقین انہی کے مشورہ سے گئے ہونگے،۔۔۔۔۔۔

لیکن صاحبزادہ مولانا عبد الشکور صاحب کو فوری طور پر کانپور نہ بھیج کر متوسطات کی بقیہ کتابیں حضرت نصرؔ نے خود اپنے پاس پڑھائیں، اس لئے کہ عام حالات میں انفرادی تعلیم میں جو توجہ ویکسوئی حاصل ہوتی ہے اور اس سے جو صلاحیت واستعداد پیدا ہوتی ہے، وہ اجتماعی تعلیم میں نہیں ہوتی۔۔۔ نیز اجتماعی اقامتی نظام میں ناپختہ ذہن لڑکوں کے لئے جن مفاسد کا اندیشہ ہے اس سے بھی تحفظ مقصود رہا ہوگا۔۔۔ مشکوٰۃ تک خود پڑھانے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور جانے کی اجازت دی۔۔۔۔۔۔

پھر کانپور میں نصاب تعلیم کے فرق کی بنا پر یا مزید پختگی پیدا کرنے کی غرض سے آپ نے دوبارہ مشکوٰۃ ہی کی جماعت میں داخلہ لیا، اور اس کی اطلاع والد ماجد کو دی، تو والد صاحب نے تحریر فرمایا:

"اور مشکوٰۃ اور تفسیر جلالین تو تم یہاں پڑھ چکے ہو، دوبارہ سماعت کا وقت ملے تو خیر مضائقہ نہیں"

اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور کا سفر

مولانا بشارت کریم صاحبؒ تو جنت الانوار کے مطابق ۱۸۹۳ء ہی میں کانپور پہونچ چکے تھے ،(غالباً) دسمبر ۱۸۹۲ء مطابق جمادی الثانیہ ۱۳۱۰ھ میں انہوں نے شرح جامی کے سال حفظ مکمل کیا،اور رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ مطابق مارچ ۱۸۹۳ء میں انہوں نے مظفر پور ہی میں تراویح سنائی اور رمضان کے بعد ان کی دستار بندی عمل میں آئی ، پھر وہ کانپور کے لئے روانہ ہو گئے ----۱۸۹۳ء میں وہ روئیداد شائع ہوئی ہے جس کا مولانا محمد ادریس صاحبؒ نے حوالہ دیا ہے۔

مولانا عبد الشکورؒ کانپور کے لئے کب روانہ ہوئے ؟--- حضرت نصرؒ کے قلمی مکتوب کی تاریخ سے اس کا تعین کیا جاسکتا ہے،خط پر سن موجود نہیں ہے البتہ اس پر ۱۶/شوال مطابق ۱۰/مارچ یوم پنجشنبہ کی تاریخ درج ہے ،حسابی میزان کے مطابق یہ ۱۶/شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۰/مارچ ۱۸۹۸ء کی تاریخ بنتی ہے۔-----

خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کانپور میں مولانا عبد الشکور کا دوسرا سال تھا، اس لئے کہ کانپور میں حدیث وفقہ اور حکمت وفلسفہ کی تمام اعلیٰ کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا نصیر الدین بیٹے کو دینیات میں رسوخ کے لئے دیوبند بھیجنا چاہتے تھے ،اور اس سلسلے میں انہوں نے دیوبند سے مراسلت بھی کرلی تھی ، لیکن بیٹے نے اساتذہ کی شفقت کا حوالہ دیا اور درپردہ اس دور کے عام مزاج کے مطابق معقولات سے ان کا بے پناہ شغف پوشیدہ تھا۔----- اس لئے والد صاحب نے زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا اور معقولات میں رسوخ وکمال پیدا کرنے کے لئے ایک سال کی مزید اجازت دے دی،خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں تم کو ابھی سے دیوبند بھیجتا لیکن تمہارے لکھنے سے معلوم ہوا کہ کانپور کے اساتذہ شفقت فرما ہیں، اس وجہ سے چھوڑتا ہوں"[138]

---

[138] ۔مکتوب نصرؒ ص ا۔

اس تفصیل کے مطابق مولانا عبد الشکور صاحبؒ اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں کانپور تشریف لے گئے، ظاہر ہے کہ اس تین سال کے وقفہ میں مولانا بشارت کریم صاحبؒ بھی مشکوٰۃ کی جماعت تک پہونچ چکے تھے۔۔۔ لیکن مظفرپور سے وہ اور مولانا خدا بخش مظفرپوری چونکہ پہلے ہی نکل چکے تھے اس لئے بحیثیت استاذ و مربی حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ نے ان حضرات کے اسباق کی تفصیل دریافت فرمائی:

"اور خدا بخش کے سبق کی کیفیت اور مولوی بشارت کریم کے سبق و کتاب کو لکھو"[139]

کانپور کی علمی اہمیت

اس وقت کانپور کو علوم منقولہ و معقولہ میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، بڑے بڑے علماء و مشائخ اور بڑے تعلیمی ادارے وہاں موجود تھے،۔۔۔ یہ شہر بہت سے دینی و تعلیمی تحریکات و انقلابات کا مرکز تھا، جن کے اثرات پورے ملک میں پہونچتے تھے۔۔۔ مثلاً ندوۃ العلماء کی تحریک یہیں سے شروع ہوئی، یہیں سے علماء اور دانشوروں کے وفود نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، اور مختلف علاقوں میں نمائندہ پروگرام ہوئے۔

حضرت مولانا مفتی سہول احمد عثمانی صاحبؒ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند بھی اسی زمانے میں پڑھنے کے لئے کشاں کشاں کانپور پہونچے تھے، وہ اپنا تاثر اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

" اس وقت کانپور عربی تعلیم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور مشاہر علماء ہند وہاں تعلیم دیتے تھے، بڑے بڑے کئی مدرسے تھے۔۔۔۔۔۔ میں تو بھاگلپور میں استاذی مولانا شفاعت حسین صاحب سے استاذ الفضلاء حضرت حاجی

139۔ مکتوب نصرؔ قلمی، ص ۲۔

صوفی مولانا احمد حسن صاحب کی بے انتہا تعریف سُن چکا تھا؛ اس لیے ان کی خدمت میں کانپور حاضر ہوا مگر اسی زمانہ میں وہ سفر حج کے سامان میں تھے، اس لیے اسباق کو رفتہ رفتہ موقوف کر رہے تھے۔۔۔۔ کانپور میں چونکہ متعدد مدرسے اور بڑے بڑے علماء درس دیتے تھے، اس لیے ہر طرح کے طلبہ بکثرت موجود تھے،۔۔۔۔۔ (بڑے اداروں کے نام) ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ کانپور میں تقریباً چھ سات برس تک میں رہا، اور وہاں مدرسہ جامع العلوم محلہ ٹپکاپور، مدرسہ فیض عام مکھنیان بازار، مدرسہ دارالعلوم مسجد تقی چھوٹا بوچڑخانہ، مدرسہ دارالعلوم مسجد رنگیان چھوٹا بوچڑخانہ، مدرسہ احسن المدارس نئی سڑک میں پڑھا۔۔۔۔۔۔۔۔ (اکابر علماء میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے علاوہ جن شخصیات کے نام ذکر کئے ہیں وہ یہ ہیں:) ایام قیام کانپور میں استاذ الفضلاء حافظ حاجی حضرت مولانا احمد حسن و حضرت مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب مدظلہ العالی بردوانی، مولانا محمد رشید صاحب کانپوری، حضرت مولانا نور محمد صاحب پنجابی، رئیس الاذکیاء مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری، مولانا خیر الدین صاحب مدظلہ پنجابی، مولوی فضل احمد صاحب پنجابی، مولوی فیض رسول صاحب پنجابی سے میں نے تعلیم پائی۔۔۔ مگر ان میں سے جناب مولانا احمد حسن صاحب و مولانا نور محمد صاحب کی خدمت میں زیادہ روز تک استفادہ علوم و فنون کا کیا۔[140]

140۔ تعلیم الانساب، ص:۸ تا ۱۵ مرتبہ حضرت مولانا مفتی سہول احمد عثمانیؒ۔

مگر طلبہ کی تعداد، معیار تعلیم اور عوامی مقبولیت کے لحاظ سے تین مدرسے بڑے تھے، مدرسہ فیض عام، دارالعلوم کانپور، اور مدرسہ جامع العلوم ۔۔۔۔۔ مدرسہ فیض عام سب سے قدیم مدرسہ تھا، دارالعلوم کانپور اس کے بعد قائم ہوا، مدرسہ جامع العلوم سب سے کم عمر اور نوخیز تھا، پھر ان تینوں میں بھی بڑا مدرسہ اس وقت دارالعلوم کانپور تھا، یہاں طالبین کا رجوع بہت تھا، پڑھانے والوں کی تعداد بھی زیادہ تھی، جیساکہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، حضرت تھانوی ؒ بھی ان دنوں کانپور ہی میں مقیم تھے، ابتداءً وہ مدرسہ فیض عام میں مدرس اول بن کر آئے تھے لیکن چند ماہ کے بعد مدرسہ جامع العلوم قائم ہوا اور وہ وہاں منتقل ہوگئے اور تقریباً چودہ (۱۴) سال تک بحیثیت مدرس اول وہاں قیام رہا۔

انہی دنوں دارالعلوم کانپور کے ایک جلسہ میں آپ مدعو ہوئے اور تشریف لائے، اس تقریر کی تفصیلی روداد اشرف السوانح میں موجود ہے، اس تقریر میں حضرت تھانوی ؒ نے کانپور کے مذکورہ بالا تینوں مدرسوں کا ذکر کیا ہے، اور تینوں کی الگ الگ خصوصیات بھی بیان کی ہیں پھر ان تینوں میں بڑا، طاقتور اور معیاری مدرسہ دارالعلوم کانپور کو قرار دیا ہے، اس تقریر کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں:

"صاحبو! یہاں سب سے قدیمی مدرسہ جو ہے وہ فیض عام ہے، ۔۔۔ یہ مدرسہ عمر میں سب سے بڑا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور دارالعلوم کی مثال مثل جوان کے ہے ۔۔۔۔۔ دارالعلوم اپنے اندر کثرت مجمع اور تعداد طلبہ کے لحاظ سے یہاں کے دوسرے مدارس سے بڑھا ہوا ہے، ۔۔۔۔ اور جامع العلوم مثل بچہ کے ہے ۔۔۔ دارالعلوم ان دونوں مدرسوں سے زیادہ مستحق خدمت ہے ۔۔۔ فیض عام بوجہ زیادت سن کے قابل تکریم وتوقیر زیادہ ہے اور جامع العلوم بوجہ کم عمری

کے مستحق ترحم زیادہ ہے[141]۔

مدرسہ فیض عام کانپور

مدرسہ فیض عام" (نزد مسجد گڑھے والی محلہ کھنیا بازار) اس وقت ملک کا سب سے قدیم ترین ادارہ تھا اور ہندوستان کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں شمار کیا جاتا تھا۔۔۔۔ تاریخی لحاظ سے ۱۸۵۷ء کے بعد یہ برصغیر کا پہلا دینی مدرسہ تھا۔۔

دارالعلوم دیوبند[142]، مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور[143] اور علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم[144] وغیرہ تمام ادارے اس کے بعد قائم ہوئے۔

اس مدرسہ کی بنیاد حضرت علامہ مفتی عنایت احمد کاکوروی ؒ (متوفی ۱۲۷۹ھ م ۱۸۶۲ء) مصنف علم الصیغہ[145] نے مالک مطبع نظامی مرحوم عبدالرحمٰن خان شاکر بن روشن خان (کانپور)

141-اشرف السوانح ج ۳ ص ۳۸۲ مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ؒ و مولانا عبدالحق صاحب ؒ، ناشر ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۲۷ھ

142 -دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۵ / محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ / مئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات عمل میں آیا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص ۱۵۵ مرتبہ مولانا سید محبوب علی رضوی ؒ ناشر المیزان، لاہور پاکستان)

143-مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کی تاسیس یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ مطابق ۹ / نومبر ۱۸۶۶ء بروز جمعہ ہوئی (ویب سائٹ مظاہر علوم)

144-علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا۔ (ویب سائٹ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی)

145-حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی ؒ بے انتہا فضل وکمال کے حامل علماء میں تھے، قریشی النسل تھے، آپ کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک شخص نے بغداد سے ترک سکونت کر کے ہندوستان میں قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں وارد ہو کر اقامت اختیار کی (کالج میگزین ص ۹،۸ –صدیق فیض عام انٹر کالج کانپور ۲۰۰۶ء – ۲۰۰۷ء مضمون شیخ مصباح الحق ایڈوکیٹ کالج منیجر)

آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی "محمد بخش" ہے، آپ کی ولادت ۹ / شوال المکرم ۱۲۲۸ھ م ۴ / اکتوبر ۱۸۱۳ء کو دیوہ میں ہوئی، جو لکھنؤ اور کاکوری سے قریب ہے، بعد میں آپ کاکوری کی نسبت سے مشہور ہوئے، حصول علم کے لئے

کے تعاون سے ۱۲۷۷ھ م ۱۸۶۰ء میں ڈالی، مدرسہ کا افتتاح اس دور کے مشہور بزرگ اور عالم

۱۳/سال کی عمر میں رامپور کا سفر کیا اور سید محمد بریلویؒ سے نحو وصرف پڑھی آگے کی تعلیم مولانا حیدر علی ٹونکی اور مولانانورالاسلام دہلوی سے حاصل کی، اور ان حضرات سے لمبے عرصے تک استفادہ کیا، پھر دہلی جاکر حضرت مولانا محمد اسحاق دہلویؒ سے حدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد علی گڑھ پہونچے اور حضرت شیخ بزرگ علی مارہرویؒ کی خدمت میں رہ کر منطق وفلسفہ میں کمال حاصل کیا، پھر علی گڑھ ہی میں ایک سال تدریسی خدمت انجام دی، پھر آپ مفتی کے منصب پر فائز ہوئے اور تدریس کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے، تین سال کے بعد آپ علی گڑھ کے قاضی بنادیئے گئے، اور دوسال تک آپ وہاں کے قاضی رہے، پھر وہاں سے منتقل ہوکر شہر بریلی تشریف لائے، اور صدرالامین کے عہدہ پر فائز ہوئے، چار سال اسی عہدہ پر فائز رہنے کے بعد آپ کو ترقی دے کر "صدرالصدور" بنادیا گیا، اور دارالسلطنت اکبر آباد منتقل کردیا گیا، مگر اس عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے ہی ۱۸۵۷ء م ۱۲۷۳ھ کی مشہور ملک گیر بغاوت شروع ہوگئی، اور قتل وخون کا بازار گرم ہوگیا، اس وقت آپ کی عمر شریف ۷۳/سال کی تھی، اس بڑھاپے میں زوال کے یہ دن دیکھنے کو ملے، معاملہ یہیں نہیں رکا، انگریزی تسلط کی جانب سے آپ پر فتنہ بھڑکانے کاالزام عائد کیا گیا، اور اس پاداش میں آپ کو جزائر سیلان (پورٹ بلیر) جلاوطن کردیا گیا، حسن اتفاق وہاں ایک انگریزی ڈاکٹر کریم بخش آپ کا قدردان ثابت ہوا، اور خاص اس کی فرمائش پر آپ نے کئی علمی کتابیں تصنیف فرمائیں، مثلاً علم صرف کی مشہور نصابی کتاب "علم الصیغہ" اور دعاؤں کی کتاب "الوظیفۃ الکریمۃ" اسی ڈاکٹر کی خواہش پر آپ نے لکھی، اسی جلاوطنی کے دوران آپ نے حضور ﷺ کی سیرت پر "تاریخ حبیب اللہ، اور ایک ادبی کتاب "خجستہ بہار" بھی تصنیف فرمائی، پھر اللہ پاک نے آپ کی رہائی کے لئے عجیب راستہ نکالا، حاکم جزیرہ کو بہت دنوں سے کسی ایسے عالم کی تلاش تھی جو جغرافیہ کی مشہور کتاب "تقویم البلدان للبلاذری" کا اردو ترجمہ کرسکے، تاکہ اردو سے انگریزی میں منتقل کرنا آسان ہو، اس خدمت کے صلے میں آپ کو رہائی ملی، اور "خان" کا لقب بھی حاصل ہوا......

وہاں سے آپ کانپور تشریف لائے، اور مالک مطبع نظامی مرحوم عبدالرحمن خان شاکر بن روشن خان کی خواہش پر ۱۲۷۷ھ م ۱۸۶۰ء میں انہی کے سرمایے سے آپ نے مدرسہ فیض عام قائم فرمایا، اور یہاں تین (۳) سال تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اسی زمانے کے اولین طلبہ میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ بھی تھے جنہوں نے خود حضرت مفتی صاحب سے ان کی کتاب علم الصیغہ پڑھی، تین سال کے بعد آپ حج وزیارت کے ارادہ سے نکلے، لیکن آپ کا جہاز جدہ پہونچنے سے پہلے ہی غرق ہوگیا، اسی میں آپ کی بھی وفات ہوگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون، سن وفات ۱۷/شوال المکرم ۱۲۷۹ھ م ۶/اپریل ۱۸۶۳ء ہے (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۰۴۸ مصنفہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ)

و محدث حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے کیا، جو عبدالرحمن خان شاکر کے پیر و مرشد بھی تھے، اس مدرسہ کے پہلے صدر مدرس خود بانی مدرسہ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوریؒ ہوئے۔

"مدرسہ فیض عام کی جائے بنیاد اولاً دو کمروں اور کھپریل و چھپر کی چھت والا وہ مکان تھا، جو پریڈ (ایک محلہ کا نام ہے) پر مسلم مسافر خانہ کے نزدیک اس جگہ واقع تھا، جہاں اسٹینڈرڈ گیراج قائم ہے، بعد میں اس مدرسہ کو مستقل ایک کشادہ جگہ پر منتقل کرنے کی غرض سے چند قابل ذکر مخیر حضرات آگے بڑھے، اور انہوں نے اپنی جائیداد مدرسہ کے نام وقف کر کے یوپی سنٹرل وقف بورڈ میں رجسٹریشن بھی کرادیا، ان واقفین میں مسماۃ عمدہ خاتون اور حافظ کفایت اللہ مکانات نمبر 200P/40 وقف نمبر 147 و 263 جن کے خانہ تولیت میں بحیثیت متولی محمد رفیق کا نام درج ہے۔۔۔۔واقف فخرالدین حیدر، حافظ محمد صدیق، محمد رفیق گرو اور چودھری محمد امین مکانات سلسلہ وار نمبر 200P/40, 157, 42/207, 40/40 قدیم اور 200/40 جدید مطابق وقف نمبرات سلسلہ وار 266,267,268,269 جن کے خانہ تولیت میں حاجی سرتاج احمد کا نام درج ہے، مذکورہ جائیداد محلہ کھنیا بازار میں واقع ہے، جس کے قریب ایک بنگالی پارک تھا، پارک کے نزدیک منشی دیانرائن نگم کا قدیمی مکان تھا جو مشہور اخبار "زمانہ" کے ایڈیٹر اور گنیش شنکر ودیارتھی کے دوست تھے، منشی دیانرائن نگم بھی اس مدرسہ کے بہی خواہوں میں شامل تھے[146]۔

---

[146]-کالج میگزین ص ۸،۹ -صدیق فیض عام انٹر کالج کانپور ۲۰۰۶ء-۲۰۰۷ء مضمون شیخ مصباح الحق ایڈوکیٹ کالج منیجر۔

۱۸۶۲ء میں آپ سفر حج پر روانہ ہوئے تو اپنی روانگی سے قبل اپنے تلمیذ ارشد حضرت مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی ؒ کو اپنا جانشین صدر مدرس مقرر فرمایا[147]، حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی ؒ ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے انہوں نے مکمل ۲۷ سالوں تک یہاں بساط

---

[147] ۔حضرت علامہ مفتی لطف اللہ بن اسد اللہ الحنفی الکوئلی غیر منقسم ہندوستان کے چند مشہور اساتذہ میں گذرے ہیں ،آپ کی ولادت ۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء میں گاؤں پلکھنہ ضلع کوئلہ (علی گڈھ) میں ہوئی،ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے اساتذہ سے حاصل کی،اس کے بعد حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے،اور ابتدا سے انتہا تک تمام درسی کتابیں مفتی صاحب سے پڑھیں،ایک لمبے عرصے تک ان کی صحبت میں رہ کر استفادہ کیا،اور جملہ علوم وفنون میں کمال پیدا کیا،سند حدیث غالباً حضرت مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی ؒ سے حاصل کی،فراغت کے بعد طویل مدت تک اپنے استاذ مفتی عنایت احمد کاکوروی ؒ کے مدرسہ فیض عام میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا،پھر اپنے شہر کوئل منتقل ہوگئے اور درس وتدریس کی بساط قائم کی،شہرت تو پہلے ہی سے حاصل ہو چکی تھی،علی گڑھ میں علماء وفضلاء کا رجوع عام شروع ہوگیا،ہندوستان سے شام اور خراسان تک کے ہزراوں اہل علم نے ان کی طرف رجوع کیا،اور استفادہ کے بعد اطراف عالم میں پھیل گئے اور بڑے بڑے مدارس اور علمی ادارے قائم کئے،ان کی شخصیت اس دور میں استاذ العلماء کی تھی،آپ کی شہرت علم وفضل کے آسمانوں کو چھورہی تھی،ہر بلندی وپستی اور قریب وبعید سے لوگ کھنچے چلے آرہے تھے،آپ کی حیثیت اس وقت کے تمام اہل علم کے لیئے مرجع وماوٰی کی بن گئی تھی،اور کوئی دوسرا نہیں تھا جو اس ریاست علمی میں آپ کا شریک وسہیم ہو۔

آخری عمر میں آپ کی شہرت وعظمت سے متاثر ہوکر ۱۳۱۲ھ م ۱۸۹۵ء میں دولت آصفیہ کے وزیر باتوقیر نواب وقار الامراء نے آپ کو حیدرآباد تشریف لانے کی پیشکش کی،اور دارالعلوم کی صدارت اور محکمۂ استئناف میں مفتی کا منصب آپ کے حوالے کیا،جس کو آپ نے بحسن وخوبی ایک عرصے تک انجام دیا،پھر آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے وطن واپس چلے آئے،اور نوے (۹۰) سال کی عمر میں ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ م اکتوبر ۱۹۱۶ء کو علی گڑھ میں انتقال فرمایا انااللہ وانا الیہ راجعون۔

باوجود اس عظمت علمی کے آپ بے حد متواضع،بااخلاق،نرم خو،کشادہ دل اور غریب پرور انسان تھے،علماء اور مشائخ سے بہت محبت رکھتے تھے،طلبہ وفقراء کو داد ودہش بھی خوب کرتے تھے،معمولات اور اذکار واشغال کے بے حد پابند تھے،بڑوں کی توقیر اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے،ندوہ تحریک شروع ہوئی،جو ان کے تلامذہ (حضرت مولانا محمد علی مونگیری ؒ وغیرہ) کے ذریعہ چلائی جارہی تھی،تو آپ نے کھل کر اس کی تائید اور سرپرستی فرمائی،بلکہ اس کے کئی سالانہ جلسوں (مثلاً جلسۂ کانپور ۱۶ تا ۱۸ / شوال المکرم ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ تا ۲۴ / اپریل ۱۸۹۴ء اور جلسۂ بریلی ۱۳۱۳ھ ،اجلاس میرٹھ ۱۵ / شوال ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۹ / مارچ ۱۸۹۷ء وغیرہ) کی صدارت بھی فرمائی،آپ نے کبھی کسی کی تکفیر نہیں کی۔آپ

درس بچھائے رکھی، اس وقت ملک کا کوئی نامور عالم ایسانہ تھاجسے مولانا سے شرف تلمذ حاصل نہ ہوا ہو، اسی لئے اس زمانے میں وہ استاذ الہند اور استاذ العلماء کے نام سے جانے جاتے تھے[148]۔

ان کے بعد یہ حیثیت حضرت مولانا سید حسین شاہؒ کو حاصل ہوئی جو حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی ؒہی کے تلمیذ رشید تھے، مفتی لطف اللہ صاحب کے عہد صدارت میں مدرسہ کے فیض عام کے مدرس تھے، آپ کے طریقۂ تدریس کی پورے ملک میں شہرت تھی[149]۔

بہر حال مفتی لطف اللہ صاحبؒ کا عہد صدارت اس مدرسہ کا عہد زریں ہے، مدرسہ نے ان کے زمانے میں بہت ترقی کی۔

۱۸۶۹ء میں جب آپ مدرسہ چھوڑ کر اپنے وطن علی گڑھ تشریف لے گئے، تو آپ کی جگہ آپ ہی کے ایک لائق فائق شاگرد حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کو صدر مدرس بنایا گیا[150]،

کے مایہ ناز تلامذہ میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ، حضرت مولانا عبد الحق حقانیؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، حضرت مولانا ظہورالاسلام فتحپوریؒ اور حضرت مولانا نور محمد پنجابیؒ وغیرہ سرفہرست ہیں۔

(نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۲۵ مصنفہ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ)

148 ۔حاشیہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۷ مصنفہ مولانا محمد الحسنیؒ ط مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۰ء)

149 ۔حضرت مولانا سید حسین شاہؒ کا شمار حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ کے بعد ہندوستان کے سب سے مایہ ناز مدرسین میں ہوتا ہے، آپ کی ولادت کشمیر میں ہوئی، اور کم عمری میں ہی کانپور چلے آئے، اور مفتی عنایت احمد کاکورویؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، تمام کتب درسیہ ان سے پڑھیں، اور ان کے باکمال تلامذہ میں شمار کئے گئے، فراغت کے بعد مدرسہ فیض عام ہی میں مدرس ہوئے، اور ایک طویل عرصے تک اپنے ممتاز طریقۂ تدریس سے مدرسہ کی شہرت کو بلندیوں تک پہونچایا۔

آخر میں بھوپال حکومت کی دعوت پر بھوپال تشریف لے گئے، وہاں سے آپ کو معقول وظیفہ ملتا تھا، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ آپ کے باکمال تلامذہ میں ہیں، وہ آپ کے طریقۂ تدریس وتحقیق کے بے حد مداح تھے، انتقال پر ملال ۱۲۸۵ھ م ۱۸۶۹ء میں ہوا، علی گڑھ میں مدفون ہیں۔

(نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۹۵۵ مصنفہ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ)

مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی تدریسی شہرت اور تعلیمی انہماک نے اس مدرسہ کو نقطۂ عروج تک پہونچایا، آپ مسلسل چودہ (۱۴) سال تک مدرس اول کی حیثیت سے اس مدرسہ میں فائز رہے، ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں آپ نے مدرسہ سے علٰحدگی اختیار کرلی، اور کانپور ہی میں اس کے قریب ہی مسجد رنگیان میں اپنا علٰحدہ دارالعلوم قائم کرلیا، جہاں انہوں نے تاحیات مدرس اول کی حیثیت سے اپنی تعلیمی، تدریسی وتربیتی خدمات جاری رکھیں[151]۔

حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی علٰحدگی کے بعد اس خلا کو پر کرنے کے لئے مدرس اول کی حیثیت سے حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کو بلایا گیا[152]، جو اس وقت بالکل عنفوان شباب پر تھے، حضرت تھانویؒ کی سب سے مستند سوانح "اشرف السوانح" میں اس کا ذکر موجود ہے، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ تحریر فرماتے ہیں:

150- مجھے مدرسہ فیض عام کی ایک قدیم سند ۱۳۱۱ھ کی دستیاب ہوئی ہے جس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ گو کہ اس مدرسہ سے علٰحدہ ہوگئے تھے لیکن اس سے تعلق میں کمی نہیں آئی، بلکہ آپ کی مسلسل سرپرستی اور نگرانی (غالباً) مدرسہ فیض عام کو حاصل رہی، اسناد پر آپ کے دستخط سے یہی ترشح ہوتا ہے، پروگرام وغیرہ میں تو تشریف لاتے ہی تھے اور ان کی صدارت بھی فرماتے تھے۔

151 -شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص ۶۴ تا ۶۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی (بحوالہ: شب چراغ از نثار احمد علوی ص ۱۶۵ ناشر کاکوری اکیڈمی ناظم آباد کراچی ۱۹۸۲ء و تاریخ کانپور از سید اشتیاق اظہر ص ۲۷، ۲۸ ناشر "کانپور اکیڈمی" کراچی ۱۹۸۷ء) واشرف السوانح-خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۳۷ - ۳۸ ط ادارہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۴۰۳ھ، ورسالہ تنزیہ الرحمن وغیرہ۔

152 -حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہندوستان کے ان اکابر علماء اور اولیاء اللہ میں گذرے ہیں، جن کا فیض ان کے عہد میں سب سے زیادہ جاری ہوا اور آج بھی جاری ہے، بے شماروں کتابوں کے مصنف، مجتہد فقیہ، محدث، مفسر، صوفی، بہترین مربی اخلاق، اعلیٰ درجہ کے منتظم، لوگوں نے ان کی نظیر نہیں دیکھی، تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ۵/ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸/ ستمبر ۱۸۶۳ء کو آپ کی ولادت ہوئی، حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ، مولانا منفعت علی دیوبندیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا سید احمد دہلویؒ، ملا محمودؒ اور حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ سے علم

"کانپور تشریف لانے کی صورت یہ ہوئی کہ مدرسہ فیض عام جو کانپور کا سب سے قدیم مدرسہ دینیہ تھا، اس کے صدر مدرس جناب مولانا احمد حسن صاحبؒ جو ایک مشہور اور جامع بالخصوص ماہر معقولات عالم تھے کسی وجہ سے ناراض ہو کر مدرسہ سے علٰحدہ ہو گئے، اور انہوں نے ایک دوسرا مدرسہ دار العلوم قائم کر لیا، چونکہ طلبہ میں ان کا بہت شہرہ تھا، اس لئے ان کی جگہ بیٹھ کر درس دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی، اور اسی وجہ سے وہاں جانے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تھا، لیکن چونکہ حضرت والا کو اس صورت حال کی خبر نہ تھی، لہٰذا جب وہاں سے ایک مدرس کی طلبی ہوئی، تو اخیر صفر ۱۳۰۱ھ دسمبر ۱۸۸۳ء میں باجازت والد ماجد و بارشاد حضرات اساتذۂ کرام بے تامل تشریف لے گئے اور درس دینا شروع کر دیا تنخواہ صرف ۲۵/ روپے ماہوار تھی۔۔
گو حضرت والا اس وقت بالکل نوجوان اور سبزہ آغاز تھے لیکن کانپور پہونچ کر وہاں کے جملہ مدرسین اور اہل شہر میں بہت جلد شہرت ہو گئی، اور عام طور پر ہر دلعزیز ہو گئے، حتیٰ کہ مولانا احمد حسن صاحب بھی بہت محبت اور وقعت سے پیش آنے لگے[153]۔

وفن میں کمال حاصل کیا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی اور آپ کے مجاز ہوئے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی کافی استفادہ کیا، حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد آپ کی طرف عوام وخواص کا رجوع عام ہوا، اور آپ کی خانقاہ نے خانقاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، خانقاہ سرہند اور خانقاہ گنج مرادآباد کی یاد تازہ کر دی، ۸۲ سال کی عمر میں ۱۶/ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹/ جولائی ۱۹۴۳ء میں وفات پائی، تھانہ بھون میں مدفون ہیں۔۔ حضرت کی شخصیت پر ایک میرا مستقل کتابچہ "حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ بحیثیت مجدد وفقیہ" شائع شدہ ہے۔
(نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۸۸ مصنفہ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ و اشرف السوانح ج ۴ ص ۸۲)

[153] - اشرف السوانح- خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۳۷ - ۳۸ ط ادارہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۴۰۳ھ۔

البتہ حضرت تھانویؒ زیادہ دنوں اس مدرسہ میں نہ رہ سکے اور صرف تین چار ماہ کے بعد ہی تحریک چندہ کے مسئلے پر منتظمین سے اختلاف ہوا اور آپ مدرسہ سے مستعفی ہوگئے۔

دراصل حضرت کانپوریؒ جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کی علیحدگی کے بعد مدرسہ فیض عام پھر دوبارہ سنبھل نہیں سکا، حضرت تھانویؒ نے بڑی حد تک علمی خلا کو پر کرنے کی کوشش کی، لیکن حضرت کانپوریؒ کی علٰحدگی سے عوامی اعتماد کو جو صدمہ پہونچا تھا، اور پھر اس کے متوازی دوسرا مدرسہ "دارالعلوم کانپور" قائم ہوگیا، تو قدرتی طور پر مدرسہ کے ماحول اور اس کے چندہ پر برے اثرات مرتب ہوئے، طلبہ کا رجوع بھی کم ہوگیا تھا اور مالی وصولی بھی کمزور پڑگئی تھی، حضرت تھانویؒ یہاں مدرس اول بن کر آئے تھے، اور مدرس اول مدرسہ کے نظام میں صرف تعلیمی امور کا نگراں نہیں ہوتا بلکہ انتظامی مسائل میں بھی اس کو تعاون دینا پڑتا ہے، اس لئے منتظمین نے حضرت تھانویؒ پر اس کے لئے دباؤ ڈالا، تاکہ مدرسہ کا مالی نظام مستحکم ہو اور عوامی اعتماد بھی بحال کیا جاسکے، حضرت تھانویؒ اس عرف سے آشنا نہ تھے، انہوں نے اس سے استعفادے دیا، اس طرح مدرسہ فیض عام کی ٹوٹی ہوئی کمر کو ایک اور صدمہ پہونچا۔

☆حضرت تھانویؒ کے بعد اس منصب جلیل پر مولانا غلام یحیٰ ہزارویؒ فائز ہوئے[154]

☆ مولانا غلام یحیٰ ہزارویؒ کئی سال وہاں کے صدر مدرس رہے، ان کے بعد مولانا فاروق چریاکوٹی (اعظم گڑھی) اس مدرسہ کے صدرالمدرسین ہوئے۔

یہی دور ہے جب مولانا مفتی سہول احمد عثمانی بھاگلپوریؒ کانپور حصول تعلیم کی غرض سے پہونچے تھے[155]، وہ حضرت کانپوریؒ کی شہرت سن کر یہاں آئے تھے، مگر حضرت کے مدرسہ

---

[154] - شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص ۶۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی۔

155 ۔ حضرت مولانا مفتی محمد سہول بن افضل حسین رحمہ اللہ کی ولادت ۱۲۹۵ھ میں ہوئی، ان کی خودنوشت کے مطابق آپ ۲۶ / ویں پشت میں خلیفہ راشد، خلیفہ سوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں، شجرہ کی حفاظت، نسب کا ضبط اور شجرہ طیبہ کے علمی وروحانی کارنامے اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ مفتی محمد سہول صاحب رحمہ اللہ عربی النسل ہیں، عرب کے ممتاز قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی صلبی اولاد ہونے کے ناطے آپ "عثمانی" کہلاتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد سہول عثمانی صاحب رحمہ اللہ کے نسب نامہ اور دیگر احوال زندگی کا بنیادی حصہ آپ کی خودنوشت تحریر ہے، آپ کی خودنوشت کا ماخذ خاندان وبرادری کے طویل العمر اشخاص کا بیان، پرانی مختلف محفوظ تحریرات اور اسی خاندان کے ایک بزرگ، حضرت مفتی صاحب کے پردادا مولوی رضی الدین رحمہ اللہ کا رسالہ "تذکرۃ الانساب" اور منظوم نسب نامہ ہے۔ اس کے علاوہ برسوں کی تحقیق کے نتیجہ میں تحریراتِ قدیمہ وجدیدہ سے اپنے سلسلۂ نسب کے بارے میں جو معلومات یکجا ہو سکیں، انھیں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اپنی سوانح عمری کے ضروری حوالہ جات کے ساتھ "تعلیم الانساب" کے نام سے خود مرتب فرمایا تھا، جو تاحال مسودہ مخطوطہ کی شکل میں ہے۔۔۔۔ "تعلیم الانساب" کے اس مسودہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے علمی وعملی مشاغل سے بے بسی کے زمانے میں اپنے ضعف اور جسمانی عوارض کے دور میں تقریباً ۱۳ / برس لگا کر مکمل فرمایا ہے (تعلیم الانساب ،ص:۸،۷)

ابتدائی تعلیم زلیخا اور انشائے خلیفہ تک اپنے والد سے حاصل کی جو اردو مڈل ورنیکولر اسکول واقع موضع پورینی ضلع بھاگل پور میں مدرس تھے۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد بھاگلپور چلے گئے، اور تقریباً ۴ سال خانقاہ ملا چک میں طالب علمی کی، اسی زمانہ میں حضرت مولانا شاہ عالم صاحب برادر مولانا شاہ اشرف عالم صاحب سے بھی عربی وفارسی پڑھی۔۔۔۔ جناب مولانا محمد وحید صاحبؒ سے شرح تہذیب اور مناظرہ رشیدیہ پڑھا، اور جناب مولانا شفاعت حسین صاحب گیاوی جو بھاگلپور خلیفہ باغ کی مسجد میں مدرسہ اسلامیہ کے مدرس مقرر ہوئے تھے ان سے بھی کچھ فقہ اور منطق پڑھی۔ مولانا شفاعت حسین صاحب سے ہندوستان کی مشہور تعلیم گاہوں اور علماء کا پتہ معلوم ہوا۔

اور پھر وہیں سے شرح وقایہ پڑھ کر کانپور پہونچے اور کانپور میں تقریباً چھ سات برس تک رہے، اور وہاں مدرسہ جامع العلوم محلہ ٹپکاپور، مدرسہ فیض عام کھنیان بازار، مدرسہ دارالعلوم مسجد تقی چھوٹا بوچڑخانہ، مدرسہ دارالعلوم مسجد رنگیان چھوٹا بوچڑخانہ، مدرسہ احسن المدارس نئی سڑک کئی مدرسوں میں تعلیم حاصل کی، اور اس دوران استاذ الفضلاء حافظ حاجی حضرت مولانا احمد حسن وحضرت مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب بردوانی، مولانا محمد رشید

دارالعلوم کانپور میں طلبہ کا اتنا اژدحام تھا کہ وہاں کوئی گنجائش نہ نکل سکی، علاوہ حضرت سفر حج

صاحب کانپوری، حضرت مولانا نور محمد صاحب پنجابی، رئیس الاذکیاء مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری، مولانا خیر الدین صاحب پنجابی، مولوی فضل احمد صاحب پنجابی، مولوی فیض رسول صاحب پنجابی سے استفادہ کیا۔

کانپور کے بعد حیدرآباد مدرسہ نظامیہ تشریف لے گئے، دو سال وہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دیوبند پہونچے، مدرسہ دیوبند میں صحاح ستہ، ہدایہ آخرین، جلالین شریف، بیضاوی شریف پڑھیں اور کل چودہ (۱۴) ماہ وہاں رہے اور ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے پاس دیوبند سے فراغت حاصل کی، .... جب کل درسیات سے فارغ ہوگئے تو حضرت شیخ الہندؒ نے مدرسہ عین العلم شاہ جہاں پور میں صدر المدرسین مقرر کرکے بھیج دیا"۔

(تعلیم الانساب، ص:۱۵،۱۶)

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ دارالعلوم کے مشاہیر اور ان کی انجام دہندہ خدمات کے تحت تاریخ دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"آپ دارالعلوم کے ممتاز ابناء قدیم میں سے تھے، دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف دینی مدارس میں آپ نے مدرسی کی، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل رہے، دارلعلوم دیوبند میں تقریباً ۸ / سال درس دیا پھر تین سال یہاں کے مفتی کی حیثیت سے کام کیا، بعد ازاں مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس ہوکر تشریف لے گئے اور عمر کا آخری حصہ وہیں گزارا، آپ کا علمی فیض بہت ہوا، شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحب جیسے لائق اور فاضل علماء آپ کے شاگردوں میں سے تھے، ممدوح رقتِ قلب کے ساتھ صاحبِ دل بھی تھے اور اکابر و اسلاف کے نقش قدم کے انتہائی طور پر محافظ تھے رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۲ھ آپ دارالعلوم (دیوبند) کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے........ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص:۹۸،۱۰۴)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے باطنی تعلیم حاصل کی اور اجازت بھی حاصل ہوئی نیز حضرت شیخ الہندؒ سے بھی بیعت و خلافت حاصل تھی۔

وفات، تدفین: مؤرخہ ۲۷ / رجب ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۹۴۸ء کو آپ کی روح مبارک اعلیٰ علیین کی جانب محوِ پرواز ہوئی اور پورینی کے خاندانی قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔ فنوّر اللہ مرقدہٗ و برّداللہ مضجعہٗ ووسّع مدخلہ وجعل قبرہ روضۃً من ریاض الجنۃ. (مشاہیر دارالعلوم دیوبند ص ۵۹ مرتبہ حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ، ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 9، جلد:100، ذی الحجہ 1437 ہجری مطابق اگست تا ستمبر 2016ء)

کے لئے بھی پابرکاب تھے، مجبوراً انہوں نے حضرت تھانویؒ کے نوخیز مدرسہ "جامع العلوم" میں داخلہ لے لیا، وہاں بڑی آسانی سے داخلہ مل گیا، لیکن اسباق میں معقولات کی کمی کی بناپر ان کو وہاں لطف نہیں آیا، ان کے ذہن وفکر کی پوری غذا وہاں موجود نہیں تھی، اتفاق سے کچھ ہی دنوں کے بعد معقولات کے مشہور عالم مولانا فاروق چریاکوٹی مدرسہ فیض عام میں اس منصب پر تشریف لائے، مولانا چریاکوٹی علامہ شبلی نعمانیؒ کے بھی استاذ تھے، بس یہ مدرسہ جامع العلوم چھوڑ کر مدرسہ فیض عام چلے آئے، یہاں بھی بآسانی داخلہ ہوگیا، یہ پوری روداد خود حضرت مفتی سہول احمد عثمانیؒ نے اپنے قلم سے لکھی ہے[156]۔

اس روداد سے اس وقت کے مدارس کانپور کے معیار تعلیم اور طلبہ کے ذوق ومزاج اور مدرسہ فیض عام کے عروج وزوال کی تاریخ سامنے آتی ہے، یہ تقریباً ۱۳۱۱ھ یا ۱۳۱۲ھ کی بات ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس دور میں بھی اس مدرسہ کی تاریخی عظمت تسلیم کی جاتی رہی اور اکابر کی یادگار ہونے کی بناپر مرکزیت بھی اسے حاصل رہی، مختلف المشرب اور مختلف ذوق ومزاج کے افراد واشخاص کے درمیان یہی ادارہ نقطۂ اتصال ثابت ہوتا تھا، اس کے جلسوں میں عوام وخواص کی بڑی تعداد امڈ پڑتی تھی، کانپور اور اطرف کے تمام مدارس میں اس کو ام المدارس کی حیثیت حاصل تھی، جہاں کہیں بھی جو بھی علمی ودینی کام ہورہے تھے، اسی مدرسہ کے ابنائے قدیم انجام دے رہے تھے، خطہ یا ملک میں کوئی بھی تحریک اٹھتی یہ مدرسہ اس کی سرپرستی قبول کرتا تھا، چنانچہ اسی کی گود سے ندوۃ العلماء کی تحریک نے جنم لیا، اور اسی کے صحن میں وہ پھلی پھولی اور پروان چڑھی، غرض اس گئے گذرے دور میں بھی ملک وملت کے مختلف المزاج اور مختلف المشرب علماء اور اہل دانش کے لئے یہی مدرسہ سب سے بڑا نقطۂ اتفاق تھا، بقول علامہ سید

156 ۔ تعلیم الانساب ص ۱۵ مرتبہ مفتی سہول احمد عثمانیؒ۔

سلیمان ندوی ؒ:

"یہ اس مدرسہ ہی کا فیض تھا کہ ہندوستان بھر کے جید علماء نے متفقہ طور پر ندوہ کی تشکیل کا اعلان کیا[157]۔

مدرسہ اینٹ اور پتھر کی عمارت کا نام نہیں ہوتا، اس فکر اور تحریک کا نام ہوتا ہے جو قوت عمل کو انگیز کرتی ہے اور جس کے تحت کچھ لوگ کام کرتے ہیں، اس لحاظ سے مدرسہ فیض عام محدود چہاردیواریوں سے نکل کر شہر اور ملک میں پھیل چکا تھا، پہلے یہ فکر عمارتوں کی رہین منت تھی، اب ان حد بندیوں کی وہ پابند نہ تھی، اب ہر سوچنے والے دماغ اور کام کرنے والی طاقت کے پیچھے اسی کا فیض کارفرما تھا۔

مدرسہ فیض عام اب ایک بھولی بسری داستان

لیکن اب یہ مدرسہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، اس کی فکر اور تحریک بھولی بسری داستان ہو چکی ہے، وہ مقام آج بھی موجود ہے، بلند و بالا عمارتیں بھی قائم ہیں، لیکن اب وہ "صدیق فیض عام انٹر کالج" میں تبدیل ہو چکا ہے، اس کی وسیع و عریض عمارت کے ایک چھوٹے سے ہال میں مدرسہ کی یادگار کے طور پر ایک دینیات کا شعبہ برقرار ہے، جس کا معیار تعلیم مدارس کے نظام کے مطابق درجۂ اطفال سے بالا نہیں ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔

اس زوال کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب کچھ دانشور حضرات نے مدرسہ میں عصری تعلیم کی ضرورت پر زور دیا، سرسید تحریک سے متاثر شمسی برادران نے "فیض عام ایسوسی ایشن کانپور" قائم کیا، اور ۲۷/ اگست ۱۹۳۷ء کو سوسائٹیز ۱۸۶۰ء ایکٹ کے تحت اس کا باضابطہ رجسٹریشن کرایا گیا، پھر رفتہ رفتہ مدرسہ سے پرائمری اسکول اور جونیر ہائی اسکول کے منازل طے

157- شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص ۲۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی۔

کرتے ہوئے ۱۹۴۴ء میں یہ ہائی اسکول بن گیا، ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ سے اس کی امداد منظور ہوئی، اور بالآخر ۱۹۵۵ء یہ "صدیق فیض عام انٹر کالج" کی صورت اختیار کر گیا[158]۔

158- کالج میگزین ص ۱۱ -صدیق فیض عام انٹر کالج کانپور ۲۰۰۶ء-۲۰۰۷ء مضمون شیخ مصباح الحق ایڈوکیٹ کالج منیجر۔

مدرسہ فیض عام کانپور کی چند جھلکیاں

دارالعلوم کانپور

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے کانپور میں اس وقت دوسرے نمبر کا اور معیار تعلیم اور تعداد طلبہ کے لحاظ سے پہلے نمبر کا مدرسہ تھا، اس مدرسہ کو حضرت مولانا احمد حسن کانپوری ؒ نے مدرسہ فیض عام سے علٰحدگی کے بعد ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں (یا اس سے بھی قبل) مسجد رنگیان بکر منڈی نئی سڑک میں قائم فرمایا، مسجد رنگیان ایک قدیم مسجد تھی جس کے کتبہ پر سن تعمیر ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء درج ہے، اب اس کی نئی تعمیر ہو گئی ہے، اس لئے پرانے خدوخال رخصت ہو چکے ہیں۔

اس دارالعلوم کے قیام میں آپ کے ایک خاص مسترشد اور نیاز مند جناب حافظ امیر الدین صاحب ؒ پیش پیش تھے، جیسا کہ وہاں سے شائع ہونے والی بعض کتابوں کے اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے، ذمہ دار اور مدرس اول تو حضرت ہی تھے، لیکن یہ منیجر کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے اور غالباً محلہ کے متمول لوگوں میں تھے۔

دارالعلوم کانپور حضرت کی آرزوؤں اور علمی خدمات کا آخری مرکز تھا، اس مدرسہ سے بڑے بڑے علماء وفضلاء تیار ہوئے اور بہت سی علمی و تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں ۔ حضرت کانپوری ؒ تاحیات اسی مدرسہ سے وابستہ رہے، اور اسی مدرسہ سے متصل اپنے ذاتی مکان میں وفات پائی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت کے وصال کے بعد اس دارالعلوم کا رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا تھا اور بالآخر آہستہ آہستہ یہ بھی ماضی کے دبیز اندھیروں میں گم ہو گیا، حضرت کانپوری ؒ کے پڑپوتے جناب حافظ قاضی طاہر ظفر نیر صابری صاحب خطیب وامام مسجد رنگیان نئی سڑک کانپور کے بیان کے مطابق

۱۹۹۱ء تک یہ چراغ ٹمٹماتا رہا، اور پھر گل ہو گیا[159]۔۔۔۔۔۔

مسجد رنگیان اب بھی قائم ہے، اس سے متصل حضرت کانپوریؒ کا وہ مکان بھی موجود ہے جس میں اب آپ کی نسل آباد ہے، لیکن تاریخ کے اس روشن مینار کی ایک لکیر بھی موجود نہیں ہے۔۔۔۔۔ مسجد رنگیان کی تعمیر نو کے بعد اب اس مرحوم دارالعلوم کے کھنڈرات کا بھی تصور ممکن نہیں رہا۔۔۔ میں نے آس پاس کے کئی سن رسیدہ اور بزرگ حضرات سے دریافت کیا لیکن ان میں کوئی نہ دارالعلوم کو جاننے والا تھا اور نہ حضرت مولانا کانپوریؒ کو۔۔۔ رہے نام بس اللہ کا۔

---

[159] ۔حافظ قاضی طاہر ظفر نیر صابری کے والد ماجد کا نام مولانا حافظ شبیر احسن صابری ہے، مولانا شبیر احسن صاحب حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے صاحبزادہ مولانا محمد احسن صاحبؒ کے فرزند اکبر ہیں، اس طرح حافظ نیر صابری صاحب حضرت کانپوریؒ کے پڑپوتے ہیں، ۱۵/ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں ولادت ہوئی، قاری احتشام صاحب کے پاس حفظ کیا، قاری اقبال علی برکاتی سے تجوید مکمل کی، والد محترم کی نگرانی بھی رہی، کانپور یونیورسٹی سے ایم کام اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی، شاہ تصلی حسن کوڑا جہان آبادی سے بیعت ہیں، اب بزرگوں کی جگہ سنبھال رہے ہیں، ۲۰۱۱ء سے مسجد رنگیان کے امام وخطیب ہیں، خاندانی حالات سے بڑی حد تک واقفیت رکھتے ہیں، چہرہ سے خاندانی شرافت نمایاں ہے، متواضع اور خوش اخلاق ہیں، مجھے خاندان کے تعلق سے بہت سی قیمتی معلومات ان سے حاصل ہوئیں، اور ان کے پاس یہ معلومات ان کے والد ماجد اور دادی مرحومہ سے آئی ہیں، حافظ صاحب موصوف نے یہ تمام معلومات مجھے لکھ کر دی ہیں، فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

مسجد رنگیان کی نئی عمارت، جس میں دارالعلوم کانپور قائم ہوا اور برسوں اس کے حدود میں چلتا رہا

مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور

اس مدرسہ کے قیام کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ مدرسہ فیض عام سے نکلنے کے بعد سیدھے وطن واپسی کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن کانپور میں معقولات کے تو کئی مدرسے تھے، مگر خالص دینیات کا کوئی مدرسہ نہیں تھا، جناب عبد الرحمن خان صاحب مرحوم اور جناب حاجی کفایت اللہ صاحب نے آپ کو روک لیا اور جامع مسجد میں دینیات کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، حضرت تھانویؒ نے جامع مسجد نیز مختلف علوم وفنون کی جامعیت کی مناسبت سے مدرسہ کا نام جامع العلوم تجویز فرمایا، اور اس مدرسہ کے آپ صدر مدرس قرار پائے، یہ مدرسہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء کے اواخر میں قائم ہوا۔۔۔۔۔

حضرت تھانویؒ ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء تک تقریباً چودہ (۱۴) سال اس مدرسہ کے صدر مدرس رہے، آپ کی علمی شہرت یہیں سے ہوئی، یہیں آپ کے شخصی اور روحانی کمالات کے جوہر ظاہر ہوئے، یہاں کے لوگوں کے اخلاق ومحبت، علم نوازی اور دین دوستی کے آپ ہمیشہ قدردان رہے[160]۔

قدیم مدارس میں یہی ایک مدرسہ ہے جو آج بھی اپنی روایات پر پورے آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔

مدرسہ احسن المدارس

یہ مدرسہ بھی حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ ہی کا قائم کردہ ہے آپ نے اپنے صاحبزادہ مولانا محمد احسنؒ (متوفی ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۵ء) کے نام پر ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں اس کی بنیاد رکھی، یہ مدرسہ بھی نئی سڑک ہی پر واقع ہے، مدرسہ کے قیام میں مولانا

---

160 -اشرف السوانح ص ۱۴۱۔

فقیر محمد صاحبؒ حضرت کانپوریؒ کے شریک سفر اور معاون رہے ،یہ آپ کے ساتھی تھے ،یہ مدرسہ اب بھی قائم ہے اور چل رہاہے ،مگر اس کا معیار مکتب سے بلند نہیں ہے، حضرت کے اہل خانہ کے ہی ہاتھ میں اس کا انتظام وانصرام ہے[161] ۔

مدرسہ الٰہیات کانپور

یہ بھی کانپور کا ایک اہم ترین ادارہ تھا، جس نے ملک کی آزادی میں بڑا رول ادا کیا، اس کی بنیاد مولانا عبد القادر آزاد سبحانی نے ۱۶/ شعبان ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۳/ ستمبر ۱۹۰۸ء میں رکھی ، مولانا سبحانی کی ولادت بلیا ضلع کے سکندر پور گاؤں میں ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں ہوئی، آپ نے اس دور کے بڑے جید علماء سے استفادہ کیا، کچھ دن فرنگی محل لکھنؤ میں بھی تعلیم حاصل کی ، ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں کانپور تشریف لائے ،یہ شہر ان کو اتنا پسند آیا کہ ساری زندگی یہیں گذار دی۔

ان کا یہ مدرسہ ابتدامیں پریڈ میدان کے سامنے واقع تھا مگر بعد میں چمن گنج منتقل ہو گیا، جو تقسیم ہند تک چلتا رہا[162]۔

یہ چند بڑے اور اہم مدارس کا تذکرہ ہے ،ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے کتنے مدرسے ہونگے جن کے آج نام ونشان بھی موجود نہیں ہیں، اس سے اس شہر کی مرکزیت اور عظمت علمی کا پتہ چلتا ہے۔

یہی حال شخصیات کا بھی ہے ، جس طرح مدارس کا جال بچھا ہوا تھا، اسی طرح علماء داعیان کی بھی بڑی تعداد یہاں موجود تھی ، کئی اکابر شخصیات کے تذکرے پچھلے صفحات میں

---

[161] یہ معلومات حافظ نیر صابری صاحب نے دی ہیں۔

[162] کالج میگزین، صدیق فیض عام انٹر کالج کانپور ص ۱۶۔

آ چکے ہیں، البتہ جس زمانے میں حضرت مولانا عبد الشکور آہ کانپور پڑھنے کے لئے آئے تھے سب سے مرکزی شخصیت حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی تھی، ان کو استاذ زمن، استاذ الکل، اور ملا متون وغیرہ کہا جاتا تھا، ہر آنے والے طالب علم کی پہلی ترجیح حضرت والا ہی کی شخصیت ہوتی تھی، یہ وہ مقام ہے جو حضرت کانپوریؒ کے ماسوا پورے شہر میں اس وقت کسی کو حاصل نہ تھی۔

حضرت مولانا احمد حسن فاضل کانپوریؒ

علماء کانپور میں حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی شخصیت بے حد ممتاز تھی، آپ صدیقی النسل تھے، شجرۂ نسب مولانا جلال الدین رومیؒ سے ہوتا ہوا حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر ملتا ہے، آپ کے دادا شیخ عظمت علیؒ مدینہ منورہ سے ہجرت فرما کر پنجاب کے پٹیالا ضلع کے "ڈسکا گاؤں" میں بس گئے تھے۔

بچپن میں پڑھنے کی طرف بالکل رجحان نہیں رکھتے تھے، ۲۰/برس کی عمر تک کچھ بھی نہیں پڑھا، ایک بار آپ کے ایک دوست کا خط آیا تو کسی دوسرے شخص سے پڑھوانے کے لئے گئے، والد محترم نے دیکھا تو فرمایا مولانا روم کی اولاد میں ہو اور اپنا خط بھی خود نہیں پڑھ سکتے، یہ بات ان کے دل میں اتر گئی، پھر حصول علم کی طرف اس قوت کے ساتھ مائل ہوئے کہ صرف پانچ (۵) سال کی مدت میں تمام علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی۔

کہتے ہیں کہ شروع میں ان کو مباحثہ و مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی، ایک دن کسی مناظرہ سے فارغ ہو کر گھر تشریف لے جا رہے تھے، کہ راستے میں کسی بزرگ سے ملاقات ہوگئی، بزرگ نے مولانا کی صورت دیکھتے ہوئے فرمایا کہ:

"کب تک تاریکی میں بھٹکتے رہوگے اگر اپنی قبر روشن کرنا چاہتے ہو تو حدیث پڑھو"

بزرگ کے یہ الفاظ تیر بن کر کلیجے میں پیوست ہوگئے اور آپ علم حدیث کی تکمیل کے لئے اپنا آبائی وطن پٹیالہ چھوڑ کر لکھنؤ کے لئے نکل پڑے، لکھنؤ میں آپ نے حضرت مولانا

عبد الحی فرنگی محلیؒ[163] سے حدیث کی تعلیم حاصل کی[164]۔

اس کے بعد دیگر علوم وفنون کی تکمیل کے لئے علی گڑھ پہونچے اور حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحبؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا اور فراغت حاصل کی۔۔۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ سے بھی آپ نے علمی استفادہ کیا، آپ کو حضرت سے بے حد عقیدت تھی، اسی لئے فراغت کے بعد انہوں نے حضرتؒ سے مرید ہونے

163۔حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلیؒ ہندوستان کے ممتاز اور نامور عالم وفقیہ اور محدث ومؤرخ اور مصنف تھے، والد ماجد کا اسم گرامی "مولانا عبدالحلیم تھا، آپ کی ولادت باندہ شہر میں ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوئی، درسیات کی اکثر کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، بعض کتابیں مفتی نعمت اللہ صاحبؒ سے پڑھیں، سترہ (۱۷) سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے، اس کے بعد ایک زمانے تک حیدرآباد میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں، دوبار حج وزیارت کی سعادت حاصل ہوئی، ۱۲۷۹ھ میں والد کے ساتھ، اور ۱۲۹۳ھ میں والد کے وصال کے بعد، حجاز مقدس میں بڑے علماء سے اجازت حدیث حاصل کی، پھر حیدرآباد سے رخصت لے کر اپنے وطن لکھنؤ میں مقیم ہوگئے، اور صبر وقناعت کی زندگی گذاری، اور تاحیات درس وتدریس اور تصنیف وتحقیق کے کام میں مصروف رہے، تمام علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل تھی، اہل علم کے مجمع میں ہوتے تو ان کے سامنے کسی کو مجال گفتگو نہ ہوتی، تمام حضرات خاموشی کے ساتھ آپ کی گفتگو سنتے تھے، حنفی المسلک ہونے کے باوجود مجتہدانہ صلاحیت کے حامل تھے۔۔۔ آپ نے مختصر سی عمر میں علم صرف ونحو، لغت، منطق وفلسفہ، نسب وتاریخ، فقہ وحدیث، ادب اور شعر وشاعری وغیرہ اکثر علوم وفنون پر بے شمار کتابیں لکھیں، انتالیس (۳۹) سال کی عمر میں ۲۹/ربیع الاول ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۶/دسمبر ۱۸۸۶ء کو وفات پائی، جنازہ میں ہر مسلک ومشرب کے لوگ بے شمار تعداد میں شریک ہوئے، تین بار نماز جنازہ پڑھی گئی، جنازہ میں صاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی لکھنویؒ بھی شریک تھے، یہ تمام تفصیلات انہوں نے قلمبند کی ہیں۔ (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۲۶۸ تا ۱۲۶۹)

164۔شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص ۶۵، ۶۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی ۲۰۰۱ء۔ مقام اشاعت: شاہراہ سعدی، کلفٹن، بلاک ۲ کراچی پاکستان۔ یہ دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس پر کراچی یونیورسٹی نے مصنف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ کتاب کے مصنف کا آبائی تعلق کانپور سے ہے، والد کا نام حافظ سید محمد حسین مرحوم ہے، صاحب کتاب ایک معتبر محقق ہیں، ان کی کئی تحقیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

کی خواہش ظاہر کی، شاہ صاحبؒ نے فرمایا میں تمہیں ضرور مرید کرتا لیکن میرے بھائی" امداد اللہ" نے اللہ سے تمہیں مانگ لیا ہے تمہارا حصہ انہی کے پاس ہے[165] ـــــ اس طرح آپ ہی کے ایما پر آپ مکہ معظمہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔

فراغت کے بعد بہت دنوں تک مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں مدرس رہے۔

مدرسہ فیض عام کانپور سے وابستگی

پھر کانپور تشریف لائے اور حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحبؒ کی علٰحدگی کے بعد مشہور زمانہ مدرسہ فیض عام کانپور کے منصب صدارت کو زینت بخشی اور ایک طویل مدت تک اس منصب پر فائز رہے، متعدد علوم وفنون کی ۱۵ کتابوں کا روزانہ پوری قوت وتوجہ کے ساتھ درس دیتے تھے، کاشغر، شام، موصل، حلب، بخارا، افغانستان، سرحد وغیرہ کے بکثرت علماء نے آپ سے درس لیا، درس وتدریس میں آپ اپنے زمانہ میں ثانی نہیں رکھتے تھے ـــــ

آپ کے استاذ حضرت مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ نے آپ کی تالیف "تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان" کی تقریظ وتصدیق میں آپ کو

"مالک ازمۃ التحقیقات الشرعیۃ والتدقیقات الفلسفیۃ، النحریر الکامل، البحر الفاضل الذی یفتخر بوجودہ الزمن المولوی احمد حسن "

کے گراں قدر خطابات سے یاد کیا ہے، آپ نہایت قوی الحفظ اور ذہن رسا کے مالک تھے، ساٹھ (۶۰) متون آپ کو ازبر یاد تھیں، اسی بنا پر آپ کو " ملا متون " بھی کہا جاتا تھا۔

---

[165] یہ بات حضرتؒ کے پڑپوتے جناب حافظ تنیر صابری صاحب نے مجھے تحریر کر کے بھیجی ہے۔

مدرسہ فیض عام کانپور سے علٰحدگی اور دارالعلوم کانپور کا قیام

۱۳۰۰ھ کے اواخر میں کسی بات سے بددل ہوکر آپ نے مدرسہ فیض عام سے علٰحدگی اختیار کرلی اور حافظ امیر الدین صاحب وغیرہ کی مدد سے نئی سڑک مسجد رنگیان بکرمنڈی میں "دارالعلوم کانپور" کے نام سے ایک نئے ادارہ کی بنیاد ڈالی، اور اسی ادارہ کو ان کے آخری تعلیمی وتربیتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی، زندگی کی آخری سانس تک آپ اسی مدرسہ سے مربوط رہے[166]۔

آپ نے ایک شادی کانپور ہی میں کی اور یہیں دارالعلوم سے متصل محلہ بکرمنڈی میں اپنا مکان بنوایا اور مستقل رہائش اختیار کرلی۔

تین بار حجاز مقدس کا سفر کیا اور حج وزیارت مقامات مقدسہ سے مشرف ہوئے اور ہر مرتبہ سال دو سال حرمین شریفین میں قیام فرمایا۔۔۔۔وہیں سرزمین پاک پر حضرت شیخ حاجی امداد اللہ تھانویؒ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت سے مشرف ہوکر ہندوستان واپس تشریف لائے، حضرت حاجی صاحبؒ کے حکم پر آپ نے "مثنوی مولائے روم" کی شرح لکھی، اس سے حضرت حاجی صاحبؒ سے آپ کے خاص تعلق اور آپ کے علم وفہم پر حضرت کے اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت کانپوریؒ کی امتیازی خصوصیات

تدریسی انفرادیت میں آپ کی شخصیت پورے ملک میں ممتاز تھی، معقول ومنقول دونوں میں کمال حاصل تھا، ان کے درس نے ملک گیر بلکہ عالمگیر شہرت حاصل کی، شام وخراسان اور موصل وحلب تک کے طلبہ آپ کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے، اپنی درسی خصوصیات

---

[166]۔شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص۲۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی۔

اور تدریسی انہماک وفنائیت کے لحاظ سے پورے ہندوستان میں ان کی کوئی نظیر تھی، صاحب نزہۃ الخواطر حضرت مولانا عبد الحی لکھنوی ؒ ان کے مناقب ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"فاضل مکرم علامہ احمد حسن حنفی پٹیالوی کانپوری ؒ ان علماء کرام میں سے ہیں جو زیادہ سے زیادہ درس دینے اور لوگوں کو فائدے پہنچانے میں مشہور ہیں۔ آپ کے بے حساب شاگرد ہوئے، آپ بہت بڑے عالم اور امام تھے۔ دینداری میں بے حد محبوب و مقبول تھے۔ پرہیز گار اور متواضع بھی تھے، بہت زیادہ عقل مند، بہترین اخلاق کے مالک، تمام اچھے اوصاف وکمالات کے حامل، اچھی معاشرت والے، لوگوں کو بہت زیادہ نصیحتیں کرنے والے، اور اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت محبت کرنے والے، کم سخن، لوگوں سے کنارہ کش، دنیاداروں کے پاس آمدو رفت سے گریز کرنے والے، تھوڑے پر قناعت کرنے والے، تکلفات سے دور، منصف مزاج، طلبگاروں کو خوش آمدید کہنے والے، معمولات کے بے حد پابند، تدریسی انہماک کے حامل، بہت ہی صابر، کسی تنگدلی اور رنجش کے بغیر اپنے درس کو جاری رکھنے والے، درس وتدریس میں بے تکان شب وروز مشغولیت کے باب میں آپ کے مثل کسی بھی عالم سے اب تک میں واقف نہیں ہو سکا ہوں۔۔۔ فنون۔ منطق، حکمت واصول اور کلام۔ کی اہم کتابوں کا درس دیتے، مختلف علوم کے دقیق مسائل سے بحث کرتے تھے اور اہم کتابوں کے اسباق ہر روز پندرہ (۱۵) گھنٹے پڑھاتے تھے۔۔۔ اسی حالت میں ان کو بواسیر کا مرض لاحق ہو گیا جس سے بدن سے بہت زیادہ خون نکل جاتا، پھر بھی درس سے رخصت نہیں لیتے تھے

بالآخر جب بہت زیادہ کمزوری ہو گئی، تو ڈاکٹروں نے بالکلیہ پڑھانے پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن یہ اپنی عادت سے باز نہیں آئے اور درس کا سلسلہ بدستور جاری رکھا یہاں تک کہ روح جسم سے پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون (ترجمہ)[167]۔

☆ تحریک ندوہ شروع ہوئی تو اس کے کئی جلسوں کی آپ نے صدارت بھی فرمائی۔

☆ آپ شہر کانپور کی عید گاہ کے امام بھی تھے۔

تصنیفات و تالیفات

☆ آپ کی تحریری خدمات میں قرآن کریم کی تفسیر کا ذکر کیا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اس کا قلمی نسخہ عرصہ تک مولانا الحاج جیلانی صدر المدرسین مدرسہ اسلامی عربی میرٹھ، کے پاس رہا، اس کے بعد مولانا شاہ وصی احمد سہسرامی سابق شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ مراد آباد کے پاس منتقل ہوا[168]۔ اس کے بعد کی خبر نہیں ہے۔

☆ شرح ترمذی - یہ بھی غالباً قلمی ہی رہ گئی، طباعت کی نوبت نہیں آسکی۔

☆ آپ کے علمی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ مثنوی مولانا رومؒ پر حواشی کی صورت میں موجود ہے، اس مثنوی کا ترجمہ تو خود آپ کے پیر طریق حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے کیا تھا، لیکن تحشیہ کا کام حضرت حاجی صاحبؒ کے حکم سے آپ نے کیا، جسے مطبع نامی نے بڑی آب و تاب اور روایتی حسن کے ساتھ ۱۹۰۰ء میں شائع کیا[169]۔

☆ افادات احمدیہ

---

167 - نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۱۸۰ مصنفہ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ۔

168 - بحوالہ اسکالرڈاٹ ضیائے طیبہ ویب سائٹ، مولانا احمد حسن کانپوری۔

169 - شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص ۶۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی۔

☆ حمد اللہ کی شرح سلم کا مفصل حاشیہ تحریر فرمایا۔

☆ امکان کذب باری کے متنازع مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ "تنزیہ الرحمن" تحریر فرمایا جس میں دلائل کلامیہ سے امتناع کو ثابت کیا ہے۔

مجھے حضرت کانپوریؒ کی دوسری کتابیں تو نہ مل سکیں، البتہ میرے پاس امتناع کذب کے مسئلے پر ان کا رسالہ "تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان "موجود ہے یہ کتاب دراصل امکان کذب کے تعلق سے ایک استفتاء کا تفصیلی جواب ہے، اس میں کلامی دلائل کے ذریعہ کذب باری تعالیٰ کے امتناع کو ثابت کیا گیا ہے، اور کچھ نقلی دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں، کتاب اردو زبان میں ہے۔

ناشر کتاب نے ابتدا میں لکھا ہے کہ حضرت کا یہ تفصیلی فتویٰ اس قدر مقبول و مشہور ہوا اور ملک کے مختلف حصوں سے اس کی اتنی نقلیں طلب کی گئیں کہ مجبوراً کتابی صورت میں اس کی طباعت کا فیصلہ کیا گیا۔

حضرت کی یہ تحریر ۱۳۰۶ھ م ۱۸۸۹ء کی ہے جب کہ آپ ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۴ء ہی میں مدرسہ فیض عام سے الگ ہو چکے تھے اور حافظ امیر الدین وغیرہ کی مدد سے مسجد رنگیان (نئی سڑک) میں ایک الگ مدرسہ "دارالعلوم کانپور" کے نام سے قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ تحریر کے اختتام پر آپ نے لکھا ہے:

> "حررہ افقر عباد ذی المنن عبدہ احمد حسن عصمہ اللہ عن آفات یوم المحن بفضلہ الخفی والعلن المقیم فی بلدۃ کانفور صانہ اللہ عن الشرور، المدرس فی دار العلوم فی آخر عشرۃ ذی الحجۃ ۱۳۰۶ھ[170]۔

[170] تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان ص ۲۳

اسی طرح کتاب کے آخر میں مدرسہ دارالعلوم کانپور کی طرف سے جناب حافظ امیر الدین صاحب نے یہ اشتہار شائع کیا ہے:

"ایمان والوں کو مژدہ ہو کہ ان دنوں یہ نادر رسالہ "تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان "جو یکتائے زمن حضرت مولانا احمد حسن صاحب عم فیضہم کی تحقیقات نادرہ سے ہے، ۱۳۰۷ھ میں چھپ کر اہل ایمان کے لئے حرز جان اور صاحبان بصیرت کے لئے قوت نظر ہوا ہے، اس گوہر گرانمایہ کی خریداری جنہیں منظور ہو، وہ چار آنہ قیمت اور آدھ آنہ محصول ڈاک بھیج کر مدرسہ دارالعلوم کانپور سے طلب فرمائیں، جو دس بیس نسخے خرید کریں گے ان سے تخفیف کی جائے گی، حق تالیف محفوظ رکھا گیا ہے، کوئی صاحب بلا اجازت جناب مؤلف طبع کا عزم نہ کریں جس قدر نسخے منظور ہوں مشتہر سے طلب فرمائیں۔

المشتہر: حافظ امیر الدین مدرسہ دارالعلوم کانپور"[171]۔

یہ کتاب محرم الحرام ۱۳۰۷ھ م ۱۸۹۰ء میں منشی عبدالعزیز کے مطبع "مطبع عزیزی" سے شائع ہوئی۔۔۔۔

اصل کتاب ص ۶۳ پر پوری ہو گئی ہے، اس کے بعد علماء کی تقریظات ہیں جو ص ۸۴ تک گئی ہیں۔۔۔۔

پہلی تقریظ حضرت مصنف کے استاذ محترم حضرت مولانا لطف اللہ علی گڈھی ؒکی ہے ، جن کے لئے یہ بلند الفاظ استعمال کئے گئے ہیں:

---

[171] ۔ تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان ص ۸۴

"صورة ماقرظه فخر العلماء الكرام صدر الفضلاء العظام استاذ اساتذة الهند والشام محط رحال الفخام آية من آيات الله الحضرة مولانا محمد لطف الله دامت بركاتهم و عمت فيوضاتهم ولقد اجاد فيما افاد[172]۔

حضرت مولانا لطف اللہؒ کی تقریظ عربی میں ہے، آپ نے وقیع الفاظ میں اپنے شاگرد حضرت مولانا احمد حسن کانپوری کا ذکر کیا ہے، اور ان کو "فخر زمانہ" قرار دیا ہے اور ان کی تحقیقات علمیہ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

ان کے علاوہ حضرت مولانا مفتی عبداللہ ٹونکیؒ استاذ مدرسہ بیت العلوم لاہور[173]، حضرت مولانا عبدالحی سورتیؒ[174]، حضرت مولانا نور محمد پنجابیؒ[175] (تلامذہ حضرت

[172] ۔ تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان ص ۶۳ - ۶۴۔

[173] ۔مفتی عبداللہ ٹونکیؒ ہندوستان کے مشہور علماء میں ہیں، حضرت مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے شاگرد ہیں، کچھ دنوں مدرسہ عبدالرب دہلی میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر لاہور اورینٹیل کالج میں ایک عرصہ تک مدرس رہے، اور وہاں کافی عزت ووقار حاصل ہوا، ان کے علاوہ دارالعلوم لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بھی آپ مدرس رہے ہیں، آخر میں فالج کی وجہ سے اپنے صاحبزادے انوارالحق کے پاس بھوپال چلے گئے اور ۱۳۳۹ھ م ۱۹۲۰ء میں وہیں وفات پائی، منطق وفلسفہ اور شعر وادب پر کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں

(نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۲۹۱ مصنفہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ)

[174] ۔مولانا عبدالحی سورتیؒ کا تعلق کفلیتہ گجرات سے تھا، بڑے صاحب تصنیف علماء میں گذرے ہیں، رنگون کی جامع مسجد میں خطیب تھے، اور وہیں ۱۳۳۱ھ م ۱۹۱۳ء میں انتقال فرمایا (نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۲۶۷ مصنفہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ)

[175] ۔مولانا نور محمد پنجابی شاہ پور پنجاب میں ۱۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے، آپ نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں مولانا عبدالرحمن ملتانیؒ، مفتی عبداللہ ٹونکیؒ، مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ اور مولانا احمد حسن کانپوریؒ مشہور ہیں، طب حکیم غلام

کانپوریؒ) وغیرہ کی تحریریں ہیں، اس طرح ۸۴ صفحات کی یہ کتاب انتہائی دقیق علمی مباحث پر مشتمل ہے، اور حضرت کے علم و فضل کی شاہکار ہے، اور اس سے بجاطور پر ان کے علمی تبحر اور عظمت و عبقریت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وفات حسرت آیات

آپ کا سانحۂ ارتحال ۳/ صفر ۱۳۲۲ھ م ۱۸/ اپریل ۱۹۰۴ء کو کان پور میں پیش آیا[176]، وصیت کے مطابق رئیس الاتقیا حضرت مولانا شاہ محمد عادل کانپوری قدس سرہ نے نماز جنازہ کی امامت کی[177]، تکیہ بساطیان (قبرستان) کانپور میں آپ کی قبر انور ہے۔

مولانا سید شاہ ابوسعید رحمانی ایرانی نے قطعۂ تاریخ وفات لکھی، جس کے دو اشعار یہ ہیں

رضا دہلوی سے پڑھی، تصوف و سلوک کی تعلیم حضرت فضل رحماں گنج مرادآبادیؒ سے حاصل کی، فتحپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، شاگردوں کی بڑی تعداد ہوئی، ۸/ رجب ۱۳۴۲ھ م ۱۳/ فروری ۱۹۲۴ء میں وفات پائی، فتحپور میں مدفون ہیں۔
(نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۳۹۷ مصنفہ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ)

176 -نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۱۸۰ مصنفہ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ۔

177 -حضرت مولانا شاہ محمد عادل کانپوری الحنفیؒ کانپور کے ممتاز عالم و فقیہ اور صاحب سلسلہ بزرگ تھے، والد ماجد کا نام "محی الدین" ہے، ولادت ۱۱/ ربیع الثانی ۱۲۴۱ھ مطابق ۲۳/ نومبر ۱۸۲۵ء کو مقام نارہ ضلع الہ آباد میں ہوئی، تعلیم مولانا غلام محمد کوئیؒ، مولانا عبد اللہ الحسینی الواسطی البلگرامیؒ اور علامہ سلامۃ اللہ بدایونیؒ سے حاصل کی، طریقۂ صوفیا کی تعلیم شیخ عبد العزیز قادری دہلویؒ سے حاصل کی، اور آپ کی اجازت و خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد شہر کانپور میں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد علامہ شیخ سلامت اللہ کشفی بدایونی قادریؒ کی خانقاہ میں مسند نشیں ہوئے شیخ صاحب نے نیل والی گلی ناج گھر برہانا روڈ کانپور میں کانپور کا پہلا دارالافتا قائم کیا تھا، آپ نے پوری عمر افتاء اور تدریس میں گذاری، معقولات میں بھی گہرا درک حاصل تھا، خوش اخلاق اور محبت کرنے والے انسان تھے، ہر ہفتہ جمعہ کی نماز کے بعد ذکر کی مجلس ہوتی تھی، شیخ سلامت اللہ کے معمول کے مطابق آخری عمر تک پانچوں نمازوں کی امامت خود فرمائی، چند کتابیں بھی یادگار چھوڑیں جن کے نام یہ ہیں:

☆تنزیہ الفؤاد عن سوء الاعتقاد، *تحقیق الکلام فی التداوی بالشیئ الحرام، *اکتساب الثواب ببیان حکم ابدان المشرکین والمؤاکلۃ مع اہل الکتاب۔

مظہر لطف اللہ و مصدر امداد حق

روضۂ اقدس جناب حضرت احمد حسن

فضل رحمانی بگویا لطف امداد اللہ

مرقد انفس جناب حضرت احمد حسن[178]

حضرت کانپوریؒ کی اولاد

حضرت کانپوریؒ کے تین نکاح ہوئے تھے:

(۱) پہلی زوجہ ہم وطن تھیں پنجاب کے "ڈیسکہ" سے تعلق تھا لیکن نکاح کانپور آکر ہوا تھا۔

(۲) دہلی کے سید میر عنایت جو 1857 کے غدر میں برباد ہونے کے بعد کانپور کے محلہ پٹکاپور میں آکر بس گئے تھے، دوسرا نکاح ان کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔

میر صاحب کی بڑی صاحبزادی کا نکاح ایک اور جید عالم دین مولانا وصی احمد محدث سورتی پیلی بھیتی کے ساتھ ہوا تھا محدث سورتی مدرسہ فیض عام میں استاد زمن کے ساتھ مدرس تھے۔

دہلی جامع مسجد کے پاس واقع رشیدیہ کتب خانہ میر صاحب کے اہل خاندان کا ہی ہے۔

(۳) تیسرا نکاح لکھنؤ میں ہوا تھا۔

تینوں زوجہ تکیہ بساطیان کانپور میں حضرت کے پاس ہی مدفون ہیں۔

حضرت شاہ احمد حسن کانپوری کے چھ (۶) صاحبزادگان اور چار (۴) صاحبزادیاں تھیں:

ابن صفی اور نوح ناروی ادب میں آپ کے شاگرد تھے، وفات ۹/ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۳/ جنوری ۱۹۰۸ء کو ہوئی۔

(نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۳۶۴ مصنفہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ، کچھ باتیں حافظ نیر صابری کی تحریر سے بھی لی گئی ہیں)

[178] بحوالہ اسکالرڈاٹ طیبہ ویب سائٹ۔

(۱)☆بڑے فرزند حضرت مولانا مشتاق احمد کانپوریؒ بڑے علماء میں گذرے ہیں،
حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کے درسی ساتھیوں میں تھے[179]

اپنے والد گرامی کے علاوہ مولانا شاہ عبید اللہ پنجابی کانپوریؒ سے علوم وفنون کی تکمیل کی ،معلمی کی ابتدا اپنے والد کے مدرسہ " دارالعلوم مسجد رنگیان کانپور" سے کی ،بارہ تیرہ برس مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں صدر مدرس رہے ،دار لعلوم معینیہ اجمیر شریف ،جامعہ شمس العلوم بدایوں،اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بھی صدر مدرس اور پرنسپل رہے ،مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں بھی شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر کے عہدوں پر کام کیا،میرٹھ کے مشہور "مدرسہ اسلامی "میں بھی صدر مدرس رہے ،۔۔۔

بیعت اپنے والد ماجد سے تھے ،عید کا چاند دیکھ کر اعتکاف سے نکلے اور گھر تشریف لائے ،اور اسی شب میں بتاریخ یکم شوال ۱۳۵۲ھ م ۱۶ / جنوری ۱۹۳۴ء وصال فرمایا،والد کے پہلو میں بساطی قبرستان کانپور میں گنبد کے اندر ابدی نیند سو رہے ہیں، آپ کے ایک صاحبزادہ کا نام حافظ امداد اللہ تھا[180]۔

استاد زمن کے وصال کے بعد آپ امام عید گاہ بھی ہوئے۔

(۲)دوسرے فرزند حضرت مولانا مفتی حافظ نثار احمد کانپوریؒ تھے[181]،جو بڑے عالم دین اور تحریک خلافت کے سر کردہ رہنماؤں میں تھے، آپ بھی اپنے والد محترم کے شاگرد تھے، آگرہ کے مفتی اعظم تھے، مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے نئی سڑک کانپور گرجا گھر پر مسلم لیگ کا نہایت ہی عظیم الشان تاریخی جلسہ آپ ہی کی دین تھا ،ریشمی رومال تحریک کے روح رواں

179۔ جنۃ الانوار ص ۱۱۱ اول ایڈیشن۔

180۔ تحریر حافظ نیر صابری صاحب، نیز اسکالر ڈاٹ طیبہ ویب سائٹ پر بھی یہ معلومات موجود ہیں۔

181۔ درس حیات —مرتبہ: قاری فخر الدین گیاوی ص ۱۲۶۔

تھے۔

ان کو کراچی کے مشہور مقدمۂ بغاوت میں جس کی سماعت "خالقدینا ہال" میں ہوئی تھی سزا سنائی گئی تھی، اس مقدمہ کے دوسرے ماخوذین میں مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر کچلو، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حیدر آباد سندھ کے پیر غلام مجدد سرہندیؒ اور جگت گرو شنکر اچاریہ شامل تھے، مولانا نثار احمد کانپوری کو ۱۵ / ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا حسرت موہانیؒ کے "خلافت سودیشی اسٹور" سے گرفتار کیا گیا تھا[182]۔

آپکا مناظرہ حجاز مقدس میں غیر مقلدوں کے ساتھ ہو رہا تھا اسی دوران پان میں زہر

دے کر شہید کر دیئے گئے، جنت البقیع میں مدفون ہیں، لاولد تھے۔

(۳) حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ: آپ "مولانا مٹھائی والے" اور "مولانا بدو" کے نام سے بھی مشہور تھے، اپنے والد محترم کے شاگرد تھے، نئی سڑک کی مشہور سنہری مسجد کے پہلے خطیب و امام آپ ہی تھے اور تاعمر امام رہے اور تراویح بھی سناتے رہے۔

آپ بہت ہی دبنگ قسم کے شخص تھے علاقہ کے لوگوں پر یہاں تک کہ آس پاس کے غیر مسلموں پر بھی بڑا دبدبہ تھا انکے رعب کی وجہ سے ہی کبھی کوئی غیر مسلم اس دور میں مسلمانوں سے زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔

انکی مٹھائی کی دکان نئی سڑک پر روٹی والی گلی میں بڑی مشہور تھی، حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ نے ان کا ذکر خیر اسی نسبت سے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے:

---

[182]۔ شہر ادب کانپور مرتبہ: ڈاکٹر سید سعید احمد ص ۶۶ مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی

"مشہور صاحب درس عالم محشی مثنوی مولانا روم "مولانا احمد حسن کانپوری مرحوم" کے مجھلے صاحب زادے جو خود عالم بھی تھے، کان پور میں صرف غالباً امرتیاں یا اور بھی دو ایک مٹھائی خاص طریقے سے بناتے تھے بناتے کیا تھے، اپنی نگرانی میں بنواتے تھے، لیکن چونکہ ہر چیز مٹھائی میں دیانت داری سے دی جاتی تھی، گھی بھی خالص ہوتا تھا، دوسرے اجزاء بھی خالص، دھوکہ فریب جو عام جاہل حلوائیوں کا شیوہ ہے، نہ دیا جاتا تھا، آج کانپور میں سیکڑوں آدمی اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ بننے کے گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مٹھائی کا ملنا ناممکن تھا، خریدار گدھ کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے بسا اوقات پیشگی دے کر اپنا حصہ آدمی کو محفوظ کرانا ہوتا تھا، حالانکہ اسی کان پور میں سیکڑوں حلوائی صبح سے شام تک بیٹھے دکانوں پر مکھیاں مارا کرتے تھے،------ مولانا کی مٹھائی سارے کانپور میں زبان زد عام تھی[183]۔

آپ بھی لاولد تھے۔

(۴) حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب: آپ بھی اپنے والد محترم ہی کے شاگرد تھے، "مسجد مولوی محمد عابد طلاق محل" میں امام تھے، لاولد تھے۔

(۵) حضرت مولانا محمد احسن صاحبؒ، والد محترم کے پاس تعلیم کا آغاز کیا لیکن آپ بارہ (۱۲) برس کے تھے کہ والد محترم کا وصال ہو گیا، بقیہ تعلیم برادر اکبر مولانا مشتاق صاحب کے پاس مکمل کی، سادہ طبیعت کے شخص تھے۔

حضرت کانپوریؒ نے انھیں کے نام پر "مدرسہ احسن المدارس" قائم کیا، اپنے نانا کی

---

[183] ۔نظام تعلیم وتربیت ج۱ص ۱۳۲، ۱۳۱ط مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی، مئی ۲۰۰۰ء۔

جگہ مسجد چھوٹی عید گاہ نئی سڑک کانپور میں امامت فرماتے تھے تا عمر اسی مسجد میں امام رہے، والد محترم کے پیر بھائی مولانا افضل احمد بخاری کی صاحبزادی سے نکاح ہوا، انکے انتقال کے بعد دوسرا نکاح شاہ ولایت صاحب آگرہ کے خاندان میں ہوا، انتقال ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

مولوی محمد شفیع الدین مکیؒ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے ان سے بیعت وخلافت حاصل تھی، آپ صاحب اولاد تھے۔

(٦)حاجی محمد حسن صاحب: یہ حضرت مولانا شاہ احمد حسن کانپوریؒ کے فرزند اصغر تھے، اپنے بھائی مولانا محمد احسن صابری صاحب کی تربیت میں رہے، ۱۸/ برس کی عمر میں حج کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے، اور ۲۰/ برس کی عمر ہی میں انتقال ہوگیا، نکاح بھی نہیں ہوا تھا۔

حضرت کانپوریؒ کی چار (۴) صاحبزادیاں تھیں:

(۱)منور جہاں: صاحب سجادہ مخدوم صابر پاک شاہ عبد الرحیم صاحب کے نکاح میں تھیں، ان سے دو بیٹے ہوئے۔

(۲)نور جہاں انکا نکاح بھی کلیر شریف کے ایک سادات خاندان میں ہوا تھا ان کے ایک پوتے بلال کلیر شریف میں موجود ہیں۔

(۳)آمنہ بیگم: انکا نکاح شاہ عظیم الدین فریدی فتحپور سیکری حضرت شیخ سلیم چشتی کے خاندان میں ہوا تھا، اردو ادب کی عظیم الشان ہستی دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مغیث الدین فریدی صاحب انکے صاحبزادے تھے دیگر دو بیٹے ستار فریدی اور معین فریدی تھے۔

(۴)عائشہ بیگم: انکا نکاح حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ شاہ افضل احمد بخاری کے بیٹے مولانا محمد قاسم صاحب سے ہوا تھا، کم عمری میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں، اپنے بڑے بھائی مولانا محمد احسن صابری صاحب کی سرپرستی میں رہیں ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۸ء میں انتقال

کیا۔۔۔۔۔۔لاولد تھیں[184]۔

مدرسہ احسن المدارس جس کو حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ نے قائم کیا تھا۔

مسجد رنگیان (سابق دار العلوم کانپور) سے متصل مولانا احمد حسن کانپوریؒ کا مکان جہاں آپ کی وفات ہوئی۔

184-اولاد اور خاندان کے تعلق سے اکثر معلومات جناب حافظ نیر صابری صاحب سے حاصل شدہ ہیں، جو حضرت کانپوریؒ کے خاندان کے ایک معزز فرد ہیں۔

کانپور مرکز علم بھی اور مرکز محبت بھی

بہر حال یہ پس منظر، بڑے بڑے علماء اور مشائخ کا ورود و نزول اور عظیم ہستیوں کے ذریعہ نوع بنوع مدارس اور اداروں کا قیام کانپور کی علمی اور مرکزی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، اور اسی بنا پر پورے ہندوستان میں کانپور علماء اور اہل طلب کے لئے مرکز توجہ بن گیا تھا، اور علماء وفضلاء کے ساتھ اہل کانپور کا جو سلوک اور حسن اخلاق تھا، اور ان کے ساتھ محبت واکرام اور قدردانی کے جو مظاہرے ہوتے تھے، کانپور کی محبوبیت اور مرکزیت میں ان کا بھی بڑا دخل تھا، ہر طرف سے علماء کھنچے چلے آتے تھے، اور جو آجاتا تھا وہ یہاں سے جانے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔

حضرت مولانا احمد حسنؒ پٹیالہ پنجاب سے آئے تھے، یہیں شادی کر کے اس کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔

حضرت مولانا غلام حسین کانپوری نقشبندی عیسیٰ خیل (بنون) سے تشریف لائے، اور کانپور کے ہو کر رہ گئے (ان کا تذکرہ آگے آئے گا) وغیرہ۔

اس طرح کی بہت ساری مثالیں یہاں موجود ہیں۔۔۔۔۔

خود حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کانپور کے بارے میں اپنے احساسات اس طرح بیان فرماتے تھے کہ:

"کانپور والوں نے میرے ساتھ ایسی محبت اور تعظیم وتکریم کا برتاؤ کیا کہ میں اپنے وطن کو بھی بھول گیا، اور جتنا جی وہاں لگتا تھا اپنے وطن میں بھی نہ لگتا تھا، اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے برتنوں پر بھی بجائے اپنے نام کے لفظ "کانپور" کھدوایا تھا، اب جو ان برتنوں کو دیکھ لیتا ہوں، تو کانپور یاد آجاتا ہے، اگر حضرت حاجی صاحب کا ایماء نہ ہوتا تو میں تو عمر بھر بھی کانپور کو نہ چھوڑتا، اور سچ تو یہ ہے کہ میری اتنی جو شہرت ہوئی تو کانپور

والوں ہی کی بدولت ہوئی، ورنہ میں واقعی اس درجہ کا شخص ہرگز نہیں تھا، اور نہ اب ہوں، مجھے اب بھی کانپور والوں سے بہت محبت ہے، اور میں ان کا بہت ممنون ہوں[185]۔

جب کہ اس وقت یہ ظاہری طور پر صرف فوجی چھاؤنی کا علاقہ تھا، اور شہری تمدن اور صنعت و تجارت کے لحاظ سے بہت پسماندہ تھا، فوجی کیمپ ہونے کی بنا پر اس کو عام لوگ "کمپو" کہتے تھے[186]، مگر دین اور اہل دین کے ساتھ تعلق اور علم و معرفت کی انہی دکانوں کی برکت سے کانپور آہستہ آہستہ ایک بڑے تجارتی مرکز اور صنعتی شہر میں تبدیل ہو گیا۔

کانپور کے علمی پس منظر سے حضرت نصرؒ کی دلچسپی

کانپور کی اسی علمی شہرت کی بنا پر اس دور میں ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح بہار کے اکثر طلبہ بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور کا رخ کرتے تھے، علاوہ ازیں دیوبند اور سہارن پور کے مقابلے میں بہار سے اس کو قرب مکانی بھی حاصل تھا۔۔۔۔۔

غالباً اسی لئے حضرت مولانا سید نصیر الدین نصرؒ نے بھی صاحبزادہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کانپور کا انتخاب کیا، بلکہ وہ کانپور کے علمی پس منظر، وہاں کے علماء واساتذہ اور بالخصوص استاذ الاساتذہ حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ وغیرہ سے ذاتی واقفیت بھی رکھتے تھے، اور معاملہ شنیدنی نہیں دیدنی تھا، وہ پیر طریق کے یہاں گنج مراد آباد جاتے ہوئے اکثر کانپور بھی آمد و رفت رکھتے تھے، اور یہاں کی دینی، علمی و ملی سرگرمیوں سے ذہنی طور پر بہت قریب تھے، جیسا کہ ان کے خط کے اس جملہ سے کانپور کے ساتھ ان کی دلچسپی عیاں ہوتی ہے:

---

185 ۔اشرف السوانح ص ۱۴۔

186 ۔سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ مرتبہ مولانا سید محمد الحسنیؒ ص ۵ مطبوعہ لکھنؤ۔

"ندوۃ العلماء کا جلسہ کب سے کب تک رہے گا اور مولوی لطف اللہ صاحب
بھی تشریف لاویں گے یا نہیں؟[187]۔

اس سے ایک طرف ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کے بنیادی مقاصد سے ان کی ذاتی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے، وہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس طرح کے پروگراموں میں وہ عملی شرکت بھی فرماتے تھے، اور کانپور کے علمی و تحریکی پس منظر کے بارے میں وہ پوری بصیرت رکھتے تھے۔۔۔

معقولات کا دور

یہ وہ دور تھا جب کسی طالب علم کی صلاحیت وذہانت کے لئے علوم معقولہ کو معیار مانا جاتا تھا، درس نظامی کا بڑا حصہ معقولات کی کتابوں سے بھرا ہوا تھا، علوم منقولہ کے بارے میں عام تصور یہ تھا کہ اگر طالب علم میں قوت فہم اور تشقیق وتدقیق کی صلاحیت موجود ہو تو ذاتی محنت ومطالعہ سے بھی ان میں کمال پیدا ہو سکتا ہے، ان کے لئے استاذ کے پاس بہت زیادہ وقت دینے کی ضرورت نہیں ہے، استاذ کی معمولی رہنمائی بھی کتب منقولہ کے مطالعہ کی صحیح سمت متعین کرنے کے لئے کافی ہے، اور انسان اس روشنی میں ساری زندگی قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی تحقیق ومطالعہ کا کام کر سکتا ہے۔۔۔۔۔

---

[187]-کانپور میں ندوہ کا یہ جلسہ اِس سال (یعنی ۱۳۱۵ھ م ۱۸۹۸ء)، ۱۴، ۱۵ شوال المکرم مطابق ۸، ۹ مارچ کو ہوا، اور اس کی صدارت مولانا مسیح الزماں خان استاذ نظام حیدرآباد ور ئیس شاہجہاں پور نے کی، یہ ارکان ندوہ کا جلسہ خاص تھا، (سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۱۸۷) غالباً مولانا لطف اللہ صاحبؒ تشریف نہیں لاسکے، اس لئے کہ شرکاء کی فہرست میں ان کا نام نظر نہیں آیا۔۔۔۔۔ یہ ندوہ تحریک کے خلاف سخت محاذ آرائی اور افوہوں کی گرم بازاری کا دور تھا، (غالباً مولانا نصیر الدین صاحبؒ کا اشارہ اسی طرف ہے)۔۔۔۔۔ لیکن اللہ پاک کے کرم سے اس تحریک نے ہر طرح کے طوفانوں کا مقابلہ کیا، اور کامیابیوں سے سرفراز ہوئی۔

نیز علوم منقولہ کی کوئی انتہا نہیں ہے، ہر موضوع پر بے شمار اہم ترین کتابیں موجود ہیں ان میں کن کن کتابوں میں اساتذہ پر انحصار کیا جائے گا؟ زندگی ختم ہو جائے گی مگر علوم منقولہ کے معارف وحقائق کی دریافت کا کام ختم نہ ہو گا، جب کہ علوم معقولہ کی چند محدود کتابیں ہیں، جن کے پڑھنے سے طالب علم کی فطری صلاحیت میں جلا پیدا ہو جاتی ہے، اور فہم وادراک، غور وفکر اور تعمق و تحقیق کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، اس میں اگر پانچ سات سال صرف ہو جاتے ہیں اور باقی زندگی کے لئے قوت فہم کی حد تک فراغت ہو جاتی ہے تو یہ مہنگا سودا نہیں ہے،۔۔۔۔

اسی تصور کی بنا پر یہ کہاوت اس دور میں بہت مشہور تھی کہ:

"جو منطق وفلسفہ نہیں جانتا وہ جاہل ہے"۔۔۔۔۔۔

خود دین کے بقا اور استحکام کے لئے بھی معقولات کو ضروری خیال کیا جاتا تھا[188]،

مدارس کے نصاب پر معقولات کا غلبہ

مدارس میں معقولات کی دقیق کتابیں پڑھنا پڑھانا قابل فخر سمجھا جاتا تھا، منطق کی مشہور کتاب "سلم العلوم" کو واقعی تمام علوم کے لئے زینہ سمجھا جاتا تھا، اور اس کے حفظ و تکرار کا بے حد اہتمام کیا جاتا تھا، حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ نے اپنی کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" میں مختلف علوم وفنون پر ہندوستانی علماء کی تصنیفات کا تفصیل اور استیعاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس ذیل میں انہوں نے صرف منطق کے شروح وحواشی کی جو تفصیل لکھی ہے اس کی تعداد ایک سو (۱۱۷) تک پہونچتی ہے، جس میں سینتیس (۳۷) صرف علامہ محب اللہ بہاری کی مذکورہ بالا کتاب "سلم العلوم" کی شروحات ہیں اور بقیہ دوسری کتابوں کی[189]۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے "میر زاہد" کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا

188۔سوانح قاسمی ص ۱۹۸، ۱۹۹ ج ا مصنفہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔

189۔الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۷ مقدمہ، بحوالہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۸۱۔

ہے:

"ان کتابوں کے ساتھ مولویوں کے شغف کا یہ حال تھا، کہ جب تک ان تینوں یا ان میں سے کسی ایک کتاب پر اپنا خاص حاشیہ مولوی نہ لکھتا مستند مولویوں میں شمار نہ ہوتا تھا، یہی حال سلم اور اس کی شروح کا تھا[190]۔

ایک ایک مولوی بعض اوقات ایک ہی کتاب پر تین تین قسم کے حاشیے لکھ کر فضیلت کی داد لیتا تھا۔۔۔دور کیوں جایئے علماء فرنگی محل کے حالات اٹھا کر پڑھئے مشکل ہی سے کوئی عالم اس علمی خانوادہ میں ایسا مل سکتا ہے جس کے قلم نے معقولات کی مندرجہ بالا کتابوں میں سے سب پر یا چند پر کوئی حاشیہ یا شرح نہ لکھی ہو[191]۔

مولانا گیلانیؒ معقولات کے غلبہ کا حال بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"نصاب میں لزوم کی وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ سب کچھ پڑھ جایئے، لیکن ان تمام مقررہ کتابوں، کتابوں کے منہیات، حواشی، شروح و تعلیقات کا اگر ایک ورق پڑھنے سے رہ گیا ہے تو اہل علم کے گروہ میں ایسے آدمی کا علم علم نہیں سمجھا جاتا تھا، اساتذہ سند دینے سے گریز کرتے تھے، عذر یہی پیش کیا جاتا تھا کہ تم نے حدیث و تفسیر و فقہ وغیرہ دینی علوم کی سب کتابیں پڑھ لی ہیں، لیکن معقولات کی فلاں فلاں کتاب تمہاری باقی رہ گئی ہے، ان کے پڑھے بغیر مولوی ہونے کی سند تمہیں کیسے دی جاسکتی ہے؟[192]

نصاب پر معقولات کا کتنا دباؤ تھا اور اس میں کیسی مسابقت ہوتی تھی اس کا اندازہ

---

190 ۔سوانح قاسمی ج۱ص۲۸۹ (حاشیہ)، سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص۸۱۔

191 ۔ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج۱ص۳۰۹، ۳۱۰۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ:

"اس اضافہ کی تاریخ بہت دلچسپ ہے، مولوی محمد فاروق چریا کوٹی اپنے استاذ مفتی محمد یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ: --ان کے بچپن میں شرح سلم علی العموم رائج نہ تھی، بلکہ قاضی مبارک کے شاگرد مولوی مدن وغیرہ اپنے شاگردوں کو سلم کے ساتھ شرح سلم قاضی مبارک بھی پڑھاتے تھے، اور ملاحسن کے شاگرد شرح سلم ملاحسن پڑھاتے تھے اور بحر العلوم کے خاندان میں شرح سلم بحر العلوم رائج تھی، اور حمد اللہ کے تلامذہ اپنے استاذ کی شرح پڑھاتے تھے، پڑھانے میں ایک دوسرے پر نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی، اس لئے ہر ایک کو دوسرے کی کتاب دیکھنا ضروری تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہو گئیں[193]۔

یہاں تک کہ علامہ گیلانیؒ کے بقول:

"درس نظامی کے نصاب فضیلت میں خالص دینیات کی کل تین (۳) کتابیں -جلالین، مشکوۃ، شرح وقایہ وہدایہ کے سوا کنز وقدوری کی مختصر فقہی متون کے بعد تقریباً چالیس پچاس کتابیں جو پڑھائی جاتی تھیں وہ خالص عقلیات کی کتابیں ہیں، یا ایسی کتابیں ہیں، جن کا تعلق تو کسی دوسرے فن سے ہے، لیکن درحقیقت ان کا طرز بیان اول سے آخر تک وہی معقولات کی کتابوں کا سا ہے ...... ممکن ہے کہ جنہوں نے غور نہیں کیا ہو انہیں کچھ اچنبھا سا ہو، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی ایک اجمالی فہرست دے دی

192-ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۳۰۹۔

193-سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۸۲ بحوالہ الندوہ ا (جلد ۶) ص ۱۴۔

جائے۔۔۔:

(۱)صغریٰ(۲) کبریٰ(۳)ایساغوجی(۴) قال اقول(۵)میزان منطق(۶) بدیع المیزان(۷) مرقاۃ(۸) تہذیب (۹) شرح تہذیب (۱۰) قطبی (۱۱)میر قطبی(۱۲)سلم(۱۳)ملا حسن(۱۴) حمد اللہ (۱۵) قاضی مبارک (۱۶)بعض مقامات میں شرح سلم بحر العلوم(۱۷)شرح مطالع خالص منطق میں(۱۸)ہدیہ سعیدیہ(۱۹)میبذی(۲۰)صدرا (۲۱) شمس بازغہ ، بعض مقامات میں (۲۲) شرح ہدایۃ الحکمۃ خیر آبادی (۲۳) شرح اشارات (۲۴)شفا(۲۵)فلسفہ میں قوشجیہ(۲۶)تصریح (۲۷) شرح چغمنی(۲۸) بعض مقامات میں تذکرہ(۲۹) بست باب ہیئت میں (۳۰)اقلیدس(۳۱) مبادی الحساب،ریاضی میں ان کے سوا(۳۲) میر زاہد رسالہ(۳۳)میر زاہد ملا جلال(۳۴)میر زاہد امور عامہ،اکثر مقامات میں ،میر زاہد رسالہ ملا جلال کے ساتھ(۳۵)بحر العلوم۔یہ کتابیں خاص طریقہ کی ہیں ، جنھیں بجز معقولات کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب اصول فقہ(۳۶)اصول الشاشی (۳۷)حسامی(۳۸)نور الانوار(۳۹)توضیح معہ تلویح(۴۰) مسلم۔کلام میں (۴۱)شرح عقائد نسفی(۴۲)شرح عقائد جلالی(۴۳)اور بعض مقامات میں شرح تجرید قوشجی،شرح تجرید کے حواشی قدیمہ وجدیدہ ،(۴۴) میر باقر کی الافق المبین، جس کا شمار امور عامہ کے مباحث ہی میں ہونا چاہئے، میں نے عرض کیا تھا کہ(۴۵) مختصر المعانی اور (۴۶) مطول کا شمار بھی اسی سلسلہ میں ہونا چاہئے،(۴۷)اور شرح جامی کو بھی میں اسی قبیلہ کی کتاب قرار دیتا ہوں۔۔

یاد رکھنا چاہئے میں نے اس سلسلہ میں عموماً ان ہی کتابوں کا شمار کرایا ہے، جو درس نظامیہ پڑھانے والی تعلیم گاہوں میں آج سے چالیس پچاس برس پیشتر تقریباً دوامی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھیں ان کے سوا بھی۔۔۔۔۔۔۔۔

مرزا جان خوانساری، میر باقر، صدر شیرازی، شریف جرجانی کے حواشی، عبدالحکیم سیالکوٹی کے حواشی، خیر آبادیوں میں مولانا فضل حق، مولوی عبدالحق کے حواشی، ہیئت وہندسہ میں کرہ وغیرہ کی کتابیں مزید بر آں تھیں، اگر ان کو بھی شمار کرلیا جائے تو شاید تعداد پچاس سے آگے بڑھ جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کتابوں کا نام مستحضر نہ رہا ہو[194]۔

اور اس کا زیادہ اثر ہندوستان کے مشرقی علاقوں پر تھا، علامہ گیلانیؒ لکھتے ہیں:

"اس مسئلہ پر ذرا اور توجہ و تعمق سے نظر ڈالی جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ گو نصاب میں معقولات کا اضافہ سکندری دور میں ہوا یا اکبری دور میں، ظاہر ہے کہ دلی ہی میں ہوا، لیکن معقولاتی علوم کہئے یا حاشیہ نگاری کا جتنا زور ہم ان علاقوں میں پاتے ہیں، جن کی تعبیر مولانا آزادؒ کی اصطلاح میں "الفورب" ہے اور جہاں کے علماء ان کی زبان میں "الفواربہ" کے نام سے موسوم ہیں، یعنی اودھ، الہ آباد، اور بہار، اتنا زور اور اتنی ہما ہمی ان علوم کی خود دلی اور دلی کے نواح واطراف میں محسوس نہیں ہوتی حتی کہ پنجاب میں بھی نہیں اور تقریباً یہی حال جنوبی ہند کا ہے[195]۔

194۔ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۲۷۴ تا ۲۷۵ مع حاشیہ۔

195۔ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۳۱۰۔

مولانا عبدالشکور کا میلان طبع

حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفرپوری ؒظاہر ہے کہ بہار کی مٹی کی پیداوار تھے اوران کی نشوونما مظفرپور سے کانپور کے مشرقی علاقوں میں ہوئی تھی،وہ بھلااس عہد کے مزاج اور روش سے بے نیاز کیسے رہ سکتے تھے،ہر ذہین طالب علم کی طرح انہوں نے بھی معقولات کو اپنا ہدف بنایا، حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ کو گو کہ طبعی طور پر معقولات میں حد درجہ توغل پسند نہیں تھا، لیکن دستور زمانہ اور ملک کے مروجہ نصاب کے مطابق علمی صلاحیت اور فکری استعداد کے لئے انہوں نے وقتی طور پر اس کی اجازت دے دی، تاکہ دقیق علوم ومعانی کے فہم وادراک میں وہ اپنے کو عاجز محسوس نہ کریں،اور بحث وتحقیق اور گفتگو ومناظرہ میں منطق وفلسفہ سے اشتغال کی کمی خدانخواستہ خفت وندامت کا باعث نہ بنے،اس لئے کہ اس زمانہ میں اکثر کتابیں فنی زبان اور فلسفیانہ اصطلاحات میں لکھی جاتی تھیں ،اور علمی گفتگو میں بھی یہی زبان معیار مانی جاتی تھی ، چنانچہ مولانا نصیرالدین نے نہ صرف یہ کہ خود یہ کتابیں ان کو پڑھائیں بلکہ ان میں فضل وکمال پیدا کرنے کے لئے معقولات کے اہم مرکز کانپور کا انتخاب فرمایا۔۔۔

کانپور–معقولات کا اہم مرکز

اس وقت معقولات کے لئے کانپور سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی ،اس دور میں وہاں حضرت مولانا احمد حسن کانپوری ؒکا درس شہرۂ آفاق تھا،خود حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی ؒ جن کے آپ خلیفہ تھے ،نے اپنے ایک مکتوب میں حضرت مولانا محمد علی مونگیری ؒکو ان کے بارے میں تحریر فرمایا کہ:

"ان (مولانا احمد حسن کانپوری) کو مشغولی اور توغل معقولات کی طرف

بہت ہے، مناسب یہ تھا کہ الٰہیات کو معقولات پر غالب رکھتے[196] "

بلکہ شہر کے تمام مدارس کا علمی مذاق ہی معقولات پر مُنتج تھا، سب پر معقولات کا غلبہ تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ کانپور کی شہرت ہی اس وقت ہندوستان بلکہ پوری علمی دنیا میں معقولات کی بنیاد پر تھی، شہر میں ایک بھی ایسا مدرسہ موجود نہیں تھا جس کے نصاب میں دینیات کو معقولات پر غلبہ حاصل ہو، "اشرف السوانح "میں مدرسہ "جامع العلوم" پٹکاپور کانپور کے قیام کے پس منظر میں خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ نے لکھا ہے کہ :

"جناب عبدالرحمن خان صاحب مرحوم اور حاجی کفایت اللہ صاحب مرحوم و مغفور نے جن کو حضرت والا (حضرت تھانوی) کے ساتھ بہت ہی محبت اور عقیدت ہو گئی تھی، آپس میں مشورہ کیا کہ ایسے مولوی کہاں ملتے ہیں ، ان کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے، اور ان کے لئے ایک الگ مدرسہ کھولا جائے ،کیونکہ ہمارے شہر میں جتنے مدرسے ہیں ان میں زیادہ تر معقولات ہی پڑھائی جاتی ہیں، ایک ایسے مدرسہ کی بھی سخت ضرورت ہے، جس میں دینیات کا پورا نصاب ہو،۔۔۔غرض جب حضرت والا گنج مرادآباد سے واپس تشریف لائے تو ان دونوں صاحبوں نے اصرار کر کے روک لیا، اور حضرت والا جامع مسجد پٹکاپور میں درس دینے لگے، اور ایک نیا مدرسہ قائم ہو گیا، اس مدرسہ کا نام جامع معقولات و دینیات ہونے کی بنا پر نیز جامع مسجد کی مناسبت سے حضرت والا نے "جامع العلوم" رکھا جو اب تک بفضلہ تعالیٰ اسی نام سے قائم ہے[197]۔

---

[196]۔سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۲۷ بحوالہ کمالات محمدیہ ص ۳۴۔

[197] ۔اشرف السوانح ص ۴۰۔

حضرت نصرؔ کی بصیرت و زمانہ آگہی

مولانا عبدالشکور کا طبعی ذوق معقولات کی طرف زیادہ مائل تھا ، اس لئے مولانا نصیر الدین نصرؔ چاہتے تھے کہ رواج زمانہ اور خود صاحبزادہ کے مذاق طبع کے مطابق معقولات کی تمام مشہور کتابیں ان کی نظر سے گذر جائیں، تاکہ منطق و فلسفہ کے تعلق سے کسی قسم کا احساس کمتری پیدا نہ ہو، نہ ذہنی و فکری جولانی میں کوئی تشنگی باقی رہے، اور ان کا شمار بھی معتبر اصحاب علم میں ہو سکے، چنانچہ خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"تمہاری طبیعت چونکہ معقولات کی طرف بہت مائل ہے ،اس وجہ سے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ معقولات ختم (مکمل) کرو، اور قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ معقولات میں اور ہدایہ، توضیح تلویح دینیات میں اور ممکن ہو تو شرح چغمنی بھی اس سال مقام درس تک ختم کرو، کیوں کہ یہ سب کتابیں مشہور درسی ہیں[198]"

کانپور میں مولانا عبدالشکورؒ کا قیام دو سال رہا، اور ان دو سالوں میں انہوں نے منقولات کی نصابی کتابوں کی بھی تکمیل کی اور معقولات میں بھی کمال واختصاص پیدا کیا، طبعی ذکاوت وذہانت، معقولات سے بے پناہ اشتغال اور مناسبت اور کثرت مطالعہ اور قوت استدلال کی بنا پر وہ اساتذہ کے منظور نظر ہو گئے۔

کانپور کے کس مدرسہ میں داخل ہوئے؟

یہاں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کانپور کے کس مدرسہ میں مولانا عبدالشکورؒ نے داخلہ لیا؟ اور کانپور میں آپ کے اساتذہ کون تھے؟ مولانا نصیر الدین کا خط اس باب میں خاموش

---

198 ۔مکتوب نصرؔ ص ا۔

ہے، بلکہ خط لکھے جانے تک کتابوں کے تعلق سے اساتذہ کی تفصیلات خود صاحب خط کو بھی معلوم نہیں تھیں، انہوں نے خود ہی دریافت کیا ہے کہ:

"جو کتاب جس استاذ سے ہو اس کا نام لکھا کرو۔۔۔[199]"

خط میں ندوۃ العلما کے جلسہ کا ذکر ہے، اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی آمد کے بارے میں سوال ہے، اور ان دونوں چیزوں کا تعلق مدرسہ فیض عام سے تھا، ندوہ کی تحریک مدرسہ فیض عام کے جلسہ سے شروع ہوئی، اور حضرت مولانا لطف اللہ صاحب کا بھی خاص تعلق مدرسہ فیض عام سے تھا، وہ ان کا مادر علمی بھی تھا اور ایک زمانے تک انہوں نے وہاں تدریسی خدمات بھی انجام دی تھیں، اسی لئے وہاں کے سالانہ جلسے کی دعوت پر بہت شوق سے تشریف لاتے تھے۔۔۔

اس سے بظاہر قیاس یہ ہوتا ہے کہ مولانا عبد الشکور غالباً مدرسہ فیض عام ہی میں داخل ہوئے ہونگے، اور یہیں حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور دیگر اساتذۂ کرام سے علوم وفنون کی تکمیل کی ہوگی۔۔۔ لیکن تاریخی لحاظ سے اس قیاس کو درست اور قابل قبول قرار دینا ناممکن ہے

مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے تلمذ

البتہ یہ طے شدہ ہے کہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل تھا، بلکہ یگونہ خصوصیت بھی حاصل تھی (جیسا کہ اگلے واقعات سے اندازہ ہوگا) اس لئے کہ ساری زندگی آپ اپنے استاذ گرامی کے تذکرہ میں رطب اللسان رہے، یہاں تک کہ آپ کے تلامذہ بھی اس نام سے کافی مانوس ہو گئے تھے، بلکہ اس سلسلے کی بعض جزئیات تک آپ کے تلامذہ کو معلوم تھیں، مثلاً:

199۔ مکتوب نصر ص ا۔

☆حضرت آہ کے مشہور تلمیذ ارشد حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ (پورہ نوڈیہہ ضلع دربھنگہ) امیر شریعت خامس امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے مجھ سے بیان فرمایا:

"کہ حضرت مولانا عبد الشکورؒ نے اپنے بڑے صاحبزادے کا نام "احمد حسن" پہلے استاذ "حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ "کے نام پر اور دوسرے صاحبزادے "ماسٹر محمود حسن "کا نام دوسرے استاذ "حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ "کے نام پر رکھا تھا"

مدرسہ فیض عام سے مولانا کانپوریؒ کی علٰحدگی ایک حقیقت ہے

☆اور یہ بھی درست ہے کہ مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی شہرت پورے ملک میں بلکہ ملک سے باہر خراسان، موصل، حلب اور شام تک تھی، اور یہ شہرت ان کو اولاً مدرسہ فیض عام سے حاصل ہوئی تھی، یہاں انہوں نے پڑھا بھی تھا اور پڑھایا بھی، وہ مسلسل (۱۴ سالوں) تک مدرسہ فیض عام کے صدر المدرسین رہے۔۔۔

لیکن ان کے استاذ مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ کی طرح انہوں نے بھی آخری عمر میں مدرسہ فیض عام سے علٰحدگی اختیار کرلی تھی، البتہ مولانا لطف اللہ علٰحدگی کے بعد اپنے وطن علی گڑھ (کوئلہ) لوٹ گئے تھے اور وہیں درس وتدریس کی نئی تاریخ رقم کی۔۔۔اس لئے کانپور سے ان کی علیحدگی کی خبر عام ہوگئی۔۔۔

لیکن مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی رہائش کانپور ہی میں تھی، اور پنجاب کے بعد اس کو انہوں نے اپنا وطن ثانی بنالیا تھا، اس لئے علٰحدگی کے بعد بھی وہ اپنے وطن واپس نہیں لوٹے اور کانپور میں ہی رہے، بلکہ ان کے مکان، مدرسہ فیض عام اور نئے مدرسہ دار العلوم کانپور میں بھی کوئی خاص فاصلہ نہیں تھا، صرف گلیوں کا فرق تھا، اس لئے ان کی شہرت بدستور کانپور کے ساتھ ہی قائم رہی، اور ہر جگہ وہ اسی نسبت سے متعارف رہے۔۔۔اسی لئے بہت سے لوگوں کو (جو

کانپور سے باہر رہتے تھے) مدرسہ فیض عام سے ان کی علیحدگی کا علم نہ ہو سکا۔

جبکہ کئی معتبر اور ناقابل تردید ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت مولانا احمد حسن کان پوریؒ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں مدرسہ فیض عام سے علاحدہ ہو کر حافظ امیر الدین وغیرہ کچھ اہل خیر کے تعاون سے مسجد رنگیان (نئی سڑک کانپور) میں اپنا الگ مدرسہ "دارالعلوم کانپور" قائم کر لیا تھا، اور پھر وہی آپ کا آخری تعلیمی مرکز بن گیا تھا، جیسا کہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے تذکرے میں یہ بات پیچھے حوالوں کے ساتھ گذر چکی ہے:

صاحب واقعہ حضرت تھانویؒ کی شہادت

(۱)- اس سلسلے میں سب سے مستند بیان حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے، کیونکہ وہ اسی زمانے میں کانپور میں مسلسل چودہ (۱۴) سال رہے، علاوہ ازیں وہ خود صاحب واقعہ ہیں، مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی علٰحدگی کے بعد انہی کی جگہ پر ان کو بلایا گیا تھا، حضرت کی سب سے مستند سوانح (جو آپ کی زندگی میں چھپ کر مقبول عام ہوئی) "اشرف السوانح" کا یہ اقتباس پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ:

"کانپور تشریف لانے کی صورت یہ ہوئی کہ مدرسہ فیض عام جو کانپور کا سب سے قدیم مدرسہ دینیہ تھا، اس کے صدر مدرس جناب مولانا احمد حسن صاحبؒ جو ایک مشہور اور جامع بالخصوص ماہر معقولات عالم تھے کسی وجہ سے ناراض ہو کر مدرسہ سے علٰحدہ ہو گئے، اور انہوں نے ایک دوسرا مدرسہ دارالعلوم قائم کر لیا، چونکہ طلبہ میں ان کا بہت شہرہ تھا، اس لئے ان کی جگہ بیٹھ کر درس دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی، اور اسی وجہ سے وہاں جانے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تھا، لیکن چونکہ حضرت والا کو اس صورت حال کی خبر نہ تھی، لہذا جب

وہاں سے ایک مدرس کی طلبی ہوئی، تواخیر صفر ۱۳۰۱ھ دسمبر ۱۸۸۳ء میں باجازت والدماجد وبارشاد حضرات اساتذۂ کرام بے تامل تشریف لے گئے اور درس دیناشروع کردیا تنخواہ صرف ۲۵ / روپے ماہوار تھی۔۔۔۔ گو حضرت والا اس وقت بالکل نوجوان اور سبزہ آغاز تھے لیکن کانپور پہونچ کر وہاں کے جملہ مدرسین اور اہل شہر میں بہت جلد شہرت ہو گئی، اور عام طور پر ہر دلعزیز ہو گئے، حتیٰ کہ مولانا احمد حسن صاحب بھی بہت محبت اور وقعت سے پیش آنے لگے[200]۔

حضرت تھانویؒ اخیر صفر المظفر ۱۳۰۱ھ م ۱۸۸۳ء میں آئے تو اس کا مطلب ہے کہ ۱۳۰۱ھ کے آغاز یعنی محرم میں یا اس سے بھی قبل رمضان سے قبل یا بعد ہی مولانا کانپوریؒ نے مدرسہ ترک فرمادیا تھا، اور "دارالعلوم کانپور" کے نام سے خود اپنا مدرسہ قائم کرلیا تھا، چونکہ ان کی وہاں سسرال تھی، علاوہ شاگردوں کا حلقہ تھا، بیعت وارشاد کا بھی سلسلہ تھا، اس لئے نئے مدرسہ کے قیام میں ان کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی، اگر وہ اپنا مدرسہ قائم نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ناراضگی کے اسباب ختم ہوجائیں تو مولانا دوبارہ واپس آجائیں، لیکن اپنا مدرسہ قائم کرلینے کے بعد یہ امکانات بھی تقریباً معدوم ہو گئے تھے، اسی لئے مدرسہ فیض عام کے منتظمین کسی قابل استاذ کی تلاش میں سرگرداں رہے، یہاں تک کہ حضرت تھانویؒ جیسی عبقری شخصیت ان کو ہاتھ لگ گئی اور گو کہ وہ اس وقت جوان تھے، اور تدریسی تجربہ نہ کے برابر تھا، لیکن اپنی صلاحیت اور بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے انہوں نے اس نقصان کی بڑی حد تک تلافی کرلی۔

حضرت کانپوریؒ کی تحریری شہادت

(۲)- دوسری سب سے بڑی شہادت خود حضرت مولانا کانپوریؒ کی کتاب تنزیہ

---

200 -اشرف السوانح-خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۳۷ – ۳۸ ط ادارہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۴۰۳ھ۔

الرحمن ہے، جو امکان کذب باری کے مسئلہ پر ہے، اور حضرت کے حکم سے خود دارالعلوم کانپور سے شائع ہوئی تھی، اس میں انہوں نے خود کو اپنے قلم سے "مدرس دارالعلوم کانپور" لکھا ہے:

حررہ افقر عباد ذی المنن عبدہ احمد حسن عصمہ اللہ عن آفات یوم المحن بفضلہ الخفی والعلن المقیم فی بلدۃ کانفور صانہ اللہ عن الشرور المدرس فی دارالعلوم فی آخر عشرۃ ذی الحجۃ ۱۳۰۶ھ[201]۔

اسی طرح کتاب کے آخر میں مدرسہ دارالعلوم کانپور کی طرف سے جناب حافظ امیر الدین صاحب نے یہ اشتہار شائع کیا ہے:

"ایمان والوں کو مژدہ ہو کہ ان دنوں یہ نادر رسالہ "تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان "جو یکتائے زمن حضرت مولانا احمد حسن صاحب عم فیضہم کی تحقیقات نادرہ سے ہے، ۱۳۰۷ھ میں چھپ کر اہل ایمان کے لئے حرز جان اور صاحبان بصیرت کے لئے قوت نظر ہوا ہے، اس گوہر گرانمایہ کی خریداری جنہیں منظور ہو، وہ چار آنہ قیمت اور آدھ آنہ محصول ڈاک بھیج کر مدرسہ دارالعلوم کانپور سے طلب فرمائیں، جو دس بیس نسخے خرید کریں گے ان سے تخفیف کی جائے گی، حق تالیف محفوظ رکھا گیا ہے، کوئی صاحب بلا اجازت جناب مؤلف طبع کا عزم نہ کریں جس قدر نسخے منظور ہوں مشتہر سے طلب فرمائیں۔

المشتہر: حافظ امیر الدین مدرسہ دارالعلوم کانپور"[202]۔

---

[201] تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان ص ۶۳

یہ کتاب محرم الحرام ۱۳۰۷ھ م ۱۸۹۰ء میں منشی عبدالعزیز کے مطبع "مطبع عزیزی" سے شائع ہوئی ہے۔

---

[202] - تنزیہ الرحمن عن شائبۃ الکذب والنقصان ص ۸۴

حضرت مولانا احمد حسن کانپوری ؒ کی کتاب "تنزیہ الرحمن" کا ٹائٹل عکس-جو مطبع عزیزی کانپور سے محرم الحرام ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی۔

سبحٰن ربک رب العزۃ عما یصفون

تنزیہ الرحمٰن عن شائبۃ الکذب والنقصان

مطبع عزیزی کانپور

۳

۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

٦٣ ٦٢

صورة ما قرظه فخر العلماء الكرام صدر الفضلاء العظام استاذ
اساتذة الهند والشام محط رحال الفخام آية من آيات الله
الحضرة مولانا احمد لطف الله دامت برکاتهم وعمت
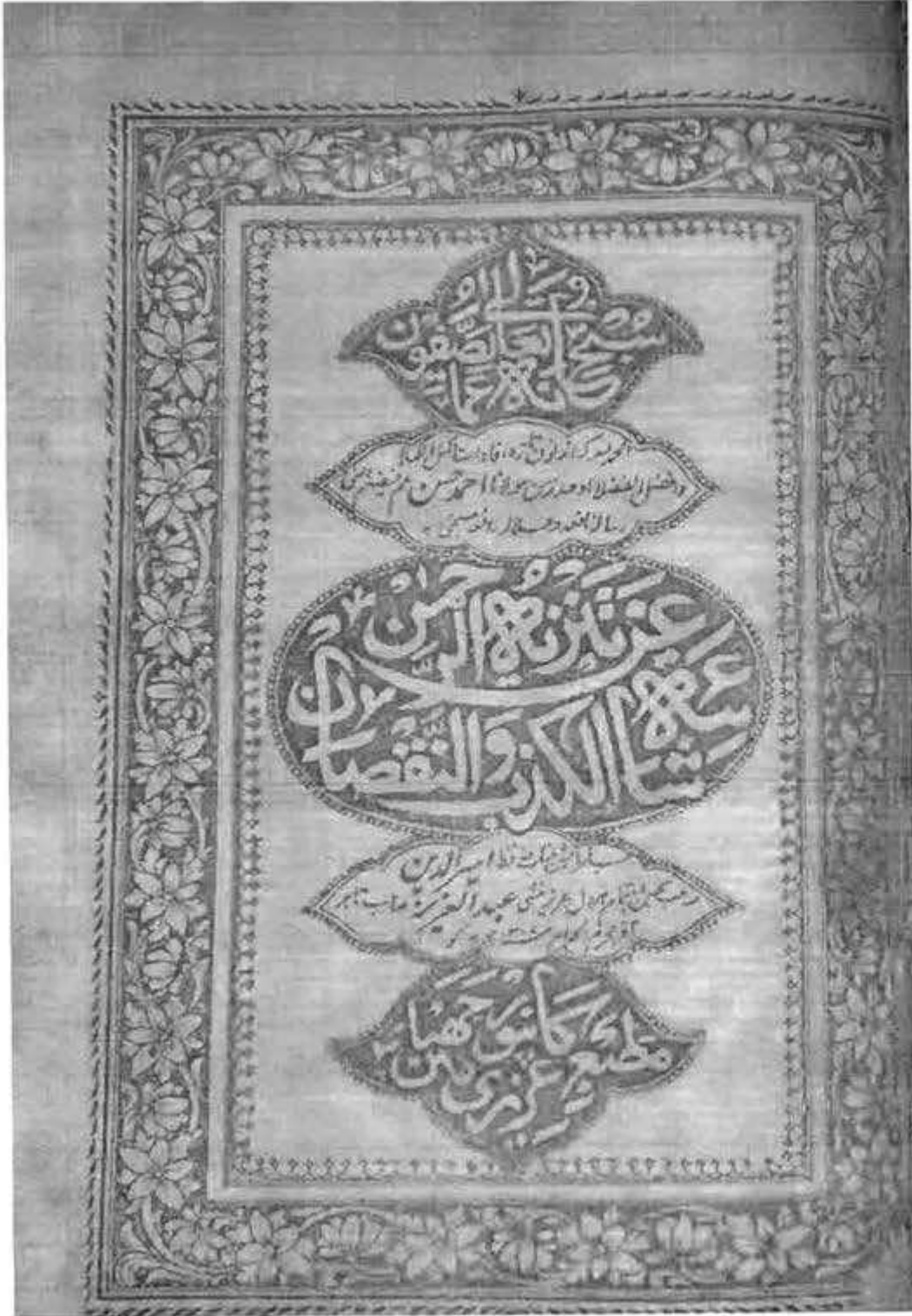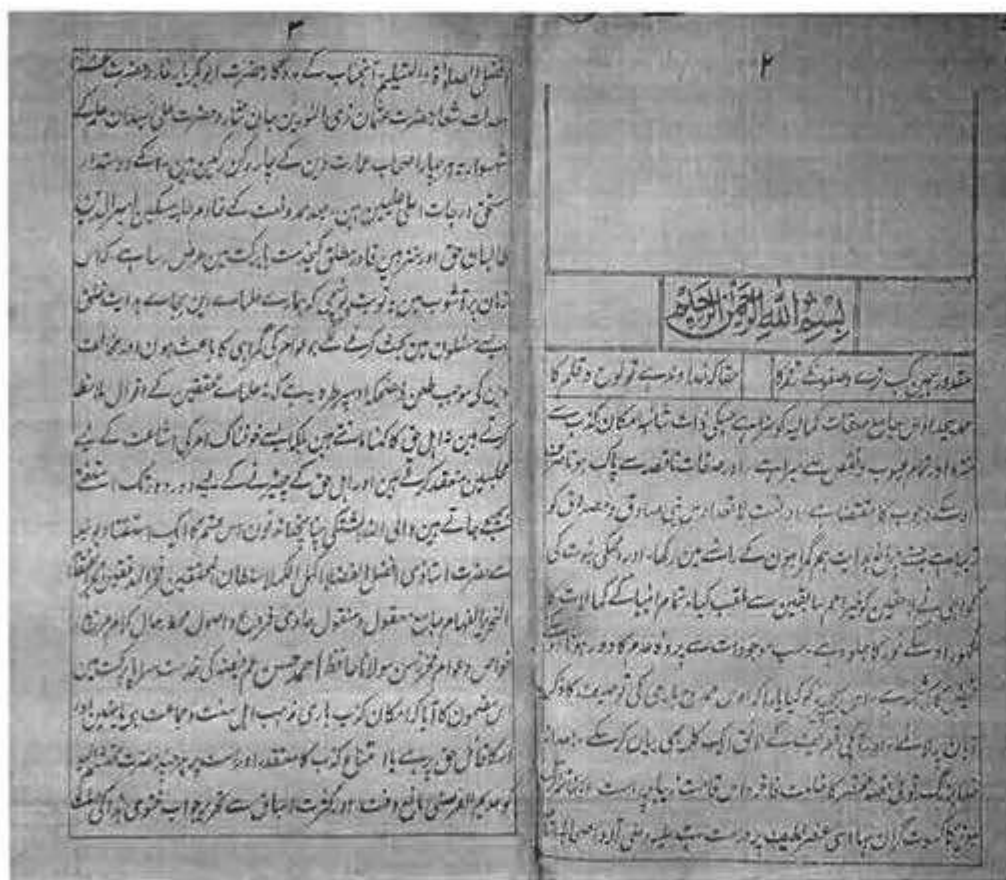
کتاب کا آخری صفحہ جس پر حضرت مصنفؒ نے خود اپنے نام کے ساتھ "المدرس فی دار العلوم"
کا لاحقہ تحریر فرمایا ہے اور ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ کی تاریخ رقم فرمائی ہے۔

ماشاء الله لا قوة الا بالله

سراج الخفیین

فی

مطبع گلزار محمدی لاہور

۸۴

اشتہار

المشتہر

ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت مگر فیض عام کی طرف سے نہیں

(۳)- اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۳۱۰ھ م ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء کی پہلی بنیادی میٹنگ مدرسہ فیض عام میں منعقد ہوئی اس میں مولانا احمد حسن کانپوریؒ بھی شریک تھے، اس کی جو چودہ (۱۴) شرکاء کی فہرست "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" میں شائع ہوئی ہے ،اس میں مولانا کانپوری کے نام کے ساتھ "مدرسہ فیض عام "کا لاحقہ موجود نہیں ہے، جب کہ بعض لوگوں کے ساتھ ان کے مدرسہ کی نسبت کا لاحقہ موجود ہے، اگر وہ اسی مدرسہ میں برسرکار ہوتے تو خود مقام میٹنگ ہونے کی بنیاد پر ان کے ساتھ یہ نسبت ضرور شامل کی جاتی، کہ شخصیت بڑی تھی، اور تحریک بھی بڑی تھی، اس سے جہاں تحریک ندوہ کو فائدہ ملتا وہیں مدرسہ کو بھی فائدہ پہونچتا[203]۔

حضرت کانپوریؒ کے صاحبزادے دارالعلوم رنگیان میں

(۴)- چوتھی اہم شہادت یہ ہے کہ آپ کے صاحبزادے مولانا مشتاق احمد کانپوریؒ جن کو مولانا محمد ادریس ذکا گڑھولوی صاحبؒ نے جنۃ الانوار میں مولانا بشارت کریمؒ کا ہم سبق قرار دیا ہے[204]، ان کے حالات میں پہلے گذر چکا ہے کہ انہوں نے اپنے والد گرامی کے پاس تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی معلمی کا آغاز اپنے والد کے مدرسہ "دارالعلوم کانپور" سے کیا، اس کے بعد دیگر کئی اداروں میں کام کیا، ان کی سن فراغت مولانا بشارت کریم کے مطابق کم از کم ۱۳۱۵ھ م ۱۸۹۸ء ہے۔۔۔۔اس کا مطلب ہے کہ ۱۳۱۵ھ میں بھی مولانا کانپوریؒ کا دارالعلوم قائم تھا، اسی لئے اپنے صاحبزادے کا تقرر اسی مدرسہ میں فرمایا۔

203- سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۱۱۵۔

204- جنۃ الانوار ص ۱۱۔

ایک اہم صراحت

(۵) بعض کتابوں میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ مولانا کانپوری علٰحدگی کے بعد تاعمر اپنے ہی دارالعلوم میں مدرس رہے، ڈاکٹر سید سعید احمد صاحب اپنی کتاب "شہر ادب کانپور "[205] میں مدرسہ فیض عام کے تذکرہ کے تحت مولانا احمد حسن کانپوری ؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا (لطف اللہ علی گڑھی ؒ) کے تشریف لے جانے کے بعد آپ (مولانا احمد حسن کانپوری ؒ) ہی صدر مدرس بنائے گئے، کچھ عرصہ کے بعد اپنا علیحدہ دارالعلوم قائم کیا اور آخری سانس تک اس مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا[206]۔

مفتی سہول احمد عثمانی ؒ کی خود نوشت سے تائید

(۶)-ایک اہم ترین شہادت حضرت مفتی سہول احمد عثمانی بھاگلپوری ؒ کی ہے، یہ بھی اسی زمانے میں کانپور حصول تعلیم کے لئے پہونچے تھے، اور تقریباً چھ سات برس وہاں قیام فرمایا، اس کے بعد دو سال حیدرآباد رہے، پھر دیوبند تشریف لائے اور ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں دیوبند سے فراغت حاصل کی، اس لحاظ سے مفتی سہول صاحب تقریباً ۱۳۰۹ھ یا ۱۳۱۰ھ میں کانپور پہونچے ہونگے، اور تقریباً ۱۳۱۵ھ یا ۱۳۱۶ھ تک وہاں رہے، اس طویل دورانیہ میں ان کو حضرت مولانا احمد حسن کانپوری ؒ مدرسہ فیض عام میں نہیں ملے۔۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ ایک بیرونی طالب علم کو اندرونی حالات کی کیا خبر ہو سکتی ہے،۔۔۔ وہ

---

[205] ـ یہ کتاب کراچی پاکستان سے شائع ہوئی ہے، اور معتبر حوالوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے، صاحب کتاب کا آبائی تعلق کانپور ہی سے ہے۔

[206] ـ "شہر ادب کانپور" ص ۷۶ طسید اینڈ (پبلشرز) کراچی،

بھاگلپور سے صرف ان کی شخصیت کا شہرہ سن کر کانپور آئے تھے، وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

"میں تو بھاگلپور میں استاذی مولانا شفاعت حسین صاحب سے استاذ الفضلاء
حضرت حاجی صوفی مولانا احمد حسن صاحب کی بے انتہا تعریف سُن چکا تھا،
اس لیے ان کی خدمت میں کانپور حاضر ہوا۔۔۔

ظاہر ہے کہ ان کو حضرت کانپوریؒ کی جو طلب ہوسکتی ہے وہ کسی خالی الذہن طالب علم کو نہیں ہوسکتی، وہ سیدھے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر حضرت سفر حج پر تشریف لے جارہے تھے، اس لئے سبق موقوف کرر کھا تھا۔

مفتی صاحب نے یہاں یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ وہ حضرت کانپوریؒ سے کہاں ملے؟ آپ نے مدرسہ فیض عام کا نام نہیں لیا ہے۔۔ قرین قیاس یہی ہے کہ وہ حضرت سے ان کی رہائش گاہ پر یا ان کے مدرسہ دار العلوم رنگیان ہی میں ملے ہونگے۔

غرض حضرت کے پاس ان کے سبق کا انتظام نہ ہوسکا تو مجبوراً انہوں نے مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور میں داخلہ لے لیا، وہ مدرسہ بھی مشہور تھا، اور وہاں کے صدر المدرسین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تھے، لیکن وہاں معقولات پر زیادہ توجہ نہیں تھی، اس لئے ان کا جی نہیں لگا وہ تو معقولات ہی پڑھنے کے لئے کانپور پہونچے تھے، ۔۔۔۔۔۔

اس بیچ ان کو خبر ملی کہ مدرسہ فیض عام میں اس منصب پر حضرت مولانا فاروق اعظم گڑھی (چریا کوٹی) بحال کئے گئے ہیں، وہ بھی معقولات کے ماہر استاد تھے، علامہ شبلی نعمانیؒ ان سے تلمذ پر فخر کرتے تھے، مفتی سہول صاحب جامع العلوم چھوڑ کر سیدھے مدرسہ فیض عام پہونچ گئے اور مولانا فاروق چریا کوٹی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، وہ ان کے طریقۂ تدریس سے کافی حد تک مطمئن ہوئے، اور حضرت کانپوریؒ سے محرومی کا جو احساس تھا اس میں تھوڑی کمی آئی ۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود وہ حضرت کانپوریؒ کے انتظار میں رہے۔۔۔۔

حضرت کانپوریؒ کا دستور تھا کہ حجاز مقدس کے سفر سے دو تین سال سے کم میں واپس تشریف نہیں لاتے تھے، بہر حال حضرت کانپوریؒ حجاز مقدس سے واپس تشریف لائے، اور انہوں نے حضرت سے بھرپور اور خاصی مدت تک استفادہ کیا۔۔۔۔۔ مگر کیا مدرسہ فیض عام میں؟ نہیں۔۔۔۔ انہوں نے کانپور کی جن درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا تذکرہ کیا ہے ان میں "مدرسہ دار لعلوم رنگیان" اور مدرسہ احسن المدارس کے نام بھی شامل ہیں، اور یہ دونوں مدرسے حضرت کانپوریؒ کے قائم کردہ ہیں۔۔۔۔۔۔ اس لئے ظاہر ہے کہ انہوں نے حضرت کانپوریؒ سے یہیں پڑھا ہوگا۔۔۔۔۔ اگر حضرت کانپوریؒ سفر حج کے لئے مدرسہ فیض عام سے رخصت لے کر گئے ہوتے، تو ظاہر ہے حجاز سے واپسی پر ان کو سیدھے مدرسہ فیض عام ہی آنا چاہئے تھا، اور اگر فی الواقع ایسا ہوتا تو مفتی سہول صاحب کو دارالعلوم مسجد رنگیان کی طرف رخ کرنے کی حاجت نہ ہوتی، لیکن حضرت مفتی صاحب نے "دارالعلوم رنگیان" اور مدرسہ احسن المدارس "کا ذکر اپنی مادر علمی کے طور پر کیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہاں وہ حضرت کانپوریؒ سے استفادہ کی غرض سے ہی تشریف لے گئے، اور زیادہ تر انہی سے استفادہ کیا، اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ:

"مگر ان میں سے جناب مولانا احمد حسن صاحب و مولانا نور محمد صاحب کی خدمت میں زیادہ روز تک استفادہ علوم و فنون کا کیا[207]۔

(۷) ایک اور بڑی دلیل یہ ہے کہ صدیق فیض عام انٹر کالج کانپور (مدرسہ فیض عام کی تبدیل شدہ صورت) نے اپنے کالج میگزین (اشاعت ۲۰۰۶ء ۲۰۰۷ء) میں ایک یادگار سند اور دستار فضیلت کا عکس شائع کیا ہے، جو مدرسہ فیض عام کے ابتدائی دور میں فضلاء کو دی جاتی

---

207 - اس پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مفتی صاحب کی خود نوشت "تعلیم الانساب ص ۵ تا ۱۸ (مخطوطہ) بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۹، جلد: ۱۰۰، ذی الحجہ ۱۴۳۷ ہجری مطابق ستمبر ۲۰۱۶ء۔

تھی، یہ مولانا مظہر الحق القنوجی ابن شیخ نیاز احمد کی سند اور دستار ہے جو ۱۳۱۱ھ میں ان کو دی گئی تھی اس سند پر مہتمم مدرسہ جناب حافظ الٰہی بخش اور سرپرست حضرت مولانا محمد لطف اللہؒ اور دیگر کئی اساتذہ واراکین کے نام یا دستخط موجود ہیں، لیکن مولانا احمد حسن کانپوریؒ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔۔۔جب کہ یہ وہی زمانہ ہے جو یہاں زیر بحث ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مولانا کانپوریؒ کا کوئی ربط دوبارہ مدرسہ فیض عام سے قائم نہیں ہوا، بلکہ یکگونہ دوری رہی، ورنہ جس طرح مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ اور مولانا احمد رضاخان صاحب وغیرہ سے دور دراز مقامات پر رہنے کے باوجود ادارہ کے روابط قائم تھے، اور وقتاً فوقتاً انتظامی یا تعلیمی ضروریات کے تحت ان سے استفادہ بھی کیا جاتا تھا اور ان کے نام بھی شائع کئے جاتے تھے، اسی طرح مولانا کانپوریؒ سے بھی کیا جا سکتا تھا، وہ تو بالکل قریب بازو والی گلی میں رہتے تھے۔۔۔۔

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مولانا کانپوریؒ کی طرف سے متوازی اداروں کے قیام اور دار العلوم کانپور کے عروج وترقی نے درمیان میں ایک خلیج قائم کر دی تھی، جو کبھی ختم نہ ہو سکی اور مولانا بھی اپنی جگہ مستغنی رہے اس لئے کہ ان کو نہ کسی شخصیت کی ضرورت تھی اور نہ ادارہ کی، یہ دونوں چیزیں ان کے پاس خود موجود تھیں۔

یہ اس سند کا عکس ہے جو ۱۳۱۱ھ میں جو مولانا مظہر الحق قنوجی کو دی گئی تھی

مدرسہ فیض عام کے ابتدائی دور میں یہ سند دی جاتی تھی۔

سند فضیلت مدرسہ فیض عام جو ابتدائی دور میں طلبہ کو دی جاتی تھی

یہ مولانا مظہر الحق کی دستار کا عکس ہے

(۸)اور ایک آخری بات یہ ہے کہ میں نے جب مولانا کانپوریؒ کے اہل خاندان سے رابطہ قائم کیا، تو آپ کے پڑپوتے جناب حافظ قاضی نیر صابری صاحبؒ (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، جو ماشاء اللہ اپنے خاندانی حالات سے بہت باخبر ہیں، اور مولانا کانپوریؒ والی "مسجد رنگیان" ہی کے امام وخطیب بھی ہیں) نے لکھا کہ ہمارے خاندان میں یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرتؒ نے تدریس یا ملازمت کی غرض سے ایک بار نکلنے کے بعد دوبارہ مدرسہ فیض عام کا کبھی رخ نہیں فرمایا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ حضرت کے نکلنے کے بعد مدرسہ فیض عام کمزور ہونے لگا تھا اور بالآخر اتنا کمزور ہوا کہ مدرسہ کی حیثیت سے اس کا تحفظ بھی مشکل ہو گیا، جب کہ حضرت کا دارالعلوم کانپور آپ کی حیات مبارکہ میں نقطۂ عروج پر رہا، یہاں تک کہ ۱۹۹۱ء تک اس نے اپنی مدرسہ والی حیثیت عرفی بچا کر رکھی۔۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ حضرت کو کیا ضرورت تھی کہ ایک ڈوبتی ہوئی کشتی میں سوار ہوتے وہ بھی جب کہ کشتی والوں کی طرف سے بے اعتنائی بھی برتی جائے۔

ان تمام یقینی شواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ مدرسہ فیض عام سے مولانا کانپوریؒ کی علٰحدگی اور لاتعلقی مسلسل تاحیات قائم رہی، لیکن فیض عام کی نسبت ابتداءً ہی میں اتنی پختگی کے ساتھ آپ کے نام کا جزو بن گئی تھی، کہ یہ کانپور سے باہر کئی لوگوں کے لئے غلط فہمی کا باعث رہی۔۔۔۔۔۔۔ اور مدرسہ فیض عام سے الگ ہونے کے بعد آپ تقریباً ۲۲/ سال زندہ رہے اور اس طویل مدت میں مسلسل اپنے مدرسہ "دارالعلوم کانپور" کو اپنے آخری مرکز علمی کی حیثیت سے متعارف کراتے رہے، کئی کتابیں بھی اسی پتہ سے شائع کیں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تاریخ کے ساتھ یہ سب باتیں افسانۂ ماضی بن گئیں اور بے خبر ذہنوں پر "فیض عام" کا وہی قدیم تصور حاوی رہا۔

بعض تسامحات

میرا خیال ہے کہ مولانا عبد الشکورؒ اور ان کے رفیق درس مولانا بشارت کریمؒ وغیرہ کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے، کہ صورت حال کی تحقیق کئے بغیر محض مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے تلمذ کی بنیاد پر ان حضرات کو مدرسہ "فیض عام" کا طالب علم قرار دیا گیا اور پھر نقل در نقل ہوتے ہوئے یہ بات مشہور ہوتی چلی گئی، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحبؒ نے حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کی سوانح حیات "جنت الانوار" ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء میں مرتب فرمائی [208]، یعنی ان بزرگوں کے عہد تلمذ سے تقریباً اسی (۸۰) سال بعد، جب مولانا کانپوریؒ کا مدرسہ بھی تاریخ کا حصہ بن چکا تھا

---

[208]-آپ کا مختصر تذکرہ حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کے ضمن میں آچکا ہے، آپ حضرت گڑھولویؒ کے منجھلے صاحبزادے ہیں، آپ کی ولادت ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں گڑھول شریف ضلع سیتا مڑھی میں ہوئی، آپ کا تاریخی نام منظور الحق ہے، وفات رجب ۱۴۱۳ھ مطابق جنوری ۱۹۹۳ء میں ہوئی، گڑھول شریف میں اپنے والد ماجد کے جوار میں مدفون ہیں، مدرسہ جامع العلوم کے صدر المدرسین اور صدر مفتی تھے اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے، آپ کے فتاویٰ انتہائی اعتماد کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، آپ وقار و تمکنت، جمال و نور اور محبت و معرفت کا خوبصورت نمونہ تھے، اس دور میں بقیۃ السلف اور حجۃ الخلف کا صحیح مصداق تھے، ان میں کہیں سے بھی تکلف اور تصنع کی نمود نہیں تھی، صدق و راستی کا پیکر اور علم و عمل کا مجسمہ تھے۔۔۔۔۔۔

مجھے حضرت کے صاحبزادگان میں سے صرف آپ ہی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے، بے انتہا شفیق اور مہربان، متواضع و خلیق اور سراپا محبت تھے، اپنے عہد کے بے نظیر عالم دین اور مفتی تھے، تعلیم و تربیت اپنے والد گرامی سے حاصل کی، معرفت و ولایت میں مقامات بلند کے حامل تھے، مگر اپنے حالات کا اخفا فرماتے تھے، میں نے جس زمانے میں انہیں جامع العلوم مظفرپور میں دیکھا، پورے بہار میں اس درجہ علم و فضل، زہد و تقویٰ، خاندانی پس منظر اور ولایت و معرفت کی جامع شخصیت کوئی دوسری موجود نہ تھی، لیکن اپنے کو مٹائے ہوئے رکھتے تھے، میرا دل بہلانے کے لئے فرمایا کہ: "اب ہم لوگ تو میوزیم میں رکھے جانے کے لائق ہیں" مجھ پر خاندانی مراسم کی بنا پر بے حد شفیق تھے اور حسن ظن بھی رکھتے تھے، میرے والد ماجد بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، اور ان کو اپنا مرشد و مربی اور سرپرست

(یازیادہ سے زیادہ مکتب کی حیثیت سے چل رہا تھا)اور بات اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ عام حالات میں ذہن اس کی تحقیق کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔

اس کتاب میں مولانا ادریس صاحبؒ نے مولانا بشارت کریم صاحبؒ کو مدرسہ فیض عام کا فارغ قرار دیا ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں کئی جگہ یہ بات لکھی ہے، مثلاً:

"فراغت از تحصیل علوم ظاہری: کانپور مدرسہ فیض عام میں استاذ زمن حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کی درسگاہ میں تمام علوم معقول و منقول سے فراغت حاصل کی[209]۔

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:

"والد علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ جب میں کانپور پہونچا تو معلوم ہوا کہ یہاں سب سے بڑے عالم مدرسہ فیض عام میں استاذ زمن مولانا احمد حسن ہیں"[210]۔

☆حضرت مولانا ادریس صاحبؒ کی کتاب کے منظر عام پر آنے کے صرف دو ماہ بعد ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق مئی ۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ (ولادت ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء – وفات ۱۰/ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۸/ فروری ۱۹۸۸ء) کی کتاب درس حیات شائع ہوئی[211]، "جنت الانوار" کا مسودہ چھپنے سے پہلے قاری صاحبؒ کی نگاہ سے گذر چکا تھا،

خیال فرماتے تھے، مجھے بھی آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنے، آپ کے بستر پر آرام کرنے اور آپ کے دستر خوان پر کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا ہے، اس عظیم انسان اور ولی کامل کے ساتھ چند لمحات کی ان صحبتوں کو میں اپنے لئے حاصل حیات تصور کرتا ہوں۔ شاید اللہ پاک ان کی برکت سے مجھے کسی لائق بنادیں اور آخرت میں مجھے معاف فرمادیں آمین۔

[209] جنۃ الانوار ص ۳، اول ایڈیشن۔

[210] جنۃ الانوار ص ۱۰، اول ایڈیشن۔

[211] حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ اس آخری دور میں بہار کے ان عظیم علماء و مشائخ میں ہوئے ہیں جنہوں نے تعلیم اور تصوف کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا خیر الدین گیاویؒ اپنے زمانے کے اکابر

قاری صاحب نے بھی اپنے والد ماجد مولانا خیر الدین حضروی کامل پوریؒ اور مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کے تذکرہ میں مدرسہ فیض عام کا ذکر کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا حافظ بشارت کریم صاحبؒ، حضرت مولانا غلام حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا خیر الدین صاحبؒ یہ تینوں کانپور کے مشہور مدرسہ فیض عام میں ایک ساتھ علوم ظاہری کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے"[212]۔

ایک جگہ مولانا خیر الدین صاحبؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"دیوبند سے فارغ ہو کر کانپور چلا آیا، اس زمانہ میں مولانا احمد حسن صاحب کانپوری مدرس اول مدرسہ فیض عام کا معقولات میں بہت شہرہ تھا، میں نے وہاں رہ کر معقولات کی تکمیل کی،۔۔۔کانپور میں حضرت مولانا غلام حسین صاحب میرے ساتھی تھے، اوران کے مرید مولانا حافظ بشارت کریم صاحب گڑھولوی نیچے کی کتابیں پڑھتے تھے"[213]۔

حالانکہ جس زمانے میں یہ حضرات (مولانا غلام حسین کانپوریؒ[214]، مولانا خیر الدین

علماء ومشائخ میں تھے، قاری صاحب کی فراغت دارالعلوم دیوبند سے تھی، شیخ الاسلام حضرت مولا سید حسین احمد مدنی کے اخص تلامذہ اور خلفاء میں شمار ہوتے تھے، مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ کے پلیٹ فارم سے آپ نے بڑے تعلیمی کارنامے انجام دیئے، شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے، درس حیات اور جنۃ الانوار میں اس کے خوبصورت نمونے موجود ہیں، "نوائے درد "کے نام سے حضرت گڑھولویؒ کی شان میں مرثیہ لکھا، اسی طرح حضرت گڑھولویؒ کے ایک مصرعہ "تاثیر دکھا تقریر نہ کر" پر بھی تضمین فرمائی، جو ان کی کتاب درس حیات میں موجود ہے، اللہ پاک آپ کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے، ۷۷/سال کی عمر میں انتقال فرمایا (درس حیات ص ۴۴)

[212] درس حیات مرتبہ قاری فخر الدین گیاویؒ ص ۲۲۳، مطبوعہ مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ گیا طبع دوم ۱۴۳۱ھ م ۲۰۱۰ء۔

[213] درس حیات مرتبہ قاری فخر الدین گیاویؒ ص ۱۲۶۔

214۔حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے مشائخ میں گذرے ہیں، ان کا فیض دور دور تک پہونچا، بڑے صاحب نسبت اور صاحب تاثیر بزرگ تھے، حضرت مولانا بشارت کریم صاحب آپ ہی کے خلیفہ ہیں، اور ان کے ذریعہ اس سلسلہ کو بہار اور بنگال میں کافی فروغ ہوا۔۔۔۔

آپ کے والد ماجد کا نام شیخ محمد اور دادا کا نام شیخ ابراہیم ہے، آپ کی ولادت "بنون" کے علاقے میں "عیسیٰ خیل" میں ہوئی، صرف و نحو اور ابتدائی کتابیں اپنے شہر میں شیخ ولایت سے پڑھیں، پھر حصول علم کے لئے سہارن پور تک پیدل سفر کیا، سہارن پور میں ریل میں بیٹھ کر کانپور پہونچے، اور مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور تمام درسی کتابیں ان سے پڑھیں، اور ایک مدت تک آپ سے استفادہ کیا، ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں فراغت حاصل کی، پھر کانپور ہی میں سکونت اختیار کر لی، اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی مسجد دلاری میں درس و تدریس کی خدمت سے وابستہ ہوگئے، یہ مسجد احاطہ کمال خان میں واقع ہے، (اب کوئی احاطہ باقی نہیں ہے، صرف گلیاں ہیں) یہ مسجد اب روٹی گلی میں واقع ہے، اس جگہ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے اجداد میں شاہ محمد نصیبؒ تشریف لائے تھے، اور انہوں نے ایک خام مسجد بنوائی تھی، ۱۲۱۹ھ میں ایک شخص دین محمد طباخ اور اس کی بیوی دلاری جو فوج میں روٹی دیا کرتی تھی، نے اس مسجد کو پختہ بنوا دیا، مسجد پر جو پتھر لگا ہوا ہے اس میں دین محمد کا نام لکھا ہوا ہے، مگر شہرت "مسجد دلاری" کے نام سے ہوئی، اس مسجد میں عرصہ تک مولانا محمد علی مونگیریؒ بھی درس دے چکے ہیں۔

(سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص۵ بحوالہ مقامات محمدیہ ص۵)

حضرت مونگیریؒ جب سفر حج کو تشریف لے گئے تو مولانا کانپوریؒ بھی ان کے ساتھ گئے، مکہ معظمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے مثنوی درساً درساً پڑھی، سلوک کی تعلیم حضرت شیخ سراج الدین موسیٰ زئی سے حاصل کی، اور ان کے مجاز طریق ہوئے، پھر واپس کانپور تشریف لائے، اور مسجد دلاری کو اپنا روحانی مستقر بنایا، گاہے گاہے حضرت مولانا فضل رحماں گنج مرادآبادی کے یہاں بھی حاضری دیتے تھے، ان سے سند حدیث بھی حاصل کی۔۔۔۔

بڑی شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، سینکڑوں بندگان خدا نے فیض پایا، علم بہت پختہ تھا لیکن کوئی تصنیفی شغل نہیں رہا، البتہ درس و تدریس اور مریدین کی تربیت پر خاص توجہ تھی، اور اس کے لئے اسفار بھی کرتے تھے، ۴ صفر المظفر ۱۳۴۱ھ میں وفات پائی، مسجد دلاری (روٹی والی گلی) میں ہی آرام فرما ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(نزہۃ الخواطر ج۸ ص ۱۳۲۰)

کامل پوریؒ[215]، مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ اور مولانا عبد الشکور مظفر پوریؒ) حصول تعلیم کے لئے کانپور پہونچے تھے، مولانا کانپوریؒ مدرسہ فیض عام سے عرصہ ہوا علٰحدہ ہو چکے تھے۔

مولانا غلام حسین کانپوریؒ اور مولانا خیر الدین کامل پوریؒ نے ۱۳۰۸ھ م ۱۸۹۱ء میں مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے سند فراغت حاصل کی، مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۳ء میں کانپور پہونچے اور متوسطات میں داخلہ لیا، مولانا عبد الشکور آہ مظفر پوری ۱۳۱۴ھ م ۱۸۹۷ء میں

215-مولانا خیر الدین گیاوی کی پیدائش حضرو ضلع کامل پور اٹک میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے ماموں جان مولانا راغب اللہ صاحب سے حاصل کی، پھر مہینوں کا پیدل سفر طے کرکے دیوبند پہونچے، ہدایہ اخیرین حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کے پاس پڑھی، ------(حضرت سہارن پوریؒ ۱۳۰۸ھ سے ۱۳۱۴ھ تک دیوبند میں مدرس رہے، پھر یہاں سے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور چلے گئے، اور وہیں سے آپ کی زیادہ علمی شہرت ہوئی)--------دورۂ حدیث حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے پڑھا،-----(حضرت شیخ الہند کو حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ کے وصال کے بعد ۱۳۰۸ھ میں دار العلوم دیوبند کا شیخ الحدیث بنایا گیا)------یہیں مولانا شاہ ولایت حسین دیوروی گیاویؒ اور مولانا صدیق احمد برادر اکبر حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ ان کے رفیق درس ہوئے۔۔۔۔۔

ان کے حالات میں قاری فخر الدین صاحبؒ نے کوئی سن وغیرہ کی تعیین نہیں کی ہے، بلکہ پوری کتاب "درس حیات" ہی محض روایات وحکایات کا مجموعہ ہے جس میں سوائے وفات کے کہیں بھی سن تاریخ کا ذکر نہیں ہے، اس لئے کسی واقعہ کے بارے میں یہ تعین کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ واقعہ کب کا ہے؟ اور کس سن میں پیش آیا؟۔۔۔ قاری صاحب نے لکھا ہے کہ دیوبند سے فارغ ہوکر کانپور تشریف لائے، اور مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے معقولات کی تکمیل کی، اور کانپور میں ان کے ساتھی مولانا غلام حسین کانپوریؒ تھے۔۔۔۔(مولانا غلام حسین کانپوری نزھۃ الخواطر کے مطابق ۱۳۰۸ھ میں کانپور سے فارغ ہوئے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ۱۳۰۸ھ کی ابتدا میں مولانا خیر الدین صاحب دیوبند پہونچے اور اس کے بعد اسی سال کانپور میں معقولات کے درس میں شامل ہوئے)

مولانا خیر الدینؒ کی شادی مولانا عبد الغفار صاحب سرحدیؒ (متوفی ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء) خلیفہ ارشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بانی مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ گیا بہار کی صاحبزادی سے ہوئی، قاری فخر الدین صاحبؒ آپ کے نامور فرزند اور خلف الرشید ہوئے، انتقال پر ملال ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں ہوا، کریم گنج گیا کے قبرستان میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون (درس حیات ص ۱۱۹ تا ۱۹۵)

کانپور پہونچے اور مشکوٰۃ کی جماعت میں دوبارہ سماعت کی، علاوہ دیگر کتب منقولات و معقولات عالیہ بھی پڑھیں، دوسال یہاں رہ کر ۱۳۱۵ھ و ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں سند فضیلت حاصل کی، اور مولانا بشارت کریم صاحبؒ بھی اسی سال فارغ ہوئے۔

مولانا عبد الشکور اور آپ کے رفقاء دار العلوم کانپور میں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام حضرات کو حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے تلمذ حاصل ہے، اس لئے کہ اس وقت کانپور میں اس پایہ کا مدرس و محقق کوئی دوسرا نہیں تھا، لیکن ان حضرات کی تعلیم کے پورے عرصے میں مولانا مدرسہ فیض عام کے بجائے دارالعلوم کانپور مسجد رنگیان میں مصروف تدریس ہیں، اور سوائے خصوصی دعوت یا جلسہ ومیٹنگ وغیرہ کے مدرسہ فیض عام تشریف نہیں لے گئے، تو یقینی طور پر ان تمام حضرات نے دارالعلوم کانپور ہی میں تعلیم حاصل کی، اور یہیں انہوں نے مولانا سے استفادہ کیا اور اسی مدرسہ سے فارغ ہوئے۔۔۔

لیکن چونکہ ان حضرات نے نہ خود اپنے احوال قلمبند کئے، اور نہ ان کے وصال کے بعد فوری طور پر براہ راست جاننے والوں سے استفادہ کیا گیا، بلکہ پورے اسی (۸۰) سال یعنی قریب ایک صدی گذر جانے کے بعد ان بزرگوں کے حالات لکھے گئے، تو ظاہر ہے کہ اس طرح کے تسامحات کا سرزد ہونا بعید نہیں ہے، اس بات کا پورا احساس حضرت مولانا ادریس صاحبؒ کو بھی تھا، جنۃ الانوار کے پیش لفظ میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "میں اپنی کم مائیگی علم کے ساتھ ساتھ زیادہ متردد اس لئے ہوا کہ والد علیہ الرحمہ کے انتقال کو ۳۸ سال کا عرصہ گذر گیا، ان کے مریدین و متوسلین بہت کم رہ گئے ہیں، خصوصا وہ حضرات جو آپ کے اوائل زندگی سے واقف ہوں، گویا سب ہی راہی دارالبقا ہو چکے، ایسی صورت میں وہ باتیں کیونکر

معلوم ہو سکتی ہیں جو آپ کے اوائل زندگی سے متعلق تھیں "[216]۔

مشکوٰۃ کے درجے میں سماعت

مولانا عبدالشکور آہؔ مظفر پور سے مشکوٰۃ پڑھ کر آئے تھے، کانپور میں بخاری، ترمذی وغیرہ کتب صحاح کے ساتھ مشکوٰۃ کے سبق میں بھی شریک رہے، جس کا ذکر مولانا نصیر الدین صاحب کے خط میں ہے:

"مشکوٰۃ اور تفسیر جلالین تو تم یہاں پڑھ چکے ہو، دوبارہ سماعت کا وقت ملے تو خیر مضائقہ نہیں۔ترمذی کو میں کیا کہوں جب خاطر نہ ہو تو جیسا موقعہ ہو کرو"

تعلیم کے بارے میں مولانا نصیر الدین کا نقطۂ نظر

مولانا نصیر الدین صاحب کی خواہش تھی کہ فرزند ارجمند کانپور میں صرف ایک سال میں جلد از جلد معقولات اور صحاح ستہ کا مقررہ نصاب پورا کرلیں اور اگلے سال دینیات کی تکمیل اور دورۂ حدیث کے لئے دیوبند روانہ ہو جائیں، وہ دیوبند کو دینیات اور علوم اسلامیہ کا سب سے معتبر اور مستند مرکز خیال فرماتے تھے، علاوہ ازیں کانپور میں معقولات کا غلبہ تھا، یہاں دورۂ حدیث پڑھنے کے باوجود دل ودماغ منطق وفلسفہ کی مرعوبیت سے آزاد نہیں ہوسکتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ذہن ومزاج کو خالص دینی سانچے میں ڈھالا جائے، اور کتاب وسنت کو اس کے حقیقی زاویہ سے پڑھا جائے۔۔۔۔۔۔

ان کی رائے میں دورۂ حدیث کے سال معقولات کی کوئی کتاب شامل درس نہیں ہونی چاہئے، اور کم از کم ایک سال خالص حدیث میں لگانا چاہئے، تاکہ مذاق طبع پر دینیات کا رنگ گہرا

---

[216] جنۃ الانوار۔پیش لفظ ص ب۔

ہو جائے، دارالعلوم دیوبند کو اس باب میں پورے ملک میں جو امتیاز اور اعتبار حاصل تھا مولانا نصیر الدین نصرؔ اس سے بخوبی واقف تھے، لیکن والد ماجد کی یہ توقعات یا صاحبزادہ محترم کی ترجیحات ایک سالہ قیام میں پوری نہ ہو سکیں اور مجبوراً حضرت نصرؔ کو کانپور میں مزید ایک سال قیام کی اجازت دینی پڑی، خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے جو ان کی حکمت و بصیرت اور دور اندیشی و زمانہ آگہی کا آئینہ دار ہے:

"۔۔۔(کتب معقولات۔۔)اِس سال مقام درس تک ختم کرو، کیونکہ یہ سب کتابیں مشہور درسی ہیں اور پھر اللہ پاک فضل کرے تو ایک سال میں حدیث ختم کرو، مولوی رسول شاہ صاحب مرحوم[217] بھی ایسا ہی تخمینہ کرتے تھے، میں تم کو ابھی سے دیوبند بھیجتا، لیکن تمہارے لکھنے سے معلوم ہوا کہ کانپور کے اساتذہ شفقت فرما ہیں، اس وجہ سے چھوڑتا ہوں ،ورنہ جیسی ضرورت وہاں جانے سے دینیات میں رفع ہوتی معلوم ہوتی ہے، ویسی یہاں نہیں ہوتی"[218]

دیوبند سے تعلق اور مراسلت

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی بافیض شخصیت سے وہ باخبر ہی نہیں متاثر بھی تھے، بلکہ دونوں کے مابین شخصی مراسم کا بھی احساس ہوتا ہے، چنانچہ آپ نے اپنے طور پر دارالعلوم دیوبند سے مراسلت فرمائی اور وہاں کے نصاب و نظام تعلیم اور قواعد داخلہ سے واقفیت

---

217 ۔مولوی رسول شاہ صاحب کے حالات کا علم نہ ہو سکا، غالباً مولانا نصیر الدین کے کوئی مخلص معاصر تھے جن سے مولانا عبدالشکور نے بھی مظفرپور کے زمانہ قیام میں علمی استفادہ کیا ہوگا، اسی لئے غالباً بات کو مؤثر بنانے کے لئے ان کا حوالہ دیا گیا۔

218 ۔مکتوب قلمی حضرت نصرؔ ص ا۔

حاصل کرنے کے لئے رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ سے قبل ہی دیوبند خط تحریر فرمایا، اور وہاں سے جو جواب آیا اس سے صاحبزادہ کو رمضان میں ہی آگاہ فرمادیا (اس سال رمضان المبارک میں مولانا عبدالشکور کا قیام کانپور ہی میں رہا تھا) تاکہ ان کی ترتیب کے مطابق وہ عید کے بعد متصلاً دیوبند کے لئے روانہ ہو جائیں، لیکن صاحبزادہ نے اساتذہ کی شفقت کے حوالے سے فنون اور معقولات میں مزید پختگی پیدا کرنے کے لئے تھوڑی مہلت طلب کی ،تو والد صاحب نے ان کی یہ درخواست قبول کرتے ہوئے ایک سال مزید کانپور میں رہنے کی اجازت دے دی ،ورنہ مولانا عبدالشکور صاحب ۱۳۱۶ھ م ۱۸۹۹ء میں ہی دیوبند سے فارغ ہو جاتے ، دیوبند کی مراسلت کے تعلق سے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے :

"دیوبند سے جو جواب آیا وہ میں اس سے پہلے اخیر کارڈ میں لکھ چکا ہوں اور احتیاطاً پھر لکھتا ہوں (دورۂ صحاح ستہ مع مؤطا امام مالک و مؤطا امام احمد حنبل[219] وطحاوی ۱۵ / شوال سے ۳۰ / رجب تک مولوی محمود حسن صاحب مدرس اول اور مدرس دوم کے یہاں ختم ہو جاتا ہے)[220]۔

دینیات کی ضرورت کا احساس

☆مولانا نصیرالدین نصرؔ کی بے قراری ایک تو معقولات سے ان کے طبعی بُعد کی بناپر تھی جو اس زمانہ میں اہل منطق وفلسفہ کی خواہ مخواہ کی تعقل پسندی اور فکری کجی کی وجہ سے بہت سے اہل دل میں پیدا ہو گیا تھا، خود ان کے شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ فضل رحماں گنج

---

219 ۔مؤطا امام احمد حنبل۔ سہو سبقت قلم ہے، دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں مؤطا امام محمد بن الحسن شیبانیؒ داخل ہے، امام احمد بن حنبل کی کوئی موطا نہیں ہے، بلکہ ان کی مسند مشہور ہے۔

220 ۔مکتوب حضرت نصرؔ ص ا۔

مرادآبادیؒ کو بھی اس سے کافی بُعد تھا:

"مصنف کمالات رحمانی لکھتے ہیں:

ایک بار مولوی احمد حسن کانپوریؒ حضرت مولانا (گنج مرادآبادیؒ) کے پاس تشریف لے گئے تو آپ نے حسب عادت دریافت کیا کہ: تم کیا پڑھاتے ہو؟ انہوں نے سب علموں کا نام لیا، معقولات زیادہ بتائے۔۔۔ حضرت نے معقولات پڑھنے پڑھانے کی بہت ہجو کی، اور فرمایا کہ منطق زیادہ پڑھانے سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے، حدیث وفقہ زیادہ پڑھا کرو[221]۔

☆دوسری طرف ملک میں تقلید اور عدم تقلید کے نام پر جو فضا تیار ہو گئی تھی، اس کے لئے وہ براہ راست دینیات کی طرف مراجعت کو ضروری خیال فرماتے تھے، اور دین کو اس کے اصل سرچشمے سے جوڑنے کے قائل تھے۔۔۔

اس عہد کا دینی منظر نامہ

ملک کا حال یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان ایک طرف انگریزی تسلط کے خلاف برسر پیکار تھے تو دوسری طرف عدم تقلید جیسے داخلی فتنوں سے دوچار تھے، جن سے یگونہ خانہ جنگی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا، اور اسلام کے بنیادی اور اصولی مسائل سے زیادہ جزوی اور فروعی مسائل پر علماء کی محنتیں صرف ہو رہی تھیں، ان پر چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں شائع ہو رہی تھیں، مثلاً:

☆طبقات ارض میں انبیاء کا وجود ☆اللہ تعالیٰ کا استواء علی العرش

☆امکان کذب ☆امکان نظیر ☆ فلک کا خرق و التیام

☆مصافحہ اور معانقہ کا جواز وعدم جواز ☆لعن یزید کا جواز یا تحریم

221۔کمالات رحمانی ص ۵۷ مصنفہ مولانا تجمل حسین بہاری بحوالہ سیرت مولانا مونگیری ص ۱۱۳۔

☆معراج جسمانی کے منکر کی تکفیر ☆آمین بالجہر ☆قرأت فاتحہ

☆اور رفع یدین وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جیسے موضوعات علماء کے درمیان زیر بحث تھے، اس دور میں جو کتابیں شائع ہوئیں ان کی ایک جھلک حضرت مولانا محمد الحسینیؒ کی کتاب "سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ" سے ملاحظہ فرمائیں:

"☆فیوس الکملۃ علیٰ روس الجہلۃ -مولانا حکیم الٰہی بخش، مطبوعہ ۱۳۰۰ھ

☆ظفر مبین علیٰ جمع الشیاطین -مولانا محمد علی بچھرانوی، مطبوعہ ۱۲۹۰ھ

☆سوط الرحمن علیٰ حاسد النعمان- مولانا حکیم الٰہی بخش خان صاحب، مطبوعہ ۱۳۰۶ھ۔

☆سبحن السبوح عن عیب کذب مقبوح-مولانا احمد رضا خان بریلوی

☆مولانا ابو الحسنات عبد الحی فرنگی محلیؒ (متوفی ۱۳۰۴ھ) نے نواب صدیق حسن خان کی بعض کتابوں پر تنقید کی، تو مولوی عبد النصیر سہسوانی نے اس کے جواب میں "شفاء العی عما اوردہ الشیخ عبد الحی" کے نام سے ۱۲۹۴ھ میں ۱۱۲ صفحے کی کتاب لکھی، اس کے جواب میں مولانا عبد الحیؒ نے "ابراز الغی الواقع فی شفاء العی" کے نام سے ۶۴ صفحات کا ایک رسالہ لکھا، اور ان کی تنقید پر تعقب کیا، اور قدرتی طور پر اپنے علمی مرتبہ اور جلالت شان کا خیال رکھا، اس رسالہ کے جواب میں مولوی ابو محمد ٹونکی نے "آخر الدواء الکی" کے نام سے ۲۰۸ صفحہ کی کتاب لکھی، اور انتہائی مضحکہ خیز اسلوب اختیار کیا[222]۔

---

[222]-سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۸۸ تا ۹۱۔

☆افواہوں کا بازار گرم تھا،ایک دوسرے کے خلاف خوب پروپیگنڈے کئے جاتے تھے،مولاناسید نذیر حسین محدث دہلوی حج کے لئے تشریف لے گئے توان کے مخالفین نے پاشا کو بدگمان کرنے کی کوشش کی،اور یہاں ان کی گرفتاری کی افواہ اڑادی گئی،ربیع الاول ۱۳۰۱ھ میں جب وہ تشریف لائے تو اشتہار بازی کا سلسلہ شروع ہوگیا،اور وہ شدت اختیار کی گئی جیسے کفرواسلام کی جنگ ہو،[223]۔

☆مولانا محمد الحسینی نے مولاناسید عبدالحی لکھنویؒ کے سفرنامہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مقلدین مقلدین کو مباح الدم اور ان کے مال اور بیویوں کو مال غنیمت اور اپنے لئے حلال تک تصور کرتے تھے،۔۔۔ مقلدین کی مسجدوں میں سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور دیگر ناپاک چیزیں پھینک دی جاتی تھیں [224]"وغیرہ اناللہ واناالیہ راجعون۔

مولانانصیرالدین کی فکرمندی

یہی وہ حالات تھے جن کی بناپر نسل نو کے تحفظ کے لئے مولانانصیرالدین نصرؔ کافی فکر مند تھے ،اور قرآن وحدیث اور علوم دینیہ کی طرف راست مراجعت کو وہ اس کا حل تصور فرماتے تھے،اپنے خط میں صاحبزادے کوانہی حالات کی طرف توجہ دلائی ہے:

"خود سوچو کہ زمانہ کیساہے؟اور دینیات کی کس قدر ضرورت ہے ، اور وہابیوں(غیر مقلدوں) نے کیسی آفت ڈھائی ہے؟۔۔۔(اگلے صفحہ پر)

---

[223]۔سیرت مولانامحمد علی مونگیری ص۹۳۔

[224]۔دہلی اوراس کے اطراف،سفرنامہ مولاناعبدالحی ص۵۸ تا۶۸ بحوالہ سیرت مولانامحمد علی مونگیری ص۱۰۰۔

رحمت اللہ [225] کے بغض وعناد کی اور وہابیوں کے شر وفساد کی کیفیت یہ ہے کہ اللہ ہی بچاوے اور اپنے حفظ وامان میں رکھے، آمین۔
وہابیوں سے ملنے والے نام کے حنفی بھی یہاں سب مہمل ہو رہے ہیں، اللہ ہدایت کرے،۔۔۔ تم خدا کا بھروسہ رکھو اور محض اللہ کے واسطے علوم دینیہ میں کمال پیدا کرو، تاکہ ان پر عمل کر کے سعادت دارین حاصل کرو، اتقیاء اور صلحاء کی صحبت رکھو، اشقیاء اور بے دینوں سے الگ رہو، اللہ مددگار ہے، یہاں کے اشقیاء سے جب اللہ نے تم کو الگ کیا ہے تو خدا کا شکر کرو [226]"

والد ماجدؒ کا درد رائگاں نہیں گیا، اور بالآخر کانپور کا سال مکمل کرنے کے بعد مولانا عبد الشکورؒ شوال المکرم ۱۳۱۶ھ مطابق فروری ۱۸۹۹ء میں دار العلوم دیوبند کی طرف روانہ ہو گئے۔۔ البتہ اس سفر علمی میں رفیق درس اور یار غار حضرت مولانا بشارت کریم صاحب گڑھولویؒ شریک نہیں تھے۔

---

[225] ۔رحمت اللہ۔شاید مظفرپور میں کوئی متشدد غیر مقلد تھے۔

[226] ۔مکتوب نصیر الدین نصر ص ۲۔

سوئے دیوبند

دیوبند کی علمی و دینی اہمیت

اسلامی ہند کے سقوط کے بعد ملت اسلامیہ کے دینی تشخصات وامتیازات کے تحفظ ،اور علوم اسلامیہ کی توسیع واشاعت کے باب میں دیوبند نے جو خدمات انجام دی ہیں ،وہ صرف ہندوستان کی تاریخ کا نہیں بلکہ اسلام اور ملت اسلامیہ کی تاریخ کا روشن باب ہے، دارالعلوم دیوبند صرف اینٹ پتھر کی کسی عمارت یا شہر کا نام نہیں ہے، یہ ہندوستان میں ایک فکر ، تحریک، مسلک، دین کی تفہیم وتشریح کے سب سے معتبر اور مستند معیار کا نام ہے، ۱۸۵۷ء کے زوال کے بعد ملت اسلامیہ کو سنبھالا دینے ،اور پورے عالم میں حق اور دین قیم کی تشریح وترسیل کے معاملے میں دارالعلوم دیوبند نے جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی کوئی نظیر ماضی قریب کی ملی، علمی اور دینی تاریخ میں نہیں ملتی ، یہ صرف ایک مدرسہ نہیں ،بڑے فکری انقلاب کا سرچشمہ ہے ، افراد سازی اور دینی وملی تحریکات کی نشو ونما میں دنیا کا کوئی ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، یہ فکر اور تحریک دیوبند جیسے چھوٹے قصبہ سے شروع ہوئی لیکن بہت تھوڑے عرصہ میں یہ ایک عالمی تحریک بن گئی ،اس کے تعلیمی نظریات ،دینی تصورات ،اور مسلکی رجحانات نے وہ عالمی قبولیت حاصل کی کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے استناد میں اضافہ ہوتا گیا،اس سرزمین نے ایسے رجال کار اور علمی وملی شخصیات پیدا کیں ،جن میں ایک ایک شخصیت پورے ایک عہد پر بھاری ثابت ہوئی، قرآن وحدیث ،فقہ اسلامی ،تصوف واحسان ،اخلاقیات ،اور دیگر علوم و فنون پر اس ادارہ نے پوری لائبریری تیار کردی، اس سے نسبت قابل افتخار بھی سمجھا گیا اور قابل استناد بھی۔

اس ادارہ کی بنیاد غیبی اشارات کے تحت اکابر علماء ومشائخ کے مشورہ سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۶ / محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۱/ مئی ۱۸۶۶ء کو رکھی

اور شیخ العالم سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور دیگر مشائخ وقت کی دعائیں شامل حال رہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ ارشد حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے تھے کہ:

"دارالعلوم دیوبند کا قیام کسی وقتی جذبہ یا شخصی حوصلہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی تاسیس طے شدہ منصوبہ اور ایک جماعت کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت عمل میں آئی ہے، جس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ قیام دارالعلوم کے بعد جب شاہ رفیع الدین دیوبندی حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئے، تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لئے دعا فرمایئے، تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:

"سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خدا ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے، دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں کو یہ سرزمین لے اڑی"[227]۔

آج بھی یہ نیر تاباں کی طرح افق عالم پر روشن ہے اور اپنی کرنیں ساری دنیا میں بکھیر رہا ہے، اللہ پاک قیامت تک اس ادارہ کی حفاظت فرمائیں آمین۔

یہ شجرۂ طوبیٰ پھیلا ہے، تا وسعت امکاں پھیلے گا

---

[227] علماء حق ج ۱ ص ۱۷، دارالعلوم دیوبند کے ویب سائٹ سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی قدیم ترین مرکزی عمارت
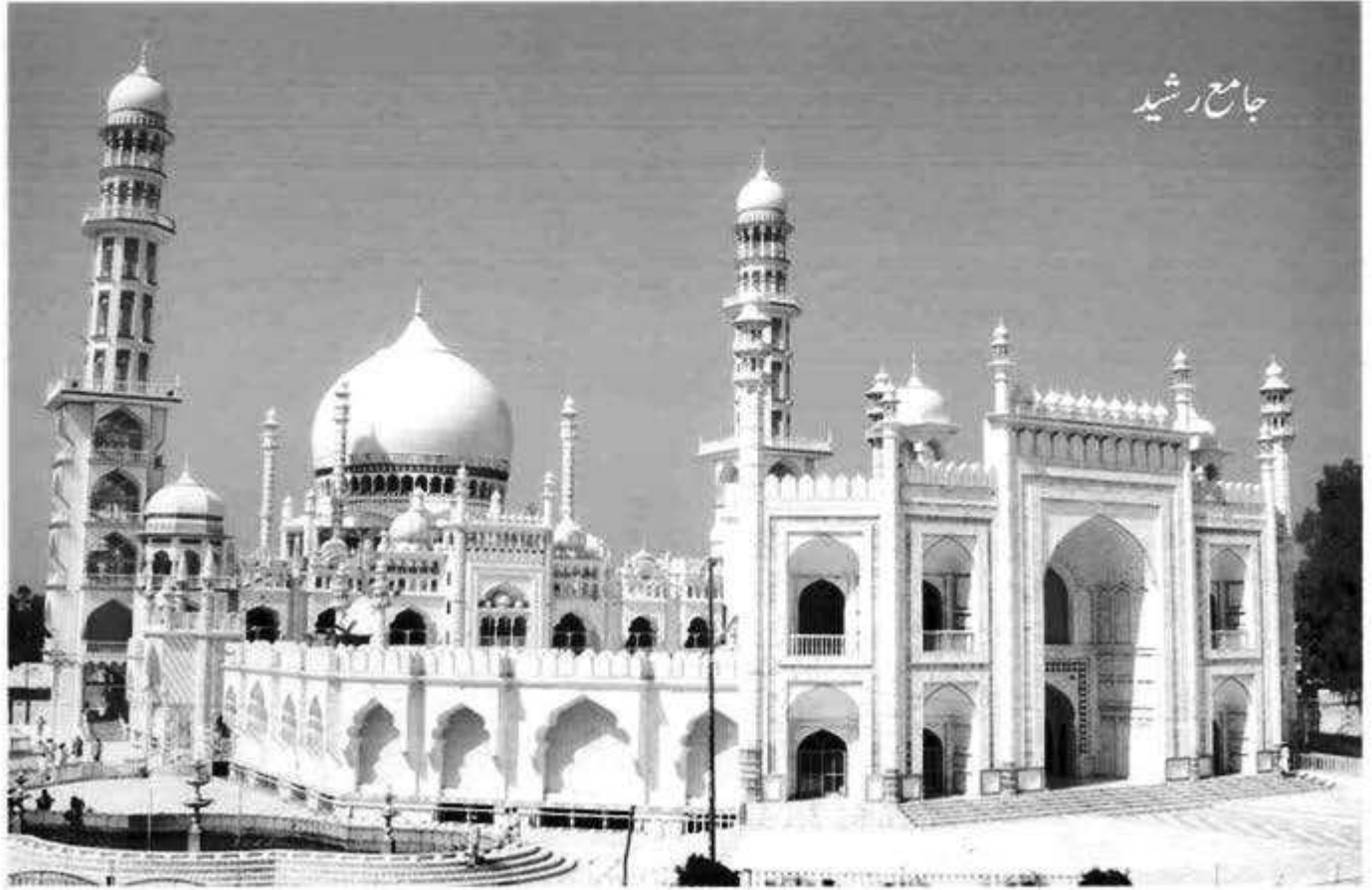
دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی مسجد جامع رشید

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

ناممکن ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا ذکر آئے اور بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نام ذہن میں نہ آئے، "قاسمیت" ہی اس ادارہ کی شناخت ہے، آپ اس قافلۂ قدس کے اولین سالار ہیں، قاسمیت ہی تحریک دیوبند کی روح ہے، دیوبند میں سب کچھ ہو اور قاسمیت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہے، تمام فرزندان دارالعلوم دراصل فرزندان قاسمی بھی ہیں۔۔۔۔باپ کے ذکر کے بغیر فرزند کا ذکر بے معنٰی ہے۔۔۔۔اس لئے محض بطور تبرک آپ کے مختصر حالات ذکر کئے جاتے ہیں، ورنہ آپ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اورآپ کے ذکر کے لئے طویل دفتر درکار ہے۔

طویل عمر ہے درکار اس کے پڑھنے کو
ہماری داستاں اوراق مختصر میں نہیں (طارقؔ بن ثاقب)

اسم گرامی "محمد قاسم" ہے، والد ماجد کا نام "اسد علی" ہے، آپ کا تعلق صدیقی گھرانے سے ہے، ولادت باسعادت ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں ایک قدیم مردم خیز قصبہ نانوتہ (ضلع سہارن پور) میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں ہوئی، مکتب کی تعلیم کے بعد آپ کو دیوبند پہونچادیا گیا، یہاں مولوی مہتاب علیؒ کے مکتب میں پڑھا، پھر اپنے نانا کے پاس سہارن پور چلے گئے جو وہاں وکیل تھے، سہارن پور میں مولوی نواز سے عربی صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء کے آخر میں آپ کو حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اپنے ہمراہ دہلی لے گئے، وہاں کافیہ اور منطق وفلسفہ اور علم کلام کی کتابیں مثلاً میر زاہد، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ مولانا مملوک علیؒ سے ان کے مکان پر پڑھیں بعد ازاں آپ کو دہلی کالج میں داخل کر دیا گیا، مگر آپ سالانہ امتحان میں شریک نہیں ہوئے، اور کالج چھوڑ دیا، بقول حضرت

مولانا یعقوب نانوتویؒ:

"آپ کی قابلیت اور ذہانت کا شہرہ ہو چکا تھا، آپ کے کالج چھوڑنے پر تمام ذمہ داران کالج اور اساتذہ کو بے حد افسوس ہوا"

آپ کی فراغت ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں دہلی سے ہوئی۔۔۔۔

بائیس، تیئس (۲۲) سال کی عمر میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ کی خواہش پر بخاری شریف کے آخری پاروں کے حواشی لکھے۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد حضرت نانوتویؒ نے ذریعۂ معاش کے لئے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار فرمایا اور پھر آخر تک یہی ذریعۂ معاش رہا، ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا، صحاح ستہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم اور دوسری کتابیں بھی پڑھاتے تھے، مگر درس کسی مدرسہ کے بجائے کسی چہار دیواری، مسجد یا مکان میں ہوتا تھا، جہاں خاص خاص تلامذہ ہی زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔

۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے، واپسی پر مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کی ملازمت کی، ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء تک اسی مطبع سے وابستہ رہے، اسی زمانے میں دوسری مرتبہ حج کے لئے جانا ہوا اور اس کے بعد مطبع ہاشمی میرٹھ سے تعلق قائم ہوا، اس دوران بھی درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، مگر کسی مدرسہ میں ملازمت اختیار نہیں کی۔

آپ کے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرمایا کرتے تھے:

"پہلے زمانے میں کبھی ایسے لوگ ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے"

آپ کے نامور معاصر سر سید احمد خان مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے آپ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحبؒ کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں، مگر مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی نیکی، دینداری، تقویٰ، ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ مولوی محمد اسحاقؒ کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔۔۔۔۔۔یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

؎ بالائے سرش زہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں، اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہونگے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبد العزیز سے کچھ کم ہو، اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، در حقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے، اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج وافسوس کا باعث ہے"[228]۔

حضرت نانوتویؒ کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ ھندوستان میں علوم دینیہ کی نشأۃ ثانیہ کے لئے تعلیمی تحریک کا احیا اور مدارس دینیہ کے لئے وہ رہنما اصول وضع کرنا ہے، جن پر مدارس دینیہ کی بقا کا انحصار ہے، آپ کی سعی جمیل سے دارالعلوم دیوبند کے علاوہ مختلف مقامات مثلاً تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر)، گلاؤ ٹھی (ضلع بلند شہر)، کیرانہ (ضلع مظفر نگر) دان پور (ضلع

228۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۴/ ۴ / ۱۸۸۰ء، یہ اقتباس دارالعلوم دیوبند کے ویب سائٹ سے لیا گیا ہے۔

بلند شہر، اور میرٹھ اور مرادآباد وغیرہ میں متعدد مدارس قائم ہوئے، آپ نے اس کو ایک دینی وعلمی تحریک کی صورت عطا کی۔

اس کے علاوہ دشمنان اسلام کے خلاف آپ کے مناظرے، کتابیں، اور عملی جہاد وغیرہ اپنی جگہ ہیں، ان میں سے ہر ایک مستقل باب ہے، جس پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے، اور مزید لکھے جانے کی ضرورت ہے، اس حقیر نے بھی حضرت کی شخصیت کے اس پہلو پر "تحفظ دین کی مساعی جمیلہ میں حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کا کردار" کے نام سے ایک مستقل مضمون لکھا ہے ---

سانحۂ وفات ۴۹ سال کی عمر میں ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۱۸۸۰ء کو پیش آیا، دارالعلوم دیوبند اور مدارس اسلامیہ کے علاوہ دو درجن سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑیں[229]۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

حضرت شیخ الہند دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم ہیں، آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں ان کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے، ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا مہتاب علیؒ سے حاصل کی، قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے، کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہوگئے، اور یہاں ملا

229۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب "سوانح قاسمی" تین جلدوں میں، تاریخ دارالعلوم دو جلدوں میں مرتبہ مولانا محبوب علی رضویؒ، وغیرہ۔

محمودؒ[230]، مولانا سید احمد دہلویؒ[231] اور مولانا یعقوب نانوتوی[232] وغیرہ اساتذہ سے نصاب کی تکمیل کی، اس کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی، فنون کی بعض

---

[230] -دار العلوم دیوبند کے آپ پہلے استاذ ہیں، دیوبند کے رہنے والے تھے، مگر کسب معاش کے لئے میرٹھ کے ایک مکتب میں ملازم تھے، وہاں دس روپے تنخواہ ملتی تھی، جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کو پندرہ (۱۵) روپے ماہانہ تنخواہ پر میرٹھ سے دیوبند روانہ فرمایا، اور مہتمم اول حضرت حاجی عابد حسین دیوبندیؒ کو تحریر فرمایا کہ

"مولوی محمود کے پہونچتے ہی مدرسہ شروع کردیں، میرے انتظار میں وقت ضائع نہ کریں۔"

چنانچہ انہوں نے دیوبند پہونچ کر پہلے طالب علم "محمود الحسن" (حضرت شیخ الہندؒ) کو پہلا سبق پڑھایا، ۱۵/ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/ ستمبر ۱۸۶۶ء کو آپ دار العلوم میں تشریف لائے اور زندگی کے آخری لمحہ تک دار العلوم سے وابستہ رہے، ملا محمودؒ بڑے قابل و فاضل تھے، دار العلوم دیوبند کے پہلے مدرس اول آپ ہی تھے، حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ کے تشریف لانے کے بعد وہ مدرس اول اور آپ مدرس دوم قرار پائے۔

حدیث و فقہ میں انہیں کامل دسترس حاصل تھی، ان کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے تھے:

"در حدیث و فقہ تفسیر و اصول — شہرۂ کامل بدار و در فحول
زیلعی و لوذعی دریائے علم — منبع خلق و تواضع کان علم

۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں آپ کی وفات ہوئی، قبرستان قاسمی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

(مشاہیر دار العلوم دیوبند ص ۲۲ مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ، ماہنامہ تجلی، دیوبند و دار العلوم دیوبند نمبر ص ۳۴ شمارہ مارچ اپریل ۱۹۸۰ء)

[231] -حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ ہندوستان کے جلیل القدر علماء میں تھے، منقولات کے ساتھ معقولات کے بھی امام تھے، فن ریاضت و ہیئت میں ان کی شہرت یورپ تک پہونچ گئی تھی، حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ فرماتے تھے کہ

"مولوی سید احمد صاحب کو اللہ پاک نے فن ریاضی و ہیئت میں وہ صلاحیت بخشی ہے کہ شاید ان فنون کے موجدوں کو بھی اتنی نہ ہو" (اشرف السوانح مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ ج ۱ ص ۶۲)

قیام دار العلوم کے تیسرے سال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء یہاں مدرس دوم کی حیثیت سے بلائے گئے، حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ کی وفات کے بعد دار العلوم کے صدر مدرس ہوئے، چھ (۶) سال اس منصب پر فائز رہے، ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۵ء کو دار العلوم سے سبکدوش ہو کر بھوپال تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا (دار العلوم ویب سائٹ)

اعلیٰ کتابیں اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی، زمانۂ تعلیم ہی سے آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، آپ کی اعلیٰ قابلیت کو دیکھتے ہوئے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا جس سے بتدریج ترقی پاکر ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

علم باطن حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل کیا، اور خلافت سے سرفراز ہوئے، دارالعلوم میں صدارت تدریس کی تنخواہ اس وقت ۷۵/ روپے تھی، مگر آپ نے

---

[232] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہندوستان کے ممتاز اور معروف صاحب دل اور صاحب نسبت عالم، محدث اور فقیہ تھے، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ استاذ الکل اور استاذ الہند کی حیثیت رکھتے تھے، آپ کی ولادت نانوتہ میں ۱۳/ صفر المظفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۲/ جولائی ۱۸۳۳ء کو ہوئی، منظور احمد، غلام حسین اور شمس الضحیٰ آپ کے تاریخی نام ہیں، حفظ قرآن کریم اور ابتدائی فارسی کتابیں پڑھنے کے بعد گیارہ (۱۱) سال کی عمر میں والد ماجد کے ہمراہ محرم الحرام ۱۲۵۰ھ مطابق مئی ۱۸۳۴ء کو دہلی کا سفر کیا، درسیات کی تمام کتب متداولہ اپنے والد ماجد سے پڑھیں، علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبد الغنی مجددیؒ سے کی،۔۔۔۔۔ باطنی تعلیم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل کی،۔۔۔۔۔ والد ماجد کے انتقال (ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ستمبر ۱۸۵۱ء) کے بعد ایک سال تک دہلی میں مقیم رہے، اس کے بعد اجمیر گورنمنٹ کالج میں ملازمت اختیار کرلی، اسی اثناء میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب (غدر) پیش آیا، آپ ملازمت سے مستعفی ہوکر نانوتہ میں مقیم ہوگئے، کچھ دنوں منشی ممتاز علی کے مطبع میں ملازم رہے، ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دیوبند تشریف لائے، اور مسند صدارت پر فائز ہوئے، اور دارالعلوم کے پہلے شیخ الحدیث ہوئے، اور ۱۹/ سال کی مدت میں آپ کے حلقۂ تلمذ سے علم وفضل کے بے شمار آفتاب وماہتاب تیار ہوئے، آپ دارالعلوم کی روح رواں تھے، طبیعت میں تھوڑا جذب تھا، مگر بے حد متواضع اور خوش اخلاق تھے، مزاج میں استغنا تھا، شخصیت بہت بارعب تھی،۔۔۔ دوبار سفر حج سے سرفراز ہوئے، دونوں مرتبہ حضرت نانوتویؒ کی معیت حاصل رہی، شعر وشاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، "گمنام" تخلص تھا، بمرض طاعون ۳/ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۱/ دسمبر ۱۸۸۴ء وفات پائی، نانوتہ میں مدفون ہیں (مشاہیر دارالعلوم دیوبند ص ۲۰ حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ)

۵۰ / روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے ،بقیہ ۲۵ / روپے دارالعلوم کے چندے میں شامل فرمادیتے تھے، آپ کے فیض تعلیم سے بے شمار نادرۂ روزگار شخصیات پیدا ہوئیں، "تحریک ریشمی رومال" آپ کی مشہور تحریکات میں سے ہے، جس میں آپ کو گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیا گیا تھا، مالٹا سے واپسی پر علی گڑھ میں آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا، ۱۸ / ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ / نومبر ۱۹۲۱ء کی صبح آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور دیوبند میں حضرت نانوتویؒ قدس سرہ کے بازو میں مدفون ہوئے[233]۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت آہ کا داخلہ

دیوبند کے اس مختصر تعارف کے بعد پھر لوٹتے ہیں دیوبند کے اسی بطل جلیل حضرت مولانا عبدالشکور آہ کی زندگی کی طرف کہ دارالعلوم دیوبند میں وہ کس طرح داخل ہوئے؟ دیوبند میں ان کے داخلہ کا بھی عجیب قصہ ہے، جو آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس امارت شرعیہ بہار واڑیسہ بڑی لذت لے کر بیان فرماتے تھے اور انہوں نے یہ قصہ اپنے استاذ سے سنا، حضرت امیر شریعت خامسؒ کے انتقال پر ملال پر میں نے ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا، اس میں ان سے سنی ہوئی کچھ باتیں بھی جمع کردی تھیں، میرا وہ مضمون رسالہ دعوت حق شمارہ ۱۳-۱۰ (ربیع الاول ۱۴۲۷ھ مطابق مئی ۲۰۰۶ء) میں شائع ہوا، اس مضمون کا ایک حصہ ہے "حضرت امیر شریعت کی مجلسی باتیں" اس کے تحت ایک عنوان ہے "حضرت آہ کی طالب علمی" ۔۔۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت آہ کے داخلہ کے تعلق سے وہیں سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں، جو کہ حضرت امیر شریعت خامسؒ کی روایات کا ایک حصہ ہے:

"فرمایا: کہ حضرت الاستاذ مولانا عبدالشکور آہ مظفرپوریؒ اپنے والد ماجد حضرت مولانا

---

[233] نزھۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۳۷۷ تا ۱۳۷۹، بعض چیزیں دارالعلوم دیوبند کے ویب سائٹ سے بھی لی گئی ہیں۔

شاہ نصیر الدین نصرؔ کے حکم سے دورۂ حدیث شریف کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، اس وقت دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے لئے تقریری امتحان ہوتا تھا، امتحان دارالعلوم کے کتب خانے میں لیا جارہا تھا، دورہ کے طلبہ کا امتحان حضرت شیخ الہندؒ لے رہے تھے، اور ان کی مدد کے لئے ایک اور کوئی استاذ موجود تھے، یہ دیوبند کا وہ دور تھا، جب وہاں بھی منطق وفلسفہ کو خاص اہمیت حاصل تھی اور کسی کی صلاحیت وقابلیت کے پرکھنے لئے اسی کو سب سے بڑا معیار مانا جاتا تھا، قاضی مبارک یا اور کوئی کتاب تھی، ممتحن صاحب نے دریافت فرمایا کہ: فلاں کتاب تم نے پڑھی ہے، اس کا امتحان دے سکتے ہو؟ تو حضرتؒ نے عرض کیا کہ: ہاں میں نے پڑھی ہے اور اس کا بے تکلف امتحان میں دے سکتا ہوں"

حضرت امیر شریعتؒ اپنے استاذ کے حوالے سے فرماتے تھے، کہ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کو منطق وفلسفہ میں امامت کا درجہ حاصل تھا، منطق وفلسفہ کی تمام کتابیں حضرت آپؒ چونکہ ان سے پڑھ کر گئے تھے، اس لئے ان کو ممتحن کے جملوں کا ذرا بھی خوف نہیں ہوا"

بہر حال فلسفہ کی کسی مشکل ترین کتاب (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کا انتخاب کر کے امتحان لیا گیا، حضرت آپؒ نے سوالات کے بھرپور جوابات دیئے، -جس کا انداز یہ تھا کہ ماتن یہ فرماتے ہیں، شارح یہ کہتے ہیں، اور اس متن کے فلاں فلاں شارحین نے یہ تحریر کیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کا صحیح مطلب یہ ہے-----

حضرت شیخ الہندؒ اور ممتحن صاحب اس عجیب وغریب طالب علم کی غیر معمولی ذکاوت وذہانت اور حاضر دماغی پر حیران رہ گئے آخر حضرت شیخ الہندؒ نے دخل دیا اور فرمایا، اس کا کیا

امتحان لیا جائے ، یہ تو پوربی ہے[234]۔

---

[234] ۔پیچھے علامہ گیلانیؒ کے حوالے سے گذر چکا ہے کہ (دیار پورب یعنی صوبہ اودھ، صوبہ الہ آباد اور صوبہ عظیم آباد جو اب پٹنہ کے نام سے مشہور ہے) کے علاقے میں معقولات کا بڑا زور تھا، اور وہاں کے پانی میں بے پناہ ذہانت پائی جاتی تھی (نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۳۱۰) حضرت شیخ الہندؒ کا اشارہ اسی طرف تھا۔

اسلامی ہندوستان میں علم وفضل اور درس وتدریس میں اس علاقہ کو خصوصی برتری حاصل تھی، دیار مشرق کے گاؤں گاؤں میں معرفت روحانیت کی ایسی خانقاہیں اور علم وفن کی اتنی درسگاہیں قائم تھیں کہ شہر کا گمان ہوتا تھا، مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ نے اپنی مشہور کتاب "سبحۃ المرجان" میں لکھا ہے کہ:

"وقصبات الفورب فی حکم البلدان لانہا مشتملۃ علی العمارات العالیۃ وعلیٰ محلات الشرفاء والنجباء والمشائخ والعلماء وغیرهم من الاقوام المختلفۃ وارباب الحرف المتنوعۃ وعلی المساجدوالمدارس والصوامع ومساجدهامعمورة بصلوٰۃ الجمعۃ والجماعات یصلح ان یطلق علی القصبۃ اسم البلدۃ "(سبحۃ المرجان ص ۵۳)

یعنی دراصل پورب کے قصبات کی حیثیت شہروں کی ہے، کیونکہ بلند وبالا عمارتوں سے عموماً یہ معمور ہیں، ان میں شرفاء، نجباء، مشائخ (صوفیاء) اور علماء کے مستقل محلے ہیں، جن کا تعلق مختلف قوموں سے ہے، ان قصبوں میں مختلف پیشوں اور دستکاریوں کے جاننے والے بھی رہتے ہیں، ان میں مساجد بھی، مدارس بھی ہیں، خانقاہیں بھی ہیں، ان قصبوں کی مسجدیں جمعہ اور جماعت سے ہمیشہ آباد رہتی ہیں، ان قصبوں کو بجائے قصبہ کے شہر کہنا زیادہ درست ہے۔

(ترجمہ حضرت مولانا گیلانیؒ، نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۵۱)

مولانا گیلانیؒ نے مآثر الکرام کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاہجہاں بادشاہ پورب کے بارے میں کہتے تھے:

"پورب شیر از مملکت ماست" یعنی پورب ہمارے ملک کا شیراز ہے۔

مآثر الکرام میں اس وقت کے پورب کی جو منظر کشی کی گئی ہے، اس کا ترجمہ حضرت گیلانیؒ کی زبانی سنئے:

"ہر پانچ سے لے کر دس کر وہ (دو میل کے قریب) میں شرفاء کی آبادی ہے، جن کو سلاطین وحکام کی طرف سے وظیفہ اور زمین وجائداد حاصل ہے، اور مساجد، مدارس اور خانقاہیں بنی ہوئی ہیں، اور ہر جگہ مایہ ناز مدرسین نے مسند علم وفن بچھا رکھی ہے، اور اطلبوا العلم (طلب علم) کی صدا دے رکھی ہے"

(مآثر الکرام ص ۲۲۲ بحوالہ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ج ۱ ص ۵۲)

پورب میں بھی خطۂ بہار کو خاص اہمیت حاصل تھی، مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ:

یہ کہہ کر حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت آہ کو رخصت کر دیا، مگر یہ جملہ حضرت آہ کی طبیعت پر کافی گراں گذرا، "پوربی" کا لفظ کانپور کی اصطلاح میں گالی کے مترادف تھا، جب کہ دیوبند کی اصطلاح میں یہ لفظ انتہائی ذکی اور ذہین طالب علم کے لئے بولا جاتا تھا، مولانا عبد الشکور صاحب دیوبند کی اصطلاح سے ناواقف تھے اس کو وہ کانپوری گالی سمجھ کر حضرت شیخ الہندؒ سے بدگمان ہوگئے، اور دیوبند میں نہ پڑھنے کا فیصلہ کر لیا، ساتھیوں نے ان کو اصطلاحی فرق سمجھایا اور حضرت شیخ الہندؒ کے فضائل و کمالات سے آگاہ کیا تو ان کی بدگمانی تو ختم ہوگئی، مگر منطق و فلسفہ کے علمی جوش نے ان کے مزاج کی شدت کم نہ ہونے دی، ساتھیوں نے ان کو بمشکل افتتاحی سبق کے لئے راضی کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا افتتاحی درس بخاری

امتحان کا نتیجہ انتہائی شاندار اور امتیازی آیا اور اب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے افتتاحی درس کی تیاری تھی، حضرت آہ نے افتتاح درس سے کئی دن قبل ہی سے مختلف شروح و حواشی کی مدد سے بخاری کی تیاری شروع کر دی تھی، یوں بھی صحاح کی ساری کتابیں وہ کانپور سے پڑھ کر آئے تھے، ان کا خیال تھا کہ پہلے ہی سبق میں حضرت شیخ الہندؒ پر سوالات و اعتراضات کی بوچھاڑ کر کے ان کے مذکورہ بالا جملہ کا حساب صاف کر لیں گے۔۔۔

بالآخر وہ یوم انتظار آہی گیا، کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر حضرت آہ درسگاہ پہونچے، جیسے وہ درسگاہ میں نہیں میدان مناظرہ میں پہونچ رہے ہوں، قریب سو (۱۰۰) طلبہ کی جماعت

"بہار مجمع علماء بود" یہ شیخ عبد الحق اور شاہ ولی اللہ کا بیان ہے، جس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے، کہ پایۂ تخت میں بہار کے علماء بہار ہی میں تحصیل علم کر کے پہونچتے تھے، ملا احمد سعید مفتی عساکر شاہ جہانی کے متعلق بھی لکھا ہے کہ "از توابع بہار بود و تحصیل علم از والد خود ملا سعد یافت کہ سر برآوردہ دان دیار بود

(بادشاہ نامہ ج ۲ — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۴۸)

تھی، حضرت شیخ الہندؒ بھی تشریف لے آئے، اور مسند درس پر جلوہ افروز ہو گئے، حضرت آہ کا دماغ علمی سوالات اور پیچیدہ اعتراضات کو سمیٹنے میں مصروف تھا، کہ شیخ الہندؒ کی تقریر شروع ہو گئی، غالباً مبادیات حدیث کا بیان تھا، بقول امیر شریعتؒ حضرت آہؒ فرماتے تھے، کہ:

"حضرت شیخ الہند کی روحانیت تھی، یا علمی گیرائی و گہرائی یا کوئی غیر مرئی طاقت کہ شیخ الہندؒ کا درس شروع ہوتے ہی، مجھ پر سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی، ان کا ایک ایک جملہ اتنے زیادہ علوم و حقائق پر مشتمل محسوس ہوا، جن کی مجھے ہوا تک نہیں لگی تھی ــــــ شیخ الہند کی تقریر سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اب تک کچھ پڑھا ہی نہ ہو، ان کا ایک ایک لفظ میرے مزعومات کے دبیز پردوں کو چاک کرتا ہوا مجھ کو اپنی جہالت کا احساس دلاتا تھا، شیخ الہند کا پورا درس ختم ہو گیا ، اور میری زبان سے اعتراض کا ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، جیسے وہ میرے اعتراضات کو خود دھوتے چلے گئے ہوں، میں ان سے اتنا متاثر ہوا کہ تکمیل حدیث کے لئے پورا ایک سال وہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا"

حضرت آہ نے حضرت شیخ الہندؒ کی پوری تقریر بخاری و ترمذی بھی ضبط کی تھی، مگر افسوس وہ تقریر محفوظ نہ رہ سکی، حضرت امیر شریعت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب گڑھولویؒ اکثر ان تقاریر کا ذکر فرماتے تھے۔

کانپور اور دیوبند کے طریق تعلیم میں فرق

حضرت آہ نے کانپور کی دو سالہ صحبت کے نتیجے میں حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ سے گہرے اثرات قبول کئے تھے، دیوبند پہونچ کر حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ کا موقعہ ملا تو اس میں ایک نئے رنگ کی آمیزش ہوئی، دونوں جگہوں کا انداز جداگانہ تھا، کانپور میں عقل کا غلبہ تھا تو دیوبند میں دل کا، وہاں ذہن متاثر ہوتا تھا تو یہاں دل متاثر ہونے لگا، وہاں ہر بات عقل کے پیرایہ

میں کہی جاتی تھی، تو یہاں نقل کے پیمانہ میں تولی جاتی تھی، وہاں ہر بات حکماء اور فلاسفہ کے حوالے سے کہی جاتی تھی تو یہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان سلف کے حوالے سے، وہاں علم یونان کو میزان مانا جاتا تھا، یہاں قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے سوا کسی معیار کو معتبر نہیں جانا جاتا تھا۔۔۔۔

بالفاظ دیگر یہاں دنیا ہی دوسری تھی، فکر واحتساب کا سانچہ ہی بدلا ہوا تھا، مولانا عبدالشکور اچانک عقل کی دنیا سے نکل کر قلب کے عالم میں پہونچ گئے تھے، بقول شاعر:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت آہؔ کو محسوس ہوا کہ وہ فطرت کی دنیا میں لوٹ آئے ہیں، اور دین فطرت کو اسی کی زبان میں سمجھنے کی شروعات کر رہے ہیں، آہستہ آہستہ دیوبند کا رنگ گہرا ہونے لگا، اس طرح اگر کانپور میں وہ حضرت کانپوریؒ کے علم وفضل سے بے انتہا متاثر ہوئے تھے، تو دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کی روحانی شخصیت، علمی کمالات، اور ان کے آفاقی افکار ونظریات نے ان کی دنیا ہی بدل ڈالی، کانپور میں سب سے مرکزی اور علمی شخصیت حضرت کانپوریؒ کی تھی، تو دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ استاذ الکل مانے جاتے تھے، ایک چیز دونوں میں قدر مشترک تھی، وہ یہ کہ روحانی طور پر حضرت کانپوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ دونوں ہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے،

حضرت آہؔ کے دو مخصوص اساتذہ

حضرت امیر شریعت خامسؒ فرماتے تھے کہ حضرت الاستاذ (مولانا عبدالشکور آہؔ) اپنے جملہ اساتذہ میں سب سے زیادہ دو استاذوں سے متاثر ہوئے، پہلے حضرت کانپوریؒ سے، ان کے

بعد حضرت شیخ الہند سے، اسی تاثر اور محبت کا نتیجہ تھا کہ حضرت آہ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کے نام اپنے دونوں استاذوں کے نام پر رکھے، پہلے صاحبزادے کا نام پہلے استاذ کے نام پر "احمد حسن" رکھا، جو اس حقیر راقم الحروف کے جد امجد تھے، اور دوسرے صاحبزادے کا نام دوسرے استاذ کے نام پر "محمود حسن" رکھا۔

حضرت آہ کا طبعی میلان

حضرت آہ یوں تو دونوں ہی اساتذہ سے متاثر ہوئے مگر بقول حضرت امیر شریعت خامسؒ حضرت شیخ الہندؒ کا تاثر ان پر غالب تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کا میلان طبع مسلک دیوبند کی طرف تھا۔۔۔ جب کہ حضرت کانپوریؒ بعض رسوم وروایات کی طرف مائل تھے[235]، حضرت امیر شریعت نے اپنے استاذ کے حوالے سے بیان فرمایا کہ:

"میں نے مسلک دیوبند کو بڑی مشکل سے سمجھا ہے، یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔۔۔۔ میں جب کانپور سے نکلا تو میرا میلان بھی رسم وروایات کی طرف تھا، دیوبند جب حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہونچا تو دنیا ہی دوسری نظر آئی، میں نے اپنے تمام دلائل جو استاذ اول سے سنے تھے حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے رکھ دیئے، حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے ایسے

---

[235] حضرت کانپوری میں غلو اور تعصب بالکل نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک وہ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں بھی اعلیٰ درجہ کے مدرس رہے، اسی طرح دیوبند جانے والے طلبہ پر انہوں نے کبھی کوئی نکیر نہیں کی، جب کہ بکثرت طلبہ ان کے یہاں فنون کی تکمیل کے بعد درس حدیث کے لئے دیوبند کا رخ کرتے تھے، اور کئی طلبہ دیوبند میں دورۂ حدیث کے بعد تکمیل فنون کے لئے ان کے مدرسہ میں بھی داخل ہوتے تھے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مسلک ومشرب کے آدمی تھے، وہ خالص علمی اور صوفیانہ مزاج رکھتے تھے، چنانچہ امتناع کذب کے مسئلہ پر ان کی رائے علماء دیوبند سے مختلف تھی، انہوں نے اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا، جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے، مگر اس میں خالص علمی زبان استعمال کی گئی ہے، اس کے کسی مقام پر غلو یا تعصب کا احساس نہیں ہوتا، اور نہ کسی کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ان کے یہاں اعتدال اور انصاف تھا۔۔۔۔ اس لئے میلان ہی کی حد تک بات زیادہ صحیح ہے۔

مسکت اور تشفی بخش جوابات دیئے کہ میں نے سمجھا کہ اب حق یہی ہے ،اس کے خلاف سب باتیں غلط ہیں ،پھر میں دیوبند سے کانپور پہونچا اور حضرت کانپوریؒ کے سامنے وہ تمام دلائل وبراہین پیش کئے ،جو حضرت شیخ الہندؒ نے رد بدعت میں دیئے تھے ،تو حضرت کانپوریؒ نے ان کا ایسا مدلل رد فرمایا کہ بس میں نے سمجھا کہ اب ان کا توڑ ممکن نہیں ،اور حق یہی ہے ،پھر دیوبند پہونچا اور وہاں حضرت کانپوریؒ کی ساری تقریر دہرادی ،تو حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا ایسا تشفی بخش جواب دیا کہ میں نے یقین کرلیا کہ اب اس کا جواب ممکن نہیں ،اور حق اسی میں منحصر ہے ، اس طرح دیوبند اور کانپور کے مختلف اسفار ہوئے اور ہر مرتبہ دلائل کی یہی کیفیت رہی ، تب جاکر میں کسی نتیجہ تک پہونچ سکا ، اللہ پاک ان دونوں بزرگوں کے درجات بلند فرمائے آمین[236]۔

---

[236] -دیوبند اور کانپور کی کشمکش اور نقطۂ عدل تک پہونچنے کی ریاضت کا اندازہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اس مراسلت سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے میلاد وقیام وغیرہ مسائل کو سمجھنے کے لئے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے کی ہے ،جو انتہائی دقیق علمی مباحث پر مشتمل ہے ،ان مراسلات کے مجموعہ کا نام حضرت تھانویؒ نے "ضیاء الافہام من علوم بعض الاعلام" رکھا تھا ،یہ پوری مکاتبت "مکاتبات رشیدیہ" میں شائع ہوچکی ہے (اشرف السوانح ج ۳ص ۴۸۴)

اس پوری مراسلت میں حضرت تھانویؒ اہل رسوم کے وکیل نظر آتے ہیں ،اور حضرت گنگوہیؒ ان کے تمام اشکالات کے جواب مرحمت فرماتے ہیں ، حضرت تھانویؒ گوکہ فاضل دیوبند تھے اور ان کی مکمل تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی تھی اس کے باوجود اس زمانے کے عام مزاج یا کانپور کی نرم آب وہوا میں رہنے کی وجہ سے وہ بھی ابتداءً ان مسائل میں نرم گوشہ رکھتے تھے ،اسی لئے حضرت حاجی صاحبؒ کی کتاب " ہفت مسئلہ "جو انہی مسائل سے متعلق ہے وہ حضرت تھانویؒ نے ہی مرتب کی تھی (اشرف السوانح ج ۳ص ۴۸۱)

حضرت تھانویؒ کا جو نقطۂ نظر یا ہفت مسئلہ کے بارے میں ان کی جو وضاحتیں بعد میں سامنے آئیں ،اور جن کے وہ سب سے مضبوط وکیل وترجمان مانے گئے ،وہ بلاشبہ حضرت گنگوہیؒ کے افکار عالیہ کا عکس اور ان کی اصلاح وتربیت کا فیض ہے۔

ایک تاریخی واقعہ

حضرت امیر شریعت خامس ؒ اپنے استاذ کے حوالے سے روایت کرتے تھے کہ ایک موقعہ پر کچھ درمیانی لوگوں کی گروہی عصبیت کے نتیجہ میں ان دونوں بزرگوں کی باہمی کشمکش انتہائی نازک موڑ پر پہونچ گئی، مگر یہ حضرت الاستاذ ؒ ہی کا کمال تھا کہ خود کو بھی اور دونوں اساتذہ کو بھی اس کشمکش سے سلامت نکال لے گئے، ورنہ اس کے نتائج خطرناک ہوسکتے تھے۔۔۔۔۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ کانپور کے کچھ متشدد اہل بدعت کی طرف سے حضرت شیخ الہند ؒ کو مناظرہ کی دعوت دی گئی، ادھر حضرت مولانا احمد حسن کانپوری ؒ کو ان کے مقابلہ کے لئے آمادہ کرلیا گیا، مقام مناظرہ کانپور منتخب کیا گیا، حضرت شیخ الہند ؒ نے خاموشی کے ساتھ اس دعوت کو قبول فرمالیا، اور دیوبند میں کسی کو اس کے بارے میں نہ بتایا۔۔۔

یہ حضرت آہ کے لئے انتہائی آزمائشی مرحلہ تھا، کانپور ایک ایسا میدان کارزار بننے جارہا تھا جس کے دونوں فریق ان کے انتہائی محبوب ترین اساتذہ تھے، حضرت آہ کی نباض طبیعت نے حالات کا تیزی کے ساتھ جائزہ لیا، اور ان کی غیر معمولی ذہانت نے اس مناظرہ کو ٹالنے کی ایک خوبصورت تدبیر نکال لی:

وہ حضرت کانپوری ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ:

حضرت! آپ معقولات کے امام ہیں اور اس باب میں بہت کم لوگ آپ کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ہونے والے مناظرہ میں آپ کے دلائل کی اہم بنیاد یہی عقلیات ہونگی اور انہی کے ذریعہ آپ اپنے مقابل کو بھی زیر کرسکیں گے اور عقول عامہ کو بھی مسخر کرسکیں گے۔۔۔

حضرت کانپوری ؒ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: بالکل درست سمجھا تم نے۔

حضرت آہ نے عرض کیا: اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کو عقلیات سے اتنا شغف نہیں ہے [237] اس لئے ممکن ہے کہ وہ آپ کے دلائل کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکیں، حضرت کانپوریؒ یہ سن کر مسکرائے۔۔۔ حضرت آہ پھر عرض رسا ہوئے کہ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لاچار ہو کر آپ کے دلائل کو ماننے سے انکار کر دیں گے، اس سے زیادہ سے زیادہ ان کی سبکی ہو گی، مگر ان کا ایمان ختم نہیں ہو گا، اس لئے کہ عقلی دلائل کو تسلیم کرنا عقیدے کے لحاظ سے فرض نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حضرت کانپوریؒ اس پر خاموش رہے۔۔۔۔۔۔

حضرت آہ نے ذرا سے توقف کے بعد پھر عرض کیا کہ: آپ یہ بھی جانتے ہیں اور مجھے تو خوب تجربہ ہے کہ قرآن وحدیث اور علوم نقلیہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی بہت گہری نگاہ ہے اور اس میدان میں ان کو جو امتیاز حاصل ہے کہ شاید باید، اس لئے مجھے یقین ہے کہ مناظرہ میں ان کے دلائل کی تمام تر بنیاد یہی قرآن وحدیث اور علوم نقلیہ ہونگے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے دلائل نقلیہ کا جواب دینا کسی کے لئے آسان نہ ہو گا، اور ایسے موقعہ پر آپ اپنے بچاؤ کے لئے ان دلائل کا انکار بھی نہیں کر سکیں گے، اس لئے کہ انکار ایمان کو ختم کر دے گا، مجھے تو لگتا ہے کہ یہ آپ کے لئے انتہائی مشکل وقت ہو گا، اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

حضرت کانپوریؒ نے اپنے مخلص اور لائق تلمیذ کی عرضداشت کا انتہائی گہرائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا، اور معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گئے، اور اپنے تلمیذ رشید سے مایوسانہ انداز میں فرمایا کہ اب تو مناظرہ کی تاریخ طے ہو چکی ہے،

---

[237] حضرت شیخ الہندؒ خدانخواستہ عقلیات میں کمزور نہیں تھے، لیکن ان کو شہرت عقلیات سے زیادہ دینیات میں تھی، گفتگو اسی نقطہ نظر سے ہو رہی ہے، ورنہ جو لوگ حضرت شیخ الہندؒ کو قریب سے جانتے تھے وہ خوب جانتے تھے کہ علوم معقولہ میں بھی وہ کسی سے کم نہیں تھے۔

بچنے کی صورت ہی کیا ہے۔

حضرت آہ نے موقعہ کو غنیمت دیکھتے ہوئے عرض کیا، کہ حضرت ایک صورت میری سمجھ میں آتی ہے، حضرت کانپوریؒ نے فرمایا کہو! حضرت آہ نے کہا کہ آپ رخصت لے کر کسی دوسرے مقام پر چلے جائیں، اور یہ یقین دہانی کرادیں کہ مناظرہ کی تاریخ مقررہ تک آجائیں گے، اس کے بعد ٹھیک مناظرہ سے ایک یوم قبل آپ اپنی علالت کی اطلاع بھیج دیں، اور حاضری سے معذرت لکھ دیں، اس طرح اس ابتلاء سے آپ نجات پاسکتے ہیں۔۔۔

حضرت کانپوریؒ کو اپنے تلمیذ رشید کے اخلاص اور فکر وفہم پر پورا اعتماد تھا، ان کے مشورہ کو قبول کرلیا، اور اسی کے مطابق وہ کانپور سے باہر چلے گئے، اور پھر مناظرہ کے دن اپنی علالت کے باعث تشریف نہ لاسکے۔

دوسری طرف دیوبند میں مناظرہ کی کسی کو خبر نہیں تھی، جب کہ کانپور میں طوفان مچا ہوا تھا، حضرت شیخ الہند تاریخ مقررہ پر کانپور تشریف لائے، تو یہاں صورت حال ہی بدلی ہوئی تھی، مناظرہ کی نوبت ہی نہیں آئی، کانپور کی جامع مسجد میں حضرت شیخ الہندؒ کی ایک زبردست تقریر ہوئی اور حضرت واپس تشریف لے گئے، اس طرح حضرت آہ کے حسن تدبیر سے کانپور کے دینی افق سے سیاہ طوفانوں کے آثار چھٹ گئے۔

اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ حضرت آہ کا قلبی رجحان حضرت شیخ الہندؒ کی طرف تھا اور ان پر حضرت شیخ کا رنگ غالب تھا، متوقع مناظرہ کی مذکورہ روداد میں انہوں نے جو کردار ادا کیا، وہ مسلک دیوبند کو خاموش فتح دلانے کے مترادف تھا، دعوت وعزیمت اور حکمت وتدبر کی تاریخ میں حضرت آہ کے اس عظیم کارنامے کا ذکر سنہرے حرفوں میں کیا جانا چاہئے تھا، مگر افسوس مورخین نے اتنے عظیم واقعہ کی طرف توجہ نہ دی، ماضی کے دبیز اندھیروں میں چھوٹا چھوٹا جزئیہ ڈھونڈنے والی چشم تاریخ اتنے بڑے واقعہ کو نہ دیکھ سکی۔

حضرت آہؒ کی زندگی مجاہدانہ تھی، وہ فنون سپہ گری میں بھی مہارت رکھتے تھے، اوراس دور کے مروج ہتھیار تلوار وغیرہ بھی اپنے پاس رکھتے تھے، بلکہ طلبہ کو ان کی تربیت بھی دیتے تھے، ان کے تیار کردہ طلبہ میں ملک وملت سے محبت اور سرشاری کی کیفیت ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ یہ رنگ بھی حضرت شیخ الہندؒ کا تھا[238]۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت

بہرحال دارالعلوم دیوبند میں حضرت آہؒ کا قیام تقریباً ایک سال رہا، اس دوران وہ ایک ممتاز اور نامور طالب علم کی حیثیت سے اساتذہ کی آنکھوں کا تارہ بنے رہے، اور پورے شعور اور سعادت مندی کے ساتھ انہوں نے اساتذۂ کرام سے کسب کمال کیا۔۔۔۔

شعبان المعظم ۱۳۱۷ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۹ء میں دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، مولانا ریاض احمد بتیاویؒ (م ۱۹۶۲ء)، مولانا عبدالاحد جالویؒ، اور مولانا خدا بخش مظفرپوریؒ (یکے از بانیان جمعیۃ علماء ہند)[239] بھی اسی دور میں دیوبند پہونچے تھے، ان حضرات کے ساتھ حضرت آہؒ کے قدیمی دوستانہ مراسم تھے، یہ حضرات آپ سے ایک سال بعد (۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں) فارغ ہوئے۔

---

[238] سہ ماہی دعوت حق ربیع الاول ۱۴۳۲ھ ص ۱۶۵ تا ۱۶۹۔

[239] الجمعیۃ۔ خصوصی شمارہ "جمعیۃ علماء نمبر" ج ۸ شمارہ ۴۳، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱۹ بحوالہ واصف از روئداد دارالعلوم دیوبند۔

نکاح اور اولاد

حضرت آہؒ کی دوشادیاں ہوئیں:

محل اولیٰ

پہلی شادی فراغت کے بعد متصلاً (غالباً جنوری ۱۹۰۰ء میں) تقریباً بیس (۲۰) سال کی عمر میں اپنے ماموں جان حضرت مولانا سید امیر الحسن قادریؒ کی صاحبزادی "سیدہ حلیمہ خاتون" سے ہوئی، یہ بڑی صاحب کمال، مہذب، تعلیم یافتہ، صابرہ وشاکرہ اور زاہدہ ومتقیہ خاتون تھیں، ایک باکمال باپ کی بے نظیر یادگار تھیں، حضرت امیرؒ کی کوئی اولاد نرینہ زندہ نہ رہ سکی تو اللہ پاک نے ان کی بیٹی ہی کو اظہار کمالات کا ذریعہ بنادیا اور بیٹی کی نسل سے علم وعمل اور روحانیت ومعرفت کے وارثین پیدا فرمائے، آپ ہی کے بطن سے (۱۹۰۱ء کے بالکل آغاز میں) قطب الہند حضرت مولانا سید حکیم احمد حسنؒ جیسی نادرۂ روزگار شخصیت پیدا ہوئی۔۔۔

کچھ عرصہ کے بعد میاں بیوی کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور بالآخر دونوں کے درمیان علٰحدگی ہوگئی۔۔۔۔ایک خاصی مدت کے بعد حضرت حلیمہؒ کا دوسرا نکاح جناب اسحاق صاحب (موضع منوروا شریف ضلع سمستی پور) سے ہوا، جس سے حضرت مولانا عطاء الرحمنؒ (عرف مولانا بہادر) پیدا ہوئے[240]۔

240۔حضرت مولانا عطاء الرحمن کی ولادت شہر مظفر پور میں (تقریبا) ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں ہوئی، شکم مادر ہی میں تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، آپ کا عرفی نام "بہادر" تھا، جو والدہ نے رکھا تھا، اس لئے کہ بچپن سے ہی آپ کا نشانہ خطا نہیں کرتا تھا۔۔۔۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے برادر بزرگ حضرت مولانا احمد حسن منورویؒ صاحب سے حاصل کی، اس کے بعد حضرت منورویؒ نے آپ کا داخلہ علاقہ کے مشہور "مدرسہ رحمانیہ "سوپول ضلع دربھنگہ میں کرادیا، سوپول کے بعد

حضرت حلیمہؒ کی خاک حیات ولایت و تقویٰ کے خمیر میں گوندھی گئی تھا، ان کی زندگی سراپا صبر و شکر سے عبارت تھی، انہوں نے زندگی میں بڑے دکھ جھیلے، مگر سب کو اللہ پاک کی مرضی جان کر سہہ گئیں:

شوہر نامدار کا گھر چھوٹا۔۔۔۔۔۔۔ایک یتیم بیٹے کا بوجھ لئے باپ کے گھر پہونچیں ۔۔۔۔۔۔باپ کے ساتھ ترک وطن کیا اور اجنبیت اور غیریت کی تمام تکلیفیں جھیلیں ۔۔۔۔۔۔جواں سال بھائی اور بہن کی تجہیز و تکفین کا منظر دیکھا، ۔۔۔۔۔۔۔شہری زندگی کے بالمقابل صلحا منورواجیسے کوردہ بیابان میں وحشیوں کے درمیان گذارا کیا۔۔۔۔۔۔۔۔اور ایک بے سروساماں یا لٹے پٹے قافلے کی طرح پوری زندگی گذاردی۔۔۔۔۔۔۔۔۔آخر میں بوڑھے باپ کی ہجرت و مفارقت اور بہار شریف میں ان کا سانحۂ ارتحال۔۔۔۔

اتنے سارے زخم جس سینے میں موجود ہوں، وہاں محبت دنیا کی کیا گزر ہو سکتی ہے۔

بے مثال تقویٰ

پوری زندگی کسی غیر محرم مرد پر آپ کی نگاہ نہیں پڑی، بلکہ اپنے سایہ کو بھی غیر محرم نگاہوں سے بچانے کی کوشش کی، اس معاملے میں وہ اس قدر محتاط تھیں کہ شاید عہد قدیم میں

آپ مدرسہ رحمانیہ مونگیر میں داخل ہوئے، اور متوسطات کی کتابیں پڑھ کر مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور تشریف لے گئے اور (تقریباً ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں) مدرسہ مظاہر علوم سے فارغ ہوئے، کچھ عرصہ مدرسہ خانقاہ رحمانی مونگیر میں تدریسی خدمات انجام دیں اور اپنے علم و فضل اور تدریسی صلاحیت سے حضرت امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے منظور نظر بن گئے، لیکن اپنی مستقل علالت کی وجہ سے مجبور ہو کر وطن مالوف منوروا شریف میں مقیم ہو گئے، آپ کے برادر بزرگ اور استاذ حضرت منورویؒ اس گاؤں کے امام وخطیب اور معلم تھے، لیکن والدہ کے ایما پر آپ نے یہ جگہ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے خالی کر دی، گاؤں کے امام اور استاذ ہونے کے بعد آپ کا فیض پورے گاؤں میں پہونچا بلکہ قرب وجوار کے لوگوں نے بھی آپ سے دینی استفادہ کیا، آپ ایک اچھے معلم اور بیدار مغز اور متقی عالم دین تھے، عین جوانی میں ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں انتقال فرمایا، منوراشریف کے قدیم قبرستان میں مدفون ہیں، فرحمہ اللہ۔

بھی اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی، ان کا ایک واقعہ اس سلسلے میں بہت مشہور ہے:

ہاتھی دیکھنے کی خواہش

منوروا گاؤں میں ایک دن ہاتھی آیا،۔۔۔۔۔ سارا گاؤں اس کو دیکھنے کے لئے نکل گیا، انہوں نے بھی زندگی میں کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا، جی میں آیا کہ ہاتھی دیکھوں، اپنے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا عطاء الرحمن مظاہری ؒ سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا، مگر مشکل یہ تھی کہ وہ باہر نکل نہیں سکتی تھیں، مولانا عطاء الرحمن صاحب ؒ نے یہ تدبیر بتائی، کہ آنگن کی ٹاٹ میں سوارخ کر دیں گے اور جب ہاتھی اس راستہ سے گذرے گا آپ اسی سوراخ سے اس کو دیکھ لیجئے۔۔۔۔۔ان کو یہ تدبیر پسند آئی اور اس کے لئے راضی بھی ہو گئیں۔۔۔۔۔ مگر کچھ خواتین سے ان کو معلوم ہوا کہ ہاتھی پر ہاتھی بان بھی رہتا ہے تو اپنے صاحبزادے کو طلب فرمایا، اور کہا:

> "کہ سنا ہے کہ ہاتھی پر ہاتھی بان بھی رہتا ہے۔۔۔۔۔۔
> پھر تو ہاتھی کے ساتھ ہاتھی بان پر بھی نظر پڑ جائے گی، چھوڑ دو بیٹا! ہاتھی دیکھنا کوئی ضروری نہیں ہے، نگاہ کی حفاظت ضروری ہے، میں ہاتھی دیکھنے کے لئے اپنے آپ کو گنہ گار نہیں کر سکتی"۔۔۔۔۔ اور ہاتھی انہوں نے نہیں دیکھا[241]۔

اس واقعہ سے ان کی طہارت و تقویٰ اور احکام شریعت میں بے انتہا احتیاط کا پتہ چلتا ہے۔

---

[241] یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد اور جناب غنیمت حسین مرحوم (موضع منوروا شریف) سے کئی بار سنا ہے۔

سائل کو محروم نہیں کیا

☆طبیعت میں بڑی سخاوت وفیاضی تھی، کسی سائل کو محروم واپس کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا، جب کہ اکثر وہ فقر وفاقہ اور تنگدستی میں مبتلا رہتی تھیں، ایک بار ایسا ہوا کہ کسی غریب خاتون نے ان سے کپڑے کا سوال کیا، وہ نئی ساڑی پہنے ہوئی تھیں، ان کے پاس کوئی دوسرا کپڑا نہیں تھا، ایک ساڑی پرانی تھی، وہ بستر پر سل چکی تھیں، انہوں نے وہی پہنی ہوئی نئی ساڑی اس کے حوالے کر دی، اور خود بستر سے پرانی ساڑی نکال کر پہن لی، کل ہو کر صاحبزادۂ اکبر حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ سے سارا ماجرا سنایا تو انہوں نے بازار سے دوسری نئی ساڑی کا انتظام فرمایا فرحمہ اللہ[242]۔

میرے جنازے پر بھی کسی مرد کی نگاہ نہ پڑے

صلحا بزرگ اور منوروا شریف کی بہت سی خواتین نے آپ سے فیض پایا، اس حقیر نے ان کی صحبت میں رہنے والی بعض خواتین کو دیکھا ہے، ان پر ان کا گہرا رنگ تھا اور وہ اپنے زہد وتقویٰ اور رہن سہن میں عہد سلف کی یادگار معلوم ہوتی تھیں، وفات سے قبل وصیت فرمائی کہ میرے جنازہ پر بھی کسی مرد کی نگاہ نہ پڑے، چنانچہ غسل کے بعد جب لاش کفن میں لپیٹ کر چارپائی پر رکھ دی گئی، (پہلے اس علاقے میں تابوت کی جگہ پر چارپائی ہی کا استعمال ہوتا تھا) تو چارپائی کو پردہ کے حصار میں قبرستان تک لے جایا گیا، نماز ادا کی گئی اور اسی حصار میں قبر میں بھی اتاری گئیں، (فنعم العبد انہ اواب)۔

---

[242]- یہ واقعہ بھی میں نے اپنے والد ماجد اور جناب غنیمت حسین مرحوم (موضع منوروا شریف) سے کئی بار سنا ہے۔

یہ تھی ایک مؤمنہ خاتون کی وفات حسرت آیات۔ تقریباً ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں منورواشریف میں وفات پائی اور یہیں "کرے" ندی کے کنارے قدیم قبرستان میں اس خطہ میں دفن ہیں، جہاں بہت سے اولیاء اللہ مدفون ہیں اور اس کو ہم بجا طور پر "خطۂ صالحین" کہہ سکتے ہیں۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت مولانا حکیم سید احمد حسن منورویؒ

حضرت حلیمہ سے ۱۹۰۱ء کی بالکل ابتداء (غالباً جنوری) میں حضرت آہ کے فرزند اکبر "حضرت مولانا حکیم احمد حسن" پیدا ہوئے، آپ کی ولادت شہر مظفر پور میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے جد امجد حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصر کے زیر سایہ ہوئی، ان کے وصال کے بعد نانا محترم حضرت مولانا سید امیر الحسن قادریؒ کی تربیت میں چلے آئے، اس وقت آپ کی عمر بمشکل تیرہ یا چودہ سال کی ہوگی، پھر نانا محترم ہی سے ظاہری وباطنی دونوں علوم کی تکمیل کی، اور سلسلۂ قادریہ میں آپ کے مجاز بیعت ہوئے۔۔۔۔۔۔علاوہ ازیں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ اور مدرسہ امداد الغرباء آرہ میں بھی آپ نے تعلیمی مراحل کی تکمیل کی ہے، طب کی تعلیم فضیلت کے بعد لکھنؤ میں حاصل کی۔۔۔

ناناحضورؒ کے انتقال (۱۹۲۱ء م ۱۳۳۹ھ) کے بعد جب آپ طب کی تعلیم مکمل کر کے دہلی میں محلہ چتلی قبر میں کسی حکیم صاحب (نام معلوم نہیں ہے) کے پاس پریکٹس (طب کی عملی مشق) کر رہے تھے حضرت مولانا شاہ ابو الخیر مجددی دہلویؒ (متوفی ۲۹ / جمادی الثانیہ ۱۳۴۱ھ م ۱۶ / فروری ۱۹۲۳ء دہلی)[243] کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، اور داخل سلسلہ ہوگئے، حضرت کی

---

[243]۔ مکمل اسم گرامی شاہ ابو الخیر عبد اللہ محی الدین خیرؔ ہے، آپ کی ولادت بتاریخ ۲۷ / ربیع الآخر ۱۲۷۲ھ مطابق ۶ / جنوری ۱۸۵۶ء بروز یکشنبہ دہلی کی خانقاہ میں ہوئی، خود والد ماجد شاہ عمرؒ نے تاریخ ولادت کہی:

خانقاہ اسی گلی میں تھی اور مرجع آفاق تھی، بڑے بڑے اکابر علماء واعیان یہاں تشریف لاتے تھے، یہ
دراصل حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی خانقاہ تھی، اسی خانقاہ کی مسجد میں کبھی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ کا درس حدیث شہرۂ آفاق تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اسی مسجد میں حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث پڑھی تھی، حضرت مولانا حکیم احمد حسن منورویؒ تقریباً چھ سات ماہ حکیم صاحب کے پاس رہے اس دوران اکثر نمازیں آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے پیچھے ادا فرماتے اور اہتمام کے ساتھ حضرت کی مجالس میں شریک

تاریخ ولادت نور چشم ابو الخیر عبد اللہ اطال عمرہ

خوب سی دینا مبارکبادیاں   جب جگر گوشہ عمر صاحب کا ہو
اور کوئی پوچھے سن میلاد تو   "قرۃ العین عمر صاحب" کہو

نو(۹) سال کی عمر میں آپ نے حفظ قرآن مکمل کیا، اور دیگر علوم درسیہ میں مشغول ہوئے، وقت کے اکابر علماء سے کتب عقلیہ ونقلیہ پڑھیں، مثلاً: حافظ عبد اللہ الضریرؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مدنیؒ بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ، حضرت مولانا سید حبیب الرحمن صاحب رودولوی مہاجر مکیؒ، قطب مکہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید احمد دہلانؒ۔۔۔۔ کتب حدیث حضرت مولانا شاہ عبد الغنی محدث دہلوی ثم المدنیؒ سے پڑھیں، کتب تصوف اپنے والد معظم شاہ عمرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا شاہ محمد مظہرؒ سے پڑھیں۔ شعر وشاعری کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔۔۔

چار پانچ سال کی عمر ہی میں اپنے جد امجد حضرت سراج الاولیاء سے شرف بیعت حاصل کر کے خلافت خاصہ سے سرفراز ہوئے، تفصیلی علوم ومعارف وتوحید اپنے والد بزرگوار سے حاصل کر کے اجازت مطلقہ وخلافت عامہ سے بہرہ ور ہوئے، بلکہ اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں بڑے بڑے علماء وفضلاء کے مرجع قرار پاگئے، آپ کی ذات علوم عقلیہ ونقلیہ کی جامع تھی، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے الہامی مشورے سے آپ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، وہاں بڑے بڑے لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور بڑی شہرت حاصل ہوئی، پھر حضور پاک ﷺ کے اشارے سے ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں خانقاہ مظہریہ میں رونق افروز ہوئے، اور خلق کثیر نے آپ سے فیض پایا، ۳۹/سال سجادہ نشیں رہے، خانقاہ میں ہی وصال ہوا اور اپنے جد امجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

(مقامات خیر ص ۱۵۲ تا ۱۸۲، مختصر حالات نقشبندیہ مجددیہ مظہریہ ص ۲۸ تا ۳۰)

ہوتے اور کسب فیض کرتے رہے، نانا جان کی تربیت سے قلب پہلے ہی مجلیٰ ہو چکا تھا، سلسلۂ قادریہ وچشتیہ میں مدارج سلوک کی تکمیل کرچکے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت نے اس نسبت کو عروج پر پہونچادیا، نقشبندیت کا جو تخم آپ کے باطن میں اپنے جد امجد حضرت نصرؒ کے ذریعہ پہلے ڈالا جاچکا تھا، حضرتؒ کی صحبت میں رہ کر وہ برگ وبار لے آیا اور بعد میں یہی نسبت آپ کی شناخت بن گئی، حضرت شاہ ابوالخیر صاحبؒ سے آپ کو چشتیہ اور نقشبندیہ دونوں نسبتیں حاصل ہوئیں[244]۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال (۱۹۲۳ء) کے بعد بہت بے چین اور اداس ہوئے، دل کسی مرشد کامل کے لئے بے تاب رہنے لگا، والدہ ماجدہ نے آپ کی پریشانی دیکھتے ہوئے حضرت مولانا عبید اللہ فریدی پھلواروی[245]ؒ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی فرمایا وہ میرے رشتے میں بھائی ہوتے ہیں، آپ نے ان سے رجوع کیا اور نسبت وخلافت سے مشرف ہوئے۔۔۔

---

[244] ۔یہ روایت میرے والد ماجد حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مجددیؒ کے حوالے سے نقل فرمائی، والد صاحب کو یہ پورا قصہ حضرت مولانا زیدؒ ہی نے سنایا تھا، مولانا زید صاحبؒ کی عمر اس وقت ۱۵/ سال کی تھی، وہ حضرت منورویؒ سے عمر میں چھ (۶) سال چھوٹے تھے، ممکن ہے کہ چشم دید ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود جد امجد حضرت منورویؒ نے ہی ان سے اپنا یہ واقعہ بیان کیا ہو۔

[245] ۔حضرت مولانا شاہ عبید اللہ صاحب کی ولادت ۹/ جمادی الثانیہ پنجشنبہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۲۱/ جون ۱۸۷۷ء میں ہوئی، صغر سنی ہی میں والدہ کا انتقال ہوگیا، اس لئے آپ کی پرورش آپ کے نانا اور نانی نے کی، ابتدائی کتابیں اپنے والد اور اپنے چچا مولوی شاہ محمد صفت اللہؒ سے پڑھیں، ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں مدرسہ خانقاہ مجیبیہ میں مولانا عبد اللہ رامپوریؒ سے شرح وقایہ اور میر قطبی کا سبق شروع کیا، ابھی چند مہینے گذرے تھے کہ آپ کے عم محترم مولانا شاہ اشرف مجیبؒ نے انتقال فرمایا، آپ کے منجھلے چچا شاہ محمد صفت اللہؒ نے آپ کو ان کی جگہ جانشین کیا، اس کے بعد درس کا سلسلہ ایک عرصہ تک موقوف رہا، جانشینی کے بعد آپ نے بعض دوسرے اساتذہ سے تعلیم پائی، ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں حج وزیارت مدینہ سے بہرہ یاب ہوئے۔۔۔۔۔ آپ کے والدؒ نے اپنے روبرو مرض موت میں مولانا شاہ اشرف مجیبؒ کی نیابت سے آپ کی بیعت لی تھی۔۔۔۔ اور آپ کے چھوٹے چچا مولانا شاہ اشرف مجیبؒ نے اپنے زمانہ انتقال سے پیشتر اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا، اور آپ کے منجھلے چچا شاہ صفت اللہ نے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد مشائخ اور اولیاء اللہ سے مختلف سلاسل میں آپ کو نسبت واجازت حاصل ہوئی، جن میں خاص طور پر حضرت مولانا شاہ بشارت کریم گڑھولوی (ولادت ۱۲۹۴ھ م ۱۸۷۷ء - وفات ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء) اور حضرت مولانا شاہ برکت اللہ دہلوی سر فہرست ہیں۔۔۔ آخری عمر میں آپ پر نقشبندیت کا غلبہ رہا اور آپ کی ذات والاصفات سے سلسلۂ نقشبندیہ کو کافی فروغ ہوا۔

عہد شباب ہی میں آپ نے اپنے بزرگوں (بالخصوص اول پیر طریق نانا حضور) کے ایما پر شہر مظفر پور کے بجائے منورواشریف ضلع سمستی پور کو اپنا مستقر بنالیا، اوراپنے نانا کے مشن کی تکمیل کے لئے اسی مقام کو اپنی دینی، علمی اور روحانی سرگرمیوں کا اصل مرکز قرار دیا۔۔۔

آپ کی بھی دوشادیاں ہوئیں:-

☆پہلی شادی سیدانی ضلع مظفر پور میں محترمہ جمیلہ خاتون (متوفیہ ۲۰۰۱ء) بنت اختر حسین مرحوم سے تقریباً ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں ہوئی، ان سے کئی اولاد پیدا ہوئی مگر صرف ایک صاحبزادی زاہدہ خاتون (ولادت ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء) زندہ رہیں اور صاحب اولاد ہوئیں، تادم تحریر یہ باحیات ہیں۔

☆دوسری شادی تقریباً ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں لادھ کپسیا (ضلع سمستی پور) میں محترمہ جمیلہ خاتون (متوفیہ فروری ۲۰۰۸ء مطابق محرم الحرام ۱۴۲۹ھ) بنت جہانگیر عرف جہانی مرحوم سے ہوئی، ان سے بھی کئی اولاد پیدا ہوئی مگر ایک فرزند حضرت مولانا محفوظ الرحمن

آپ کی شادی چودھری واعظ الدین احمد (پٹنہ) کی صاحبزادی سے ہوئی، ان سے ایک صاحبزادے مولانا شاہ محمد نعمت اللہ پیدا ہوئے، ۳۰/ شعبان ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۵/ جنوری ۱۹۲۹ء کو انتقال فرمایا، اور اپنی خانقاہ کے اس حجرہ میں جہاں آپ کے مرشد عم محترم مولانا شاہ اشرف مجیب کا مزار ہے اپنے مرشد کے پہلو میں مدفون ہوئے (اعیان وطن - آثارات پھلواری شریف ص ۳۵۴ - مرتبہ مولانا سید شاہ حکیم محمد شعیب نیر ناشر دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ)

صاحب (میرے والد ماجد- ولادت ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۴ء) اور ایک صاحبزادی رابعہ خاتون (ولادت ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء) زندہ رہے اور صاحب اولاد ہوئے، تادم تحریر حضرت کی یہ دونوں یادگاریں بقید حیات ہیں، اللہ پاک تادیر ان کا سایہ ہمارے سروں پر باقی رکھے آمین۔

وفات حسرت آیات ۲۸/ رجب المرجب ۱۳۸۷ھ مطابق ۲/ نومبر ۱۹۶۷ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر ۲/ بج کر ۲۵/ منٹ پر ہوئی اور اسی دن وصیت کے مطابق اپنے ہی احاطے میں مغرب کی نماز کے بعد مدفون ہوئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

محل ثانیہ

حضرت آہؔ کی دوسری شادی (تقریباً) ۱۹۱۴ء ۱۳۳۲ھ میں محترمہ انیسۃ الفاطمۃ (مقام بہپورہ ضلع دربھنگہ) سے ہوئی، یہ ایک نیک، دیندار اور وفاشعار خاتون تھیں، انہوں نے اپنی محبت ،خدمت اور جذبۂ ایثار سے حضرت آہؔ کا دل جیت لیا تھا، سفر و حضر میں اکثر ساتھ ہوتی تھیں، اور شوہر کے درد و غم میں برابر شریک رہتی تھیں[246]۔

---

[246] -اس کا اندازہ حضرت آہؔ کی ڈائری میں ان منظوم محبت ناموں سے ہوتا ہے، جو انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کے نام تحریر کئے ہیں، جس کا ایک نمونہ "کلیات آہؔ" میں بھی شامل ہے، حضرت آہؔ نے جن الفاظ سے اپنی اہلیہ کو مخاطب کیا ہے ان سے ایک طرف ان کی بے پناہ محبت و وفا کا پتہ چلتا ہے، اور ہجر و وصال کی حرارت و لذت کا احساس ہوتا ہے تو وہیں ان کے صاحب فضل و کمال ہونے کی بھی عکاسی ہوتی ہے، اس کے چند نمونے پیش ہیں:

اے سراپا محبت و خوبی — گوہر بحر حسن و محبوبی
شمع محفل سکون پروانہ — رنگ گل اور بوئے مستانہ
محرم راز و جان آہؔ حزیں — مرہم زخم دل جگر کی مکیں
تم سلامت رہو ہزار برس — باکرامت رہو ہزار برس
تم رفیق حیات ہو میری — بلکہ کل کائنات ہو میری

حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ نے بھی اپنے مکاتیب میں ان کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے اور ان مکاتیب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ گاہے گاہے گڑھول بھی حاضر ہوتی تھیں[247]، اور حضرت گڑھولویؒ سے بیعت وارادت کا تعلق بھی رکھتی

اے میری ہمدم و وفا پرور	زینت خانہ و کرم گستر
یہ دعا اور سلام تم پر ہو	رحمت حق مدام تم پر ہو
چین ملتا نہیں ہے فرقت میں	آگ لگ جائے اس محبت میں
لطف تھا جب کہ ساتھ رکھتا میں	ہر گھڑی ہاتھوں ہاتھ رکھتا میں
کچھ تو تقدیر سے رہا مجبور	کچھ مصالح نے کردیا معذور
الغرض دس برس سے دوری ہے	دل کو تم سے مگر حضوری ہے
کاش اللہ کا کرم ہو جائے	کچھ دنوں ساتھ تو بہم ہو جائے

اے انیس و غمگسار و دلنواز	اے مرے زخم جگر کی چارہ ساز
تم خدا کے فضل سے اچھی رہو	تا ابد تم پر سلام خاص ہو

جنت الانوار کے مکاتیب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اہل وعیال کو ساتھ رکھنا زیادہ پسند فرماتے تھے اور زیادہ دنوں تک گھر والوں سے دور رہنا باعث قلق ہوتا تھا، ایک خط میں حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ نے حضرت آہؒ کو تحریر فرمایا:

"یہاں پہونچ کر مجھ کو آپ کی ملازمت کی خبر معلوم ہوئی تو مجھ کو بے حد خوشی ہوئی، خداوند تعالیٰ آپ کو وہاں استقامت اور اطمینان تام نصیب فرمائے، اگر متعلقین (اہل وعیال) کی پریشانی آپ کو تشویش کر رہی ہے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بصورت استقامت ملازمت متعلقین کو آپ اپنے ہمراہ رکھیں، اور وہاں ان لوگوں کا معقول انتظام کرلیویں باقی آپ جیسی مصلحت سمجھیں۔

(جنت الانوار مکتوب نمبر ۲۶ ص ۲۴۳ طبع اول و ص ۲۵۶ طبع ثالث)

247 - ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی اہلیہ کی علالت کی خبر سے تعلق پیدا ہوگیا، شافی مطلق ان کو شفائے کامل عاجل نصیب فرما کر جمعیت واطمینان کلی عطا فرمادے آمین ـــ اپنی اہلیہ شفاہا اللہ تعالیٰ کو سلام ودعا کہہ دیں۔

تھیں، اور اسی بنا پر حضرت گڑھولویؒ کے صاحبزادگان از راہ محبت و خلوص ان کو "بھابھی صاحبہ" بھی کہتے تھے[248] ۔۔۔۔۔

آپ کی وفات ۲۲/جون ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۸/اکتوبر ۱۹۶۵ء بروز سوموار ہوئی، مظفرپور کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

ماسٹر سید محمود حسنؒ

ان کے بطن سے ۱۹۱۷ء میں "ماسٹر سید محمود حسن" پیدا ہوئے، مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے ابتداءً ان کو بھی اپنی خاندانی روایات کے مطابق دینی تعلیم دلانے کی کوشش کی، کچھ دنوں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں اپنے پاس بھی رکھا، لیکن دینی تعلیم کی طرف ان کا رجحان نہ دیکھ کر ان کی خواہش کے مطابق بادل ناخواستہ مظفرپور کے ایک انگریزی اسکول میں داخلہ کرادیا، انہوں نے انگریزی تعلیم محنت اور دلچسپی سے حاصل کی اور اس میں امتیاز و کمال پیدا کیا۔

ماسٹر سید محمود حسن صاحب کو انگریزی زبان اور علوم عصریہ کی تدریس پر اچھی قدرت حاصل تھی، تدریسی ملکہ ورثے میں ملا تھا، وہ ترہت اکیڈمی سمستی پور میں ملازم سرکار ہوئے، جس کے وائس پرنسپل کے عہدہ سے وہ ۱۹۷۷ء میں ریٹائرڈ ہوئے، ۱۹۵۰ء میں ملازمت

(جنت الانوار مکتوب نمبر ۳۶ ص ۲۴۱، ۲۴۲ طبع اول و ص ۲۶۳، ۲۶۴ طبع ثالث)

ایک اور خط میں رقمطراز ہیں:

"والدۂ محمد ایوب آپ کی اہلیہ کی بہت شکر گذار ہیں، پھر کسی موقعہ پر ان کو طلب کرنے کا خیال ضرور ہو رہا ہے، وقت مناسب پر اس کی نسبت اطلاع دی جائے گی"

(جنت الانوار مکتوب نمبر ۴۴ ص ۲۴۸ طبع اول و ص ۲۷۰ طبع ثالث)

یہ خط یکم ستمبر ۱۹۲۵ء کا ہے، جب مولانا عبدالشکور صاحب مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ملازمت پر فائز ہو چکے تھے، اس کا مطلب ہے کہ شادی کے چند سال بعد ہی سے ان کی گڑھول آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔

[248] دیکھئے: "جنت الانوار مکتوب نمبر ۴۵ ص ۲۴۹ طبع اول و ص ۲۷۱ طبع ثالث۔

کے دوران انہوں نے سمستی پور قلب شہر محلہ کاشی پور میں تقریباً دو کٹھہ زمین خریدی اور مختصر سا مکان بنوا کر یہیں رہائش اختیار کر لی، ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اپنے اسی مکان میں ایک کوچنگ سینٹر قائم کیا، جہاں شہر اور مضافات سے طلبہ کا کافی رجوع ہوا۔

ان کا انتقال ۲۲/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۴/ دسمبر ۱۹۸۷ء میں ہوا، مظفر پور اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہیں[249]۔

اس طرح حضرت آہؔ کے دونوں بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے، دونوں میں سے کسی سے کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی۔

---

249 - اس حقیر کو ماسٹر صاحب مرحوم کی زیارت کا شرف ایک بار حاصل ہوا ہے، ان کی تین شادیاں تھیں، پہلی شادی ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں جناب معزالدین صاحب (بتیا، چمپارن) کی صاحبزادی منظور النساء صاحبہ سے ہوئی، اس محل سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، دوسری شادی ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں ہوئی اس سے تین لڑکے سعید احمد عرف نجمی، معصوم احمد عرف زیدی اور عبدالناصر صاحبان پیدا ہوئے، تیسری شادی ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر یعقوب صاحب (نوادہ کمراؤں دلسنگھ سرائے) کی صاحبزادی سے ہوئی اس محل سے ایک لڑکی عشرت عرف ایلی پیدا ہوئی، تادم تحریر آخر الذکر چاروں اولاد بقید حیات ہیں، اب سمستی پور والا مکان ان کے بڑے صاحبزادے نجمی صاحب کے تصرف میں ہے، مظفر پور والا قدیم مکان جو حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ کا تعمیر کردہ ہے، اس میں جو حصہ بچا ہوا ہے وہ جناب عبدالناصر صاحب کے زیر تصرف ہے، یہ مکان ۱۹۳۴ء کے زلزلے میں منہدم ہو گیا تھا، ۱۹۳۶ء میں اس کو حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے دوبارہ تعمیر کرایا (یہ معلومات ماسٹر محمود حسنؒ کی خود نوشت ڈائری اور ان کے بعض صاحبزادگان سے لی گئی ہیں)

باب سوم

تزکیہ واحسان

(حضرت آہؒ کے روحانی سفر کی داستان)

حضرت مولانا عبد الشکور صاحب ایک دینی اور روحانی گھرانے میں پیدا ہوئے، اس لئے قدرتی طور پر آپ پر صوفیانہ رنگ غالب تھا، سیدھی سادی مؤمنانہ زندگی گذارتے تھے، تکلفات اور بناوٹوں سے دور رہتے تھے، طبیعت میں استغنا اور توکل تھا، حرص وطمع اور خود غرضی سے پاک تھے، گہرا علم اور اللہ پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔

درویشانہ زندگی

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ حضرت الاستاذ مولانا عبد الشکورؒ تخت پر نہیں فرش زمین پر سوتے تھے، اوران کے حجرہ کا نقشہ کچھ اس طرح تھا:

☆ایک چٹائی اور اس پر ایک پتلا سا بستر☆ وضو کے لئے ایک لوٹا
☆کمرہ کے ایک گوشے میں ایک تلوار☆اور بوریے کا ایک جھولا جوان کے سفری بیگ کے قائم مقام تھا دیوار کی ایک کھونٹی پر لٹکا رہتا تھا۔

یہ تھی اس مرد درویش کی کل کائنات، یہی تو اولیاء اللہ کی شان ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے صحابہ کرام کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

أولئك أصحابُ محمد–صلى الله عليه وسلم–كانوا أفضلَ هذه الأمة : أبرَّها قلوبًا ، وأعمقَها علمًا ، وأقلَّها تكلُّفًا[250]۔

---

[250]- جامع الأصول في أحاديث الرسول ج 1 ص 292 حديث نمبر :80 المؤلف : مجد الدين أبو السعادات المبارك بن محمد الجزري ابن الأثير (المتوفى : 606هـ)تحقيق : عبد القادر الأرنؤوط

محلہ چھوٹی کلیانی شہر مظفرپور میں حضرت آہ کے مکان کا بیرونی حصہ

حضرت آہ کا حجرۂ مبارکہ

الناشر : مكتبة الحلواني – مطبعة الملاح – مكتبة دار البيانالطبعة : الأولى– أخرجه ابن عبد البر في جامع بيان العلم وفضله (97/2) .

حضرت مولانا عبد الشکور آہؒ کی تلوار جوان کو اپنے والد حضرت نصرؒ سے حاصل ہوئی تھی

ترجمہ: یہ صحابہ کی جماعت ہے جو اس امت کی سب سے افضل ترین جماعت ہے، ان کے دل پاک صاف تھے، علم گہرا تھا اور تکلف نام کی کوئی چیز ان کے یہاں نہیں تھی۔

بقول فارسی شاعر:

نباشد اہل باطن در پئے آرائش ظاہر
بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

ترجمہ: اہل باطن ظاہر کو سنوارنے کے درپے نہیں ہوتے کہ گلستاں کی دیوار کے لئے کسی نقاش کی ضرورت نہیں ہے، اس کے اندر خود بے پناہ گل بوٹے موجود ہیں۔

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند
دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

ترجمہ: حسینان جہاں زیور وسنگار سے آرائش حاصل کرتی ہیں اور ہمارا دلبر حسن خداداد کے ساتھ باہر نکلتا ہے۔

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

ترجمہ: پھل دار درخت بار برداری سے بوجھل ہیں، سرو خوش نصیب ہے جو بند غم سے آزاد سیدھا نکلتا ہے۔

ان حضرات کے سامنے دنیا کی کچھ حقیقت نہیں ہے، یہ فقط صحرا کا سراب اور نظر کا فریب ہے، بقول شاعر معرفت حضرت مجذوبؒ:

یہ عالم عیش وعشرت کا یہ حالت کیف ومستی کی
بلند اپنا تخیل کر یہ سب باتیں ہیں پستی کی

جہاں دراصل ویرانہ ہے گو صورت ہے بستی کی

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

کسی کو روز و شب مشغول فریاد و فغاں پایا

کسی کو فکر گوناگوں میں ہر دم سرگراں پایا

کسی کو ہم نے آسودہ نہ زیر آسماں پایا

بس ایک مجذوبؔ کو اس غمکدہ میں شادماں پایا

جو بچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

آہؒ کی زندگی اولیاء اللہ کا نمونہ تھی

وہ ہر وقت دین اور اہل دین کی محبت میں سرشار رہتے تھے، اللہ والوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، اور باوجود علم بے کراں کے ان کی خدمت وغلامی کو اپنے لئے سعادت تصور کرتے تھے، یہ چیزیں ان کو خاندانی ورثہ میں ملی تھیں، بچپن سے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کی صحبت پائی تھی، ان کی پاک زندگیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا، والد ماجد حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ، ماموں جان اور خسر محترم حضرت مولانا امیر الحسن قادریؒ، استاذ محترم حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور استاذ ثانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ وغیرہ جیسے کیمیا نظر بزرگوں کی تربیت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا، ان سب کی خدمت کی اور سب کی دعائیں حاصل ہوئیں، اور جب تک یہ حضرات حیات رہے ان کی آنکھوں کا تارا بنے رہے، ظاہر ہے کہ یہ صحبتیں بے فیض نہیں رہی ہونگی، حضرت آہؔ کی شخصیت نے ان میں سے ہر ایک کے عکس جمیل کو قبول کیا تھا، اور ان کی خمیر ولایت میں ان تمام سرچشموں کا پانی شامل تھا۔۔۔

رفیق کو خضر طریق بنایا

لیکن طریقت کے اصول پر بظاہر آپ کا حصہ اپنے ہی رفیق درس اور یار غار قطب الاقطاب حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کے یہاں تھا، انسان روحانی طور پر خواہ کتنا ہی کامل ہو اس میں استناد پیدا کرنے کے لئے ظاہری واسطہ کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ پاک نے ان کے لئے یہ سعادت حضرت گڑھولویؒ کے یہاں رکھ رکھی تھی۔۔۔۔

انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مشائخ کا زمانہ پایا، ان کی قربت ومعیت بھی انہیں حاصل رہی، مگر متقدمین کے بجائے عہد اخیر کی ایک شخصیت کو اپنا پیر طریق بنایا، حضرت گڑھولویؒ نہ صرف یہ کہ ان کے رفیق درس اور صدیق قدیم تھے بلکہ ان کے لڑکپن سے عنفوان شباب تک کا زمانہ ان کے والد ماجد حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ کے زیر سایہ گذرا تھا، ان کی علمی وعملی دونوں زندگی ان کے سامنے تھی، گھر (مظفر پور) سے لیکر کانپور تک ایک ساتھ رہ چکے تھے، دونوں ایک دوسرے کے محرم اسرار بھی تھے، باہم بے تکلفی بھی تھی اور بے انتہاء احترام بھی ---

اس پس منظر میں حضرت گڑھولویؒ کو اپنا خضر طریق بنانا جہاں حضرت گڑھولویؒ کی عظمت شان اور رفعت مقام کی دلیل ہے تو وہیں حضرت آہؔ کی بے نفسی، عبدیت، فنائیت اور باطنی کمال کا ثبوت ہے، کسی انسان کا محض اللہ کے لئے اپنے ہی رفیق کے قدموں پر پامال ہوجانا معمولی بات نہیں ہے، اس پامالی سے اللہ کے حضور جو رفعت وسربلندی حاصل ہوتی ہے وہ بھی بہت غیر معمولی ہوتی ہے۔۔۔۔

بیعت کی تاریخ

حضرت آہؔ کا حضرت گڑھولویؒ سے یہ روحانی رشتہ کب قائم ہوا اس کی صحیح تاریخ تو

معلوم نہیں ہے، البتہ جنت الانوار کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ تعلق حضرت گڑھولویؒ کے پیر طریق حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ کی حیات ہی میں ۱۹۱۶ء سے قبل قائم کر لیا تھا، جنت الانوار میں یکم جون ۱۹۱۶ء کا ایک مکتوب ہے، اس میں حضرت گڑھولویؒ نے لکھا ہے:

"امید کہ وظیفہ مقررہ پر میرے برادر کاربند رہیں، انجام کار کا مدار استقامت پر ہے، إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَ أَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ[251]

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

شغل مقرر قوم رحمہم اللہ کسی مصلحت سے موقوف رکھا گیا ہے۔

لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً جس وقت موقعہ مناسب معلوم ہوگا آپ کو اطلاع دوں گا، امید کہ میری اطلاع کا انتظار کریں، اس وقت موقعہ آپ کی تشریف آوری کا نہیں معلوم ہوتا۔

(فقیر محمد بشارت کریم عفی اللہ عنہ از گڑھول ۲۷/رجب سہ شنبہ ۱-/جون ۱۹۱۶ء)[252]۔

خط کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ یہ کسی مسترشد کو لکھا جارہا ہے، اور غالباً حضرت آہ گڑھول میں کسی خانقاہی شغل میں شرکت کرنا چاہتے تھے، خط میں اس کے عارضی توقف کی اطلاع دی گئی ہے۔

---

[251] فصلت: ۳۰۔

[252] جنت الانوار مکتوب نمبر ۱۳۱ص ۲۴۵، ۲۴۶۔

پیر و مرید کی زندگی میں یکسانیت

اس خط سے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ حضرت آہ حضرت گڑھولوی سے ۱۹۱۶ء میں وابستہ اور آپ کے وظائف پر کاربند ہو گئے تھے، جبکہ حضرت کانپوری کا وصال ۴ / صفر المظفر ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۶ / ستمبر ۱۹۲۲ء میں ہوا ہے، یعنی بیعت کے بعد بھی حضرت کانپوری تقریباً سات (۷) سال باحیات رہے، اس سے حضرت گڑھولوی کے ساتھ مولانا عبد الشکور کے شدت رجحان اور قوت اعتقاد کا پتہ چلتا ہے، دراصل یہ راستہ فیضان کا ہے اور فیضان کے معاملے میں نسبت کی بلندی سے زیادہ عقیدت کی پختگی مؤثر ہوتی ہے، یہ بات حضرت گڑھولوی کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے اور حضرت آہ کی زندگی میں بھی۔

جنت الانوار میں حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"چنانچہ اس وقت کے بہت سے مشہور اولیاء اللہ مثلاً حضرت شاہ ابو الخیر، حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی اور ان کے علاوہ اور بھی بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر کہیں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا، بلکہ ایک بزرگ مولانا عیسیٰ خان نے فرمایا کہ آپ کو آپ کے ساتھی ہی سے فائدہ ہوگا۔۔۔۔۔

یہ بھی حضرت والد علیہ الرحمۃ کے جذبۂ خدا طلبی کی انتہا تھی کہ اپنے ہم سبق اور ساتھی کو پیر بنا کر ان کی غلامی میں داخل ہو گئے، پھر اپنے شیخ کا کس درجہ لحاظ کرنے لگے"[253]

---

253 - جنت الانوار ص ۱۴ – ۱۶۔۔۔۔۔۔ البتہ اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت مولانا غلام حسین کانپوری اور حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی کے مابین دوستانہ بے تکلفی اور معاصرانہ خلوص کی حد تک تو بات درست ہے لیکن

اسی واقعہ کو حضرت قاری فخر الدین گیاویؒ نے اس طرح نقل فرمایا ہے:
"حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ نے زمانہ طالب علمی ہی میں حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ سے درخواست بیعت کردی، وہ برابر ٹالتے رہے، مگر یہ نہ مانے، بالآخر انہوں نے فرمایا کہ "میرے شیخ موجود ہیں، تم ان سے بیعت ہوجاؤ" تب بھی یہ نہ مانے اور عرض کیا کہ "اس راہ میں عقیدت شرط ہے، مجھ کو آپ ہی سے عقیدت ہے" حضرت مولانا نے

دونوں کو ہم سبق اور رفیق درس قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت مولانا غلام حسین کانپوری کی سن فراغت ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء ہے، اور فراغت کے بعد وہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی خاندانی مسجد "مسجد دلاری" میں تدریس و تعلیم کے کام سے وابستہ ہوگئے تھے (نزہۃ الخواطر مؤلفہ مولانا عبدالحی الحسنی لکھنویؒ ج ۸ ص ۱۳۲۰) جب کہ اس وقت مولانا بشارت کریم صاحب مدرسہ خادم العلوم (جامع العلوم) مظفرپور بہار کے نو آموز طالب علم تھے، کانپور پہونچے بھی نہیں تھے، مولانا بشارت کریم صاحب ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۳ء میں کانپور متوسطات کی کتابیں پڑھنے کے لئے پہونچے، (جنت الانوار ص ۱۰ اول ایڈیشن) اور مکتوب حضرت نصرؔ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۵ھ تک مولانا بشارت کریم صاحب پڑھ ہی رہے تھے (مکتوب قلمی ص ۲) اس طرح مولانا گڑھولویؒ کی فراغت کانپور مدرسہ سے (کم از کم) شعبان المعظم ۱۳۱۶ھ مطابق جنوری ۱۸۹۹ء میں ہوئی، یعنی حضرت کانپوریؒ کی فراغت سے پورے آٹھ سال بعد مولانا گڑھولویؒ کی فراغت ہوئی، اس طویل مدت میں تو انسان عام طور پر تلمذ سے استاذی تک پہونچ جاتا ہے۔

حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ کے بیان سے بھی فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے، اپنی کتاب "درس حیات" میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا غلام حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا خیر الدین صاحبؒ اوپر کے درجہ میں فنون کی کتابوں میں ہم سبق تھے، اور حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ نیچے کی کتابیں پڑھتے تھے، ان تینوں میں قابل رشک حد تک دوستانہ تعلقات تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (چند سطروں کے بعد)

۔۔۔۔۔۔ والد صاحب مرحوم (حضرت مولانا خیر الدین صاحبؒ) نے فرمایا کہ:

"حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ نے کنز پوری کتاب مجھ سے خارج اوقات مدرسہ میں پڑھی تھی۔ (درس حیات - تذکرہ بشارت کریمؒ - ص ۲۲۳، ۲۲۴)

فرمایا کہ "تم نے ہمارے شیخ کو دیکھا نہیں، اس لئے مجھ سے عقیدت ہے،
ان کو دیکھ لوگے، تو ان سے بہت زیادہ عقیدت پیدا ہو جائے گی تم میرے
ساتھ چلو میں تم کو اپنے شیخ سے ملاؤں اور بیعت کرادوں، مولانا نے فرمایا،
"لے چلیے، مگر مجھ کو یقین ہے، کہ ان سے ملنے کے بعد بھی آپ کی عقیدت
کم نہ ہوگی" چنانچہ وہ ان کو لے کر اپنے شیخ کامل کی خدمت میں لے کر حاضر
ہوئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا اور بار بار اثناء قیام ان سے پوچھتے رہے،
کہ بولو کیا فیصلہ کیا؟ مگر یہ وہاں بھی یہی کہتے رہے، کہ "میں اپنے فیصلہ پر
اٹل ہوں، مجھ کو آپ ہی سے عقیدت ہے، آپ ہی مجھ کو بیعت کرلیں"
آخر پیر و مرشد کے حکم سے ان کو بیعت کرنا ہی پڑا[254]۔

نسبت کی بلندی کے بجائے عقیدت پر بنیاد

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دونوں کی زندگیوں میں کیسی یکسانیت ہے، اکابر کو چھوڑ کر اصاغر سے رجوع کرنے کی جو روایت پیر طریق نے قائم کی اسی کو مرید صادق نے بھی آگے بڑھایا، دونوں ہی رفقاء نے نسبت کی بلندی کے بجائے افادیت اور فیضان کو بنیاد بنایا۔

اگر ایک نظر حضرت گڑھولویؒ کے شجرۂ طریق پر ڈالیں تو یہ بات اور زیادہ واضح ہو جائے گی:

☆حضرت گڑھولویؒ کو یہ نسبت حاصل ہوئی حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ (متوفی ۳ / صفر المظفر ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۴ / ستمبر ۱۹۲۲ء) سے[255]۔

---

[254] سوز حیات ــ مرتبہ حضرت قاری فخر الدین گیاویؒ ــ ص ۲۲۴ طبع دوم ۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء، شائع کردہ: مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ گیا)

☆حضرت کانپوریؒ کو حاصل ہوئی حضرت خواجہ سراج الدین سے [256]۔

☆خواجہ سراج الدینؒ کو حاصل ہوئی اپنے والد ماجد حضرت خواجہ عثمان دامانیؒ سے [257]۔

☆ان کو حاصل ہوئی حضرت خواجہ دوست محمد قندھاریؒ سے [258]۔

---

[255]-آپ کے حالات گذشتہ صفحات میں آچکے ہیں۔

[256]-خواجہ سراج الدین کی ولادت بتاریخ ۱۵ / محرم الحرام ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۹ / دسمبر ۱۸۷۹ء بروز سوموار خانقاہ سعیدیہ موسیٰ زئی کے ایک علمی وروحانی خانوادے میں ہوئی، درسیات کی تکمیل مولانا محمود شیرازیؒ، ملاشاہ محمد بابرؒ اور مولانا حسین علیؒ (م ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء) سے کی، طریقت کی تعلیم اپنے والد ماجد حضرت عثمان دامانیؒ سے حاصل کی، چودہ سال کی عمر میں بیعت ہوگئے تھے ۲۳ / ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۸ / مئی ۱۸۹۴ء میں خلافت سے سرفراز ہوئے اور والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے، مضبوط نسبت کے حامل تھے، بڑا فیض پہونچا، عزت ووجاہت بھی حاصل تھی، علم حدیث سے خصوصی شغف تھا، مبسوط سرخسی کی احادیث کی تخریج کی تھی۔۔۔۲۶ / ربیع الاول ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۱ / فروری ۱۹۱۵ء بروز جمعہ وفات پائی۔(نزھۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۲۳۳، مجموعہ فوائد عثمانی ص ۲۲ تا ۲۴ مرتبہ سید محمد اکبر علی دہلوی ناشر: خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ میاں والی، مطبوعہ دارالکتاب لاہور ۲۰۱۰ء)

[257]-خواجہ عثمان دامانیؒ کی ولادت ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں "لونی" کے مقام پر حضرت مولانا موسیٰؒ کے گھر میں ہوئی، مقامی اساتذہ سے علم دین کی تکمیل کی، پھر ۱۲۶۲ھ میں خواجہ دوست محمد قندھاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اوران سے حدیث، سیر اور دیگر علوم کے ساتھ طریقت کی تعلیم بھی حاصل کی، اور طریق نقشبندیہ کے مطابق منازل سلوک طے کئے، ایک لمبی مدت تک شیخ کی صحبت میں رہ کر مراتب کمال تک پہونچے، شیخ کے وصال کے بعد ۳۰ سال تک منصب مشیخت پر فائز رہے، حج وزیارت کے سفر سے واپسی پر موسیٰ زئی میں اقامت اختیار کی، اور یہیں سے ایک زمانہ نے آپ سے فیض پایا۔۔۔۔ آپ کا وصال پر ملال ۲۲ / شعبان المعظم ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۶ / جنوری ۱۸۹۷ء بروز منگل ہوا، اور خانقاہ احمدیہ سعیدیہ میں اپنے پیرومرشد حضرت حاجی دوست محمد قندھاری کے پہلو میں مدفون ہوئے فرحمہ اللہ (نزھۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۳۰۸، مجموعہ فوائد عثمانی ص ۲۰ تا ۲۱ مرتبہ سید محمد اکبر علی دہلوی ناشر: خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ میاں والی، مطبوعہ دارالکتاب لاہور ۲۰۱۰ء)

[258]-حضرت خواجہ حاجی دوست محمد قندھاریؒ کی ولادت ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں قندھار میں ہوئی، والد ماجد کا نام حضرت آخوند ملا علیؒ تھا، کا شمار اکابر مشائخ نقشبندیہ میں ہوتا ہے، کابل میں وقت کے اکابر علماء سے تعلیم ظاہری کی تکمیل کے بعد وہ حضرت شاہ احمد سعید دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور یہاں ایک سال دوماہ قیام فرمایا، اس اثنا آپ نے حضرت شیخ سے

☆اور حضرت قندھاریؒ کو حاصل ہوئی حضرت سراج الاولیاء ابو المکارم شاہ احمد سعید دہلویؒ سے[259]۔

صحاح ستہ کا درس بھی لیا اس طرح مختصر مدت میں ہی آپ کمال تک پہونچ گئے ،اور خلافت سے سرفراز ہوئے ، شاہ صاحبؒ سے خلافت کے حصول کے بعد وطن واپس لوٹے اور "موسیٰ زئی" میں اقامت اختیار کی، علماء ومشائخ کا رجوع عام ہوا اور آپ کی خانقاہ پورے برصغیر میں ایک مثالی خانقاہ بن گئی، بے شمار کشف وکرامات آپ کی طرف منسوب ہیں۔وفات موسیٰ زئی" میں شب سوموار ۲۲ / شوال المکرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۶ / جنوری ۱۸۶۸ء کو ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔
(نزھۃ الخواطر ج ۷ ص ۹۶۷، ۹۶۸، مجموعہ فوائد عثمانی ص ۱۶ تا ۱۸ مرتبہ سید محمد اکبر علی دہلوی ناشر: خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ میاں والی، مطبوعہ دار الکتاب لاہور ۲۰۰۷ء))

[259]-آپ کی ولادت: یکم ربیع الآخر ۱۲۱۷ھ مطابق ۳۱ / جولائی ۱۸۰۲ء بمقام رامپور ہوئی اور وفات ۲ / ربیع الاول ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸ / ستمبر ۱۸۶۰ء بمقام مدینہ منورہ ہوئی ــــــ انتہائی بلند ترین صاحب فیض شخصیت کے مالک تھے، حضرت خواجہ شاہ ابو سعید دہلویؒ (ولادت ۲ / ذی قعدہ ۱۱۹۶ھ ــ وفات: یکم شوال المکرم ۱۲۵۰ھ) کے بڑے صاحبزادے ہیں، معقولات کی کتابیں مولوی فضل امام سے اور باقی کتابیں مولوی رشید الدین خانؒ سے پڑھیں، آپ شاہ عبد العزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اور شاہ عبد القادرؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے، اور فرماتے تھے کہ یہ تینوں بھائی علم کے سمندر رہیں، آپ نے رامپور میں مفتی شرف الدین اور شاہ سراج احمد مجددی سے بھی پڑھا ہے، شاہ سراج احمد سے حدیث مسلسل بالاولیہ کی اجازت بھی لی ، دس (۱۰) سال کی بھی عمر نہیں ہوئی تھی کہ والد صاحب کے ساتھ حضرت شاہ غلام علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ سے بیعت ہوگئے، حضرت شاہ غلام علیؒ آپ کو اپنا بیٹا فرماتے تھے، اور کہتے تھے کہ میں نے لوگوں سے ایک بچہ طلب کیا کسی نے نہ دیا، ابو سعید نے میری طلب پوری کردی، اور اپنا بیٹا مجھ کو دے دیا، حضرت شاہ غلام علیؒ سے آپ نے تصوف کی کتابیں - رسالہ قشیریہ، عوارف، الاحیاء، نفحات، رشحات، مکتوبات، مثنوی معنوی وغیرہ اور حدیث میں مشکوۃ اور ترمذی پڑھی، حضرات نقشبندیہ مجددیہ کا سلوک اول سے آخر تک حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے حاصل کیا، تقریباً پندرہ (۱۵) سال آپ کی تربیت میں رہے، اور شاہ صاحب ہی نے آپ کو خلافت عطا کی ہے، یوں باقاعدہ اپنے والد صاحب کے جانشین ہوئے، جمادی الاخریٰ ۱۲۴۹ھ میں والد ماجد حج کو تشریف لے گئے تو خانقاہ ان کے حوالے فرمادی، ۱۲۷۴ھ میں آپ نے حج ادا کیا، مسند ارشاد پر آپ اٹھائیس (۲۸) سال تک جلوہ فگن رہے، مزار مبارک مدینہ طیبہ میں حضرت امیر المؤمنین سیدنا عثمان غنیؓ کے مزار شریف کے بازو میں ہے (مقامات خیر ص ۸۸ تا ۹۹، مختصر حالات نقشبندیہ مجددیہ مظہریہ ص ۲۶)

اگر حضرت گڑھولوی ؒ مثلاً حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی ؒ[260] (ولادت ۲۷/ربیع الآخر ۱۲۷۲ھ مطابق ۶/جنوری ۱۸۵۶ء - وفات ۲۲/جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ) سے وابستہ ہوجاتے تو حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی ؒ اپنے والد ماجد حضرت خواجہ شاہ محمد عمر ؒ[261] (ولادت: ۶/شوال المکرم ۱۲۴۴ھ مطابق اپریل ۱۸۲۹ء - وفات: ۲/محرم الحرام ۱۲۹۸ھ مطابق ۵/دسمبر ۱۸۸۰ء بمقام رامپور) کے خلیفہ وجانشین تھے، اور حضرت شاہ محمد عمر ؒ اپنے والد ماجد حضرت شاہ احمد سعید دہلوی ؒ کے جانشین تھے، یوں حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی ؒ کو اپنے جد امجد حضرت شاہ احمد سعید دہلوی ؒ سے بھی بیعت اور خلافت خاصہ حاصل تھی[262]۔ اس طرح وہ صرف ایک یا دو واسطے سے حضرت شاہ احمد سعید دہلوی ؒ تک پہونچ سکتے تھے........یہی بات حضرت آہ مظفرپوری ؒ پر بھی صادق آتی ہے، اس لئے کہ یہ دونوں حضرات ہم عمر تھے، مگر ان بزرگوں نے اپنے اپنے رجحان اور عقیدت کی بنیاد پر اپنا راستہ منتخب فرمایا، فرحمهما الله۔

---

[260] حالات پہلے آچکے ہیں۔

[261] آپ حضرت شاہ احمد سعید دہلوی کے فرزند ثالث ہیں، ولادت خانقاہ دہلی میں ہوئی، حفظ قرآن کریم کے بعد مولانا حبیب اللہ صاحب ؒ سے علوم متداولہ اور اپنے چچا شاہ عبدالغنی ؒ سے حدیث شریف اور کتب تصوف حضرت والد صاحب سے پڑھیں، اور سلوک کی تکمیل تعلیم بھی حاصل کی ۱۲۶۲ھ میں آپ کا نکاح ہوا.....مولانا سید حبیب الرحمن کاظمی رودولوی ؒ، مولانا عبدالحق الہ آبادی ؒ خلیفہ حضرت شاہ عبدالغنی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ سے آپ کے خصوصی مراسم تھے ، ان حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور یہ حضرات اپنا تازہ کلام ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے، اس میں حضرت شاہ عمر ؒ شمع محفل ہوتے تھے ، آپ کی وفات رامپور میں ہوئی اور حضرت شاہ جمال اللہ ؒ کے گنبد سے متصل جہت غرب چبوترے پر مدفون ہوئے، آپ کی عمر شریف قمری حساب سے ۵۳ سال ۳ ماہ اور شمسی حساب سے ۵۱ سال ۸ ماہ ہوئی(مقامات خیر ص ۱۱۴ تا ۱۲۵۔ مختصر حالات نقشبندیہ مجددیہ مظہریہ ص ۲۷، ۲۸)

[262] -مقامات خیر مؤلفہ حضرت شاہ زید ابوالحسن فاروقی مجددی ؒ ص ۱۵۴ ناشر شاہ ابوالخیر اکیڈمی چتلی قبر دہلی، مطبوعہ ۱۴۳۱ھ م ۲۰۱۰ء، و مختصر حالات نقشبندیہ مجددیہ و مظہریہ ص ۲۸ مرتبہ حضرت مولانا حکیم حاجی احمد حسن منوروی ؒ شائع کردہ خانقاہ منورواشریف، طبع جدید۔

حضرت آہؒ کی شخصیت جنت الانوار کے مکاتیب کے آئینے میں

ان دونوں بزرگوں کے مابین رفیقانہ تعلقات سے لیکر رشد وہدایت کے رشتوں تک رسائی کے لئے ہمارے پاس ان تیئیس (۲۳) خطوط کے علاوہ جو جنت الانوار میں شائع شدہ ہیں اور کوئی دوسرا معتبر ماخذ نہیں ہے[263]، یہ خطوط ان دونوں شخصیتوں کے باہم احترام واکرام کی بھی عکاسی کرتے ہیں اور گھریلو قسم کے تعلقات کی بھی، ان میں ایک مرشد روحانی کی ہدایات بھی ہیں اور محبوب کے آتش جگر کی چنگاریاں بھی، اصلاح ذات کا نسخۂ کیمیا بھی ہے اور دوسروں کے کام آنے کی تلقین بھی، بزرگانہ فاصلے بھی ہیں اور دوستانہ بے حجابیاں بھی، ان خطوط کے تخاطبات میں مشورے بھی ہیں اور ہم کلامی بھی۔۔۔

باہمی احترام واکرام اور حسن تعلق

☆ ہر خط میں تخاطب کے لئے انتہائی احترام کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جو عموماً مسترشدین کے بجائے قابل احترام شخصیتوں یا دوستوں کو لکھے جاتے ہیں، اور لب ولہجہ میں

263-اس مقام پر جنت الانوار میں حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب ذکاؔ گڑھولویؒ کے ایک اور تسامح کی نشاندہی ضروری ہے کہ: آپ نے حضرت مولانا عبدالشکور کے نام جملہ مکاتیب نقل کرنے بعد آخر میں ایک نوٹ چڑھایا ہے:

"مکتوب ۲۳ سے یہاں تک کے سارے مکاتیب مولانا عبدالشکور صاحب ساکن مظفرپور محلہ کلیانی کے نام ہیں، جو والد علیہ الرحمۃ کے شاگرد بھی تھے، ان کو آپ سے حد درجہ عقیدت اور محبت تھی ۱۲(ذکا)۔ جنت الانوار ص ۲۴۹ اول ایڈیشن)

مولاناؒ کا یہ نوٹ جنت الانوار کے اگلے ایڈیشنوں میں بھی موجود ہے (دیکھئے طبع ثالث ص ۲۷۱)

مولانا عبدالشکورؒ کو مولانا گڑھولویؒ کا شاگرد کہنا اصطلاحی طور پر صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ہم سبق ساتھی تھے، جیساکہ مولانا عبدالشکورؒ کے تعلیمی احوال کے ضمن میں گذر چکا ہے۔۔۔۔۔۔ البتہ طریقت کے لحاظ سے مولانا عبدالشکورؒ نے مولانا گڑھولویؒ سے روحانی تعلیم حاصل کی، تو روحانی شاگرد (مرید) ضرور تھے۔

دوستانہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے مثلاً:

☆ہمہ عطوفت فضیلت مرتبت۔۔۔۔متعدد مکاتیب کرم فرما موصول ہوئے[264]۔

☆خلت آیات بارک اللہ فی احوالہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ مکتوب بہجت اسلوب کرم فرما موصول ہو کر مزید دعا گوئی وخوش وقتی کا سبب ہوا۔۔۔[265]

☆ہمہ عطوفت وخلت۔۔۔مدت دراز کے بعد رقیمہ مودت ضمیمہ عنایت فرما اوائل ماہ رمضان میں موصول ہوا تھا۔۔۔[266]

☆خلت اطوار فضیلت آثار۔۔۔۔پرسوں مکرر رقیمہ مودت ضمیمہ کے وصول سے ممنون ومزید دعا گو ہوا۔۔۔[267]

☆فضیلت دستگاہ خلت پناہ۔۔۔۔گرامی نامہ مودت شمامہ کے وصول فرحت شمول سے ممنون ومسرور ہوا، دو دن ہوئے کہ کارڈ سامی دربارۂ علالت طبع موصول ہو کر باعث تعلق کا ہوا۔۔۔۔امید کہ پھر کیفیت وحالت مزاج سامی سے مطلع فرماویں کہ رفع تعلق ہوئے۔۔۔[268]

☆ہمہ عطوفت وخلت فضیلت مرتبت۔۔۔۔۔بارک اللہ فی احوالکم

264۔مکتوب ۲۳ص ۲۵۳ طبع ثالث۔

265۔مکتوب ۲۵ص ۲۵۴۔

266۔مکتوب ۲۸ص ۲۵۷۔

267267۔مکتوب ۳۰ص ۲۵۹۔

268۔مکتوب ۳۱ص ۲۵۹۔

وزادکم اذواقاًواشواقاً، بعد سلام سنت التیام مکشوف ضمیر مودت تخمیر ہووے، کچھ عرصہ ہوا کہ مکتوب شریف کے ورود سے محظوظ وخوش وقت ہوا۔[269]

☆امید کہ تنگ خاطر شریف نہ ہوویں۔۔۔[270]

☆عنایت نامہ کرم فرماورود ہو کر باعث مزید بر مزید دعا گوئی کا ہوا، بہت عرصہ سے خیال ہو رہا تھا کہ آپ کو بذریعۂ تحریر کے بھی حسبۃ للہ و اداء لحق الصداقۃ ضرور کچھ یاد دلاؤں بایں مضمون کہ:

گرچہ یاران فارغ انداز از یاد من

از من ایشاں راہزاراں یاد ہا[271]

☆خلت آثار فضیلت شعار السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدت مدید کے بعد نمیقہ مودت ضمیمہ کرم فرماکے وصول فرحت شمول سے مسرور و مبتہج ہوا،فجزاکم اللہ تعالیٰ، تقریباًپانچ ماہ سے علیل ہوں، ابھی تک میری علالت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔۔۔ مجھ کو افسوس ہے کہ کبھی آپ سے ملاقات نہیں ہوتی مگر کیا کیا جاوے جبکہ آپ اپنی تندرستی سے معذور ہو رہے ہیں[272]۔

☆عطوفی فضیلت نشاں السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

---

269 ۔مکتوب ۳۳ص ۲۶۰۔

270۔مکتوب ۳۴ص ۲۶۱۔

271۔مکتوب ۳۷ص ۲۶۴۔

272۔مکتوب ۳۹ص ۲۶۶۔

عنایت نامہ سامی ورود ہو کر باعث ممنونیت کا ہوا، احسن اللہ الیکم [273]۔

یہ انداز تخاطب، اور مخاطب کے ذوق و مزاج کی اس درجہ رعایت پیر و مرشد حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ کے نام کے مکاتیب کا استثناء کر کے جنت الانوار کے کسی اور نام کے مکاتیب میں موجود نہیں ہے، اس سے ان دونوں بزرگوں کے تعلقات کی نوعیت اور نزاکت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا عبد الشکور کے لئے سواری کا انتظام

حضرت گڑھولویؒ آپ کو افراد خاندان کی طرح اہمیت دیتے تھے، اور اپنے گھریلو معاملات و مسائل میں بھی انتہائی اہتمام کے ساتھ آپ کو شریک فرماتے اور مشورے لیتے تھے۔

حضرت آہؒ شہر مظفر پور کے رہنے والے تھے، اور زندگی کا بیشتر حصہ بھی شہروں (مثلاً کانپور، مئو، پٹنہ وغیرہ) ہی میں گذرا تھا، جب کہ گڑھول شریف مظفر پور ضلع کے انتہائی دور دراز علاقے میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، وہاں پہونچنے کا راستہ بھی مشکل تھا، اکثر لوگ پیادہ پا سفر کرتے تھے، لیکن حضرت گڑھولویؒ خصوصیت کے ساتھ حضرت آہؒ کے لئے سواری (پالکی یا بیل گاڑی وغیرہ) کا انتظام فرماتے تھے، تاکہ ان کو دقت نہ ہو، ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:

> "ہمارے یہاں کی تقریب میں آپ کی شرکت لابد ہے [274]، اس میں آپ از قبیل ارکان تصور کئے جاتے ہیں، اس لئے پیشتر سے آپ کو اطلاع دی جاتی ہے، کہ آپ بسہولت رخصت لے کر تاریخ مقررہ سے کچھ دن پہلے

---

[273] مکتوب ۱۴۱ ص ۲۶۷۔

[274] یہ حضرت گڑھولویؒ کی بڑی صاحبزادی کی شادی کا ذکر ہے، جو ۲۵، ۲۶ ذی قعدہ مطابق ۲، ۳ جولائی ۱۹۲۵ء کو انجام پائی، (مستفاد از حاشیہ حضرت مولانا ادریس صاحبؒ)

تشریف لاویں اور آپ اپنے آنے کی نسبت سے مجھ کو مطلع کریں، تاکہ اس
موقع پر سواری کا انتظام آپ کے لئے کیا جاوے[275] "

گھریلو روابط

گھریلو تعلقات کی انتہاء یہ تھی کہ مخصوص مواقع پر حضرت آہؒ کی اہلیہ محترمہ بھی گڑھول شریف تشریف لے جاتی تھیں، حضرت گڑھولویؒ سے بیعت کا تعلق بھی رکھتی تھیں، اس لئے بھی ان کے لئے گڑھول میں خصوصی کشش تھی، ایک مکتوب میں حضرت گڑھولویؒ کے ان الفاظ سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

"اگر کچھ مدت کے لئے رخصت لے لیویں تو بہت مناسب، میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں، اس موقعہ پر کچھ دن یہاں آکر بھی ضرور قیام کریں، والدۂ محمد ایوب[276] آپ کی اہلیہ کی بہت شکرگذار ہیں، پھر کسی موقعہ پر ان کو طلب کرنے کا خیال ضرور ہو رہا ہے، وقت مناسب پر اس کی نسبت اطلاع دی جائے گی۔۔ بشرط یاد۔۔مناسب کہ کبھی کبھی اپنی خیریت وحالت سے ضرور مطلع فرماتے رہیں[277]۔

ایک آخری خط حضرت کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا محمد ایوب صاحبؒ کا تحریر کردہ ہے، جو ۱۹۳۴ء کے زلزلے کے بعد کا ہے، اس کا یہ اقتباس بھی اسی شدت تعلق کی

---

[275] ۔مکتوب ۳۳ص ۲۶۹۔

[276] ۔یہ حضرت گڑھولوی کے بڑے صاحبزادے تھے، بہت کامل واکمل اور اپنے والد بزرگوار کے عکس جمیل تھے، عین جوانی میں ہیضہ کے مرض میں انتقال فرمایا، ولادت ۱۳۳۲ھ میں ہوئی اور وفات ۱۳۶۳ھ میں ہوئی۔

(جنت الانوار ص ۹۲ طبع ثالث)

[277] ۔مکتوب ۳۴ص ۲۷۰۔

عکاسی کرتا ہے:

"حاصل یہ کہ یہاں بھی کسی قدر بے اطمینانی ہے، مگر آنجناب نے جو صعوبتیں تحریر فرمائی ہیں، اس کے لحاظ سے یہاں اطمینان ہے، اگر اس حالت میں بھی بھابھی صاحبہ آنے کو پسند فرماویں، تو کوئی مضائقہ نہیں، ہم لوگوں کو خدانخواستہ کوئی اور ثقل نہیں [278]۔

معاصرانہ انداز تخاطب

بحیثیت مرشد کبھی کسی بات پر حضرت گڑھولوی تنبیہ بھی فرماتے تھے، اور کبھی شکوہ بھی، مگر اس میں بھی رفیقانہ وقار، معاصرانہ احترام اور دوستانہ خلوص کا لحاظ رہتا تھا، اور اس کی بناپر انداز تخاطب میں بسا اوقات خود کلامی کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا، ملاحظہ فرمایئے مکاتیب کے یہ چند اقتباسات:

☆ "مجھ کو انتظار رہا کہ آپ اس تعطیل میں تشریف لائیں گے، مگر افسوس کہ آپ اپنے کسل مزاج کی وجہ سے نہ آسکے [279]۔"

☆ خداوند تعالیٰ بعنایت خاصہ ہم لوگوں کو ازالۂ غفلت قلبی میں سرگرمی کی توفیق عطا فرمائے آمین، یوم لاینفع مال ولابنون الامن اتی اللہ بقلب سلیم، الم یان للذین آمنو ان تخشع قلوبہم لذکر اللہ ومانزل من الحق آہ، اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون- آیات بینات زاجرات سے اگر ہمارے قلوب سے غفلت و کسل رفع نہ ہووے، فیا حسرتاہ ویاویلتاہ [280]۔

278۔ مکتوب ۵۴ ص ۲۷۱۔

279۔ مکتوب ۵۳ ص ۲۶۲۔

☆آیات زاجرہ اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون، الم یان للذین آمنو ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ و مانزل من الحق آہ، یوم لاینفع مال ولابنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم ہمارے جیسے آلودۂ نجاست غفلت کے لئے تازیانہ بر تازیانہ ہے[281]۔

خصوصیت و بے تکلفی

اسی ضمن میں ہم اس فارسی شعر کا ذکر بھی کرسکتے ہیں، جو اکثر حضرت گڑھولویؒ کسی اصلاحی تعلیم یا ہدایت کے بعد خط کے درمیان یا آخر میں تحریر فرماتے تھے:

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں گر ما نرسیدیم تو شاید برسی[282]

ترجمہ: ہم نے گنج مقصود کی نشاندہی کردی ہے، اگر ہم نہ پہونچ سکے تو شاید آپ پہونچ جائیں۔

حضرت مولانا عبدالشکورؒ کے کئی خطوط میں یہ شعر درج ہے، حضرت گڑھولویؒ یہ شعر بہت کم کسی کو لکھتے تھے، جنت الانوار میں مولانا ظہور احمد (رسول پور نستہ ضلع دربھنگہ) کے علاوہ کسی کے خط میں یہ شعر موجود نہیں ہے، اس سے ایک طرف حضرت گڑھولویؒ کی تواضع ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف حضرت مولانا عبدالشکورؒ کے ساتھ ان کی خصوصیت، اور معاصرانہ رشتوں کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

☆کئی مکاتیب میں ہدایا اور پارسل وغیرہ کا ذکر ہے، ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آہ حضرت گڑھولویؒ کے حکم پر بعض مالی ذمہ داریاں بھی قبول فرماتے

---

[280] ۔مکتوب ۲۸ ص ۲۵۸۔

[281] ۔مکتوب ۳۶ ص ۲۶۳۔

[282] ۔مکتوب ۲۵ ص ۲۵۵۔

تھے، جیسا کہ حضرت مولانا غلام حسین کانپوریؒ کے وصال کے بعد صاحبزادگان کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت گڑھولویؒ بہت فکر مند تھے تو حضرت آہ نے آپ کی خواہش پر بعض اخراجات اپنے ذمے لے لئے، اور جب تک اس کا متبادل انتظام نہیں ہوا اور پیر طریق نے صراحت اور اصرار کے ساتھ روک نہیں دیا اس وقت تک پابندی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے، دیکھئے اس موقعہ کا ایک مکتوب:

"ہمہ خلت فضیلت مرتبت السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ کرم فرمامع منی آرڈر مرسلہ کے وصولی سے منت کش ہوا، احسن اللہ الیکم۔ عزیزی حافظ محمد یونس سلمہ ربہ کے تعلیمی مصارف کی نسبت جناب حافظ عبد اللہ صاحب نے انتظام کر لیا ہے، جیسا کہ مشافۃً اس کا تذکرہ آپ سے میں نے کیا تھا، مگر اس پر بھی آپ نے ازراہ حسن خلوص امداد فرمائی، فجزاکم اللہ تعالیٰ، مگر آئندہ اس کے لئے تکلیف نہ فرماویں[283]۔

یہ چیزیں بھی ان دونوں بزرگوں کے حسن تعلق اور بے تکلف لگاؤ کی دلیل ہیں، بغیر خصوصی تعلق کے اس طرح کے معاملات نہیں ہوتے، دیگر حضرات کے مکاتیب میں یہ بات موجود نہیں ہے۔

سفارشی مکتوب

☆ایک موقعہ پر حضرت گڑھولویؒ کے ایک متوسل کا کام بگڑا ہوا تھا، معاملہ عدالتی مقدمات تک پہونچ گیا تھا، ایک موقر شخصیت (مولانا مبارک کریم صاحبؒ[284]) کی مداخلت سے

---

[283] ۔مکتوب ۲۹ ص ۲۵۸۔

یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا، جو حضرت آہؒ کے قدر دانوں میں سے تھے، تو حضرت گڑھولویؒ نے آپ کے نام ایک سفارشی خط تحریر فرما کر حامل رقعہ کے حوالے کیا:

"اس وقت باعث تحریر یہ امر ہے کہ حامل ہٰذا میرے مخلص ہیں، غالباً اس کا آپ کو علم بھی ہو گا، ان کے خاص قریبی رشتہ دار نے زیر بار و پریشان کرنے کے خیال سے ان پر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے، اگرچہ قانونی طریقہ سے یہ بھی ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن بوجہ پراگندگی اوقات و اسراف مال بمقتضائے خیال اہل صلاح ان کو یہ زیادہ پسند ہے کہ اگر میرے فریق میرے ساتھ صلح کر لیتے تو زیادہ مناسب ہوتا، اور اس کام کے لئے مولوی مبارک کریم صاحب اگر توجہ فرمادیں تو امید قوی ہے کہ میرا معاملہ طے ہو جائے گا، اور آپ کو غالباً مولوی صاحب موصوف کے ساتھ روابط ہیں، لہٰذا بحکم کریمہ: من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منہا، وبفحوائے من کان فی عون اخیہ کان اللہ فی عونہ، وبمقتضائے انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم وامثال ذلک۔ آپ کو تکلیف دہ ہوں کہ مولوی صاحب موصوف کو کلمۃ الخیر فرما کر ان کو آمادہ کر دیویں کہ ان دونوں کے درمیان

---

[284]۔یہ بہار کے مشہور اور ممتاز عالم دین تھے، جن کی پکڑ عوام و خواص سے لے کر حکومتی حلقوں تک تھی، پورا نام ابو نعیم محمد مبارک کریم" تھا، انگریزی حکومت کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب ملا تھا، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس رہے، ۱۹۲۲ء میں جب اسلامی تعلیم کی نگرانی (سپرنٹنڈنٹ آف اسلامک اسٹڈیز) کا عہدہ قائم کیا گیا تو اس منصب پر آپ کا تقرر عمل میں آیا، بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سپرنٹنڈنٹ تھے (حیات عبدالرحمن ص ۳۲ مرتبہ مولوی وصی احمد شمسی صاحب، مضمون مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب ناظم امارت شرعیہ- مع حاشیہ)

صلح کرادیویں اور عند اللہ ماجور ہوں[285]۔

پیدائشی ولی

جنت الانوار کے ایک مکتوب میں حضرت مولانا احمد حسن منورویؒ کا ذکر ہے کسی وجہ سے والد ماجد آپ سے ناراض ہوگئے تھے، حضرت منورویؒ حضرت گڑھولویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور والد صاحب سے کلمۂ خیر کہنے کی درخواست کی، تاکہ والد صاحب کی ناراضگی ختم ہوجائے، حضرت گڑھولویؒ نے آپ کی درخواست قبول کرتے ہوئے حضرت آہ کو تحریر فرمایا:

"آپ کے فرزند محل اولیٰ مسمیٰ احمد حسن دوبار مجھ سے ملاقات کرچکے ہیں، درود شریف وختم مجددیہ کی اجازت بھی لی ہے، اور بہت الحاح کے ساتھ مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ والد بزرگوار سے بطریق کلمۃ الخیر سفارش کردیویں کہ وہ مجھ سے راضی ہوجائیں، مجھ کو حقیقت حال سے گرچہ واقفیت نہیں ہے، لیکن امید بحکم ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفراللہ لکم واللہ غفور رحیم[286] آپ نظر بزرگوارانہ سے ان کو ہم آغوش فرمادیں والسلام"[287]

حضرت امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمن صاحبؒ اپنے استاذ محترم (حضرت آہ) کے حوالے سے میرے سامنے ایک سے زیادہ بار بیان فرمایااور ایک بار میرے والد ماجد کے سامنے بھی بیان فرمایا کہ:

---

[285]۔مکتوب ۲۷ ص ۲۵۶، ۲۵۷۔

[286]۔سورۃ النور: ۲۲

[287]۔مکتوب ۳۴ ص ۲۶۲۔

حضرت گڑھولویؒ کے اس خط کے جواب میں ان کو جو لکھنا تھا لکھا، پھر جب گڑھول حاضری ہوئی تو حضرت گڑھولویؒ نے حضرت آہؒ سے ارشاد فرمایا:

"آپ کے فرزند احمد حسن پیدائشی ولی ہیں، ان سے ہر گز ناراض نہ ہوا کریں"

حضرت گڑھولویؒ نے پہلی نظر ہی میں حضرت منورویؒ کے نور ولایت کو دیکھ لیا تھا، اور ان کے اسی مشاہدہ کی کشش حضرت منورویؒ کو بارگاہ گڑھول تک لے گئی اور والد صاحب کی ناراضگی بظاہر اس کا ذریعہ بن گئی ۔۔۔۔۔۔ چنانچہ ابتدائی چند ملاقاتوں کے بعد ہی حضرت گڑھولویؒ نے آپ کے جوہر کامل کو دیکھتے ہوئے اپنے سلسلۂ روحانی کی امانت آپ کے حوالے فرمادی، اور معاملہ صرف ختم مجددیہ اور درود شریف کی اجازت تک محدود نہ رہا بلکہ ان کو اس طریق کی امامت وریاست سونپ دی گئی، چنانچہ بعنایت ایزدی حضرت گڑھولویؒ کی منشا کے مطابق آپ کا فیض روحانی حضرت منورویؒ ہی کے واسطے سے جاری ہوا۔۔۔۔

حضرت منورویؒ پر حضرت گڑھولویؒ کا رنگ ایسا غالب ہوا کہ عمر شریف کے آخری حصے میں انہوں نے سلسلۂ گڑھول کے فروغ واستحکام کے لئے جو خدمات جلیلہ انجام دیں اور اس سلسلے کا فیض جس قوت کے ساتھ آپ کے ذریعہ جاری ہوا وہ ان کے اپنے دیگر پیش رو سلاسل کے لئے بھی نہیں ہوسکا، جب کہ حضرت منورویؒ جامع النسبت بزرگ تھے، اور ہر سلسلے کے مشائخ سے ان کو ولایت کاملہ حاصل ہوئی تھی، لیکن حضرت گڑھولویؒ کی قوت نسبت سے ان کو جو فنائیت ملی وہ سب پر غالب آگئی اور عام طور پر یہی نسبت آپ کی روحانی شناخت بن گئی، فرحمہ اللہ[288]۔

---

[288]۔حضرت منورویؒ کے حالات میں پہلے گذر چکا ہے کہ ان کی خاندانی نسبت روحانی جد امجد حضرت نصرؒ کے واسطے سے نقشبندیت اور نانا حضرت شاہ امیر الحسن کے واسطے سے قادریت ہے، آپ کے پہلے پیر طریق آپ کے نانا محترم ہیں، نقشبندیت کا تخم اولین غیر شعوری طور پر آپ کے اندر جد امجد کے زیر تربیت ڈالا گیا، لیکن بعض حالات وحوادث کی بنا

پر جب آپ باپ اور دادا کے سایۂ شفقت سے نکل کر نانا محترم کے ظلِ عاطفت میں پہونچے، تو قادریت آپ کی پہلی شعوری خاندانی (مادری) نسبت بن گئی، اس سلسلے کی پہلی اجازت وخلافت بھی نانا حضورؒ ہی سے حاصل ہوئی، نانا محترم کے وصال کے بعد خاندان فاروقی مجددی کے چشم وچراغ، شیخ الشیوخ حضرت شاہ ابوالخیر مجددی دہلویؒ کے آستانے پر حاضر ہوئے اور داخل سلسلہ ہوئے، میرے والد ماجد نے حضرت مولانا زید ابوالحسن مجددی دہلویؒ کے حوالے سے بیان فرمایا کہ:

"حضرت مولانا احمد حسن سراپا گل تھے، خانقاہ تشریف لاتے تو جیسے روحانیت کی بہار آجاتی تھی"

حضرت مولانا ابوالخیر دہلویؒ سے وابستہ ہونے کا قصہ حضرت زیدؒ نے ہی بیان فرمایا، کہ اسی گلی میں وہ کسی حکیم کے مطلب میں پریکٹس کرتے تھے، جس زمانے میں وہ والد صاحب (حضرت دہلویؒ) کے پاس آتے تھے، میرا لڑکپن تھا، اور پھر والد صاحب کے وصال کے بعد جب پہلی بار تشریف لائے، تو میں حلقے میں تھا، انہوں نے مجھے نام لے کر پکارا تو ایسا لگا کہ ہاتف غیبی کی صدا آرہی ہو، پھر میں کھڑا ہو گیا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔

حضرت شاہ ابوالخیرؒ کے وصال کے بعد مزید ترقی کے لئے والدہ ماجدہ کے اشارہ پر سلسلۂ قادریہ کے معروف بزرگ حضرت شاہ عبید اللہ پھلوارویؒ سے وابستہ ہوئے، اور آپ کی نسبت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

ان کے علاوہ حضرت شاہ بشارت اللہ بہرایچی کے سلسلے کے مشائخ سے بھی ان کی وابستگی ثابت ہے، غرض انہوں نے ملک کے مختلف مشائخ طریق سے استفادہ کیا اور ولایت وروحانیت میں عروج وکمال تک پہونچے۔۔۔۔۔۔

اس پورے عرصے میں حضرت مولانا بشارت گڑھولویؒ سے ان کی کوئی ارادت ووابستگی نہیں تھی، زیادہ سے زیادہ وہ حضرت کو غائبانہ طور پر جانتے تھے اور وہ بھی اپنے والد کے رفیق یا پیر طریق ہونے کی نسبت سے۔۔۔۔

یہ حسن اتفاق تھا یا حضرت گڑھولویؒ کی قوت روحانی کی جاذبیت کہ گڑھول شریف تک آپ کے پہونچنے کے اسباب پیدا ہو گئے، جنت الانوار کے مذکورہ بالا مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سفارش کی غرض سے گڑھول حاضر ہوئے تھے

میرے والد ماجد (مولانا محفوظ الرحمن صاحب) نے ایک روایت یہ بھی نقل فرمائی کہ حضرت منورویؒ کو پیٹ میں تکلیف کی شکایت تھی اور دوا علاج کے باوجود آرام نہیں ہوتا تھا، تو دعا کی غرض سے گڑھول حاضر ہوئے، حضرت سے مل کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے مرض کی کیفیت بیان کی، حضرت نے آپ کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ "یہ تو کوئی مرض نہیں ہے، انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا" حضرت منورویؒ حکیم تھے، دل ہی دل میں خیال کیا کہ "حکیم میں ہوں اور یہ کہتے ہیں کہ مرض ہی نہیں ہے" حضرت گڑھولویؒ پر یہ بات منکشف ہو گئی اور حضرت نے فرمایا میں بھی حکیم ہوں۔۔۔

بہر حال مجلس برخواست ہوئی اور شب میں قیام کے بعد صبح آنکھ کھلی تو پیٹ کا مرض زائل ہو چکا تھا، پہلے بھوک ہی نہیں لگتی تھی، اب سخت بھوک لگی، حضرت گڑھولویؒ نے بڑی شفقت کے ساتھ آپ کو ناشتہ کرایا اور رخصت کیا

"جنت الانوار" کے مکاتیب سے جستہ جستہ یہ چند چیزیں اس لئے پیش کی گئیں کہ ان دونوں شخصیات کے باہمی تعلقات، معاصرانہ رشتے، حضرت آہؒ کی خصوصیات وامتیازات، اورآپ کی فنائیت وبے نفسی کی کچھ جھلکیاں سامنے آسکیں۔

نماز جنازہ کی وصیت

باہم انہی گہرے تعلقات کا عکس تھا کہ حضرت گڑھولویؒ نے اپنے نماز جنازہ کی امامت کے لئے حضرت آہؒ کے حق میں وصیت فرمائی تھی، گو کہ بروقت نہ پہونچ سکنے کی بناپر صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد ایوب صاحبؒ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔۔۔۔

یہ بات مجھ سے حضرت آہؒ کے تلمیذ خاص حضرت امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ نے بیان فرمائی، امیر شریعت خامس نے بیان فرمایا کہ حضرت الاستاذؒ کے

حضرت کی اس کرامت اور شفقت سے آپ بے حد متاثر ہوئے، اور یہی اثر انگیزی رفتہ رفتہ عقیدت وارادت میں تبدیل ہوتی گئی۔۔۔۔

حضرت گڑھولویؒ سے آپ کے بیعت کا قصہ ایک بار آپ نے خود ہی اس طرح بیان فرمایا، جس کے راوی جناب پروفیسر محمد علی نیازی صاحب (مقیم حال مظفر پور محلہ چندوارہ) ہیں جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے:

"حضرت منورویؒ حضرت گڑھولویؒ کی خدمت میں بالکل خالی الذہن حاضر ہوئے تھے، بیعت وغیرہ کا کوئی خیال نہیں تھا، (اس لئے کہ وہ دیگر مشائخ سے وابستہ رہ کر منازل سلوک طے کرچکے تھے) کہ اچانک حضرت گڑھولویؒ نے ارشاد فرمایا:- احمد حسن! مجھ سے بیعت ہوگے؟ عقیدت ہوگی؟۔۔۔ حضرت منورویؒ نے سکتہ کے عالم میں عرض کیا: کیوں نہیں حضور! حضرت گڑھولویؒ نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت منورویؒ نے بھی بے اختیار اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا، اور بیعت ہوگئے"

یہ واقعہ حضرت منورویؒ نے گڑھول شریف میں صاحبزادگان حضرت گڑھولویؒ کی موجودگی میں سنایا تھا۔

یہ تمام واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت منورویؒ گڑھول شریف مرید کے بجائے مراد بن کر پہونچے تھے، اور آپ نے حضرت گڑھولویؒ کو نہیں بلکہ حضرت گڑھولویؒ نے آپ کو دریافت کیا تھا، حضرت گڑھولویؒ نے سلسلے کی ذمہ داری اور امانت آپ کے حوالے فرمائی، جس کو حضرت منورویؒ نے بحسن وخوبی تکمیل تک پہونچایا فرحمہا اللہ۔

ساتھ اس سفر میں میں بھی تھا، لیکن گڑھول ہم لوگ ایسے وقت پہونچے جب نعش مبارک تابوت سے قبر میں اتاری جارہی تھی، ہم لوگ تدفین میں شریک ہوئے، اور اس وصیت کا وہاں کے کئی لوگوں کو علم تھا۔۔۔اس سے حضرت آہ کے روحانی مقام و مرتبہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گڑھول شریف سے وابستہ بعض واقعات

حضرت آہ کو اپنے شیخ سے بے پناہ محبت تھی، اسی لئے جب موقعہ میسر ہوتا گڑھول شریف آپ کی صحبت میں حاضر ہوتے، حضرت گڑھولویؒ انتہائی قوی التاثیر اور سراپا فیض بزرگ تھے، حضرت آہ آپ کے کئی باطنی تصرفات کے عینی شاہد تھے، جنت الانوار میں اس قسم کے کئی واقعات نقل کئے گئے ہیں مثلاً:

فیل پا کا قصہ

☆ایک مرتبہ آپ کو فیل پا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ایک پاؤں کا جوتا بڑا اور دوسرے کا چھوٹا بنوایا، یہ نہایت برا معلوم ہوتا تھا جس سے سخت کوفت ہوتی تھی، گڑھول شریف حاضر ہوئے، واپسی کے وقت حضرت والاؒ نے ملاحظہ فرمایا اور کچھ دیر مراقب رہے، اور پھر رخصت کی اجازت دے دی، جو گیارہ اسٹیشن حسب معمول بیل گاڑی سے پہونچے، گاڑی سے اتر کر دیکھا تو ایک پاؤں کا جوتا ڈھیلا تھا اور دونوں پاؤں مساوی تھے، نہ سوجن تھی نہ فیل پا، پھر ساری زندگی یہ بیماری نہیں لوٹی[289]۔

ہر طرف پیکر شیخ

☆حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ نے ایک اور واقعہ لکھا ہے، آپ ہی کے الفاظ

---

[289] جنت الانوار ص ۳۵ طبع ثالث۔

میں ملاحظہ فرمائیں:

"مولانا عبد الشکور صاحبؒ نے لڑکوں کو پڑھایا کہ کسی بزرگ نے ایک ہی وقت میں کئی کئی جگہوں میں دعوت کھائی،اس پر طلبہ نے اعتراض کیا ، مولانا نے استاذانہ انداز میں ان کو جواب دے دیا لیکن خود ان کا دل مطمئن نہیں ہوا کہ آخر یہ کیسے ہوا؟ سوچا گڑھول جاکر آپ سے استفسار کروں گا، جب گڑھول پہونچے تو نماز کا وقت تھا، مسجد میں جماعت ہو رہی تھی ، سیدھے مسجد پہونچے تو امام بھی آپ ہی تھے اور دائیں بائیں ہر طرف آپ ہی آپ نظر آرہے تھے، سلام پھیرا تو پوری جماعت میں آپ ہی کی صورت اور آپ ہی کا پیکر تھا، اس طرح اپنے سوالوں کا جواب آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا، خطرات دور ہو گئے اور قلب کو طمانیت حاصل ہوئی[290]۔

کر ضبط فغاں فریاد نہ کر۔۔۔۔

☆گڑھول شریف حاضری کا ایک اور تاریخی واقعہ جس کو حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ کی عارفانہ شاعری نے حیات دوام بخش دیا ہے قاری صاحبؒ کی کتاب "درس حیات سے انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"مولانا عبد الشکور صاحبؒ مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ حضرتؒ کے منظور نظر متوسلین میں سے تھے، ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو اپنی ایک تقریر اور اس کے مضامین کا ذکر کیا، جب یہ چپ ہوئے تو حضرتؒ حسب عادت تھوڑے

290-جنت الانوار ص ۴۰۔ "درس حیات" مرتبہ حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ میں بھی یہ واقعہ کچھ فرق کے ساتھ موجود ہے (ص ۲۴۰، ۲۴۱)

سکوت کے بعد ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولے کہ "ابھی تک آپ تقریر کرتے ہی ہیں؟" پھر تھوڑے سکوت کے بعد فرمایا:

ع　　کر ضبط فغاں فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تقریباً دو سال پہلے ایک نوٹ بک میں مولانا عبد الشکور صاحبؒ مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا مذکورہ بالا واقعہ اور اسی کے ساتھ وہ مصرعہ جو حضرت گڑھولویؒ نے پڑھا تھا لکھا ہوا ملا، اس کو پڑھ کر دیر تک لطف اٹھاتا رہا، پھر خیال آیا کہ اس اجمال کی کچھ تفصیل ہونی چاہئے، مولانا گڑھولویؒ نے کیا فرمایا، وہ کیا چاہتے تھے، اور وعظ و تقریر و تبلیغ و اصلاح کے سلسلہ میں ان کا کیا مسلک تھا، اس مختصر واقعہ اور مصرعہ سے یہ واضح نہیں ہوتا، بلکہ جو لوگ حضرتؒ کے رنگ طبع سے واقف نہیں ہیں، ان کو اس اجمالی واقعہ اور مصرعہ سے کچھ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے، یہ خیال آتا تھا کہ منجانب اللہ اس موضوع پر کچھ اشعار موضوع ہو گئے، جن سے حضرت گڑھولویؒ کے رنگ طبع کی روشنی میں ان کے اس فرمان کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے، یعنی پوری نظم پڑھئے پھر پتہ چلے گا کہ حضرت گڑھولوی کیا چاہتے تھے اور کیا فرما رہے ہیں۔

کر ضبط فغاں فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر

جو راز درون سینہ ہو، اس کی تو کبھی تشہیر نہ کر

جو دل کی حکایت مجمل ہو، اس کی تو کبھی تفسیر نہ کر

مستور اگر ہو حال ترا، مستور ہی اس کو رہنے دے

جو خواب محبت راز میں ہو اس کی تو بیاں تعبیر نہ کر

ایسی تو کبھی اصلاح نہ کر، افساد نتیجہ ہو جس کا

تخریب ہو جس کے پردہ میں ایسی تو کبھی تعبیر نہ کر

کر بند زبان قال کو تو اور بول زبان حال سے تو

تو جذبہ دل کو لب پہ نہ لا، دل جوش میں لا تقریر نہ کر

تعظیم بھی کر توقیر بھی کر، لذت کش درد محبت کی

دل عشق سے خالی ہو جس کا اس کی تو کبھی توقیر نہ کر

قابو سے ہو باہر دل جس کا اور ضبط فغاں جو کر نہ سکا

مجرم ہے مگر معذور ہے وہ، معذور کی تو تعزیر نہ کر

جو راہ نبی سے دور کرے اور عشق سے جو مہجور کرے

تو ہاتھ میں اس کے ہاتھ نہ دے اس شخص کو اپنا پیر نہ کر

ہر عزم و عمل سے اپنے تو، تبلیغ محبت کرتا رہ

صرف اپنی زباں ہی سے تو فقط انذار نہ کر تبشیر نہ کر

تدبیر پہ اپنی ناز نہ کر، میں اتنا ہی تجھ سے کہتا ہوں

اسباب کا عالم دنیا ہے، کس نے یہ کہا تدبیر نہ کر

راضی بہ رضائے الٰہی رہ، صابر بہ قضائے الٰہی رہ

آ جائے مگر جب وقت عمل، پھر تذکرۂ تقدیر نہ کر

فرمایا گڑھول کے حضرتؒ نے اے فخرؔ اک اپنے مخلص سے [291]

کر ضبط فغاں فریاد نہ کر، تاثیر دکھا تقریر نہ کر [292]

---

[291] ۔اس سے مراد حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ کی شخصیت ہے۔

[292] ۔درس حیات ص ۲۲۱، ۲۲۲۔

چند روحانی تعلیمات و ہدایات

اس بحث کا اختتام حضرت گڑھولوی ؒ کی ان روحانی تعلیمات و ہدایات پر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے خاص حضرت آہؒ کے لئے تحریر فرمائے تھے:

☆ امید کہ میرے دوست بہ یک سرگرمی پرداخت باطن کو اہم تصور کریں[293]۔

☆ امید کہ وظیفہ مقررہ پر میرے برادر کاربند رہیں، انجام کار کا مدار استقامت پر ہے،ان الذین قالوا ربنااللہ ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکۃ[294]۔

☆ فی الجملہ بھی التزام و مداومت شغل باطن کو مہمات امور سے تصور کریں تو امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ برکات مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو بالضرور محسوس فرماویں گے[295]۔

☆ خداوند تعالیٰ آپ کو جمعیت صوری و معنوی عطا فرمائے آمین، مرجو کہ میرے دوست بہر حال ہر گز پرداخت باطن سے فارغ و غافل نہ رہیں،

ع کار ایں ست غیر ایں ہمہ ہیچ[296]۔

☆ برادر من کدورت یا قبض کا لاحق ہونا یہ بھی لوازم راہ سے ہے، امید کہ اس سے تنگدل نہ ہوں، ہاں عند القبض نیاز و استغفار لازم ہے، اب تو بحمد اللہ وہ حالت نہیں رہی مگر احیاناً اگر ایسی صورت ہو جائے، تو ہر گز ہر گز تنگ خاطر نہ ہوویں[297]۔

293۔ مکتوب ۷۳ ص ۲۶۴۔

294294۔مکتوب ۱۴۱ ص ۲۶۷۔

295۔مکتوب ۳۸ ص ۲۶۵۔

296۔مکتوب ۳۹ ص ۲۶۶۔

☆ مداومت شغل حضرات کرام رحمہم اللہ تعالیٰ (جو باعث سلامتی قلب ہے)
کو اہم الامور سے تصور فرمائیں۔کار نیست غیر ایں ہمہ ہیچ[298]۔
☆ تلوینات حالات وانقباض وانبساط کیفیات باطنی سے متردد خاطر نہ ہوویں
،استقامت کار کو اہم تصور فرماویں[299]۔
☆ مداومت ذکر میں غفلت ہرگز نہ کریں۔

ع کار ایں است غیر ایں ہمہ ہیچ

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین[300]۔

☆ مناسب کہ رات اور دن میں گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ ہی اہتمام کے ساتھ
قلبی مشغولی میں صرف کریں۔

ع۔ کار ایں ست غیر ایں ہمہ ہیچ[301]۔

☆ جمعیت معنوی وسلامتی کی اہمیت کو بہر حال مقصود اصلی تصور کریں،
باقی مطالب کو ذرائع ووسائل۔ع۔ کار ایں است غیر ایں ہمہ ہیچ

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں گر ما نہ رسید تو شاید برسی

بزرگوں کے فاتحہ کے لئے تو کوئی خاص طریقہ معہودہ نہیں ہے، مگر معمول
اس ناچیز کا یہی ہے کہ اوقات خاصہ میں روزانہ مشغولی ذکر ومراقبہ چند آیات

---

[297]۔مکتوب ۲۳ص ۲۵۳۔

[298]۔مکتوب ۲۵ص ۲۵۵۔

[299]۔مکتوب ۲۹ص ۲۵۸۔

[300]۔مکتوب ۳۰ص ۲۵۹۔

[301]۔مکتوب ۳۲ص ۲۶۰۔

وسورۂ قرآنیہ پڑھ کر ایصال ثواب کیا کرتا ہوں، امید کہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ استقامت طریقۂ مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نصیب حال فرماوے ہو
ماذلک علی اللہ بعزیز[302]۔

☆مناسب کہ تقیید فرائض شرعیہ کی بخوف آخرت ومداومت وظائف اندرونی بنظر ازالہ امراض قلبیہ کو اہم المہمات سے تصور فرماویں[303]۔

☆اگر ممکن ہو اور مناسب سمجھیں تو دفع ترددات وتشویشات کے لئے کسی تنہائی کے وقت میں یا حی یا قیوم برحمتک استغیث کو سر بسجود ہو کر پڑھ لیا کریں اس وقت تک کہ قلب میں خشوع ونیاز باقی رہے[304]۔

☆حضرات سلسلہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جمعیت قلبی ماہ رمضان مثمر جمعیت تمام سال کے لئے ہے، اور اس میں فتور خدانخواستہ باعث فتور تمام سال کے لئے ہے[305]۔

☆خداوند تعالیٰ مزید بر مزید توفیق طاعات واوراد مشائخ رحمہم اللہ نصیب حال فرماوے آمین ؎ کار ایں ست غیر ایں ہمہ ہیچ

داد یم ترا ز گنج مقصود نشاں گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

مگر استقامت شرط ہے، کریمہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ آہ شاہد عدل ہے، حضرت جان جاناں شہیدؒ

---

[302] ۔مکتوب ۳۴ ص ۲۶۱۔

[303] ۔مکتوب ۳۵ ص ۲۶۲۔

[304] ۔مکتوب ۳۶ ص ۲۶۳ ۔

[305] ۔مکتوب ۴۰ ص ۲۶۷۔

فرماتے ہیں:

براہل استقامت فیض نازل می شود مظہرؔ
نمی بینی تجلی گرد کوہ طور می گردد[306]

ان تعلیمات میں بڑی معنویت اور قلب وروح کے لئے بہت سوز وگداز ہے، ان کو پڑھ کر دل ودماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، اگر ہم توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھیں تو ان میں زندگی میں انقلاب لانے کی بھرپور صلاحیت ہے، مگر افسوس آج بزرگوں کی یہ تعلیمات سینوں کے بجائے سفینوں میں مدفون ہیں اور ہماری عملی زندگی کے بجائے محض زیب قرطاس بنے ہوئے ہیں۔

گوہر مستور

حضرت آہؒ یقینی طور پر اپنے بلند خاندانی اقدار وروایات کی بدولت اور اکابر مشائخ کی تربیت نیز حضرت گڑھولویؒ کے فیض صحبت سے کندن بن کر نکلے تھے، اور روحانیت وولایت کے اعلیٰ مقامات پر فائز تھے، لیکن اپنی فطری سادگی وبے نفسی، اور شہرت سے گریز پسند طبیعت کی بناپر خانقاہی دنیا سے اپنے آپ کو بالکلیہ الگ رکھا، پیر ومرشد حضرت گڑھولویؒ کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا، ان کے بعد آپ مکمل دس (۱۰) سال حیات سے رہے، حضرت گڑھولویؒ کے حلقہ کے دوسرے نسبتاً چھوٹے حضرات بھی اپنی روحانیت کی بساط بچھاتے رہے، لیکن اس مرد باصفا نے اپنے تمامتر علمی وروحانی کمالات کے باوجود گوشۂ گمنامی میں عافیت محسوس کی، فرحمہ اللہ۔

306۔ مکتوب ۲۴ ص ۲۶۸۔

باب چہارم

علمی وادبی خدمات

داستان گم کردہ

حضرت آہؔ کی تعلیمی ،تدریسی اورفکری وفنی خدمات کادائرہ مسلسل چھیالیس (۴۶)سالوں پر محیط ہے اور یہ پوری مدت انہوں نے فوج کے ایک گمنام سپاہی کی طرح نہیں بلکہ نامور قائد اور جنرل کمانڈر کی طرح گذاری، اگر ان کی زندگی میں یا وفات کے متصلاً بعد آپ کی خدمات علمیہ کے ریکارڈ کی حفاظت کی جاتی، تو آپ کے علم وکمال اور فکروفن کے بے شمار گوشے سامنے آتے، لیکن آج جب آپ کی وفات پر سات(۷) دہائیوں سے زیادہ لمبا عرصہ گذر چکا ہے ،آپ کے شاگرد بلکہ شاگردوں کے شاگرد بھی دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں، تاریخ کی ان گم کردہ کڑیوں تک پہونچنا ہمارے لئے ناممکن ہے، اس لئے معتبر ذرائع سے جو کچھ بھی میسر آسکا ہے اس کا ایک منتخب حصہ ہم پیش کررہے ہیں۔

شخصی کمال اور علمی جامعیت

آپ کی علمی صلاحیت اور کانپور اور دیوبند دونوں مکاتب فکر اور مراکز تعلیم سے استفادہ کا شہرہ زمانۂ طالب علمی میں ہی ہو گیا تھا، اللہ پاک نے جس قوت تقریر اور طرز خطابت سے آپ کو نوازا تھا اور زبان وبیان کی جو شگفتگی حاصل تھی، اس نے اس شہرت کو اور مہمیز دی، دیوبند سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو مولانا خدا بخش مظفرپوری کو چھوڑ کر اس پایہ کا کوئی عالم دین شہر میں موجود نہیں تھا، مولانا عبدالشکور خلیق، خوش مزاج، بلند پرواز اور مرنجامرنج انسان تھے، ان میں خاندانی نجابت اور سادات کی شرافت وفیاضی موجود تھی جو تھوڑی دیر میں انسانوں کو اپنا گرویدہ بنالیتی تھی، اس کے علاوہ زبان وادب اور شعر وشاعری کی نعمت ان کو ورثہ میں ملی تھی ،اس لئے جس مجلس میں جاتے چھا جاتے تھے۔۔۔۔۔۔

نیز مولانا خدا بخش مظفرپوریؒ بھی اسی خانوادہ کے تربیت یافتہ تھے جس سے مولانا

عبد الشکور کا تعلق تھا اس لئے مولانا عبد الشکورؒ کی شخصیت ان کے لئے بھی قابل احترام تھی[307]۔

جامع العلوم مظفر پور میں تدریس کے لئے انتخاب

غالباً یہی وجوہات تھیں کہ فراغت کے بعد ہی آپ کو مدرسہ جامع العلوم میں تدریسی خدمات کے لئے منتخب کر لیا گیا۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ ہر نوخیز مدرس کی طرح مولانا عبد الشکورؒ نے بھی اپنے تدریسی عمل کا آغاز کیا ہوگا، لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی صلاحیت کا سکہ اہل مدرسہ اور اہل شہر سے منوالیا، اور مدرس اول کے منصب پر فائز ہوئے، اور ایک طویل عرصہ (تقریباً ۱۹۲۰ء) تک مدرسہ جامع العلوم مظفر پور کے صدر المدرسین رہے[308]۔

دار العلوم مئو سے تدریسی وابستگی

مدرسہ جامع العلوم مظفر پور اس وقت بہار کے ممتاز ترین مدارس میں شمار کیا جاتا تھا، جہاں اعلیٰ صلاحیت کے اساتذہ موجود تھے، پورے صوبہ سے طلبہ کا رجوع عام تھا، بلکہ بسا اوقات بیرون صوبہ کے طلبہ بھی یہاں آجاتے تھے، اس کی وجہ سے یہاں پڑھانے والے عام اساتذہ بھی پورے ملک میں مشہور ہو جاتے تھے، آپ تو خیر صدر المدرسین ہی تھے۔۔۔۔۔۔

---

[307] علاوہ ازیں مولانا خدا بخشؒ کی شخصیت تحریکی تھی وہ قائدانہ ذوق ومزاج رکھتے تھے چنانچہ وہ ملک کی ملی سیاست میں بھی سرگرم رہے اور جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس واستحکام میں بنیادی رول ادا کیا، وہ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں تھے، اس لئے ملازمت ان کے طبع آزاد کے خلاف تھی، انہوں نے اپنا الگ مدرسہ "فیض عام" کے نام سے قائم فرمایا، اور اس طرح کانپور کے جامع العلوم اور فیض عام دونوں مدرسے شہر مظفر پور میں جمع ہو گئے۔

[308] ڈائری یادداشت ماسٹر سید محمود حسنؒ۔۔۔ اس بیس (۲۰) سالہ عرصۂ تدریس کی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔۔۔۔

ماسٹر صاحب مرحوم کی ڈائری میں اجمالی طور پر ۱۹۲۳ء تک حضرت آہؒ کو جامع العلوم کا مدرس بتایا گیا ہے، لیکن میں نے جب جنت الانوار میں مولانا گڑھولویؒ کے مکتوب کی تاریخ اور دار العلوم مئو سے آپ کے تدریسی انتساب سے اس کا موازنہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ تاریخ کے نقل میں ماسٹر صاحب مرحوم سے سہو ہوا ہے۔

چنانچہ آپ کی علمی شخصیت اور تدریسی شہرت سے متاثر ہو کر دارالعلوم مئو کی طرف سے آپ کو تدریس حدیث کی پیشکش کی گئی اورآپ نے دارالعلوم مئو کی علمی اہمیت کے پیش نظر اس کی دعوت قبول فرمائی[309] اور مدرسہ جامع العلوم مظفرپور سے معذرت کر کے (غالباً) ۱۹۲۰ء میں بحیثیت مدرس اول (شیخ الحدیث) دارالعلوم مئو تشریف لے گئے آپ نے اپنی خدا داد صلاحیت سے مئو کی علمی فضا کو متاثر کیا، اورآپ کی علمی شہرت کا ارتعاش ایک مدت تک وہاں کی فضا میں محسوس کیا جاتا رہا[310]۔

---

[309]-دارالعلوم مئو کا قیام ۱۸۷۵ء میں ہوا، یہ ہندوستان کے قدیم ترین اور معیاری مدارس میں شمار کیا جاتا ہے، بہار سے قرب مکانی پائے جانے کی بنا پر بہار کے اساتذہ اور طلبہ کی خاصی تعداد یہاں رہتی ہے، گورنمنٹ سے منظور شدہ ہونے کے باوجود تعلیم وتربیت کے باب میں اس ادارہ نے اپنی قدیم اقدار وروایات کو پورے اعتباراور وقار کے ساتھ اب تک محفوظ رکھا ہے فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

[310]-دارالعلوم مئو میں مولانا عبدالشکور آہؒ کی تدریسی خدمات کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے، خود ہمارے خاندان میں بھی اس بات کی کسی کو خبر نہیں تھی، پہلی مرتبہ اس کا انکشاف والد ماجد (مولانا محفوظ الرحمن صاحب دامت برکاتہم) کے سامنے اس حقیر کے استاذ گرامی قدر حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ سابق صدرالمدرسین مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڑھ یوپی نے کیا، مولانا موصوف بڑے محقق اور صاحب نظر عالم دین تھے اور ان کی پورے ملک بالخصوص ان کے اپنے علاقے کے مدارس کی تاریخ پر گہری نگاہ تھی، مولانا موصوف نے فرمایا کہ میں نے دارالعلوم کے مشائخ حدیث کی فہرست میں مولانا عبدالشکور آہؒ مظفرپوری کا نام دیکھا ہے، یہ میری طالب علمی کے زمانے کی بات ہے، جب میں مدرسہ وصیۃ العلوم الہ باد میں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔۔۔۔

☆ایک عرصہ کے بعد میری ملاقات دارالعلوم مئو کے (سابق) شیخ الحدیث اور پرنسپل، معروف عالم دین اور صاحب قلم حضرت مولانا ڈاکٹر ظفرالاسلام صدیقی صاحب دامت برکاتہم سے ہوئی، میں نے ان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے اس کی تائید کی اور فرمایا کہ ہمارے یہاں پہلے کتب خانہ میں دارالعلوم کے تمام شیوخ الحدیث کی فہرست لگی ہوئی تھی، اس میں ان کا نام بھی ہے، بعد میں میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اس فہرست تک میری بھی رسائی ہو جائے، لیکن بدقسمتی سے نئی عمارت میں کتب خانہ منتقل ہو جانے کی بنا پر وہ فہرست حاصل نہ

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ملازمت

اسی زمانے میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ قائم ہوا تھا، آپ کی شہرت علمی سے متاثر ہوکر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے ذمہ داروں نے بھی آپ کو بحیثیت استاذ اعلیٰ تشریف لانے کی دعوت دی، اس وقت تک آپ دارالعلوم مئو سے وابستہ ہوچکے تھے۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا شمار بھی اس دور میں بہار کے ممتاز مدارس میں ہوتا تھا، جناب جسٹس نورالہدیٰ صاحب[311] نے اپنے والد مرحوم میر شمس الہدیٰ صاحب[312] کے نام پر

ہو سکی، لیکن میرا احساس ہے کہ ان دو معتبر شہادتوں کے بعد اس بات کی صداقت کے لئے میرے جیسے گناہ گار کے دیکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی۔

311۔ جسٹس سید نورالہدیٰ صاحب میر شمس الہدیٰ صاحب رئیس پٹنہ سیٹی کے بڑے صاحبزادے ہیں، یکم ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۵۴ء کو پٹنہ سیٹی کے قدیم محلہ لودی کٹرہ میں آپ کی ولادت ہوئی، میر شمس الہدیٰ صاحب کی دو شادیاں تھیں، آپ پہلے محل سے تھے، ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی، عربی و فارسی کی کتابیں اپنے وقت کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد کمال صاحبؒ سے پڑھیں، مروجہ ضروری دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد عصری تعلیم کے لئے جارج ایم ای اسکول پٹنہ سیٹی میں داخل کئے گئے، وہاں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے، اس کے بعد پٹنہ کالجیٹ اسکول کے انٹرنس کلاس میں داخل ہوئے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد کلکتہ پریسیڈنسی کالج سے گریجویشن کیا اور امتیازی نمبرات سے پاس ہوئے، ـــ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن تشریف لے گئے، والد صاحب نے لندن جانے سے قبل شادی کرادی تھی، ۱۸۷۵ء میں لندن کے کیمبرج یونیورسیٹی کے ڈی وی ایس جان کالج میں داخلہ لیا، مسلسل پانچ برس وہاں زیر تعلیم رہے، اور بیرسٹر بن کر نکلے، اس کے بعد وہیں سے ایل، ایل بی کی بھی ڈگری حاصل کی، خدا بخش خان بانی خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری پٹنہ کے بھائی جناب ابوالحسن صاحب لندن میں آپ کے ساتھی تھے،

لندن سے واپسی پر کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی، اس وقت پٹنہ میں ہائی کورٹ نہیں تھا، اس دوران آپ کے جوہر بحیثیت ایک قانون داں کے پوری چمک دمک کے ساتھ منظر عام پر آئے، آپ کی صلاحیت سے متاثر ہوکر حکومت برطانیہ نے آپ کو منصف کے عہدہ پر بحال کردیا، اس طرح ترقی کی منزل طے کرتے ہوئے آپ کلکتہ ہائی کورٹ کے ۱۹۰۷ء کے جج مقرر کئے گئے، آپ کے فیصلے تمام حقائق و انصاف کی رو سے اول نمبر پر رہے، جس کا اعتراف انگریزی

سرکار نے بھی کیا، حکومت برطانیہ نے آپ کو مختلف اعزازات سے نوازا، جس میں سی آئی ای اور او بی ای بی ہے، اس کے علاوہ آپ کو انڈین اسٹیٹری سول سروسز کے اعزازی عہدہ پر بھی فائز کیا۔

۱۹۱۶ء میں جب پٹنہ ہائی کورٹ قائم ہوا تو آپ کا تبادلہ بحیثیت جج پٹنہ ہائی کورٹ کر دیا گیا، اسی اثنا وہ حضرت امیر شریعت مولانا شاہ بدرالدین صاحبؒ سے بیعت ہوئے، ۱۹۱۲ء میں شیخ کے ایما پر مدرسہ اسلامیہ قائم کیا، اس کے بعد آہستہ آہستہ آپ سرکاری ملازمت سے تنگدل ہونے لگے اور بالآخر وقت سے قبل ریٹائرمنٹ لے لی۔

جج صاحب کی غیرت ایمانی قابل رشک تھی، وہ اپنے مدرسہ کو اپنا دینی سرمایہ تصور کرتے تھے، اور اس کے مفادات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جس زمانہ میں سائنس کالج کی تعمیر کی بات چل رہی تھی، وی، ایچ جیکسن کالج کا پرنسپل تھا، ایک دن اس نے جج صاحب سے کہا کہ مدرسہ کی سینئر سیکشن والی زمین آپ ہمیں دے دیں، وہاں سائنس کالج کے کیمسٹری ڈپارٹ کی عمارت بنائیں گے، جس کے عوض پھلواری شریف میں پانچ ایکڑ زمین دی جائے گی، جج صاحب نے برجستہ انکار کر دیا۔۔۔۔۔ پھر بہار کے گورنر سر ہینری وھیلر نے جسٹس نورالہدیٰ کو اپنے یہاں دن کے کھانے پر مدعو کیا، اور اسی بات کو دہرایا، اور یہ بھی کہا کہ اس کے عوض انگریز سرکار آپ کو "سر" کے خطاب سے نوازے گی، جو اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لئے بڑا اعزاز تھا، جج صاحب نے صاف انکار کر دیا اور یہ رویہ ان کو اتنا برا لگا کہ اس کے بعد سے گورنر ہاؤس جانا بالکلیہ ترک کر دیا۔

مدرسہ اسلامیہ کے علاوہ مدرسہ کے احاطے میں مسجد نوری کی تعمیر بھی آپ کا شاندار کارنامہ ہے، اس مسجد کی سنگ بنیاد حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب نے رکھی، جج صاحب نے کھڑے ہو کر یہ پوری مسجد تعمیر کرائی۔

۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء میں حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔۔۔۔۔ ۵ / ربیع الاول ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو انتقال پر ملال ہوا، اور اپنی بنوائی ہوئی نوری مسجد کے جوار میں مدفون ہوئے۔۔۔۔۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی، فرحمہ اللہ (رسالہ الشمس صد سالہ اشاعت ص ۵۳ تا ۵۶ مضمون پروفیسر سید عزیز احمد سابق پرنسپل اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی پٹنہ، شائع کردہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ نومبر ۲۰۱۲ء)

[312]- میر شمس الہدیٰ صاحب اپنے زمانہ کے بڑے رئیسوں اور زمینداروں میں شمار ہوتے تھے ان کی سالانہ آمدنی اس زمانے میں تیس (۳۰) ہزار روپے ہوا کرتی تھی، میر صاحب نے لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی میں ایک وسیع زمین پر اپنا رہائشی ایک منزلہ مکان تعمیر کرایا جس کا نام "فردوس" رکھا، یہ دینی شعور اور دینی وضع کے حامل ایک خدا ترس انسان تھے، ان کی سالانہ آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ غریبوں اور مسکینوں پر خرچ ہوتا تھا، ان کو عصری تعلیم سے خاص لگاؤ تھا، جس کے نتیجہ میں پٹنہ سیٹی میں انہوں نے جارج ایم ای اسکول قائم کیا (رسالہ الشمس صد سالہ اشاعت ص ۵۳ مضمون پروفیسر سید عزیز احمد سابق پرنسپل اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی پٹنہ، شائع کردہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ نومبر ۲۰۱۲ء)

اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی[313] کے مشورہ سے بتاریخ یکم نومبر ۱۹۱۲ء مطابق ۱۳۳۲ھ اس ادارہ کو قائم کیا، جسٹس نورالہدیٰ صاحب ایک عصری تعلیم یافتہ اور حکومت ہند کے بلند ترین عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود دینی وملی دردمندی وفکرمندی میں ممتاز تھے، وہ ایک پر عزم انسان تھے، جذبہ کی قوت کے ساتھ وہ جہد مسلسل کے قائل تھے، فرماتے تھے:

"انسانی زندگی نام ہے سعی وعمل کا، جدوجہد کا، حق وباطل میں امتیاز کا، انسانی ہمدردی کا اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا۔۔۔۔۔۔۔

313۔حضرت فیاض المسلمین مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری صاحبؒ کی ولادت ۲۷/جمادی الثانیہ یک شنبہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸/اپریل ۱۸۵۲ء کو ہوئی، درسی کتابیں اپنے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین اور مولانا شاہ محمد علی حبیب نصرؒ سے پڑھیں، ۱۰/ربیع الاول ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۳/جولائی ۱۸۶۶ء کو حضرت حبیب نصر کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، ۲۳/ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۲/جنوری ۱۸۷۴ء کو جملہ سلاسل مجیبیہ وجنیدیہ کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔

حصن حصین ودیگر کتب حدیث کی سند مولانا آل احمد محدث مہاجر مدنیؒ سے حاصل کی، حزب البحر کی اجازت حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے ملی۔۔۔۔۔ حضرت حبیب نصر کے خلفاء میں آپ سب سے ممتاز ہوئے، اور آپ کے بے پناہ فیوض چاردانگ عالم میں ظاہر ہوئے، آپ کے زمانے میں خانقاہ بقعۂ نور معلوم ہوتی تھی، آپ نے قرآن اور علوم احسان کی تدریس کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا، سالہاسال تک مکتوبات صدی کا درس دیا، آپ کے علم وکمال کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۵ء میں شمس العلماء کا خطاب اور خلعت وتمغہ پیش کیا، آپ لینے پر راضی نہیں ہوئے، مگر اصرار پر رکھ لیا اور پھر واپس کردیا۔۔۔۔ آپ نے تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں پرجوش حصہ لیا، بہار میں ان تحریکوں کو آپ کی سرپرستی حاصل تھی، اس غرض سے ایک جلسہ ۱۹/شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۶/جون ۱۹۲۱ء کو پتھر کی مسجد میں منعقد ہوا اور باتفاق رائے تمام علماء کرام نے آپ کو امیر شریعت منتخب فرمایا اور کل حاضرین نے سمع وطاعت کی بیعت کی۔

حضرت کی شخصیت مرجع خلائق تھی، کامل ۳۳/سال سریر آرائے سجادہ رہنے کے بعد ۷۵/سال کی عمر میں شب سہ شنبہ ۱۶/صفر المظفر ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۶/ستمبر ۱۹۲۴ء میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور مقبرۂ مجیبیہ میں اپنے پیر و مرشد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

(اعیان وطن مرتبہ حضرت حکیم شعیب نیرؔ صاحب ص ۶۸)

اگر انسانی زندگی صرف روپیہ پیدا کرنے اور کھانے کا نام ہے تو میں ایسی زندگی سے موت کو ترجیح دیتا ہوں[314]۔

جن دنوں اس ادارہ کی تاسیس عمل میں آئی، ان کا قیام بسلسلۂ ملازمت "پٹنہ بنگال میں تھا اس لئے اپنے معتمد مولوی فصیح احمد صاحب مختار محلہ دریاپور اور سر فخر الدین صاحب وزیر تعلیمات ریاست بہار واڑیسہ کو مدرسہ کی نگرانی کے لئے مقرر کیا۔۔۔

مدرسہ ابتدا میں کئی سالوں تک جج صاحب کی کوٹھی ہی میں چلتا رہا، طلبہ کا قیام کوٹھی سے شمالی جانب سڑک کے کنارے پھاٹک سے متصل بنگلہ میں تھا، پھر مدرسہ کی مستقل آمدنی کے لئے جج صاحب نے مصلح پور (بانکی پور) پٹنہ میں ایک بہت بڑی جائداد بتاریخ ۲۵/ جنوری ۱۹۱۲ء مدرسہ کے لئے وقف کی، وقف نامہ کا مضمون یہ تھا:

"من کہ سید نور الہدیٰ ولد مولوی سید شمس الہدیٰ مرحوم ساکن حال مقیم مصلح پور من محلات پٹنہ کا ہوں، چونکہ من مقر کو عرصہ سے خیال تھا کہ پٹنہ یا بانکی پور میں ایک تعلیم گاہ عربی وغیرہ کے لئے قائم کریں اس لئے من مقر نے چند جائیداد کو اپنی وقف کر دیا اور قطعہ وثیقہ وقف نامہ مورخہ ۲۵/ جنوری ۱۹۱۲ء باندراج شرائط متعلق مدرسہ و تقرری متولی وغیرہ کہ تحریر و تعمیل کرادیا اور مکان مدرسہ بھی بنوادیا[315]۔

مدرسہ کا شاندار آغاز ہوا، یہ آغاز اس کے روشن مستقبل کی ضمانت تھا، اس وقت مدرسہ کی جو صورت تھی اس کا تذکرہ "سفر نامۂ مظہری" کے حوالے سے مولانا مفتی محمد ثناء

314۔بہار مدرسہ بورڈ - تاریخ و تجزیہ باب دوم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ص ۶۷ مرتبہ جناب مولانا مفتی ثناء الہدیٰ صاحب قاسمی مدظلہ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ بحوالہ "نور ہدیٰ" از ابو محفوظ کریم نطق۔

315۔حوالہ بالا ص ۷۰ بحوالہ نور ہدیٰ ص ۳۵ - ۳۶۔

الہدیٰ قاسمی صاحب نے اس طرح نقل کیا ہے:

"مدرسہ اور دارالاقامہ کی عمارتیں بن گئی ہیں، مسجد بننے والی ہے، دوسو (۲۰۰) کے قریب طلبہ مدرسہ میں رہتے ہیں، چالیس بورڈر ہیں، باقی ڈے اسکالرز، بورڈروں کو کھانا دارالاقامہ سے ملتا ہے، مدرس گیارہ ہیں، حساب بھی سکھایا جاتا ہے،۔۔۔۔ مصارف مدرسہ کے لئے پندرہ ہزار روپے سالانہ کی جائیداد وقف کر دی ہے"[316]۔

دراصل وہ اس مدرسہ کے ذریعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طرز کی ایک بڑی عربی اسلامی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے تمام قدیم وجدید وسائل کو بروئے کار لانا چاہتے تھے[317]، چنانچہ ان کو ابتدا میں بڑی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، پڑھنے والے طلبہ کا بھی کافی رجوع ہوا اور بہتر رجال کار بھی میسر آئے، ابتدا ہی میں تین قابل ترین اساتذہ کی خدمات ادارہ کو حاصل ہو گئیں:

۱-حضرت مولانا محمد شریف صاحب اعظم گڑھی۔

۲-علامہ ظفر الدین قادری بہاری[318]۔

316-حوالہ بالا ص ۲۷ بحوالہ سفر نامہ مظہری ص ۱۳۷۔

317-جناب سید نور الوارث صاحب متولی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ تحریر فرماتے ہیں:

"اپنی زندگی میں سینئر اور جونیر دونوں مدارس کی تکمیل کے بعد جج صاحب مرحوم اسے ایک وسیع پیمانہ پر دارالعلوم بنانا چاہتے تھے مگر زندگی نے وفا نہیں کی اور ان کا پلان ادھورا رہ گیا مگر دوسری شکل میں مدرسہ بورڈ اور عربی فارسی یونیورسیٹی وجود میں آئی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، جج صاحب کے اس خواب کو پورا کرنا ہی شاید ان کے لئے سب سے بڑا اخراج عقیدت ہوگا" (رسالہ الشمس ص ۱۸ نومبر ۲۰۱۲ء)

318-ملک العلماء علامہ ظفر الدین قادری بہاری ملک کے ممتاز علماء میں گذرے ہیں، آپ رسول پور میجرہ ضلع پٹنہ (اب ضلع نالندہ) بہار میں ۱۴/ محرم الحرام ۱۳۰۳ھ مطابق ۲۳/ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے، والد ماجد کا نام"

۳-حضرت مولانا مشتاق احمد کانپوری خلف الرشید حضرت مولانا احمد حسن کانپوری[319]

یہ تینوں حضرات اپنے ساتھ درجات علیا اور وسطیٰ کے نو نو (۹) طلبہ لے کر آئے ،نصاب تعلیم درس نظامیہ والا مقرر کیا گیا۔۔۔۔

منشی محمد عبد الرزاق" تھا، آپ کے مورث اعلی سید ابراہیم بن سید ابو بکر غزنوی ملقب بہ مدار الملک ہیں، ان کا نسب ساتویں پشت میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے ملتا ہے،۔۔۔۔۔۔۔

چار سال کی عمر میں حضرت چاند شاہؒ کے مبارک ہاتھوں کے ذریعہ رسم بسم اللہ انجام پائی، ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی ،شوال المکرم ۱۳۱۳ھ مطابق مارچ ۱۸۹۶ء میں مدرسہ حنفیہ غوثیہ موضع بین ضلع پٹنہ میں داخل ہوئے، ابتدائی فارسی کتب حافظ مخدوم اشرف، مولانا کبیر الدین اور مولانا عبد اللطیف سے پڑھیں، متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا قاضی عبد الوحید فردوسی مرحوم رئیس لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی کے قائم کردہ مدرسہ دار العلوم حنفیہ میں داخل ہوئے، مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی سے "مسند امام اعظم "مشکوۃ شریف اور ملا جلال پڑھی، یہاں ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء تک رہے، پھر منڈی کانپور میں مولانا قاضی عبد الرزاقؒ، مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور مولانا شاہ عبید اللہ پنجابی کانپوریؒ سے تعلیم حاصل کی، تکمیل بریلی میں مولانا حکیم محمد امیر اللہ شاہ بریلوی، مولانا حامد حسن رامپوری، مولانا سید بشیر احمد علی گڑھی، اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کے پاس ہوئی،۔۔۔۔

محرم الحرام ۱۳۲۱ھ میں مولانا احمد رضا خان صاحب سے بیعت ہوئے اور ان کے خلیفہ قرار پائے۔۔۔۔

علم تقویم وتوقیت میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، اور یہ چیز انہوں نے مولانا احمد رضا خان صاحب سے حاصل کی تھی۔

فراغت کے بعد مختلف مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں خانقاہ کبیریہ سہسرام سے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ آئے، فقہ، حدیث اور ہیئت میں ان کا درس مشہور تھا، ۱۶/ مئی ۱۹۳۸ء سے ۱۸/ مئی ۱۹۴۸ء تک، پھر ۱۶/ جولائی ۱۹۴۸ء سے ۲۲/ نومبر ۱۹۴۹ء تک انچارج پرنسپل رہے، ۱۹/ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو ایک طویل مدت تک علمی خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے، آپ کی کئی اہم تصنیفات ہیں، ان میں الصحیح البہاری، اور مؤذن الاوقات بہت مشہور ومعروف ہیں۔

وفات شب دوشنبہ ۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۸/ نومبر ۱۹۶۲ء کو ذکر بالجہر کرتے ہوئے ہوئی، آپ کا مزار شاہ گنج قبرستان میں شمالی گیٹ کے قریب ہے (رسالہ الشمس پٹنہ اشاعت صد سالہ ص ۳۵ وضیاء طیبہ ڈاٹ کام)

[319]-آپ کا تذکرہ پیچھے حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے حالات میں گذر چکا ہے۔

بعد میں طلبہ کی تعداد بڑھی، تو اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا، ان میں مولانا سید اقبال حسین صاحبؒ، مولانا حافظ سید عبد الرشیدؒ، مولوی حافظ نذیر احمد جہان آبادیؒ، مولوی سید ظہور احمدؒ، مولانا محمد شریف صاحبؒ، مولوی عبد الرحمن صاحب اور انگلش کے استاذ ماسٹر محمد شعیب صاحبؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۔۔۔۔۔

۱۹۱۵ء میں مولانا محمد شریف صاحب مدرسہ مظہر العلوم کچی باغ بنارس چلے گئے تو ان کی جگہ پر مولانا مقبول احمد در بھنگویؒ استاذ حدیث کی حیثیت سے تشریف لائے [320]، انگریزی حکومت نے بھی اپنے اعتماد واعتبار کا اظہار کرتے ہوئے اس کو اپنی منظوری سے سر فراز کیا [321]، اس کی وجہ سے اس کی اہمیت میں کافی اضافہ ہو گیا، اسی لئے اکثر وہ طلبہ جو صلاحیت کے ساتھ سرکاری اسناد کے بھی خواہشمند ہوتے تھے وہ براہ راست اسی مدرسہ میں داخلہ لینے کو ترجیح دیتے تھے [322]۔

320-بہار مدرسہ بورڈ-تاریخ وتجزیہ باب دوم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ص ۶۸ مرتبہ جناب مولانا مفتی ثناء الہدیٰ صاحب قاسمی مدظلہ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

321-اس کی صورت بظاہر اس طرح بنی کہ جج صاحب کو ہمیشہ مدرسہ کے مستقبل کی فکر رہتی تھی، اس کا ذکر ایک دن سر فخر الدین وزیر تعلیمات کے سامنے آگیا، انہوں نے مدرسہ کو سرکار کی ماتحتی میں دینے کا مشورہ دیا اور اس سلسلے میں حکومت سے گفت وشنید کا بھی یقین دلایا، چنانچہ جج صاحب نے تعلیم قرآن، حدیث وفقہ کی شرط کے ساتھ ۱۹۱۹ء کے اواخر میں مدرسہ کو مع جائیداد موقوفہ حکومت کے سپرد کر دیا، اور یکم جنوری ۱۹۲۰ء سے حکومت نے اس مدرسہ کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ (بہار مدرسہ بورڈ-تاریخ وتجزیہ باب دوم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ص ۶۷ بحوالہ "نور ہدیٰ" ص ۳۷)

322-یہ حکومت سے امداد لینے والے مدرسوں کا ابتدائی دور تھا، اس وقت تک اس کی قباحت اور برے نتائج سامنے نہیں آئے تھے، اور نہ سرکاری ملازمین میں دیانت وامانت کا بحران آیا تھا، بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ اس طرح کے تمام مدارس جنھوں نے حکومت کی امداد پر بھروسہ کیا، ان کو حکومت کے آستانے پر سجدہ ریز ہونا پڑا، ان کی اعتباریت مجروح ہوئی، اور رفتہ رفتہ وہ اپنی موت آپ مر گئے، وہاں دین پر دنیا نے، دیانت پر خیانت نے، قناعت پر ہوس نے اور سادگی پر مکر

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی مرکزی عمارت "شیش محل" جس کی تعمیر خود جج صاحب نے کرائی تھی

وفریب نے غلبہ پایا، ان کی دینی وعلمی روح ختم ہوگئی اور غیر مسلم حکومت کے خبیث سرمایے نے ملت کے ان عظیم اثاثوں کوغارت کردیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، بقول شاعر

اے طائرلاہوتی اس رزق سے موت اچھی ☆ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی خوشنما عمارت جس میں درسگاہیں، پرنسپل چیمبر، اسٹاف روم، وغیرہ

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا پارک

نوری مسجد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ

نوری مسجد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا اندرون حصہ

سرکاری مدرسہ بن جانے کے بعد مزید قابل اور مستند علماء واساتذہ کی تلاش شروع ہوئی، چنانچہ اس کے پہلے پرنسپل حضرت مولانا مفتی محمد سہول عثمانی بھاگلپوریؒ سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند بنائے گئے پہلے سے کل نو(۹) مدرسین تھے، سرکاری تحویل میں جانے کے بعد پرنسپل اور کلرک کے علاوہ ۲۱/جولائی ۱۹۲۰ء تک مزید سات (۷) مدرسین بحال کئے گئے، خان بہادر محمد مصطفیٰ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسکولز کو عارضی طور پر مدرسہ کے انتظام وانصرام کا "افسر خاص" متعین کیا گیا[323]۔

غالباً یہی وہ دورانیہ ہے جس میں حضرت مولانا عبدالشکورؒ کو بھی سرکاری ملازمت کی پیشکش کی گئی۔۔۔۔۔اس وقت مدرسہ ایک خوش آئند مستقبل کی طرف بڑھ رہا تھا، اور گو کہ اس کے قیام کو ابھی آٹھ نو سال کا ہی عرصہ گذرا تھا، لیکن ذمہ داروں کی مستعدی اور فکر مندی کی بدولت وہاں اعلیٰ صلاحیت کے افراد جمع ہو گئے تھے، ملک کے مختلف حصوں سے ممتاز علماء کو جمع کر کے شمس الہدیٰ کو ایک کہکشاں بنانے کی تیاری جاری تھی، جس کا اکثر حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا تھا۔۔۔۔

جس وقت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو یہ دعوت ملی وہ ایک قدیم، تاریخی اور مستند ادارہ "دارالعلوم مئو" سے وابستہ تھے، اورانہوں نے اپنی صلاحیت اور منفرد طریقۂ تعلیم وتربیت سے انتظامیہ اور طلبہ دونوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا، ظاہر ہے ایسے باکمال استاذ کو آسانی کے ساتھ اہل مدرسہ کہاں چھوڑ سکتے تھے، اس پیشکش پر مولانا بھی شش وپنج میں پڑ گئے۔

ایک طرف وطن اور اہل وطن کی محبت اور تقاضے نیز سرکاری ملازمت کے نقطۂ نظر سے بہتر مستقبل کا تصور، دوسری جانب موجودہ تعلیمی سلسلے کا توقف اور مدرسہ سے فراق کا کرب

---

[323] -بہار مدرسہ بورڈ- تاریخ وتجزیہ باب دوم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ص ۲۷ بحوالہ "نور ہدیٰ" ص ۳۸۔

ظاہر ہے کہ انسان ایسے موقعہ پر اللہ پاک سے استخارہ بھی کرتا ہے اور اپنے خاص لوگوں سے مشورہ بھی لیتاہے، جنت الانوار کے ایک مکتوب سے پتہ چلتاہے کہ مولانا نے حضرت گڑھولویؒ کو بھی مشورہ کے لئے خط لکھا تھا، حضرت گڑھولویؒ نے جناب اختر صاحب کے ذریعہ اپنی رائے اثبات میں بھجوادی تھی، لیکن شاید ان کا یہ جواب مولانا تک بروقت نہیں پہونچ سکا، اور انہوں نے دیگر اہل تعلق اور اصحاب دانش کی رائے کے مطابق مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ملازمت اختیار فرمالی، یہ اکتوبر ۱۹۲۲ء کی بات ہے، حضرت گڑھولویؒ کو اس ملازمت کی خبر ملی تو اظہار مسرت کے طور پر یہ خط تحریر فرمایا:

"بانکی پور[324] کی ملازمت کی نسبت تو میں نے آپ کو حتمی مشورہ دے دیا تھا، جیسا کہ عزیزی اختر سے آپ کو معلوم ہی ہوا ہوگا، یہاں پہونچ کر مجھ کو آپ کی ملازمت کی خبر معلوم ہوئی، تو مجھ کو بے حد خوشی ہوئی، خداوند تعالیٰ آپ کو وہاں استقامت واطمینان تام نصیب فرمائے۔۔۔۔ مجھ کو ہر حال میں دعاگو و متوجہ سامی تصور فرماتے رہیں، اپنی حالت و خیریت سے کبھی کبھی ضرور مطلع فرماتے رہیں" (محمد بشارت کریم کان اللہ لہ ــ مورخہ ۲۸/صفر ــ مہر ڈاک ۲۳/اکتوبر ۱۹۲۲ء)[325]۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے ساتھ آپ کی تدریسی وابستگی مسلسل تیئیس (۲۳) سال (۱۹۴۵ء) تک رہی[326]۔۔۔۔۔

324-مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ توخاص "محلہ مصلح پور" میں واقع ہے، لیکن یہ پورا علاقہ "بانکی پور" کہلاتا ہے۔

325-جنت الانوار مکتوب ۲۶ ص ۲۳۳۔

326-ڈائری یادداشت ماسٹر سید محمود حسنؒ۔

درمیان میں سات آٹھ سال کے بعد ۱۹۳۰ء میں بعض ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے مدرسہ کی ملازمت سے مستعفی ہوجانے کا ارادہ فرمالیا، لیکن اپنے مخلصین بالخصوص حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ کے مشورے سے انہوں نے اس ارادے کو عملی شکل نہیں دی اور وہ مدرسہ کی ملازمت پر بدستور قائم رہے، جنت الانوار کے مکتوب نمبر ۳۸ میں اس کا ذکر ہے:

> "ترک ملازمت کا خیال خلاف مصلحت ہے، بوجہ عدم مساعدت وقت بیان تفصیل سے معذور ہوں، ممکن ہے پھر کسی موقعہ پر اس کی تفصیل کی نوبت آجائے، کبھی کبھی اپنی خیریت وحالت سے ضرور مطلع فرماتے رہیں"۔(لاشی محمد بشارت کریم عفی عنہ، ۷/ صفر-جمعہ مہر ڈاکخانہ ۶/ جولائی ۱۹۳۰ء) [327]۔

حضرت آہ کا علمی مقام

مدرسہ جامع العلوم مظفرپور میں آپ کا قیام تعمیر شخصیت کا زمانہ ہے تو دارالعلوم مئواور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا قیام آپ کی شہرت وعظمت کے نقطۂ عروج کا دور ہے، خاص طور پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے ایام کو آپ کی زندگی کا عہد زریں قرار دیا جاسکتا ہے، آخری دور میں یہ نسبت آپ کی شخصیت کی شناخت بن گئی تھی، آپ کے کمالات علمیہ اور مردم ساز شخصیت کا اصل ظہور اسی دور میں ہوا، آپ کے علم وتحقیق اور فکروفن کے شاندار مظاہرے ہوئے، بڑے بڑے جبال العلم نے آپ کی علمی تحقیقات سے استفادے کئے، زبان وادب اور شعروشاعری کے بھی خوبصورت نمونے ملک کے رسائل وجرائد کی زینت بنے، رجال کار

327-جنت الانوار مکتوب ۳۸ص ۲۴۳۔

تیار کئے، آپ کے تیار کردہ طلبہ نے پورے ملک میں اپنی صلاحیت کی دھوم مچادی۔۔۔۔۔

ایک مردم ساز شخصیت

کہتے ہیں کہ اس دور میں کسی طالب علم کا آپ کے ساتھ درسی انتساب ہی فقط اس کے باصلاحیت ہونے کے لئے کافی مانا جاتا تھا:

حضرت مولانا منظور احمد قاسمی صاحب

اس کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو محترم جناب مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی صاحب نے[328] مجھ سے بیان فرمایا کہ جب میں دارالعلوم دیوبند داخلہ کے لئے جانے لگا تو اپنے رشتے کے

---

[328]-مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی مقام بھتورہ بلاک بسفی ضلع مدھوبنی بہار کے رہنے والے ہیں، والد ماجد کا نام محمد سلیمان مرحوم ہے، ولادت ۹ / دسمبر ۱۹۵۷ء م ۱۶ / جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں داخل کئے گئے، ۱۹۷۷ء م ۱۳۹۷ھ میں وہاں سے سند فضیلت حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اور ۱۹۸۰ء م ۱۴۰۰ھ میں فاضل دیوبند ہوئے، انتہائی ذہین عالم دین ہیں، ایک زمانہ ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانتا ہے، کتابوں بالخصوص مراجع پر گہری نگاہ ہے، زبان میں فصاحت وبلاغت ہے، بولنا اور لکھنا دونوں فن ان کو آتا ہے، کئی بڑے مدرسوں میں استاذ درجۂ علیا کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اپنے گہرے نقوش ثبت کئے، جن میں مدرسہ بشارت العلوم کھرایاں پتھرا ضلع دربھنگہ، مدرسہ حسینیہ رانچی، دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، جامعہ ربانی منوروا شریف، اور دارالعلوم باسکنڈی آسام قابل ذکر ہیں۔

بزرگوں اور مشائخ سے ہمیشہ وابستہ رہے، اصلاحی تعلق حضرت مولانا عتیق الرحمن احمد قاسمی چندرسین پوری (ولادت ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ م ۲۵ / جولائی ۱۹۳۵ء بروز جمعرات - وفات ۹ / ربیع الاول ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۱ / اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز جمعہ بوقت نماز مغرب) سابق مہتمم مدرسہ بشارت العلوم کھرایاں دربھنگہ بہار سے قائم کیا، ان کے وصال کے بعد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سابق مفتی اعظم دالاارالعلوم دیوبند کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مفتی صاحب کے وصال کے بعد اب میرے والد ماجد حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب قادری نقشبندی دامت برکاتہم العالیہ سے وابستگی رکھتے ہیں، اللہ پاک ان کے علم وعمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے اور قبول فرمائے آمین۔

پھوپھا حضرت مولانا منظور احمد قاسمیؒ (مقام پروہی ضلع مدھوبنی بہار) جو حضرت مولانا عبد الشکور آہؒ کے تلمیذ رشید تھے) کی خدمت میں رہنمائی کی غرض سے حاضر ہوا اس موقعہ پر انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے داخلے کا قصہ اس طرح بیان فرمایا کہ:

"جب وہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا نصاب مکمل کر کے دارالعلوم دیوبند داخلہ کے لئے پہونچے، تو حضرت ممتحن صاحب (جو دارالعلوم کے کوئی بڑے استاذ تھے) نے مشکوٰۃ شریف کے امتحان میں مسئلہ " قرأت خلف الامام " کے تعلق سے کچھ سوالات کئے، اسی ضمن میں ممتحن صاحب نے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص ایک دن قرأت کرے، اور دوسرے دن ترک قرأت کر لے تاکہ دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے، تو کیا یہ درست ہو گا؟۔۔۔۔۔ مولانا منظور احمد (طالب علم) نے عرض کیا کہ چاروں اماموں میں سے تو یہ کسی کا مسلک نہیں ہے، البتہ اگر آپ پانچویں امام بن جائیں تو یہ آپ کی رائے ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ اس بے تکلف حاضر جوابی پر ممتحن صاحب نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے پڑھ کر آئے ہو؟ مولانا منظور صاحب نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ اور اپنے استاذ حضرت مولانا عبد الشکورؒ کا نام لیا تو ممتحن صاحب نے فرمایا کہ پہلے ہی کیوں نہیں بتایا؟ امتحان ہی کی ضرورت نہیں تھی، اس کے بعد ان سے کوئی سوال نہیں کیا گیا[329]۔

---

[329]۔ حضرت مولانا منظور احمد قاسمی (مقام پروہی، ضلع مدھوبنی بہار) بہار کے ممتاز علماء میں تھے، اور ایک بڑے علاقے کو ان سے فیض پہونچا، آپ کے والد ماجد کا نام عبد الغفار تھا، نسباً شیخ صدیقی اور معزز اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، آپ کی ولادت تقریباً ۱۹۰۰ء میں ہوئی، آپ دو بھائی تھے اور دو بہنیں بھی تھیں، بڑے بھائی کا نام محمد مہدی حسن تھا وہ تعلیم یافتہ اور باشعور تھے، در بھنگہ راج میں منشی کے عہدہ پر فائز تھے، اور گھوڑے پر شاہانہ سوار ہو کر در بھنگہ کے لئے گھر سے نکلتے تھے، ان کے بالمقابل آپ (یعنی حضرت مولانا منظور احمد) ابتداء میں بظاہر لا ابالی اور کھلاڑی قسم کے لڑکے تھے، پڑھنے لکھنے کی طرف کوئی رجحان نہیں تھا، گاؤں کی ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے پڑھائی چھوڑ کر گھر کی کھیتی باڑی سنبھال لی، اس طرح گھر کے دیگر کاموں کی طرح بڑے بھائی شیخ مہدی حسن کے گھوڑے کا چارہ لانا بھی ان کی ذمہ داری تھی، والد صاحب کو یہ

چیز پسند نہیں تھی، وہ چاہتے تھے کہ منظور احمد بھی تعلیم یافتہ ہو جائیں تاکہ دونوں بھائی باعزت زندگی گذار سکیں، انہوں نے بیٹے کو بارہا سمجھایا مگر بیٹے نے اس کی پرواہ نہیں کی، اور عمر کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، آخر عاجز آکر والد کی صاحب کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ اگر تو نہیں پڑھے گا تو ساری زندگی مہدی حسن کی نوکری کرے گا؟۔۔۔۔۔ یہ جملہ غیرت مند بیٹے پر بجلی بن کر گرا، اچانک طبیعت کا رخ تبدیل ہوا، اور تقریباً ۱۶، ۱۷ سال کی عمر میں (جو عام طور پر تعلیم کی تکمیل کی عمر ہوتی ہے) بغیر کسی اطلاع کے خاموشی کے ساتھ ماں کے بٹوہ سے چھ (۶) روپے لے کر نکل گئے، کنتول اسٹیشن پہونچے، اندازہ تھا کہ گھر والے تعاقب کریں گے اور پکڑنے کی کوشش کریں گے، ان سے بچنے کے لئے ایک درخت پر چڑھ گئے، گھر سے چار ملازم تلاش میں بھیجے گئے، انہوں نے کنتول اسٹیشن کا چپہ چپہ چھان مارا، مگر مولانا نہیں ملے، جب وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے، تو مولانا درخت سے نیچے اترے، اور ٹرین کے راستے سے آرہ چلے گئے، آرہ کی جامع مسجد میں نماز پڑھ کر یہ سوچتے ہوئے باہر نکلے کہ اب کہاں جائیں؟ کہ ایک سفید پوش شخص نظر آئے انہوں نے بڑی شفقت سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ عرض کیا میں پڑھنا چاہتا ہوں، سفید پوش بزرگ نے جیب سے کاغذ نکالا اور ایک سفارشی پرچہ لکھ کر دیا اور فرمایا کہ مدرسہ امداد الغرباء چلے جاؤ اور وہاں کے ناظم صاحب کو یہ پرچی دے دینا۔۔۔۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، ناظم صاحب نے پرچی دیکھتے ہی داخلہ فرمالیا، اور تعلیم شروع ہو گئی، کھانے کا مسئلہ ایک مقامی طالب علم کو پڑھانے کے ذریعہ حل ہو گیا، اس کے گھر سے کھانا آتا تھا، داخلہ اور کھانا کے مراحل مکمل ہو گئے تو گھر والوں کو خط کے ذریعہ اس کی اطلاع دی، اور خط میں طالبعلمانہ دو شعر تحریر فرمائے:

نہ جائے گی برباد محنت ہماری ☆ بڑھائے گی ایک دن عزت ہماری

پائے مرا لنگ نیست
ملک خدا تنگ نیست

خط ملتے ہی والد صاحب تشریف لائے، اور ناراض بیٹے کو منانے کی کوشش کی اور گھر واپس چلنے کے لئے بھی کہا، لیکن مولانا آمادہ نہیں ہوئے، وہیں کچھ طلبہ کو پڑھا کر اپنی ضرورت کے بقدر خرچ نکال لیتے تھے، اس طرح گھر سے استغناء کا معاملہ رکھا۔۔۔ کچھ عرصہ کے بعد کلکتہ تشریف لے گئے اور (غالباً) مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے، وہاں دوران تعلیم ایک استاذ نے کہا کہ "جس کو دنیا حاصل کرنا ہو یہاں پڑھے اور جس کو دین حاصل کرنا ہو، دیوبند چلا جائے، یہی وہ زمانہ تھا جب پٹنہ میں مدرسہ شمس الہدیٰ قائم ہوا تھا، اور ملک کے طول و عرض سے بڑے بڑے علماء وہاں بلائے گئے تھے، غالباً وطن عزیز کے اس نوخیز مدرسہ کی شہرت نے مولانا منظور احمد کو بھی متاثر کیا اور وہ دیوبند سے قبل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ پہونچ گئے، اور مولانا عبد الشکور آہؒ اور مفتی سہول احمد عثمانیؒ وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، حدیث غالباً حضرت آہؒ سے اور فقہ مفتی سہول صاحبؒ سے پڑھی، یہاں سے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، دیوبند میں امیر شریعت رابع

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ آپ کے رفیق درس تھے، حضرت امیر شریعت کا دارالعلوم دیوبند میں زمانہ تعلیم ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء سے ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء تک ہے۔

۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں آپ نے فراغت حاصل کی، ان کے گھر والوں کا بیان ہے کہ آپ کی صلاحیت کے پیش نظر فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی پیشکش بھی کی گئی تھی، لیکن آپ نے از راہ انکسار اس کو قبول نہیں کیا، دارالعلوم سے واپسی پر گھر میں اقامت اختیار کی، اور گھر پر ہی مخصوص طلبہ کی تعلیم وتربیت کا کام شروع کیا، کسی مدرسہ میں ملازمت نہیں کی، البتہ مختلف مدارس کے رکن شوریٰ رہے، جن میں مدرسہ محمود العلوم دملہ ضلع مدھوبنی اور مدرسہ بشارت العلوم کھرایاں پتھرا ضلع دربھنگہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، دملہ میں حضرت مولانا ادریس صاحبؒ سے گہرا ربط تھا ، اور اکثر ان سے ملنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے، آپ مدرسہ محمود العلوم دملہ کے تین سال مہتمم بھی رہے، مولانا نے بہت محتاط زندگی گذاری، رکنیت یا اہتمام کے پورے دور میں کبھی کسی مدرسہ کا کھانا نہیں کھایا اور نہ تنخواہ قبول کی، رات میں قیام کی نوبت آتی تو گھر سے کھانا منگوا لیتے تھے،۔۔۔۔ خاص حالات میں مدرسہ کا چندہ بھی فرمادیتے تھے۔۔

اللہ پاک نے حج کی سعادت سے بھی سرفراز فرمایا، اس کا بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے، آپ کے بڑے بھائی منشی مہدی حسن حج کی تیاری کر رہے تھے، مولانا بھی اپنے بھائی کی مدد میں شامل ہوگئے، خواب میں رسول پاک ﷺ کی زیارت ہوئی، حضور ﷺ نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا: ہمارے یہاں نہیں آؤگے ؟ آپ نے اپنی غربت کا عذر پیش کیا، اس طرح مسلسل تین شب زیارت نصیب ہوئی اور ہر بار آپ کو دربار حاضر ہونے کی دعوت دی گئی، اور آپ اپنی بے چارگی کا عذر کرتے رہے، حضور ﷺ نے مختلف لوگوں کے نام بتائے کہ فلانے سے روپے لے لو، آخری شب دیکھا کہ سیدہ فاطمۃ الزہراء کھانا لئے کھڑی ہیں اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ کھانا تمہارے لئے ہے،۔۔۔۔ صبح ہوئی تو مولانا نے اس خواب کا تذکرہ اپنی اہلیہ محترمہ سے کیا، پاک باطن خاتون نے کہا کہ پہلی فرصت میں گھر کا چاول فروخت کریں اور حج کو تشریف لے جائیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا،۔۔۔۔

اس طرح انہوں نے ایک پاک اور مثالی زندگی گذاری، لوگوں کے دلوں میں ان کا بہت احترام پایا جاتا ہے، جہاں تشریف لے جاتے عوام وخواص اپنی پلکیں بچھاتے تھے، نماز کی امامت فرماتے، تاحیات پر سونی ضلع مدھوبنی بہار میں عیدین کے امام رہے، آپ کی حیات میں آپ کا گھر مرجع علماء تھا، لمبی عمر پائی، ۳/ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۸/ مئی ۲۰۰۰ء بروز سوموار بوقت نماز عصر وفات پائی، جنازہ کی نماز آپ کے فرزند جناب مولانا عبدالحنان قاسمیؒ نے پڑھائی، جنازہ میں قریب وبعید کے سینکڑوں لوگوں نے شرکت کی (یہ معلومات حضرت مولانا منظور احمدؒ کے گھر میں ایک قلمی کاپی سے لی گئی ہیں، میں نے اس کی فوٹو کاپی آپؒ کے پوتوں سے حاصل کی، اور ان میں بہت سے واقعات کی تصدیق گاؤں کے دیگر اہل علم اور آپ کے تلامذہ نے بھی کی ہے، البتہ مدرسہ شمس الہدیٰ میں حضرت مولانا عبدالشکور آہؒ سے تعلیم حاصل کرنے کی بات مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی نے بتائی،

اس واقعہ سے ایک طرف دارالعلوم دیوبند میں مولانا عبدالشکورؒ کی شہرت اور عظمت علمی کا اظہار ہوتا ہے، تو دوسری جانب اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ طلبہ کو کس انداز میں تیار کرتے تھے، اور ان میں خوداعتمادی کی کیسی روح بھرتے تھے کہ بڑے سے بڑے اداروں میں اکابر علماء کے سامنے بھی وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔۔۔۔

وہ خوداعتمادی کی روح بھرتے تھے

مولانا عبدالشکورؒ کی یہ وہ خصوصیت تھی جو ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی تھی، اور ہر دور میں یہ چیز بڑی نادرالوجود رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ بڑی روایتی درسگاہوں تک نہ جاسکے، اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہی کی سند فضیلت پر انہیں قناعت کرنی پڑی وہ بھی علمیت و قابلیت میں کسی بڑی درسگاہ کے فاضل سے ہرگز کم نہیں تھے، مولانا سے پڑھنے کے بعد جو طلبہ بڑی درسگاہوں کا رخ کرتے تھے وہ پڑھنے کے لئے کم اور حصول نسبت کے لئے زیادہ جاتے تھے، ورنہ جس کو علم گھول کر پلانا کہتے ہیں، وہ سب کچھ مولانا عبدالشکورؒ کی درسگاہ میں ہو جاتا تھا۔۔۔۔

مولانا کی درسگاہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ طالب علم صاحب رائے بن جاتا تھا، حدیث وفقہ، اور علم الخلافیات میں جیسا تعمق وہ پیدا فرماتے تھے کہ بسا اوقات بہت سی روایتی درسگاہوں کے فضلاء میں بھی وہ چیز کم نظر آتی تھی۔

مولانا منظور احمد صاحبؒ آپ کے پھوپھا تھے اور یہ بات انہوں نے خود (۱۹۷۸ء میں پروہی ان کے گھر پر) ان کی زبان سے سنی تھی ۔۔۔۔ میں جب حضرت مرحوم کے در دولت پر حاضر ہوا تو بہت سے اہل علم اور باخبر حضرات میری مدد کے لئے موجود تھے، انہوں نے اس حقیر کے ساتھ بڑے اکرام کا معاملہ کیا، مولانا محمد ثوبان اعظم قاسمی (بھتورہ ضلع مدھوبنی) اور جناب ظفیر احمد صاحب (بھریاہی ضلع دربھنگہ) اور جامعہ ربانی کے بعض فضلاء تخصص بھی شریک سفر تھے)

حضرت آہؒ کے تلمیذ ارشد مولانا عبد الرحمن صاحبؒ

اس کی ایک مثال امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ کی شخصیت تھی، میں نے اپنے قیام سراج العلوم سیوان کے دوران ان کا بارہا تجربہ کیا، وہ بڑے صاحب نظر اور صاحب تحقیق عالم دین تھے، درسیات کی تمام کتابیں آپ کو ازبر یاد تھیں، فتوے کے لئے عام طور پر فقہ حنفی کی معروف ومشہور کتابیں: فتح القدیر، مبسوط، بدائع اور شامی زیر مطالعہ رہتیں، شامی کی عبارتیں آپ کو کثرت سے یاد تھیں، کتب احادیث میں بخاری کا خصوصی مطالعہ فرماتے تھے، تصوف کی کتابوں میں اکثر شیخ ابواللیث سمرقندیؒ کی کتابوں کے حوالے دیتے تھے۔۔۔ ان کی مجلسوں پر علمی رنگ غالب ہوتا تھا، حدیث وفقہ کے مسائل بالعموم زیر بحث رہتے تھے، وہ پوری وسعت نظری کے ساتھ مسائل پر گفتگو کرتے تھے، اور معاصرین بلکہ خوردوں کی تحقیقات کو بھی پوری اہمیت دیتے تھے۔

نماز میں سورتوں کے اجزاء پڑھنا—ایک علمی تحقیق

اس موقعہ پر ایک واقعہ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک مجلس میں جس میں میں بھی موجود تھا انہوں نے نماز میں سورتوں کو کاٹ کر پڑھنے سے اختلاف فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ رواج نماز کی سنت متوارثہ کے خلاف ہے، وہ نماز میں پوری سورت کی قرأت پر زور دیتے تھے، اور اس کے خلاف کرنے پر برملا نکیر فرماتے تھے۔

ایک دن میں نے عرض کیا کہ: حضرت! اس کا ثبوت تو روایات اور آثار صحابہ سے ہے

☆ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی تو اس میں سورۂ اعراف کو کاٹ کر دو رکعت میں پڑھا:

وَقَدْ رُوِیَ عَنِ النَّبِیِّ –صلی اللہ علیہ وسلم– أَنَّهُ قَرَأَ فِی الْمَغْرِبِ

بِالْأَعْرَافِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا[330].

☆حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو مغرب میں سورۃ مرسلات یا سورۃ طور کے بعض حصوں کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے:

عن ابن عباس عن أمه أنها سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في المغرب بالمرسلات القراءة في المغرب بالطور[331]

☆حضرت ابوایوبؓ بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ مغرب کی دونوں رکعتوں میں سورۃ انفال پڑھتے تھے،

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ،أَنّ َالنَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:كَانَ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنَ الْمَغْرِبِ بِسُورَةِ الْأَنْفَالِ[332].

☆بہت سے صحابہ کا بھی یہ عمل بتایا گیا ہے، محدث ابن ابی شیبہؒ نے اس قسم کی بہت سی روایات وآثار کو جمع کیا ہے اور اس پر باب قائم کیا ہے:

"في السورة تقسم في الركعتين"

---

[330] - الجامع الصحيح سنن الترمذي ج ۲ ص ۱۱۲ حديث نمبر : ۳۰۸ المؤلف : محمد بن عيسى أبو عيسى الترمذي السلمي الناشر : دار إحياء التراث العربي – بيروت تحقيق :أحمد محمد شاكر وآخرون عدد الأجزاء : 5-* مسند الإمام أحمد بن حنبل ج ۳۸ ص ۵۲۴ حديث نمبر: ۲۳۵۴۴ ، المؤلف : أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفى : 241هـ)المحقق : شعيب الأرنؤوط – عادل مرشد ، وآخرون إشراف : د عبد الله بن عبد المحسن التركي الناشر : مؤسسة الرسالة الطبعة : الأولى ، 1421 هـ – 2001 م ·

[331]- السنن الكبرى ج ۱ ص ۳۳۹المؤلف : أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (المتوفى : 303هـ)

[332]- المعجم الكبير ج ۴ص ۱۷۸حديث نمبر:۳۷۹۵ المؤلف : سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (المتوفى : 360هـ)

اور ان آثار واقوال سے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ رکعات نماز میں سورتوں کو تقسیم کر کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے:

(1)حدثناأبوبكرقال:حدثناأبوخالد قال:حدثنا عبدة ووكيع عن هشام عن أبيه عن أبي أيوب أوزيدبن ثابت أن النبي صلى الله عليه وسلم قرأ في المغرب بالاعراف في ركعتين۔

(2) حدثنا عبدة ووكيع عن هشام عن أبيه أن أبا بكر قرأ بالبقرة في الفجر في ركعتين.

(3) حدثنا عبدة عن محمد بن عمرو عن يحيى بن عبد الرحمن بن حاطب أن عمر قرأ بآل عمران في الركعتين الاوليين من العشاء قطعها يعني فيها.

(۴)حدثناوكيع عن سفيان عن عمربن يعلى عن سعيدبن جبيرأنه كان يقرأفي الفجر ببني إسرائيل في الركعتين.

(5) حدثنا وكيع عن مسعر عن عمرو بن مرة قال : صليت خلف سعيد بن جبير الفجر فقرأ بحم المؤمن فلما بلغ (بالعشي والابكار) ركع ثم قال في الثانية فقرأ بقية السورة ثم ركع ولم يقنت.

(6) حدثنا وكيع عن الاعمش عن يحيى قال : كان يقسم السورة في الركعتين في الفجر.

(7) حدثنا عبدة عن محمد بن إسحاق عن نافع عن ابن عمر أنه كان يقسم السورة في ركعتين.

(8) حدثنا وكيع عن سفيان عن جابر عن عامر قال : لا بأس أن يقسم السورة في ركعتين.

(9) حدثنا وكيع عن الاعمش عن يحيى قال : يقسم السورة في ركعة الفجر.

(10) حدثنا يعلى عن عبدالملك عن عطاء قال:لابأس أن تقسم السورة في

رکعتین[333].

☆دیگر مصنفین نے بھی ابن شیبہ ؒ وغیرہ کے حوالے سے ان روایات کو نقل کیا ہے:

وَقَالَ أَبُوبَكْرِبْنُ أَبِي شَيْبَةَ:حَدَّثَنَا وَكِيعٌ وَعَبْدَةُ،عَنْ هِشَامٍ،عَنْ أَبِيهِ،عَنْ أَبِي أَيُّوبَ،أَوْزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ،أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيه وسَلَّم قَرَأَ فِي الْمَغْرِبِ بِالأَعْرَافِ فِي رَكْعَتَيْنِ.قُلْتُ : رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ ، وَالنَّسَائِيُّ دُونَ قَوْلِهِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنْ طَرِيقِ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ ، قَالَ : قَالَ : لِي زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ ... فذكره.وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وقال فيه : فرقها في الركعتين[334].

اسی لئے فقہاء حنفیہ اس کے جواز بلا کراہت پر متفق ہیں،کلام کچھ ہے تو افضلیت کے بارے میں ہے کہ بعض لوگ اس کو خلاف اولیٰ کہتے ہیں اور بعض نہیں کہتے،دیکھئے مختلف کتابوں سے یہ فقہی عبارات:

والسنة أن يقرأفي كل ركعة سورة تامة مع الفاتحة،ويستحب أن لايجمع بين سورتين في ركعة لأنه لم ينقل ، وإن فعل لا بأس ، و كذلك سورة في

---

[333] - المصنف المؤلف : أبو بكر بن أبي شيبة،ج ۱ ص ۳۰۶ عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (المتوفى : 235هـ)

[334]- *إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة ج ۲ ص ۱۷۴ حدیث نمبر :۱۲۸۱ المؤلف : أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل البوصيري المُتوفَّى هجرية* مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج ۲ ص ۲۹۶ حدیث نمبر:۲۷۹۹المؤلف : نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي (المتوفى : 807هـ)الناشر:دار الفكر، بيروت – 1412 هـ عدد الأجزاء : 10 *البدر المنير في تخريج الأحاديث والأثار الواقعة في الشرح الكبير ج ۳ ص ۱۸۳ المؤلف : ابن الملقن سراج الدين أبو حفص عمر بن علي بن أحمد الشافعي المصري (المتوفى : 804هـ)المحقق : مصطفى أبو الغيط و عبدالله بن سليمان وياسر بن كمال الناشر : دار الهجرة للنشر والتوزيع – الرياض–السعوديةالطبعة : الاولى ، 1425هـ–2004م عدد الأجزاء : 9

ركعتين[335].

ويؤيد ذلك قول المنية يقرأ سورة البروج أو مثلها فإنه ظاهر في أن المراد قراءة سورة البروج في الركعتين لكن في كون سورة البروج من طوال المفصل كلام---- لأن السنة في الحضر في كل ركعة سورة تامة كما يأتي[336]

ولو قرأ في الركعتين من وسط (سورة) أو من آخر سورة، فلا بأس به، ولو قرأ في الركعة الأولى من وسط سورة أو من آخر سورة وقرأ في الركعة الأخرى من وسط سورة أخرى أو من آخر سورة، فلا ينبغي أن يفعل ذلك على ما هو ظاهر الرواية، ولكن لو فعل لا بأس به، هكذا حكي عن الفقيه أبي جعفر رحمه الله ذكره شيخ الإسلام رحمه الله في «شرحه» في نسخة شمس الأئمة رحمه الله قال بعضهم: يكره وقال بعضهم: لا يكره »[337].

قَرَأَ) بَعْدَ الْفَاتِحَةِ (مِنْ وَسْطِ السُّورَةِ لَا يُكْرَهُ ، وَقِيلَ يُكْرَهُ) قِرَاءَةُ خَاتِمَةِ السُّورَةِ فِي رَكْعَتَيْنِ يُكْرَهُ ، وَكَذَا خَاتِمَةُ سُورَةٍ فِي رَكْعَةٍ أَوْ سُورَتَيْنِ فِي رَكْعَتَيْنِ ، وَقِيلَ لَا يُكْرَه[338] .

---

[335]- الاختيار لتعليل المختار ج ١ ص ٦٢المؤلف : عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي الحنفي دار النشر : دار الكتب العلمية - بيروت / لبنان - 1426 هـ - 2005 م الطبعة : الثالثة تحقيق : عبد اللطيف محمد عبد الرحمن عدد الأجزاء / 5 -

[336]- حاشية رد المختار على الدر المختارشرح تنويرالأبصار فقه أبو حنيفة ج ١ص ٥٣٩ ابن عابدين. الناشر دار الفكر للطباعة والنشر.سنة النشر 1421هـ - 2000م.مكان النشر بيروت.عدد الأجزاء 8.

[337]- : المحيط البرهاني ج ١ ص ٤٣٥المؤلف : محمود بن أحمد بن الصدر الشهيد النجاري برهان الدين مازه المحقق:الناشر : دار إحياء التراث العربي الطبعة :عدد الأجزاء : 11-

[338]- درر الحكام شرح غرر الأحكام ج ١ ص ٣٩٢المؤلف : محمد بن فراموز الشهير بمنلا خسرو (المتوفى : 885هـ)مصدر الكتاب : موقع الإسلام

وَإِنْ قَرَأَ بَعْضَ السُّورَةِ فِي رَكْعَةٍ وَبَعْضَهَا فِي الثَّانِيَةِ الصَّحِيحُ أَنَّهُ لَا يُكْرَهُ وَلَا يَنْبَغِي أَنْ يَقْرَأَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنْ وَسَطِ السُّورَةِ وَمِنْ آخِرِهَا وَلَوْ فَعَلَ لَا بَأْسَ بِهِ نَقَلَ ذَلِكَ عَنْ الْفَقِيهِ أَبِي جَعْفَرٍ[339]۔

مگر سورۃ کاملہ کو علی الاطلاق افضل کہنا بھی مشکل ہے اس لئے کہ متعدد فقہاء نے صراحت کی ہے کہ سورت کاملہ اگر چھوٹی ہے تو اس سے افضل یہ ہے کہ سورتوں کے اواخر سے لمبی آیات پڑھی جائیں:

وفي «الفتاوى»: سئل عن القراءة في الركعتين من آخرالسورة أفضل أم قراءة سورة بتمامها؟ قال: إن كان آخر السورة أكثر آية من سورة التي أراد قراءتها كان قراءة آخر السورة أفضل، وإن كانت السورة أكثر فهي أفضل، ولكن ينبغي أن يقرأ في الركعتين آخر سورة واحدة، ولا ينبغي أن يقرأ في كل ركعة آخر سورة على حدة، قال ذلك مكروه عند أكثرهم، هكذا ذكر في «فتاوى أبي الليث»[340].

أي صلاة قراءة بعض السورة فيها أفضل من سورة ؟ فقل : التراويح لاستحباب الختم في رمضان فإذا قرأ بعض سورة كان أفضل من قراءة سورة الإخلاص ويمكن أن يقال في غيرها أيضا لأن البعض إذا كان أكثر آيات كان

---

[339]- تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشِّلْبِيِّ ج ١ ص ١٣١المؤلف : عثمان بن علي بن محجن البارعي ، فخر الدين الزيلعي الحنفي (المتوفى : 743 هـ)الحاشية : شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (المتوفى : 1021 هـ)الناشر : المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق ، القاهرة الطبعة : الأولى ، 1313 هـ

[340]- : المحيط البرهاني ج ١ ص ٣٣٥المؤلف : محمود بن أحمد بن الصدر الشهيد النجاري برهان الدين مازه المحقق:الناشر : دار إحياء التراث العربي الطبعة :عدد الأجزاء : 11-

أفضل[341].

حافظ ابن حجرؒ نے اس پر فاضلانہ گفتگو کی ہے، اور اس کے جواز اور ثبوت پر بہت سی دلیلیں جمع کی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جو چیز رسول اللہ ﷺ اور متعدد صحابۂ کرام سے ثابت ہو اس میں کراہت کیسے ہو سکتی ہے،۔۔۔۔

نعم الكراهة لا تثبت إلا بدليل ، وأدلة الجواز كثيرة ، وقد تقدم حديث زيد بن ثابت أنه صلى الله عليه وسلم قرأ الأعراف في الركعتين ولم يذكر ضرورة ففيه القراءة بالأول وبالأخير ، وروى عبد الرزاق بإسناد صحيح عن أبي بكر الصديق أنه أم الصحابة في صلاة الصبح بسورة البقرة فقرأها في الركعتين ، وهذا إجماع منهم . وروى محمد بن عبد السلام الخشني بضم الخاء المعجمة بعدها معجمة مفتوحة خفيفة ثم نون – من طريق الحسن البصري قال " غزونا خراسان ومعنا ثلاثمائة من الصحابة فكان الرجل منهم يصلي بنا فيقرأ الآيات من السورة ثم يركع " أخرجه ابن حزم محتجا به ، وروى الدارقطني بإسناد قوي عن ابن عباس أنه قرأ الفاتحة وآية من البقرة في كل ركعة[342].

بعض علماء محدثین نے بڑی لائق قبول بات لکھی ہے جس سے مختلف احادیث وآثار اور فقہی جزئیات کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے وہ یہ کہ اس مسئلہ میں چھوٹی اور بڑی سورتوں کا فرق ہے، یعنی تین چار آیات والی سورتوں میں ٹکڑے کرنا خلاف سنت ہے، بڑی سورتوں میں نہیں، ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں:

والكلام في سورة طويلة كالأعراف بخلاف سورة ثلاث آيات أو أربع

---

[341] الاشباه والنظائر لابن نجيم الحنفى كتاب الصلوٰة ج ۱ ص ۴۳۲۔

[342] فتح الباري بشرح صحيح البخاري ج ۳ ص ۱۵۰ مصدر الكتاب : موقع الإسلام المؤلف : أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلاني (المتوفى : 852هـ)

فتفريقها خلاف السنةاه[343]

دراصل قرآت نماز میں کئی چیزیں بدرجہ حسن مطلوب ہیں: مثلاً:

☆ نماز میں پڑھی جانے والی دوسورتوں کے درمیان کسی چھوٹی سورت یا ایک آیت کے ذریعہ فصل نہ کیا جائے۔

☆ آیات میں ترتیب کی رعایت ملحوظ رکھی جائے، ان میں تقدیم وتاخیر نہ کی جائے۔

☆ مضمون کے اعتبار سے آیات مکمل پڑھی جائیں درمیان سے کوئی آیت ادھوری نہ چھوڑی جائے وغیرہ۔

پوری سورت پڑھنے میں ان سب چیزوں کی رعایت بآسانی ممکن ہے جبکہ درمیان سورت سے پڑھنے یا مختلف سورتوں کے ٹکڑے پڑھنے میں ان امور کالحاظ رکھنا توجہ اور استحضار کا طالب ہے۔

توجن فقہاء نے سورتوں کی تقسیم کو خلاف اولیٰ یا نامناسب کہا ہے وہ دراصل اسی دشواری سے بچنے کے لئے ہے، نہ کہ فی نفسہ۔۔۔۔اسی لئے تین چار آیات والی چھوٹی سورتوں میں اس سے بطور خاص روکا گیا، یا سورتوں کے اواخر سے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑھنا بھی خلاف ادب قرار دیا گیا ہے، ورنہ فی نفسہ قرآن کریم کی تمام آیات نماز کے حق میں مساوی شان رکھتی ہیں، اور "فاقرؤا ماتیسر من القرآن" کا مقتضا بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام حالات میں نمازوں میں پوری سورت پڑھنا افضل اور مستحب ہے، لیکن اس کی خلاف ورزی قابل نکیر نہیں ہے۔

میری اس تحقیق کو (جو اس وقت اجمال کے ساتھ پیش کی گئی تھی) حضرت امیر

---

[343]- مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ج ٣ ص ٣٧٨ المؤلف : الملا علي القاري ، علي بن سلطان محمد (المتوفى : 1014هـ)المصدر : موقع المشكاة الإسلامية -

شریعتؒ نے قبول فرمایا اور اس کے بعد میرے بارے میں ان کا حسن ظن بہت زیادہ بڑھ گیا، کئی بار مختلف مجلسوں میں مجھ سے فرمایا کہ آپ مدرسہ کی مسجد میں "بدائع الصنائع" کا درس دینا شروع کریں جس میں مدرسہ کے اساتذہ اور علماء بھی بیٹھیں، اس سے بڑا فائدہ ہو گا انشاء اللہ۔

لیکن مجھ میں نہ یہ صلاحیت تھی اور نہ وہاں کے ماحول میں اس کی گنجائش تھی۔

حضرت امیر شریعتؒ کی علمی گفتگو سن کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دارالعلوم دیوبند یا مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور جیسے بڑے اداروں کے فاضل نہیں ہیں، عہد حاضر کے علماء میں مولانا کی شخصیت بلاشبہ نادرۂ روزگار تھی[344]۔

344۔حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب کا وطن مالوف شہر در بھنگہ سے چھ سات کلو میٹر مشرق میں غوثا گھاٹ کے قریب ایک گاؤں "پورانوڈیہہ" ہے، یہیں ۱۹/ محرم ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۷/اپریل ۱۹۰۳ء کو آپ کی ولادت ہوئی، والد کا نام حکیم منشی بشارت علی اور والدہ محترمہ کا نام "بی بی بتولن" تھا، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں مولوی یوسف صاحبؒ سے حاصل کی، کچھ دنوں اپنے نانیہال موضع اسراہا ضلع در بھنگہ میں بھی پڑھا، اس کے بعد آپ کا داخلہ در بھنگہ کے محلہ "لی بی پاکر" کے ایک مڈل اسکول میں کرایا گیا، لیکن آپ کے والد حضرت سمرقندیؒ کے مرید تھے، اس لئے غالباً آپ ہی کے مشورے سے اسکول سے ہٹا کر مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ در بھنگہ میں داخلہ کرایا گیا، مدرسہ حمیدیہ اس زمانہ کے معیاری مدارس میں شمار کیا جاتا تھا، اس وقت مولانا مقبول احمد خان صاحب صدر مدرس تھے، مولانا مقبول احمد خان صاحب کو منطق وفلسفہ سے بہت شغف تھا، مولانا عبد الرحمن صاحب کو یہ ذوق ان سے حاصل ہوا، مدرسہ حمیدیہ کے بعد مدرسہ اسلامیہ بتیا چمپارن میں حضرت مولانا ریاض احمد سنت پوری کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے ۱۹۲۴ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے عالمیت کا نصاب مکمل کیا، اور یہیں حضرت آہؒ سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہوا، پھر معقولات کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۲۵ء میں کانپور اور رامپور کا سفر کیا، ۱۹۲۶ء میں مولانا ریاض احمد صاحب مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع چھپرہ آگئے تو آپ ان کے حکم پر رامپور سے گودنا چلے آئے،

۱۹۲۷ء میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے امر سے حضرت شاہ نعمت اللہ عرف میاں صاحب (عباد اللہ اندرواں ضلع گوپال گنج بہار) کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں فضیلت کا کورس مکمل کیا، اور پورے بہار میں اول پوزیشن حاصل کی، اور گولڈ میڈل کے مستحق قرار پائے، آپ نے جن اکابر علماء ومشائخ سے درسیات کی تکمیل کی ان میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند،

حضرت مولانا مفتی سہول احمد بھاگلپوری سابق مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ ظفر الدین محدث بہاری، حضرت مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری" تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند"، حضرت مولانا دیانت حسین صاحب در بھنگوی" اور حضرت مولا شاہ عبیداللہ صاحب امجھروی" (گیا) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۔۔۔۔

آپ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز ترائی نیپال کے مدرسہ محمودیہ راج پور میں صدر مدرس کی حیثیت سے کیا، اس کے بعد مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سپرنٹنڈنٹ مولانا مبارک کریم صاحب کے اصرار پر آپ مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں صدرالمدرسین کے عہدہ پر بحال ہوئے، ۱۴/ جون ۱۹۳۲ء کو آپ کا تقرر عمل میں آیا، ۲۹ / جون ۱۹۴۲ء استاذ محترم مولانا ریاض احمد سنت پوری (متوفی اپریل ۱۹۶۱ء) کے مشورہ سے مدرسہ حمیدیہ گودنا تشریف لائے، اور پھر تاحیات وہیں مقیم رہے، یہاں تک کہ اسی کی خاک میں مدفون بھی ہوئے۔۔۔۔۔

روحانی تعلق اوائل ۱۹۲۷ء میں حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب (متوفی ۱۴/ نومبر ۱۹۲۹ء) سے قائم کیا، حضرت شاہ نعمت اللہ" کے وصال کے بعد حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی" (متوفی ۱۹۳۵ء) سے رجوع ہوئے، پھر حضرت گڑھولوی" کے وصال کے بعد حضرت شاہ نور اللہ عرف حضرت پنڈت جی" (متوفی ۱۹۵۸ء) سے وابستہ ہوئے، حضرت پنڈت جی کو قرآن پڑھانے کا شرف بھی آپ کو حاصل ہوا، ان کے ہجرت پاکستان کے بعد باضابطہ اپنے استاذ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اور پھر آپ کے خلیفہ و مجاز ہوئے۔

مدرسہ حمیدیہ گودنا میں قیام کے دوران ۱۳۹۳ء مطابق ۱۹۷۳ء میں آپ کو امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا نائب امیر شریعت مقرر کیا گیا، پھر حضرت امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی" کی وفات کے بعد ۱۴/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ء مطابق ۳۱/ مارچ ۱۹۹۱ء کو باتفاق رائے آپ کو امیر شریعت خامس منتخب کیا گیا۔

۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ء مطابق ۲۹/ ستمبر ۱۹۹۸ء بوقت ساڑھے سات بجے شام منگل وبدھ کی درمیانی شب پٹنہ میں آپ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا، جسد خاکی اولاً دفتر امارت شرعیہ لایا گیا، پھلواری شریف میں ۱۱/ بجے حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب" کی امامت میں پہلی نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کے بعد گاڑیوں کے ایک قافلے کے ساتھ نعش مبارک مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع چھپرہ لیجائی گئی، اور مولانا مظہر عالم صاحب مہتمم مدرسہ سراج العلوم سیوان کی امامت میں ہزاروں لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی اور مدرسہ کی مسجد سے متصل جانب شمال میں سپرد خاک ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔۔۔۔

آپ کے نامور تلامذہ میں فقیہ کبیر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی (ولادت: ۲۱/ شعبان ۱۳۴۴ء- وفات: ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء) سابق مفتی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا اقبال احمد مظاہری (ولادت ۱۹۳۳ء-

حضرت مولانا سید محمد شمس الحق صاحبؒ

بہار کے عظیم محدث اور جامعہ رحمانی مونگیر میں ایک طویل عرصہ تک درس بخاری کی بساط بچھائے رکھنے والے شیخ الحدیث حضرت مولانا شمس الحق صاحب ویشالویؒ بھی حضرت آہ کے مایہ ناز تلامذہ میں تھے، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں آپ کو تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔

آپ کا شمار ہندوستان کے بلند پایہ محدثین میں ہوتا ہے، آپ نے مسلسل چالیس (۴۰) سال جامعہ رحمانی میں ایک جگہ بیٹھ کر علم وفن کی پوری نسل تیار فرمادی، آپ کے طریقہ تدریس میں بڑی حد تک حضرت آہ کی جھلک محسوس ہوتی تھی، آپ سے پڑھنے والے طلبہ اور مستفیدین کی بڑی تعداد ہے، مجھے آپ کی زیارت وملاقات کے زیادہ مواقع میسر نہیں آئے، لیکن آپ سے پڑھنے والے بڑے اصحاب علم وفضل سے میری ملاقات ہوئی ہے، ان سب کا مشترکہ احساس یہ تھا کہ آپ سے پڑھنے کے بعد ہمیں کسی بڑی مشہور درسگاہ میں پڑھنے کی تمنا نہیں ہوتی تھی، بلکہ بعض مرتبہ بڑی درسگاہوں کے بڑے محدثین کے اسباق ان کے درس کے آگے پھیکے معلوم پڑتے تھے۔۔۔۔

آپ علم اور تقویٰ کا مرقع تھے، آپ نے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت کے علاوہ کئی تصنیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ:

☆عوامل نحو منظوم مع خلاصۃ النحو (مطبوعہ) ☆یاد حرم (مطبوعہ) ☆ترجمہ پارہ عم منظوم (غیر مطبوعہ) ☆الاربعین (غیر مطبوعہ) ☆جہد البہاری فی حل البخاری (غیر مطبوعہ)

وفات: ۲۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ مطابق ۸/ اکتوبر ۱۹۹۵ء) بانی مدرسہ سراج العلوم سیوان سرفہرست ہیں (حیات عبدالرحمن ص ۱۸ تا ۶۰ مرتبہ جناب مولوی وصی احمد شمسی صاحب، ناشر انجمن تعمیر ملت روپس پور دربھنگہ طبع ۲۰۱۲ء)

☆غنیۃ المبتدی فی حل الترمذی (غیر مطبوعہ) ☆اور سفر نامہ حجاز (غیر مطبوعہ)[345]۔

---

[345]- آپ کی ولادت اپنے آبائی گاؤں چک اولیا ضلع ویشالی میں ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں ہوئی، والدماجد کا نام سید شاہ محمد ابراہیم تھا، پانچ سال کے تھے، کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد دادی جان بی بی محمودہ بنت سید شاہ مصاحب علی نے آپ کی پرورش کی۔

ابتدائی تعلیم اپنے برادر مکرم مولوی منظور الحق ؒ سے حاصل کی، فارسی کی ابتدائی تعلیم والدماجد سے پائی، دس (۱۰) سال کی عمر میں مدرسہ احمدیہ ابابکر پور ویشالی (مظفر پور) میں داخل ہوئے، اور مولانا نعیم الدین صاحب ؒ (جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد تھے) سے میزان ومنشعب سے قدوری وشرح جامی تک تعلیم پائی، صفر ۱۳۴۹ھ مطابق جولائی ۱۹۳۰ء میں آپ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخل ہوئے اور درج ذیل بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا:

☆مولانا عبد الشکور آہ صاحب ؒ ☆مولانا اصغر حسین صاحب ؒ ☆مولانا شاہ عبد اللہ صاحب ؒ ☆ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری صاحب ؒ ☆مولانا دیانت حسین صاحب ؒ ☆مولانا محمد قاسم صاحب ☆حافظ عبد الرحمن صاحب ؒ ☆مولانا اقبال حسین صاحب ؒ ☆مولانا عبد الماجد صاحب ؒ ☆اور مولانا عبد الرشید صاحب ؒ

یہاں سے "ملا" کا امتحان پاس کر کے رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ مطابق جنوری ۱۹۳۳ء میں آپ دیوبند تشریف لے گئے، وہاں چار سال رہ کر علوم وفنون کی بڑی کتابیں پڑھیں، وہاں آپ نے علامہ شمس الحق افغانی ؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب ؒ، علامہ ابراہیم بلیاوی ؒ، مولانا ریاض احمد چمپارنی ؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒ، مولانا محمد ادریس صاحب ؒ جیسے اساتین علم وفن سے استفادہ کیا،

۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں اچانک ایک بڑے انقلاب کی زد میں آکر جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل منتقل ہوگئے، اور رجب المرجب ۱۳۵۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۷ء میں اسی مدرسہ سے فراغت پائی، یہاں علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ، مولانا بدر عالم میرٹھی ؒ اور مولانا عبد الرحمن امروہوی ؒ سے درس حدیث لیا، اور مولانا احمد سعید دہلوی ؒ اور مفتی کفایت اللہ دہلوی ؒ کے ہاتھوں دستار فضیلت باندھی گئی۔

تدریس کا آغاز مدرسہ احمدیہ ابابکر پور ویشالی بہار سے کیا، وہاں دو مرحلوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، درمیان میں چار سال باگھی ہائی اسکول میں پڑھایا، جمادی الاول ۱۳۷۲ھ مطابق فروری ۱۹۵۳ء استاذ گرامی مولانا نعیم الدین صاحب ؒ کی جگہ پر مدرسہ احمدیہ میں صدر مدرس ہوئے، وہاں سے استعفا کے بعد ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی ؒ کی دعوت پر جامعہ رحمانی تشریف لائے، پھر تاحیات یہاں کے شیخ الحدیث رہے، مونگیر کے قاضی بھی تھے، تین بار حج وزیارت کا شرف حاصل ہوا۔

اگر حضرت مولانا عبدالشکور آہ کے دیگر شاگردوں تک بھی اس حقیر کی رسائی ہوتی تو اس کے کچھ اور نمونے بھی پیش کئے جاسکتے تھے۔

وفات حسرت آیات حضرت آہ

حضرت آہ ۱۹۴۵ء میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے ریٹائرڈ ہوئے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد وطن مالوف مظفرپور واپس تشریف لے آئے، آپ کی تشریف آوری کی اطلاع جب اہل شہر اور مدرسہ جامع العلوم مظفرپور کے ذمہ داروں کو ہوئی، تو خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے اور بطور برکت دوبارہ مدرسہ میں درس دینے کی درخواست پیش کی، آپ نے ضعف اور مختلف امراض کے باوجود مادر علمی کی محبت میں ان کی درخواست قبول فرمائی اور کچھ عرصہ اعزازی طور پر طلبہ کو اپنے دروس عالیہ سے سرفراز فرمایا، یہاں تک کہ وقت موعود آپہونچا، اور زندگی بھر کا یہ تھکا ہارا مسافر ۱۷/جون ۱۹۴۶ء مطابق ۱۷/رجب المرجب ۱۳۶۵ھ بروز سنیچر اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، مظفرپور کے رام باغ قبرستان (مولوی محمد عیسیٰ کے باغ) میں مدفون ہیں۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں آپ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے بیعت ہوئے تھے، آپ کے وصال کے بعد حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے تجدید بیعت کی، اور آپ کے مجاز وخلیفہ ہوئے، ۱۵/ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۵/نومبر ۲۰۰۷ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور آپ کے ساتھ ہی ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون (رسالہ الشمس ص ۹۲ تا ۹۶ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ صد سالہ اشاعت نومبر ۲۰۱۲ء)

قلمی وادبی خدمات

حضرت آہ علم کے ساتھ قلم کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔

تقریرات بخاری وترمذی

دیوبند کی تعلیم کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تقریر بخاری اور تقریر ترمذی عربی زبان میں قلمبند کی تھی، حضرت الاستاذ کا درس اردو زبان میں ہوتا تھالیکن یہ اس کو عربی زبان میں محفوظ کرتے تھے،اس کا علم حضرت کے کئی تلامذہ اور متعلقین کو بھی تھا،اس سے ان کی عربی اور اردو دونوں زبانوں پر بے پناہ قدرت اور زود نویسی کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے،ان کے اس کمال کی نمود ان کے عربی اور فارسی قصائد ومراثی میں بھی خوب نظر آتی ہے۔۔۔۔

مگر افسوس یہ علمی سرمایہ حضرت آہؒ کے بعد محفوظ نہ رہ سکا،اس محرومی کی چبھن بحیثیت فرد خاندان اور بحیثیت طالب علم میں بھی محسوس کرتا ہوں،اور امیر شریعت خامس حضرت مولاناعبدالرحمن صاحبؒ اور حضرت مولانامفتی محمد ادریس ذکاءؔ گڑھولویؒ صاحب وغیرہ کو بھی اس کا بے حد ملال تھا۔

بیش قیمت ادبی سرمایہ

وہ عالم دین ہونے کے ساتھ صاحب طرز ادیب اور بڑے شاعر بھی تھے،ان کے ہم عصر شعراء ان کی شعری تخلیقات کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے،ان کے کلام میں لسانی شگفتگی کے ساتھ گہری معنویت پائی جاتی ہے،ان کے کلام میں زندگی ہے۔۔۔۔ان کے یہاں طنزو مزاح ہے،شکوۂ زمانہ ہے،غم جاناں اور حکایت گل وبلبل ہے،مگر فکری کجی نہیں ہے،ان

کے پاس جو روحانی طاقت اور علم کی روشنی ہے وہ ہر قسم کی ذہنی اور فکری ضلالت سے ان کو روکتی ہے ،ان کا کلام ان کی پاک زندگی کا آئینہ دار ہے ۔۔۔۔آپ کی ادبی تخلیقات آپ کی حیات مبارکہ میں بہت سے اخبار ورسائل میں شائع ہوتی تھیں اور ارباب سخن اور اصحاب فن سے خراج تحسین وصول کرتی تھیں۔۔۔۔۔۔بڑے بڑے اہل قلم اور شعراء اپنے دیوان اور مجموعۂ کلام پر آپ سے منظوم تقریظات وقطعات لکھواتے تھے[346]۔۔۔۔۔نکاح کا سہرا لکھنے کا بھی عمدہ ذوق اور سلیقہ رکھتے تھے ،بڑی تعداد میں انہوں نے سہرے لکھے ہیں ،۔۔۔۔۔قصیدہ اور مرثیہ بھی خوب لکھتے تھے ،۔۔۔۔۔۔۔بہت سے قطعات تاریخ بھی کہے ہیں ،۔۔۔۔۔۔عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان کی شاعری موجود ہے ، فن پر عبور حاصل تھا، کلام میں سادگی اور روانی ہے ،فصاحت وبلاغت اور فنی خوبیوں سے کلام آراستہ ہے ،اس دور کے عظیم شعراء کی فہرست میں فنی اور فکری اعتبار سے وہ صف اول کے شعراء میں جگہ پانے کے حقدار ہیں۔

قصہ ان کے دیوان ناتمام کا

وہ ایک صاحب دیوان شاعر تھے ،ان کے پاس دیوان کے اصول پر حروف تہجی کے مطابق غزلیں اور نظمیں وغیرہ موجود تھیں،جو ان کے ذخیرۂ کاغذات میں بکھری ہوئی تھیں،اور کئی کلام ایسے بھی تھے جو رسالوں میں شائع ہوئے اور ان کی نقل ڈائری میں نہیں کی جاسکی۔۔۔

حضرت آہؔ کو زندگی کے آخری دنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان بکھرے ہوئے

[346] مثال کے طور پر کلیات آہؔ میں "دیوان شاہ حامد حسین حامدؔ آرزانی" پر آپ کا ایک منظوم کلام موجود ہے ،جو ان کے دیوان کے ساتھ پہلی بار طبع ہوا تھا، مگر اب پہلا ایڈیشن کہیں نہیں ملتا،خدا بخش لائبریری میں اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا ہے ،اس میں یہ کلام مطبوع نہیں ہے۔

تاروں کو سمیٹا جائے، اور باقاعدہ ان کو ایک دیوان کی شکل دی جائے، چنانچہ انہوں نے یہ کام خود شروع کیا، اور کاغذ کا ایک بستہ خرید کر اس کی ضخیم کاپی تیار کی، اور حروف تہجی کی ترتیب پر اپنے قلم سے اس کا آغاز فرمایا، اور کاغذات کے ذخیرے سے جیسے جیسے کلام ملتا گیا اپنی خوبصورت تحریر کے سانچے میں اسے ڈھالتے گئے، نیز حک وفک اور تصحیح وترمیم کا عمل بھی جاری رہا، کسی کسی غزل کا تو نقشہ ہی بدل گیا، لیکن ابھی صرف نصف سے زیادہ دیوان تیار ہو سکا تھا کہ وقت موعود آپہونچا اور اس کام کے مکمل ہونے سے پہلے ہی عمر عزیز کے لمحات پورے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس مجموعۂ ناتمام پر حضرت آہؔ کے صاحبزادۂ خورد جناب ماسٹر سید محمود حسن صاحبؒ نے ایک مختصر سا تعارفی نوٹ لکھا ہے جو اپنے صاحبزادہ کے نام خط کے لب ولہجے میں ہے، اس کا آغاز ان سطروں سے ہوتا ہے:

"عزیزی نجمی سلمہ!

یہ کاپی اسی کاغذ کی بنی ہوئی ہے جو تمہارے دادا مرحوم نے اپنے دیوان کے مسودہ کے لئے خرید کیا تھا، لیکن اس مسودہ کے تیار ہونے سے پہلے ہی وہ اس دار فانی سے ۱۷/ جون ۱۹۴۶ء کو رخصت ہوگئے، تمہارے دادا کا نام مولانا محمد عبد الشکور صاحب تھا وہ ایک بڑے عالم تھے۔۔۔"[347]

یہ کاپی (مسودۂ ناتمام) حضرت آہؔ کے بعد عرصہ تک آپ کے صاحبزادۂ خورد ماسٹر سید محمود حسن صاحبؒ کے پاس رہی، لیکن اہل سخن، اصحاب ذوق بلکہ خاندان میں بھی سب کو اس کی خبر نہیں تھی، ماسٹر صاحب مرحوم کی ایک بار زیارت کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے، لیکن اس وقت

---

[347] ڈائری (یاداشت) ماسٹر سید محمود حسنؒ۔

میری عمران باتوں کی متحمل نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔ماسٹر صاحب کے انتقال (۱۹۸۷ء) کے بعد یہ مسودہ ماسٹر صاحب مرحوم کے کاغذات میں دفن ہوگیا تھا، ممکن ہے کچھ باخبر لوگوں نے ان کے صاحبزادگان سے اس کی نقلیں حاصل کی ہوں، لیکن ایسی کوئی چیز کبھی منظر عام پر نہیں آئی اور اس نادر خزانے پر گمنامی کا دبیز پردہ پڑا رہا۔۔۔

حضرت آہ کی شاعری کے تذکرے

☆میرے والد ماجد اکثر اپنی مجالس میں حضرت آہؒ کے شعری اور ادبی کمالات کا تذکرہ فرماتے تھے، اور کبھی نمونے کے ایک دو اشعار بھی (جو ان کو بروقت یاد آتے) سناتے تھے، والد صاحب سے میں نے اس سہرے کا بھی ذکر سنا تھا جو حضرت آہؒ نے اپنے فرزند اصغر "ماسٹر سید محمود حسن" کی پہلی شادی کے موقعہ پر تحریر فرمایا تھا۔۔۔۔۔۔

☆اسی طرح حضرت مولانا مفتی محمد ادریس ذکاؔ گڑھولویؒ کی کتاب "جنت الانوار" مطالعہ کرتے ہوئے، حضرت گڑھولویؒ کی وفات پر حضرت آہؒ کا پر اثر اور شاہکار مرثیہ پڑھا، (جو اب "کلیات آہؔ" میں بھی شامل ہے) اس سے بھی ان کے ادبی شعور و آگہی کا اندازہ ہوا۔

☆دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد (۱۹۹۰ء میں) جب میں مدرسہ سراج العلوم سیوان میں مدرس ہوا تو وہاں کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا عبدالرحمن صاحبؒ امیر شریعت خامس (اس وقت کے نائب امیر شریعت) سے ملاقات ہوئی وہ مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع چھپرہ سے تشریف لائے تھے اور حضرت مولانا اقبال احمد مظاہریؒ مہتمم مدرسہ سراج العلوم کے پیر طریق تھے، میرے لئے وہ اجنبی تھے، لیکن حضرت آہؔ سے تلمذ کی نسبت کا علم ہوا تو میں بھی ان سے قریب ہوا اور وہ بھی مجھ پر شفقت فرمانے لگے، میں تقریباً ایک سال (تعلیمی -رجب المرجب تک) وہاں رہا، اس دوران وہ کئی

بار تشریف لائے، میری مناسبت سے اکثر وہ اپنے استاذ محترمؒ کا تذکرہ چھیڑ دیتے ، اور ان کے ملفوظات وواقعات اور بہت سے اشعار بھی لذت ومحویت کے ساتھ سناتے تھے۔

ان تمام واقعات سے مجھے پورا اندازہ تھا کہ حضرت آہؔ ایک بڑے شاعر تھے ، اور انہوں نے اپنی زندگی میں بڑی تعداد میں اشعار کہے ہیں، لیکن یہ تصور نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے ترکہ میں پورا دیوان (مجموعۂ کلام) چھوڑا ہے ، اور غالباً حضرت کے دیگر تلامذہ اور متعلقین کو بھی اس کی پوری خبر نہیں تھی، میں نے کسی سے بھی اب تک ان کے مجموعۂ کلام کا تذکرہ نہیں سنا تھا۔

مجموعۂ کلام کا انکشاف

لیکن اسے حسن اتفاق ہی کہنا چاہئے یا ایک مصیبت کے بطن سے نعمت خداوندی کی نمود کہ:۔۔۔۔۔

میں نے اپنے قیام حیدرآباد(۱۹۹۶ء) کے زمانے میں سمستی پور میں ایک دینی تعلیمی تحریک (بنام دارالعلوم سمستی پور) کا آغاز کیا، جس کی سرپرستی ونگرانی مخدوم العلماء، راس الفقہاء فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی قاضی القضاۃ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے قبول فرمائی، حضرت خود بنفس نفیس سمستی پور تشریف لائے اور میری اس "حرکت علمیہ" کا افتتاح فرمایا، اسی تحریک کے نتیجے میں "جامعہ ربانی منوروا شریف" اور شہر ومضافات کے بعض دیگر ادارے وجود میں آئے ، اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں مجھے سخت آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور اسی ضمن میں ایک موقعہ پر مجھے کئی ہفتے تک سمستی پور شہر میں ٹھہرنا پڑا۔۔۔

اسی دوران ایک دن اچانک میرے برادر عزیز مولانا رضوان احمد قاسمی خبر خیریت

معلوم کرنے کے لئے سستی پور پہونچے[348]، اور کئی دن تک ہمارے ساتھ رہے، اثنائے گفتگو ایک دن حضرت مولانا عبد الشکورؒ کی تقریرات بخاری وترمذی کا ذکر آیا، جو انہوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی درسگاہ میں بیٹھ کر قلمبند کی تھیں، اور حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ اور حضرت مولانا ادریس صاحب گڑھولویؒ کو ان کی ہمیشہ تلاش رہی۔۔۔۔۔۔

میں تو مدرسہ کے معاملات ومسائل میں الجھا ہوا تھا، اس لئے حسب مشورہ مولانا رضوان احمد قاسمی ان تقریروں کی تلاش میں ماسٹر سید محمود حسن مرحوم کے مکان (محلہ کاشی پور) پر حاضر ہوئے، آپ کے بڑے صاحبزادہ جناب نجمی صاحب سے ملاقات کی، چند روز کی آمد ورفت اور لیت ولعل کے بعد آخر نجمی صاحب نے عزیزم رضوان کے سامنے ایک پرانا سا

---

[348] -مولانا رضوان احمد قاسمی عمر میں مجھ سے قریب تین سال چھوٹے ہیں، تاریخ ولادت ۲۷ / رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۶ / نومبر ۱۹۷۰ء ہے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد، مدرسہ اسلامیہ کوشیشور استھان ضلع دربھنگہ اور مدرسہ اسعد العلوم سہسی ضلع کھگڑیا میں بالترتیب تعلیم حاصل کی، حفظ قرآن کی تکمیل مدرسہ دینیہ غازی پور یوپی میں جناب حافظ عبد الجبار صاحب مرزاپوری اور جناب قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی (موجودہ ناظم مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھرواره دربھنگہ) اساتذۂ حفظ کے پاس کی، عربی تعلیم مدرسہ دینیہ غازی پور یوپی کے علاوہ، مدرسہ اسلامیہ بنارس، اور مدرسہ امداد الاسلام ایلیاچکیا ضلع بنارس میں حاصل کی، ۱۹۹۳ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، فراغت کے بعد بلند شہر یوپی اور کشمیر کے کئی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، دار العلوم عزیزیہ میرا روڈ ممبئی میں کئی سال صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے، کئی سال تک دار العلوم حیدرآباد کے مقبول ترین اساتذہ میں رہے، اور دورۂ حدیث شریف تک کی کتابیں متعلق رہیں، اس کے بعد برسوں تک مدرسہ شمس العلوم شاہدرہ دہلی میں دورۂ حدیث کے مقبول اور ممتاز اساتذہ میں رہے، مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی میں بھی دو سال شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔۔۔۔۔

شعر وسخن کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں، تحریری صلاحیت بھی عمدہ ہے، سوپور (کشمیر) اور دہلی سے ایک آدھ ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا جو حالات کی ناموافقت کی بنا پر جلد ہی بند ہو گیا۔۔۔۔ تقریر وخطابت میں مہارت وقبولیت حاصل ہے، ذہین ترین عالم دین ہیں، جہاں رہے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، اللہ پاک مزید ترقیات سے نوازے، اور فتنوں سے محفوظ رکھے آمین۔

بکس لاکر ڈال دیا کہ دیکھ لو! اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی میں ملے گا۔۔۔

اس بکس میں حضرت آہؒ کی وہ تقریریں تو نہ مل سکیں جن کی تلاش میں یہ سر گردانی مول لی گئی تھی، البتہ ان کے بوسیدہ و کرم خوردہ دیوان ناتمام کی ایک کاپی مل گئی، جو خود ان کے ہاتھ کی تحریر کردہ تھی، ہم میں سے کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ حضرت آہؒ نے اپنے منظوم کلام کا اتنا بڑا حصہ اپنے سرمایہ میں چھوڑا ہوگا، ہم نے محسوس کیا کہ ہماری جستجو ناکام نہیں رہی، اس مسودہ کی تین فوٹو کاپیاں کرائی گئیں، ایک والد صاحب کے پاس محفوظ کر دی گئی اور ایک میرے پاس اور تیسری کاپی مولانا رضوان کے پاس رہی، یہ قصہ ۱۹۹۷ء کا ہے۔۔۔۔۔۔۔

پھر یہ مسودہ بھی ہمارے کاغذات کے ذخیرہ میں پڑا رہا، یہاں تک کہ اس کی یافت پر بھی بیس (۲۰) سال کا عرصہ بیت گیا، اور کسی کو اس کی ترتیب واشاعت کا خیال نہیں آیا، میرا ارادہ شروع سے اس پر کام کرنے کا تھا، لیکن دوسری مصروفیات کی وجہ سے اپنے کو اس کے لئے فارغ نہ کر سکا۔۔۔۔۔

حسن اتفاق بعض اسباب کے تحت مجھے جد امجد قطب الہند حضرت مولانا سید احمد حسن منورویؒ کی شخصیت پر کام کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، آپ پر مستقل اور معتبر تذکرہ کی کمی عرصہ سے محسوس کی جارہی ہے، اور کسی حد تک کام کی شروعات بھی کر دی۔۔۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اصولی طور پر پہلا حق آپ کے والد ماجد حضرت مولانا عبد الشکور آہ کا بنتا ہے، بس کام کا رخ تبدیل ہو گیا، اور میں نے خاموشی کے ساتھ حضرت آہؒ کے کلام اور حیات و خدمات پر کام کا آغاز کر دیا، ابتدا میں کام کی رفتار کچھ دھیمی رہی، لیکن پھر اعتدال کے ساتھ کام آگے بڑھنے لگا، اس طرح اپنی تمام مصروفیات کے ساتھ تقریباً ایک سال میں اس کام کو مکمل کرنے جارہا ہوں، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

کچھ مجموعۂ کلام کے بارے میں

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ حضرت آہ نے یہ مجموعہ دراصل دیوان کے طرز پر حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق لکھنا شروع کیا تھا، اوردالالف، الباء، التاء وغیرہ عنوانات کے تحت وہ غزلوں اور نظموں کو مرتب فرمارہے تھے، لیکن زندگی نے وفانہ کی اور یہ دیوان نا تمام رہ گیا، دس (۱۰) سے زیادہ حروف تہجی پر کوئی شعر موجود نہیں ہے۔۔۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں اس کو اصطلاحی دیوان کہنا ممکن نہ تھا، اس لئے میں نے بعض اہل علم اور اہل نظر کے مشورے سے صاحب کلام کے منشا اور ترتیب کے خلاف کلیات کے اصول پر از سر نو اس مجموعہ کو مرتب کیا، جس میں حروف تہجی کے بجائے موضوعات اور مضامین کو مطمح نظر بنایا گیا، اور جو اشعار ناقابل اشاعت محسوس ہوئے ان کو شامل نہیں کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ معیاری اشعار ہی کو جگہ دی جائے، اس بنا پر آپ چاہیں تو اس کو "مکمل مجموعۂ کلام" کے بجائے "منتخب مجموعۂ کلام" کہہ سکتے ہیں۔۔۔ اس طرح کام کا دائرہ بڑھ گیا اور کچھ مشکلات بھی پیش آئیں، لیکن اللہ پاک کے کرم اور ان بزرگوں کے فیض سے سب آسان ہوگیا، فالحمدللہ علیٰ ذلک۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت آہ کی سب سے بڑی علمی یادگار

☆یوں حضرت آہ کی سب سے بڑی علمی ودینی یادگار آپ کے فرزند اکبر حضرت مولانا الحاج حکیم سید احمد حسن منورویؒ کی شخصیت تھی، جو حضرت آہ کے فضل وکمال اور عظمت علمی کا کامل نمونہ تھے، شکل وشباہت میں بھی وہ اپنے والد کے مثیل تھے اور علم وفضل میں بھی ان کی نظیر، بلکہ حضرت منورویؒ بشمول والد ماجد اپنے پورے خاندانی علوم ومعارف اور بلند اقدار

وروایات کے امین تھے ،انہوں نے اپنے والد گرامی ہی کی نہیں بلکہ دادھیالی اور نانیہالی دونوں خاندانوں کی عظمتوں کی حفاظت کی اور ان کے علمی وروحانی تسلسل کو فروغ دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن ؎
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

باب پنجم

کلام آہ کا فکری و فنی مطالعہ

(حضرت مولانا عبد الشکور آہؔ کے مجموعۂ کلام کا فکری و فنی تجزیہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا عبد الشکور آہ مظفرپوری بیسویں صدی عیسوی کے عظیم شاعر تھے، ان کے کلام میں وہ تمام شاعرانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس عہد کے بڑے شعراء کے یہاں موجود ہیں، بلکہ بلند پایہ عالم دین اور عظیم مفکر و فلسفی ہونے کے ناطے عالمانہ دقت نظر اور فلسفیانہ تفکر و تعمق مستزاد ہے۔

آہ کی شاعرانہ عظمت

ان کے یہاں روایت وانفرادیت کا حیرت انگیز امتزاج اور حسن خیال اور حسن تنظیم کا شاندار توازن پایا جاتا ہے، فکر و معنیٰ، ترکیبات و تعبیرات، ہیئت وساخت، شعری صناعت وبداعت، فنی تحفظات و تنوعات جس زاویہ سے بھی دیکھا جائے ان کا کلام بیسوی صدی کے بلند پایہ شعراء کے درمیان ایک انفرادیت اور معنویت رکھتا ہے، مگر ایک خود حضرت آہ کے اپنے مزاج کی عافیت پسندی اور طبیعت کی گوشہ نشینی، دوسرے ارباب سخن کی مسابقانہ کشمکش ـــــ جس نے ان کو اس دلدل سے دور رکھا اوران کو شعر وادب میں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ بجاطور پر مستحق تھے۔

کسی درجہ میں ان کی شخصیت کے درسی اشتغال اور خانقاہی رجحانات کو بھی اس کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے، کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ مدرسہ جامع العلوم (قدیم نام خادم العلوم) مظفرپور بہار، دارالعلوم مئو اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں قرآن وحدیث اور فقہ وفلسفہ کی تدریس میں گذرا، اس سے جو وقت بچتاوہ خانقاہی ریاضت اور ذکر و شغل کی نذر ہو جاتا، مگر اسی کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہا، اور حسب موقعہ اپنا کلام ڈائری میں ضبط بھی کرتے رہے، کبھی رسائل وجرائد میں بھی کلام شائع ہو تا تھا۔۔۔

لیکن ان کے علمی شان و شکوہ میں ان کی شاعرانہ شخصیت دب کر رہ گئی، اور صوفیانہ انکسار نے ان کے کلام کا اکثر حصہ اہل فکر و نظر اور ارباب نقد و فن کی نگاہوں سے مستور رکھا۔

اعلیٰ شاعری کا معیار

ورنہ بقول کنھیالال کپور:

"ایک جدید انگریزی نقاد کے نزدیک اعلیٰ شاعری میں تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:-موسیقیت، معنویت اور اشاریت۔ ان تینوں میں اشاریت کا ہونا ازبس لازمی ہے، ذوقؔ کا ایک شعر ہے:

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا　　　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

یہ شعر چونکہ اشاریت سے خالی ہے اس لئے اسے عمدہ شعر نہیں کہا جا سکتا، اس کے برعکس غالبؔ کے اس شعر کو لیجئے:

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی　　　　کیوں ترا راہگذر یاد آیا

اس شعر میں جو اشاریت ہے اس کی وجہ سے سحر ہلال کا نمونہ بن گیا۔[349]

حضرت آہؔ کی شاعری کا اکثر حصہ ان تینوں کسوٹیوں پر پورا اترتا ہے، ان کے اکثر اشعار معنویت کے ساتھ موسیقیت اور اشاریت کا خوبصورت نمونہ ہیں، مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کریں:

عشق میں مر کر مری مٹی ٹھکانے لگ گئی
حلقۂ تربت زیارت گاہ جانانہ بنا

---

349 ۔ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ (پٹنہ) کے مجموعہ کلام "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" پر کنھیالال کپور کے تاثرات سے اقتباس ص ۵۷، ۵۸، مطبوعہ طوبیٰ پبلیشر حیدر آباد ۱۹۹۶ء۔

بعد مرنے کے بھی قسمت میں مری گردش رہی

خم بنا، ساغر بنا، آخر کو پیمانہ بنا

یہاں تک اسے مجھ سے ہے اجتناب کہ تربت سے دامن بچا کر چلا

یہ کیسے مست ہیں مستی میں بھی ہشیار رہتے ہیں

بہک کر بھی نہیں کہتے کبھی کچھ راز ساقی کا

اچھی سے اچھی صورتیں اب دل میں رہتی ہیں

خالی یہ گھر پڑا تھا، پرستان ہو گیا

رہا چین سے دل ترے ہاتھ میں یہ وحشی بہت باادب ہو گیا

سیہ کار ہوتا ہے پس کر عزیز رہا آنکھ میں سرمہ جب ہو گیا

کمال درد کی لذت کا یہ کرشمہ ہے ہزار رنج میں بھی دل کو شادماں دیکھا

غریق لجۂ آفت ہے عمر کی کشتی ہمیشہ باد مخالف میں بادباں دیکھا

حشر کہتے ہیں کسے، ہول قیامت کیا ہے وہ تو اک فتنۂ قامت کا سراپا ہو گا

مجھے جو دفن کیا رکھ کے دل کو سینے میں بنی مزار میں اک اور مزار کی صورت

خوشا نصیب کہ بعد فنا ہوا پابوس ترے قدم سے ملا میں غبار کی صورت

فراق دست حنائی میں آہؔ سینے سے ٹپک رہے ہیں لہو چشم خونچکاں کی طرح

گل ہوئی شمع محبت نہ کبھی گل ہوگی
عشق بلبل پہ ہے موقوف نہ پروانے پر
مٹ گیا سوز محبت کا اثر تربت سے
ورنہ افسوس نہ تھا شمع کے بجھ جانے پر

خوب ہوتا ہے کہ سر کٹتے چلے جاتے ہیں
لاش بسمل کی سبکدوش ہوئی جاتی ہے

کلام آہؔ کی شعری خصوصیات

آہؔ کی شاعری میں زبان وبیان کی شگفتگی بھی ہے اور فکر و نظر کی بلندی بھی، فصاحت وبلاغت کی چاشنی بھی ہے اور حسن خیال کی بالیدگی بھی، تصور کی پاکیزگی بھی اور حسن معنٰی کی ربودگی بھی، فنی روایات کی پاسداری بھی ہے اور معنوی اقدار واوزان کی نگہداری بھی، مؤمنانہ غیرت وجسارت بھی اور زاہدانہ صبر وقناعت بھی، قلندرانہ جاہ وجلال بھی ہے اور فقیرانہ خاک نشینی بھی، شاعرانہ خود پسندی بھی ہے اور صوفیانہ بے نفسی بھی، گرمی ذکر وفکر بھی اور نعرۂ احد احد بھی، تلقین صبر وشکر بھی اور دعوت انقلاب بھی، علمی ژرف نگاہی بھی اور فلسفیانہ تجر و تعق بھی، خود شناسی بھی اور خدا شناسی بھی، انسانیت بھی روبرو اور کائنات کی وسعتوں سے بھی گفتگو،

غم جاناں بھی ہے اور غم زمانہ بھی، عرفان ذات بھی ہے اور مطالعہٴ انفس و آفاق بھی، اقدار شکنی سے گریز بھی ہے اور تجدیدیت کا رجحان بھی۔۔۔۔۔

صاف ستھرا اچھا تلا کلام، کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان، لب ولہجہ کا بانکپن، تراکیب میں حسن بندش اور اشعار رمزیت اور موسیقیت سے لبریز۔

حسن بندش اور غنائیت

مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیں کہ ان میں کیسی مٹھاس، کیسی غنائیت اور معنوی لطافت پائی جاتی ہے:

ملو سب سے محبت سے یہ ہے ارشاد رحمانی
اسی حق نے مزین کی ہے ساری بزم انسانی

مجوسی ویہودی مسلم وہندی ونصرانی
خراسانی و تاتاری وشامی وبدخشانی

لگایا ہے یہ سارا باغ عالم ایک مالی نے
تمہیں تفریق میں ڈالا ہے کس کوتہ خیالی نے

بحق مرشد برحق زہے قسمت جو ہو جائے
زمین قبر میری مورد الطاف رحمانی

نگاہ مرشد کامل ہے وجہ انبساط دل
نہیں تو میں کہاں بندہ کہاں یہ ذکر سلطانی

وہ درویش یکتا عطوف ورحیم | سراپا محمد بشارت کریمؒ
رہے یاد مولیٰ میں خلوت پسند | مگر فیض تھا ان کا فیض عمیم
انہیں جس نے جانا تو جانا یہی | سراسر ہیں رحمت سراپا رحیم
مرے مرشد و مقتدائے جہاں | ہمہ دم مطیع رسول کریمؐ

دل کو میخانہ بنا آنکھوں کو پیمانہ بنا
پاکبازوں کو پلا کر رند مستانہ بنا

خلوت توحید میں تو سب کو بیگانہ بنا
پہلے تو خود شمع بن پھر اسکو پروانہ بنا

کیوں بھٹکتے پھر رہے ہو دربدر اے آہ تم
کچھ تو سوچو کیوں دل آباد ویرانہ بنا

عجب وہ دن تھے عجب لطف کا زمانہ تھا
چمن میں گل تھے گلوں میں مرا فسانہ تھا

کسی کے حسن کا چرچا جو غائبانہ تھا
تو میرے عشق پہ حیرت زدہ زمانہ تھا

چمن میں گل تھے نہ بلبل کا آشیانہ تھا
قفس سے چھوٹے تو بدلا ہوا زمانہ تھا

ہجوم یاس والم نے کیا ہے دیوانہ
نہیں تو سر تھا مرا تیرا آستانہ تھا

بتوں سے دل نہ لگا تا تو کوئی کیا کرتا
جنون عشق میں اس کا کہاں ٹھکانہ تھا

اُدھر کوئی صورت دکھا کر چلا
اِدھر دل پہ بجلی گرا کر چلا

سراپا وہ شعلہ بنا کر چلا
عجب آگ دل میں لگا کر چلا

قیامت کی چالیں چلیں قبر پہ
مٹایا بھی اور پھر جلا کر چلا

ہوئی بزم ساقی کی سنسان آہ
کوئی مست جب پی پلا کر چلا

یہ اشارہ ہے چشم قاتل کا
پھر تماشا ہو رقص بسمل کا

یہ تقاضا ہے دیدۂ ودل کا
نہ رہے فرق بحر وساحل کا

طالب دید کو نہ جھڑکیں اب
رد نہ کیجے سوال سائل کا

منزل عشق پر خطر ہے دیکھے تھے
لٹ نہ جائے یہ قافلہ دل کا

نالہ کیسا ہے اور فغاں کیسی
کچھ کہو بھی تو ماجرا دل کا

درد و غم جزو ہیں حقیقت کے
غیر ممکن ہے فصل داخل کا

اُدھر کوئی رخصت طلب ہو گیا
اِدھر آہ میں جاں بلب ہو گیا

الٰہی یہ کیسا غضب ہو گیا
وہ مجھ سے خفا بے سبب ہو گیا

بکھر آئیں زلفیں جو رخسار پر
گہن لگ گیا، روز شب ہو گیا

مرنے والے سے ترے ہائے وطن چھوٹ گیا
کس مپرسی میں اٹھی لاش۔ کفن چھوٹ گیا

وقت شانہ جو گرا غنچۂ دل چوٹی سے
زلف بل کھانے لگی سانپ کا من چھوٹ گیا

آہ محرومی قسمت سے وطن چھوٹ گیا
دوست سب چھوٹ گئے رشتہ ہر ایک ٹوٹ گیا

مونس و ہمدم بنالے قبر کا
لوح دل پر یار کی تصویر کھینچ

آہ و نالے کا ابھی ہو فیصلہ
تیغ ابرو اوبت بے پیر کھینچ

وصل اس کا جو ہے موقوف قضا آنے پر
جان آمادہ ہے قالب سے نکل جانے پر

رنگ بدلا تری محفل کا ترے آنے پر
شمع جلتے ہی جلانے لگے پروانے پر

انتہا ہوگئی اب تو ستم ایجادی کی
خاک تک ڈالنے آئے نہ وہ دیوانے پر

سر میں سودا جو ہے تیرا تو اسیری میں بھی
دل ہے آمادہ تری زلف کے سلجھانے پر

بے مروت ہیں جفا جو ہیں ستمگر آنکھیں
خون کرتی ہیں یہ عاشق کا بدل کر آنکھیں

کتنی پر کیف ہیں متوالی ہیں دلبر آنکھیں
گویا چلتی ہیں چڑھا کے کئی ساغر آنکھیں

جز ترے اور کسی پر نہ پڑیں گر آنکھیں
حشر تک کیوں نہ رہیں طاہر و اطہر آنکھیں

دین و دنیا کو تو کرتی ہیں مسخر آنکھیں
یا الٰہی یہ ولی ہیں کہ پیمبر آنکھیں

نہ بنیں وادی الفت میں جو رہبر آنکھیں
چشم حق بیں کی نظر میں ہیں وہ دو بھر آنکھیں

تیر دل میں اتر گئے ہوتے　　دیکھنے والے تر گئے ہوتے

تم اگر قبر پر گئے ہوتے　　مرنے والے تو تر گئے ہوتے

آہ ہم قید کے مارے نہ گئے　　ولولے دل کے ہمارے نہ گئے

یہ شباب اور غضب کی شوخی　　اب بھی بچپن کے طرارے نہ گئے

اے فلک تجھ کو جلا دیتے ہم　　کیا کہیں دل کے شرارے نہ گئے

جب خوشامد سے نہ مانی جائے گی　　دوسری تدبیر ٹھانی جائے گی

مر مٹوں کو کیا مٹائے گا فلک　　حشر تک ان کی کہانی جائے گی

بت چلے جاتے ہیں کعبہ کی طرف　　آج منت کس کی مانی جائے گی

حسن پر اتنا غرور اچھا نہیں　　چار دن میں یہ جوانی جائے گی

تہ کاکل جبین یار جب معلوم ہوتی ہے

جبش کے سایہ میں شکل حلب معلوم ہوتی ہے

ازل سے ایک صورت منتخب معلوم ہوتی ہے

کہ جس کی دیر وکعبہ میں طلب معلوم ہوتی ہے

ترے کوچے میں جا بیٹھیں نکلنا سخت مشکل ہے

یہ حسرت بھی زمیں بوس ادب معلوم ہوتی ہے

شاعری کے الگ الگ رنگ

آہ کی شاعری میں بے پناہ تاثیر ہے، یہاں درد و غم بھی ہے اور جوش وجذبہ بھی، فقر ومسکنت بھی ہے اور بڑے سے بڑے انقلاب کا حوصلہ وولولہ بھی۔۔۔۔

کلیات اقبال شائع ہوئی تو اس پر شیخ عبدالقادر مرحوم بیرسٹرایٹ لاء سابق مدیر مخزن نے اپنے دیباچہ میں یہ چونکادینے ولا فقرہ تحریر کیا:

"غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جاکر بھی چین نہ لینے دیا، اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا"[350]

بعض مبصرین کو شیخ عبدالقادر کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے، کیونکہ آہنگ غالب اور آہنگ اقبال میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے، غالب کا کوئی شعر بانگ درا یا بال جبرئیل میں شامل کرلیا جائے، وہ اجنبی سا لگے گا، اقبال کا انداز خطیبانہ ہے، اس میں مغربی موسیقی، جذبۂ حریت اور دعوت انقلاب کا جوش وخروش ہے، وہ کہتے ہیں:

مری فغاں سے رست خیز کعبہ وسومنات میں

----

[350] دیباچہ کلیات اقبال ص۹، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک

مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایان خانقاہی
انھیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگ آستانہ

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کرانہ

جبکہ غالب کے لہجے میں سوز و گداز ہے، فقر و مسکنت ہے، پسپائی اور شکستگی ہے اور درد و غم کی فراوانی ہے، غالب فرماتے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ

مبارکباد اسدؔ غم خوار جان درد مند آیا

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار، غیر ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

قید حیات وبند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے

کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ

تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

میر تقی میرؔ کی شاعری بھی اسی غم ویاس کا نقطۂ عروج ہے اور مرزا غالبؔ نے اسی تصویر درد میں فلسفیانہ اور متصوفانہ رنگ بھرے ہیں، میرؔ فرماتے ہیں:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　　آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں　　　تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

سبز ان تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھئے تو واں نہیں سایہ درخت کا

جوں برگہائے لالہ پریشان ہو گیا
مذکور کیا ہے اب جگر لخت لخت کا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا　　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو　　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

کس کا کعبہ ،کیسا قبلہ ،کون حرم ہے، کیااحرام
کوچے کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سفید وسیاہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میرؔ کے دین ومذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا ، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد
ابھریں گے عشق دل سے ترے راز میرے بعد

شمع مزار اور یہ سوز جگر مرا
ہر شب کریں گے زندگی ناساز میرے بعد

بیٹھا ہوں میرؔ مرنے کو اپنے میں مستعد
پیدا نہ ہونگے مجھ سے بھی جانباز میرے بعد

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے
آتش غم میں دل بھنا شاید — دیر سے بو کباب کی سی ہے
دیکھیئے ابر کی طرح اب کے — میری چشم پر آب کی سی ہے

شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہوتی ہے

دراصل ہر شاعر اپنے عہد کے حالات کا اسیر ہوتا ہے اور اس کی شاعری میں اس کی

زندگی اوراس کے دور کا عکس موجود ہوتا ہے، میرؔ وغالبؔ کا دور اسلامی ہندوستان کے انتہائی خلفشار اور زوال کا تھا اور مقابل طاقت نے اپنی برتری کا سکہ ساری دنیا سے منوالیا تھا، اور روز افزوں مسائل ومشکلات کے حل کے لئے تدبیر کے ناخنوں کا فقدان تھا، قنوطیت کا تاریک سایہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا، میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کی شاعری انہی ظلمتوں اور مایوسیوں کی تصویر پیش کرتی ہے۔

جب کہ اقبالؔ کا دور نشاۃ نو کی تشکیل کا ہے، جب مسلمان مایوسیوں سے نکل کر اوپر اٹھنے کی کوشش کررہے تھے، اور ایک نئے مستقبل کی تعمیر کا منصوبہ بنارہے تھے، اس وقت ضرورت تھی للکار کی، اسلام کی حوصلہ افزاء تعلیمات اور قرآنی بشارتوں کو پیش کرنے کی، اقبالؔ کی شاعری اسی ضرورت کی تکمیل تھی۔

آہؔ کے یہاں ہر رنگ وآہنگ

حضرت آہؔ کا دور بھی یہی ہے، یہ اضطراب اور بے یقینی کا دور تھا، مسلمانوں کا سفینہ ایسے گرداب میں تھا جس سے نکلنے کے لئے حوصلوں کی ضرورت تھی، مگر مسلمانوں کی سیاسی قیادت ایسے مضبوط اور مخلص ہاتھوں سے محروم تھی، خدا سے نصرت کی امید بھی جاگتی تھی اور کبھی مایوسی کی لہر بھی پھیل جاتی تھی، قرآن وحدیث میں خدائی وعدے اس کو آگے کی طرف کھینچتے تھے، اور قوم کی بے عملی اور مخالف ہوائیں اس کو پیچھے ڈھکیل دیتی تھیں، آہؔ کی شاعری میں دونوں کا عکس موجود ہے، ان کے خون میں اقبالؔ کا جوش وولولہ بھی ہے اور میرؔ وغالبؔ کا درد بھی ہے، حالات کی ستم ظریفیوں کا شکوہ بھی ہے، اور وعدۂ ربانی پر یقین بھی ہے، عزم سفر بھی ہے اور خطرات کا اندیشہ بھی، میرؔ کا غم جاناں اور غالبؔ کا غم دوراں بھی ہے اور اقبالؔ کا طوفانوں سے ٹکرانے والا حوصلہ بھی، آہؔ کے کلام میں دونوں تصویریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، دیکھئے ان کے درج

ذیل اشعار:

میرے نالوں کو سن کے وہ بولے
ایسی پر درد آہ کس کی ہے

خوگر درد کو بے درد نہیں آتا چین
اک سکوں ہوتا ہے جب درد جگر ہوتا ہے

امارت سے مجھ کو سروکار ہے کیا
طبیعت ہی غربت کی پالی ہوئی ہے

مری تربت پہ افسردہ دلی کا دیکھ لو نقشہ
کہ جتنے پھول ہیں مرجھائے ہیں جو شمع ہے گل ہے

کمال درد کی لذت کا یہ کرشمہ ہے
ہزار رنج میں بھی دل کو شادماں دیکھا

اے جنوں تیری بدولت تو ہوئی سیر نصیب
دائمی رنج و الم دیکھا زمانہ دیکھا

کہتا ہے درد عشق کہ سر ہے برائے دوست
دل ہے برائے دوست جگر ہے برائے دوست
المختصر یہ حال ہے خانہ خراب کا
غم ہے الم ہے آہِ سحر ہے برائے دوست

ہمارا نالہ پر درد سن کے فرمایا
اسی حزیں کی ہے آواز ناتواں کی طرح

ان اشعار میں درد کی کراہ اور آہوں کی سسکیاں صاف طور پر سنائی دیتی ہیں۔ دوسری جانب حوصلوں سے لبریز شاعری کے نمونے دیکھئے جس میں ان کی امیدوں کی حرارت اور انقلابی جذبات کی تپش واضح طور پر محسوس ہوتی ہے:

کرو شکر اس خدا کا جس نے دی ہے تم کو یہ دولت
تغیر کے تسلسل میں یہاں کی ہے ہر اک حالت
نہیں رہنے کی یہ حالت نہیں ملنے کی یہ مہلت
غنیمت ہے ملی ہے جس قدر یہ زیست اور صحت
یہاں رہ کر وہاں کے واسطے بھی کام کچھ کر لو
بہت لمبا سفر ہے زاد کچھ تو باندھ کر دھر لو

تم اٹھالو ہاتھ میں پھر دوش خالدؓ کا علم
زور حیدرؓ کا دکھادو اور عثمانؓ کا حشم

تم کو ہے کس بات کا کھٹکا بتاؤ کیا ہے غم
ساری دنیا سے زیادہ ہو کسی سے کب ہو کم
اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو
شیر نر بھی کانپتے ہیں تم سے اے شیر نبرد
کاخ کسرے کو مٹا کر کر دیا جب تم نے گرد
کیا تمہارے سامنے ہیں دشمنان روئے زرد
گرم جوشی تم کرو اغیار کی اب جلد سرد
اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

گو کہ آہ کے یہاں غالب واقبال جیسی بلند خیالی اور فلسفیانہ گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن مجموعی طور پر معاصر شعراء میں آہ کی شاعری ندرت خیال، زبان وبیان کی شگفتگی، فکر کی پاکیزگی، رمزیت، معنویت اور موسیقیت کے لئے ایک انفرادیت رکھتی ہے، اور اس کا احساس بغیر کسی تعلی کے خود ان کو بھی ہے، فرماتے ہیں:

کس طرح کہوں فخر زمانہ ہوں میں　　　مجموعۂ فن دیکھو یگانہ ہوں میں

یہ بھی ہے کمالوں کی مرے پختہ دلیل
افلاک کے تیروں کا نشانہ ہوں میں

ہزار حیف کہ اس نے نہ مدعا سمجھا
مرا کلام ہے دشوار چیستاں کی طرح

آپ نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شاعری کی ہے، گو کہ اردو کے مقابلے میں عربی اور فارسی کا ذخیرہ بہت مختصر ہے، لیکن جو بھی ہے اس سے ان کی زبان دانی، اور شاعرانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، عام طور پر نعت پاک یا قصیدہ و مرثیہ کے لئے آپ نے عربی و فارسی زبان استعمال کی ہے، اور تمام فنی نزاکتوں کا لحاظ رکھا ہے۔

عربی شاعری کے نمونے

عربی شاعری کے نمونے دیکھئے:

رسول اللہ ﷺ کے دربار اقدس میں خراج عقیدت پیش فرماتے ہیں

حان ان نثنی علیٰ خیرالوریٰ　　الذی نارت بہ شمس الہدیٰ
قد اری من نورہ یجلو القمر　　بل رأیت الشمس ایضاً ہٰکذا
قوت قلبی ذکرہ بل فکرہ　　رَوح روحی وصلہ و ا حسرتاہ
قد رای و اللہ انوار الالہ　　من رای انوار ذاک المرتضیٰ

ترجمہ: اب وقت آیا ہے کہ خیر الخلائق ﷺ کی ثنا خوانی کریں، جن کی روشنی سے آفتاب ہدایت منور ہوا، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شمس و قمر سرکار دوعالم ﷺ کے نور سے روشن ہیں، آپ کی یاد اور آپ کا پاک خیال میرے دل کی غذا ہے، اے کاش! میری روح کی زندگی اور تازگی آپ کے وصل سے وابستہ ہے قسم بخدا! جس نے ذات مرتضیٰ ﷺ کا نور دیکھا اس نے گویا انوار الٰہی کا مشاہدہ کیا۔

☆ اپنے استاذ جلیل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے وصال پر مرثیہ تحریر فرمایا جس کا ایک بند یہ ہے:

کیف لااصلی بنار الہم اذ لم یبق لی
من شیوخ اوعطوف ذی صلاح او کریم
مات قطب الوقت شیخ الہند محمودالحسن
قیل لی سبا روحہ فازت بجنات نعیم

ترجمہ: میں آتش غم میں کیوں کر نہ پگھلوں جب میرا کوئی شیخ مصلح اور سرپرست باقی نہیں رہا، قطب وقت حضرت شیخ الہند محمود الحسنؒ کی وفات ہوئی تو ہاتف غیبی نے مجھ سے کہا کہ ان کی روح باغ جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔

فارسی شاعری کے نمونے

☆فارسی زبان میں حضرت آہ کی طویل نعت موجود ہے، جس میں ذات رسالت مآب ﷺ کے مختلف مقامات وصفات پر روشنی ڈالی گئی ہے، مثلاً:

اے کہ از نامت نمایاں جاہ وفخر سروری
رفت صیت خلق تو بالائے چرخ چنبری

روئے تو نورالہدیٰ بدرالدجیٰ شمس الضحیٰ
ذات تو در علو رشک گنبد نیلو فری

فضل تو در ذات پنہاں مثل باراں در سحاب
حلم از رویت جلی چوں حسن از حور و پری

زانتقاش نقش پایت فخر ہادارد زمیں
وز غبار راہوارت چرخ راایں برتری

سابع ارض شعیرہ نسبتے دارد بارض
ہم چنیں نسبت بہ تو دارد فلک در برتری

پا یگاہت برتر از پرواز طیر عقل کل
زاآستانت مفتخر شد قصر ترک وقیصری

من چہ دانم تا بگویم وصف تو اے کان جود
لیک از بہر سعادت کردم ایں مدحت گری

☆حضرت شیخ الہند کے فارسی مرثیہ کا ایک بند ہے:

نالہا بگذشت از چرخ بریں

ز انتقال حامی دین متیں

از سر دل سال رحلت گفت آہ

مات محمود الحسن موت الیقین

☆حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی ؒ کی وفات پر ایک پر تاثیر مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

مہ غم رسید وشب بستم آہ کہ بربست رختش بحکم حکیم

چو رفتند آمد بگوشم ندا مکیں شد معزز بخلد نعیم

☆ شیخ محبوب علی مرحوم کا مرثیہ بھی فارسی زبان میں ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں:

حیف صد حیف آنکہ بُد مشہور در آفاقہا

با مروت بے ریا کان عطا بحر سخا

روز عاشورہ پدید او بست سامان سفر

سایۂ لطف اتم ہیہات شد از ماجدا

جملہ افتادند از رنج والم در شور و شین

شد زمین و آسماں ہم چوں زمین کربلا

چوں ز بے ہوشی بہ ہوش آمد دل صد چاک من

جستجوئے سال رحلت کردم از بہر بقا

اس طرح آہ نے اردو کی طرح عربی اور فارسی میں بھی اپنے فن کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

شاعری کی قسمیں

اس کے بعد آیئے آہ کی شاعری پر ذرا فکری اور فنی اعتبار سے ایک نظر ڈالیں، آہ نے ہیئتی اور موضوعی (معنوی) اکثر اصناف سخن کو اپنے اظہار خیال کا محور بنایا ہے۔

شاعری دو قسم کی ہوتی ہے (۱) داخلی شاعری (۲) اور خارجی شاعری،

داخلی شاعری و خارجی شاعری

داخلی شاعری کو ذاتی شاعری بھی کہا جاتا ہے جس میں شاعر خود اپنی ذات میں موضوعات کی تلاش کرتا ہے، اور اپنے ہی جذبات، احساسات اور خیالات کو الفاظ کا پیکر دیتا ہے، اگر شاعر اپنے کلام کا مواد بیرونی دنیا میں تلاش کرے، اور گردوپیش کے حالات، وسیع کائنات یا مناظر فطرت کو شاعری کا موضوع بنائے تو اہل فن کی اصطلاح میں یہ خارجی شاعری کہلاتی ہے۔

اصناف شاعری میں غزل اور رباعی اسی طرح مرثیہ کی ایک قسم شخصی مرثیہ عموماً داخلی عناصر کا احاطہ کرتی ہے، کیونکہ ان میں اکثر شاعر اپنے داخلی جذبات واحسات کا اظہار کرتا ہے، خارجی دنیا اور گردوپیش کے مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں تو اپنے جذبات کے آئینے میں ان کی تصویر کشی کرتا ہے، ان کے علاوہ اصناف خارجی شاعری کے زمرہ میں آتی ہیں۔

اصناف سخن

شاعری کے مواد اور موضوعات کے لحاظ سے یہ عمومی تقسیم ہے، لیکن اگر شاعری کے اصناف کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تقسیم دو اعتبار سے کی گئی ہے:

(۱) ہیئت وساخت کے لحاظ سے، یعنی مصرعوں کی ساخت وپرداخت، الفاظ کی تراکیب ،جملوں کی نشست وبرخاست، عروض وقوافی اور بحور واوزان کے لحاظ سے اشعار کو مختلف زمروں

میں تقسیم کیا گیا ہے، مثلاً قطعہ، فرد، مثنوی،، رباعی، مسمط، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع، معشر، ترجیع بند، ترکیب بند،، مستزاد، تضمین وغیرہ۔

(۲) موضوع و معنٰی کے لحاظ سے: جس میں ہیئت سے زیادہ معنٰی اور موضوع تقسیم کی بنیاد بنتے ہیں، مثلاً: حمد، نعت، نظم، قصیدہ، منقبت، مناجات، مرثیہ، نوحہ، غزل، شہر آشوب، صلوٰۃ وسلام، واسوخت، گیت، دوہا، ماہیا اور ریختی وغیرہ، البتہ ان میں کچھ اصناف ایسی بھی ہیں جن میں ہیئت و موضوع دونوں ملحوظ ہوتے ہیں اور کسی ایک کا لزوم نہیں ہوتا ان کو موضوعی ہیئتی اصناف کا نام دیا جاتا ہے، مثلاً کئی حضرات نے قصیدہ اور مثنوی کا شمار اسی صنف میں کیا ہے، اس لئے کہ قصیدہ کسی بھی ہیئت شعری میں کہا جاسکتا ہے اسی طرح مثنوی کی ہیئت میں کوئی بھی مضمون باندھا جاسکتا ہے [351]۔

ان میں سے ہر ایک کی تشریح کی جائے تو مضمون کافی بوجھل ہوجائے گا، تفصیلات اردو تاریخ وادب کی کتابوں میں موجود ہیں، یہاں صرف چند اصناف سخن کی روشنی میں کلام آہؔ کا ایک ادبی مطالعہ پیش کرنا مقصود ہے، اگر چیکہ یہ کتاب - جیسا کہ ان کے دیوان ناتمام کی سرگذشت کے ضمن میں پہلے عرض کرچکا ہوں-حضرت آہؔ کے کلام کا مکمل مجموعہ نہیں ہے، بہت سی چیزیں ضائع ہوگئیں اور کئی چیزیں بعض مصلحتوں سے قابل اشاعت نہیں سمجھی گئیں [352]

---

[351] ۔مختصر تاریخ اردو ادب اور اصناف شعری، مؤلفہ ڈاکٹر سیدہ زہرہ بیگم ص ۱۶۷ ناشر بوستان اشہر حیدرآباد ۲۰۰۵ء۔

[352] ۔پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ کلیات جس کو حضرت آہؔ نے دیوان کا نام دیا تھا، اور حروف تہجی کی ترتیب پر اپنے خوشخط قلم سے اس کو لکھنا شروع کیا تھا، اس میں جگہ بجگہ حک وفک اور تصحیحات واصلاحات خود انہی کے قلم سے موجود ہیں، لیکن اس مسودہ کے تیار ہونے سے پہلے ہی وقت موعود آپہونچا، اور وہ واصل بحق ہوگئے۔

اس طرح یہ دیوان مکمل نہ ہوسکا، اور شعر وشاعری اور علم وادب کا وہ متاع گرانمایہ جو ان کے ذہن ودماغ یا متفرق کاغذات میں محفوظ تھا زیب قرطاس ہونے سے رہ گیا، دس (۱۰) سے زیادہ حروف تہجی پر کوئی شعر نہیں آسکا، اور ان کی شاعری پر یہ کام بھی اتنی تاخیر سے شروع ہوا کہ وہ متفرق کاغذات بھی میسر نہ آسکے۔۔۔۔اب ہم فنی طور پر اس

، بااین ہمہ اس کلیات میں اردو شاعری کی اکثر اصناف شعری کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا گیا ہے ،اس ضمن میں بطور نمونہ ہیئت و موضوع دونوں اصناف میں سے کچھ چیزیں پیش کی جارہی ہیں، جن سے اس کلیات کی جامعیت اور معنویت کا اندازہ ہو گا:

ہیئتی اصناف شاعری

قطعہ

قطعہ کے لغوی معنیٰ ہیں "ٹکڑا" یا کاٹا ہوا" ادبی اصطلاح میں قطعہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو ظاہری طور پر غزل یا قصیدہ کا کٹا ہوا حصہ معلوم ہو، قطعہ میں کم سے کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ سترہ (۱۷) اشعار ہوتے ہیں، بعض شعراء کے یہاں اس سے زائد اشعار بھی قطعہ میں ملتے ہیں، قطعہ کے اشعار معنیٰ کے اعتبار سے مربوط اور مسلسل ہوتے ہیں، قطعہ میں عموماً مطلع نہیں ہوتا[353]۔

قطعہ فارسی سے اردو میں آیا، ہر عہد کے شعراء نے اس صنف کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے مثلاً شہر دہلی کے بارے میں میرؔ کا مشہور قطعہ ہے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!

ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دیوان ناتمام کو دیوان نہیں کہہ سکتے تھے، اسی لئے میں نے بعض اہل علم و نظر (جن میں میرے ماموں جان، صاحب دیوان شاعر، ناقد و ادیب جناب مولانا محی الدین سالکؔ صاحب فاضل دیوبند سابق آر ڈی ڈی در بھنگہ کمشنری و اسپیشل ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم حکومت بہار سر فہرست ہیں) کے مشورہ سے اس مجموعۂ کلام کا نام کلیات آہؔ تجویز کیا۔

353 ۔اردو شاعری کا فنی ارتقا ،ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۴۱ ؁ عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی ۱۹۹۸ء۔

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

بستے تھے جہاں منتخب ہی روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اسی طرح اکبر آلہ آبادی کا مشہور قطعہ ہے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں

اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا

کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آہ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے:

یہی خیال تھا عہد وفا کریں گے ہم

کسی کے عشق میں مر کے جیا کریں گے ہم

نگاہ غور سے دیکھا تو یہ نظر آیا

عذاب حال میں نہ دل مبتلا کریں گے ہم

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ

علم و فن میں یگانہ ہیں ہم لوگ

چٹکیوں میں اڑا دیں گے دشمن کو

توپ کے پیش دہانہ ہیں ہم لوگ

آہ نے متعدد شخصیات کی تاریخ وفات پر بھی کئی قطعات لکھے ہیں، مثلاً:

تھا مری تقدیر میں لکھا جو غم ‏ ‏ چل بسا وہ دل ربا سوئے ارم

سال رحلت آہ جب یاد آگیا ‏ ‏ منہ سے نکلا میرے ہائے رنج و غم

(۱۳۱۵ھ)

فرد

"فرد" کے لغوی معنٰی ایک کے ہیں، ادبی اصطلاح میں ایک شعر یا دو مصرعوں کو فرد کہتے ہیں، ان میں مصرعوں کی پابندی نہیں ہوتی، یہ دونوں مصرعے ہم قافیہ بھی ہوسکتے ہیں اور مختلف القافیہ بھی، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں اچانک کوئی اچھا شعر آجاتا ہے، مگر مزید اشعار نہیں ہوپاتے، اس لئے وہ بیت کی طرح تنہا رہ جاتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غزل کا ہر شعر مطلع کے علاوہ اپنی جگہ فرد ہوتا ہے، لیکن محققین فن نے اس کو غلط قرار دیا ہے [354]

فرد کی مثال میں محی الدین مخدومؔ کا یہ مشہور شعر پیش کیا جاسکتا ہے:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

آہؔ کے مجموعۂ کلام میں بھی ایک فرد ہمیں ملتا ہے، جو انہوں نے مرحومہ شرف النساء بنت محمد مصطفٰے کی تاریخ وفات پر کہا ہے:

بزیر خاک چوں جائے نہاں یافت

شہید ایں حیات جاوداں یافت (۱۳۵۵ھ)

---

354 ۔ مختصر تاریخ اردو ادب ص ۲۱۴۔

مثنوی

"مثنوی" کے معنیٰ لغت میں دو جز والی چیز کے ہیں، یہ لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ ہیں ہو بہو یا نقل، کیونکہ مثنوی کے ہر شعر میں مصرعۂ اولیٰ مصرعۂ ثانی کا مثنیٰ ہوتا ہے۔۔۔

ادب کی اصطلاح میں مثنوی ایسی طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی عشقیہ داستان یا تاریخی واقعہ بیان کیا جائے، اس کا مضمون مسلسل یا مربوط ہوتا ہے۔۔۔ مثنوی کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن ہر شعر کا قافیہ جداگانہ ہوتا ہے، اس میں قافیہ کے ساتھ ردیف کا لزوم بھی نہیں ہے، اس طرح خیالات کے اظہار کے لئے اس صنف میں بڑی سہولت ہے، اور شاعر طویل سے طویل نظم کہتا چلا جاتا ہے۔

یہ صنف بھی فارسی سے آئی ہے، اور ملا وجہی، میر تقی میر، میر حسن، پنڈت شنکر نسیم، مرزا شوق، محمد حسین آزاد اور علامہ حالی جیسے ممتاز شعراء نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، خاص طور پر میر حسن کی سحر البیان کو اس صنف میں کافی شہرت حاصل ہوئی، جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ
بہت حشمت و جاہ و مال و منال — بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال
کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج — خطا اور ختن سے وہ لیتا خراج

بعد کے ادوار میں محمد حسین آزاد اور علامہ حالی نے اس کو وسعت دیتے ہوئے اس میں اخلاقی مضامین بھی شامل کئے۔

حضرت آہ نے بھی اسی روش پر چلتے ہوئے محبوب سے ہم کلامی کے علاوہ اخلاقی مضامین کو بھی موضوع بنایا، اور کئی طویل مثنویاں لکھیں مثلاً:

☆رفیقۂ حیات کے نام ایک منظوم خط میں اپنی بے قراری اور رخصت نہ ملنے کی داستان اس طرح رقم فرمائی:

اے سراپا محبت و خوبی　　گوہر بحر حسن و محبوبی
شمع محفل سکون پروانہ　　رنگ گل اور بوئے مستانہ
محرم راز و جان آہ حزیں　　مرہم زخم دل جگر کی مکیں
تم سلامت رہو ہزار برس　　با کرامت رہو ہزار برس
تیسرا خط یہ نظم کرتا ہوں　　فسخ آنے کا عزم کرتا ہوں
کچھ تو بیمار و ناتواں ہوں میں　　بیکسی میں پڑا یہاں ہوں میں
گذریں گی مدتیں کئی دن کی　　رات کٹتی ہے جیسے کمسن کی

☆اسی طرح دنیا کی بے ثباتی پر ایک طویل نظم لکھی ہے جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

جہان بے بقا کی دوستو! ہر چیز فانی ہے
تنفس کی طرح ہر شے یہاں کی آنی جانی ہے
غرض ہونا یہاں کا اک نہ ہونے کی نشانی ہے
تمہیں دیکھوں کہاں وہ شوکت نوشیروانی ہے
نظر آتے ہیں جو نقشے یہ سارے مٹنے والے ہیں
اجل نے دھکے دے دے کر ہزاروں کو نکالے ہیں

☆مسلم نوجوانوں کے لئے آپ کی طویل انقلابی نظم بھی اسی صنف میں لکھی گئی ہے:

جلد اعداء وطن کا منہ عدم کو موڑ دو
کوہ بھی حائل اگر ہو بیچ میں تو توڑ دو

جو دکھائے آنکھ تم کو آنکھ اس کی پھوڑ دو
موت سے اغیار کے رشتے کو اٹھ کر جوڑ دو

رباعی

رباعی "ربع" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ چار کے ہیں، یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے اسے رباعی کہتے ہیں، اس کا قدیم فارسی نام "چہار بیتی" بھی ہے، پھر اس کو "دو بیتی" اور "ترانہ" بھی کہا گیا ہے[355]۔

رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا لازم ہے، تیسرا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہو جائے تو کوئی عیب کی بات نہیں، البتہ جس رباعی میں تین مصرعے ہم قافیہ ہوں اس کو ادبی زبان میں "خصی رباعی" کہتے ہیں اور جس میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں اس کو "غیر خصی رباعی" کہتے ہیں، "خصی" ناقص کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، رباعی کے چاروں مصرعوں میں ایک ہی خیال کی بندش ہوتی ہے، رباعی میں مستعمل ہر لفظ بامعنیٰ ہوتا ہے اسی لئے یہ مختصر ترین ہونے کے باوجود مشکل ترین صنف مانی جاتی ہے، رباعی کا سارا حسن چوتھے مصرعہ پر منحصر ہوتا ہے، شاعر اس کی بندش میں اپنی پوری قوت بیان صرف کر دیتا ہے۔۔ رباعی مخصوص بحر ہی میں کہی جا سکتی ہے، بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر:

> "علم عروض کے ماہروں نے بحر ہزج سالم سے جو مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن ہے دس (۱۰) ارکان نکالے ہیں اور انہیں رباعی کے لئے مخصوص کر دیا ہے، ان میں ایک رکن سالم آتا ہے، اور باقی نو (۹) زحافات کے ساتھ[356]۔

---

[355] دکنی رباعیات ص ۳ مؤلفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر مطبوعہ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۷۶ء۔

صنف رباعی فارسی سے اردو میں آئی، اور جنوبی ہندوستان سے اس کا آغاز ہوا، پہلے رباعی گو شاعر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز مانے جاتے ہیں، جنوب میں امجد حیدرآبادی نے اس میں زبردست شہرت حاصل کی، ان کی یہ رباعی زبان زد خاص وعام ہے:

ہر چیز مسبب سے سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

شمالی ہندوستان کے اکثر بڑے شعراء نے بھی رباعیات کہی ہیں اور اس صنف کو بام عروج تک پہونچایا ہے، حضرت آہ نے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا اور پیش رو شعرا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت ہی کامیاب رباعیات تحریر فرمائیں، مثلاً:

مدت سے ہے تجھ پر بدگمانی ساقی — مستوں سے ہے بے جا لن ترانی ساقی
صدقے میں جوانی کے کرم ہو تیرا — دے دے کوئی جام ارغوانی ساقی

بادل کی گرج ہے زندگانی ساقی — بجلی کی چمک ہے نوجوانی ساقی
لمحے ہیں یہی پینے پلانے کے چند — لا جلد شراب شادمانی ساقی

مل جائے جو حور آسمانی ساقی — پیری میں ہو لطف نوجوانی ساقی
مستی میں شراب شوق مل جائے اگر — چلتا رہے جام ارغوانی ساقی

---

356 ۔دکنی رباعیات ص ۱۴ امؤلفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔

ساقی کی جو آنکھوں کا کرشما دیکھے　　چلتے ہوئے جادو کا تماشا دیکھے
مستی میں چھلک جائے جو ساغر کوئی　　ہر قطرہ میں عرفان کا دریا دیکھے

کیونکر نہ کہوں غربت وطن ہے اے آہ
جب اہل وطن کو سوئے ظن ہے اے آہ
کانٹے کی طرح مجھ کو نکالا صد حیف
اعداء کو مبارک یہ چمن ہو اے آہ

عاقل نہ خردمند نہ فرزانہ ہے　　ہر شمع جمال کا جو پروانہ ہے
کس طرح سے سمجھائیں دل وحشی کو　　میخانہ الفت کا یہ دیوانہ ہے

مسمط

"مسمط" تسمیط سے مشتق ہے، اس کے معنٰی ہیں موتی پرونا، مسمط ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کئی بند ہوں، اور تمام بندوں کے مصرعوں میں وزن اور بحر تو یکساں ہو، لیکن ہر بند کے مصرعے قافیہ کے لحاظ سے مختلف ہوں، نظم کے بندوں میں اگر مصرعے طاق یعنی تین، پانچ، سات کی تعداد میں ہوں تو ہر بند کا آخری مصرعہ قافیہ کے اعتبار سے یکساں ہوگا، اور اگر مصرعوں کی تعداد جفت یعنی چار اور چھ ہو تو ہر بند کا آخری مصرعہ مختلف القافیہ ہوگا، اس لحاظ سے مسمط کی کئی قسمیں ہو جاتی ہیں، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع اور معشر، ان میں ابتدائی چار قسمیں اردو شاعری میں زیادہ مستعمل اور معروف رہی ہیں، بقیہ اقسام کا استعمال

اردو میں بہت کم ہوا ہے،۔۔۔۔

حضرت آہ کے کلام میں مثلث (تین بند) اور مربع (چار بند) بھی موجود نہیں ہیں ،ان کے یہاں صرف مخمس اور مسدس کا استعمال ہوا ہے۔

مخمس

"مخمس" عربی لفظ "خمسۃ" سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ہیں پانچ (۵)، شعری اصطلاح میں مخمس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور دوسرے بند سے ابتدائی چار مصرے ایک ہی قافیے میں ہوتے ہیں اور پانچواں مصرعہ مطلع کے قافیہ کی پابندی کرتا ہے، کبھی ساری نظم میں پانچواں مصرعہ بہ تکرار ملتا ہے[357]۔

نظیر آکبر آبادی کی زیادہ تر نظمیں مخمس میں ملتی ہیں جن میں زیادہ تر پانچویں مصرعہ کی تکرار کی گئی ہے، مثلاً ان کی مشہور نظم "آدمی نامہ" کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

دنیا میں بادشاہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

زردار بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

علامہ اقبال نے ہندوستانی بچوں کا قومی گیت بھی مخمس ہی میں لکھا ہے، جس کا ایک بند یہ ہے:

---

357 ۔مختصر تاریخ اردو ادب ص ۲۱۰۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

حضرت آہ نے بھی اس صنف میں بہترین نمونے چھوڑے ہیں، ایک نظم سے چند بند ملاحظہ کریں:

ہے تمہارا ہر نقب آفاق میں خیبر شکن
چیر ڈالے تم نے آسانی سے شیروں کے دہن
اب ہو تم خاموش کیوں بیٹھے ہوئے اے جان من
ہاتھ میں شمشیر لے لو باندھ لو سر سے کفن
اے میرے پیر وجواں آگے بڑھو آگے بڑھو
تم اٹھالو ہاتھ میں پھر دوش خالدؓ کا علم
زور حیدرؓ کا دکھادو اور عثمانؓ کا حشم
تم کو ہے کس بات کا کھٹکا بتاؤ کیا ہے غم
ساری دنیا سے زیادہ ہو کسی سے کب ہو کم
اے میرے پیر وجواں آگے بڑھو آگے بڑھو
شیر نر بھی کانپتے ہیں تم سے اے شیر نبرد
کاخ کسرے کو مٹا کر کردیا جب تم نے گرد

کیا تمہارے سامنے ہیں دشمنان روئے زرد

گرم جوشی تم کرو اغیار کی اب جلد سرد

اے میرے پیر وجواں آگے بڑھو آگے بڑھو

مسدس

یہ لفظ سدس سے مشتق ہے ،اس کے معنی "چھ " کے ہیں ،ادب کی اصطلاح میں مسدس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے ابتدائی چار مصرعے ہم قافیہ اور دو مصرعے نئے قافیے کے ساتھ ہوں ، لیکن مطلع میں عموماً پورے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ،علامہ حاؔلی کی نظم "مدوجزر اسلام "پوری مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے ،اسی لئے یہ "مسدس حاؔلی" کے نام سے مشہور ہے ،اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا

مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا

کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں

کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

میر انیسؔ کا شہرۂ آفاق مرثیہ بھی تقریباً اسی ہیئت میں ہے، دیکھئے نمونہ:

جب کہ خاموش ہوئی شمع امامت رن میں

دن کو پیدا ہوئی ظلمت کی علامت رن میں

اور تڑپنے لگا وہ سرو سا قامت رن میں
صاف ظاہر ہوئے آثار قیامت رن میں
چرخ ہلتا تھا زمیں خوف سے تھراتی تھی
نالۂ فاطمہ زہرا کی صدا آتی تھی

حضرت آہ کا شعری سرمایہ بھی قیمتی مسدسات سے مالامال ہے، انہوں نے کئی نظمیں اس ہیئت میں لکھی ہیں، چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

اسی کی ذات واحد ہے قدیم و باقی و قائم
جو تھا پہلے ازل سے اور رہے گا اک وہی قائم
جہاں کے ظالم وسفاک وجابر منعم وناعم
شریف وخود پسند و بے نوا اور زاہد و صائم
عزیز اور آشنا اغیار اور احباب جتنے ہیں
ذرا یہ بھی تو دیکھ ان سب میں تیرے دوست کتنے ہیں

بھرا ہے یہ جو سودائے ہوس ایک ایک کے سر میں
پھنسا رکھا ہے جس نے کر کے حیراں ایک چکر میں
نہ آسائش سفر میں دے نہ دم لینے دے یہ گھر میں
قضائے ناگہانی سے نکل جائے گا دم بھر میں
گھڑی جب آنے والی آگئی سب بھول جائیں گے
دکھایا جب منہ اس نے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے

کرو شکر اس خدا کا جس نے دی ہے تم کو یہ دولت
تغیر کے تسلسل میں یہاں کی ہے ہر اک حالت
نہیں رہنے کی یہ حالت نہیں ملنے کی یہ مہلت
غنیمت ہے ملی ہے جس قدر یہ زیست اور صحت
یہاں رہ کر وہاں کے واسطے بھی کام کچھ کر لو
بہت لمبا سفر ہے زاد کچھ تو باندھ کر دھر لو

(نظم بے ثباتی عالم)

نظم "مرثیہ محبوب" بھی اسی ہیئت میں ہے، اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

مانا کہ خلد میں ہے تمہیں عافیت ہزار
مانا کہ زیر حکم ہیں حوران گل عذار
مانا نظر فروز تمنا ہے سبزہ زار
مانا کہ دل فریب ہے لطف گل و بہار
لازم تھا چھوڑنا مجھے تنہا تمہیں کہو
آخر وفا ہے نام اسی کا تمہیں کہو

سوز دروں نے مجھ کو جلا کے کیا ہے خاک
اڑتے ہیں شعلے دل سے تو اوروں پہ ہے تپاک
دامن کی طرح سینہ بھی اپنا ہے چاک چاک
دیکھیں تو رحم کرتا ہے کب تک خدائے پاک

فصل خزاں میں بھی مجھے سودا کا جوش ہے
اک بے خودی سی ہے نہ خرد ہے نہ ہوش ہے

ترجیع بند

"ترجیع بند" ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ ہو، ترجیع کے معنٰی لوٹانا ہیں، اس میں ہر بند کے آخر میں ایک شعر پہلے اشعار ہی کا ہم وزن ہوتا ہے، لیکن ہم قافیہ نہیں ہوتا، یہ شعر ہر بند کے بعد دہرایا جاتا ہے، جس کو "ٹیپ کا شعر" کہتے ہیں ہر بند کے اشعار قافیہ اور ردیف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، کبھی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ ٹیپ کے شعر کے بجائے ٹیپ کا مصرعہ دہرایا جائے، بہت سے شعراء نے اس ہیئت میں شاعری کی ہے، آہ کے یہاں بھی ترجیع بند اشعار موجود ہیں:

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو
تھام لو قومی نشاں آگے بڑھو آگے بڑھو

جلد اعداءِ وطن کا منہ عدم کو موڑ دو
کوہ بھی حائل اگر ہو بیچ میں توتوڑ دو

جو دکھائے آنکھ تم کو آنکھ اس کی پھوڑ دو
موت سے اغیار کے رشتے کو اٹھ کر جوڑ دو

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

تم ہو مسلم قوم تم ہو تیغ و خنجر کے دھنی
سب تمہاری چشم کو کہتے ہیں برچھی کی انی

تم ذرا بپھر و تو شیروں پر بھی چھائے مردنی
کیا تمہارے سامنے ہیں ارمنی و جرمنی

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

ترکیب بند

"ترکیب بند" کی تعریف بھی وہی ہے جو ترجیع بند کی ہے ، فرق صرف اتنا ہے کہ ترکیب بند نظم میں میں دہرایا جانے والا ہم وزن شعر ایک نہیں بلکہ مختلف ہوتا ہے، آہ کے ایک مرثیہ کو اس کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے،اس کا ایک بند دیکھئے:

تجھ سے بہار گلشن ہستی تھی میری جان
آباد ایک دن یہی بستی تھی میری جان

کیا اتنے روزوں موت ترستی تھی میری جان
ایسی ہی جان کیا تیری سستی تھی میری جان

کس نے لحد سے تجھ کو ہم آغوش کر دیا
کس نے سدا کے واسطے روپوش کر دیا

اب کون ہے کہ جس کی محبت پہ ناز ہو
اب کون ہے جو محرم اسرار و راز ہو

اب کون ہے کہ جس سے حصول نیاز ہو
اب کون ہے جہاں میں مجھے جس پہ ناز ہو

اب کون ہے کلیجہ سے مجھ کو لگائے کون

ہو میرے سر میں درد تو آنسو بہائے کون

تضمین

"تضمین" کے معنٰی ملانا کے ہیں، شعری اصطلاح میں کسی دوسرے شاعر کے مصرعہ یا بند پر مصرعہ یا بند لگانے کو تضمین کہتے ہیں، تضمین میں شاعر کسی دوسرے شاعر کے شعر کے بعد بھی اور کسی کے شعر سے پہلے بھی اپنے اشعار لگا سکتا ہے، ہر دور کے شعراء نے اپنے سے پہلے شاعر کے مصرعہ یا شعر پر تضمین کا عمل کیا ہے۔

☆مثال کے طور پر نظیر اکبر آبادی کا مشہور شعر ہے:

یہ رنگ برنگی تقریریں، یہ آڑی ترچھی تحریریں

"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا"

☆مرزا غالبؔ نے ناسخؔ کے شعر پر تضمین کی:

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ

"آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میرؔ نہیں"

علامہ اقبالؔ کے یہاں بھی تضمینات بکثرت ملتی ہیں، بانگ درا" میں ایک نظم کا عنوان ہے "تضمین بر شعر انیسی شاملو" اقبالؔ نے ایک فارسی شعر پر پوری نظم کہی ہے:

"وفا آموختی ازم ابکار دیگراں کردی

ربودی گوہرے ازما نثار دیگراں کردی"

ایک نظم ہے "تضمین بر شعر صائبؔ" جس میں صائبؔ کے ایک فارسی شعر پر اقبال نے یہ نظم کہی ہے:

"ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی"

نظم "فردوس میں ایک مکالمہ شیخ سعدی شیرازیؒ کے ایک شعر پر بطور تضمین کہی گئی ہے:

"خرماتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیباتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم"

☆حضرت آہؔ بھی شعراء کی اس معروف سنت کو کہاں نظر انداز کر سکتے تھے، مرزا غالبؔ کا مشہور شعر ہے:

"رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"

آہؔ نے پوری ایک غزل اس شعر پر کہہ ڈالی، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک ہی صورت سے کتنی شکل انساں ہو گئیں
قدرتیں اللہ کی کیا کیا نمایاں ہو گئیں

میں نے پوچھا حسرتیں پوری مری جاں ہو گئیں
قتل کر کے مسکرائے اور کہا ہاں ہو گئیں

کیا کریں گے اب عنادل سیر گلہائے چمن
گرمی آہ وفغاں سے خشک کلیاں ہو گئیں

☆غالبؔ ہی کی مشہور غزل کا ایک شعر ہے:

"نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں"

آہ کے کلام میں اس پر دو مستقل غزلیں موجود ہیں، ایک غزل کا عنوان ہے " یا میرا سر نہیں رہے یا آستاں نہیں " اس غزل کے چند اشعار:

اشکوں کا کب فراق میں سیل رواں نہیں
اس بحر میں حباب سا کب آسماں نہیں

جب وہ فروغ بزم مرا میہماں نہیں
کچھ دل میں حوصلہ نہیں روح رواں نہیں

سودائے زلف کا یہی ٹھہرا ہے اک علاج
یا میرا سر نہیں رہے یا آستاں نہیں

مقطع ہے:

مطلع پڑھوں اک اور کہ ہو حسب حال آہ
بزم سخن ہے دوست ہیں دشمن یہاں نہیں

دوسری غزل کا عنوان ہے:

" میں آشنائے درد ہوں درد آشنا مرا "

اس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

کس دن ترا خیال ہمیں جان جاں نہیں
گذری وہ کون رات کہ آہ و فغاں نہیں

تم مہربان ہو تو کوئی نامہرباں نہیں
دشمن زمیں نہیں ہے عدو آسماں نہیں

ناصح نہ پوچھ مجھ سے مرے رنج و یاس کو
خاطر جو ہو ملول تو ممکن بیاں نہیں

آنکھیں لڑا کے ان سے ہوا سینہ پاش پاش
کھائی وہ چوٹ جس کا تھا وہم و گماں نہیں

اس کا مقطع ہے:

مر مٹ چکے کسی کی محبت میں آہ ہم
ڈھونڈھے سے بھی تو ملتا ہمارا نشاں نہیں

دیوان غالب میں سب سے طویل قطعہ جو تیس (۳۰) اشعار پر مشتمل ہے اس کا آخری شعر ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس کے پہلے مصرعہ پر آہ نے اپنے منظوم نامۂ محبت میں اس طرح تضمین فرمائی:

تم سلامت رہو ہزار برس با کرامت رہو ہزار برس

ایک مشہور شعر ہے:

مریض عشق پر رحمت خدا کی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کلیات آہ میں اسی عنوان کے ساتھ ایک طویل غزل موجود ہے:

کھنچی تلوار اس کافر ادا کی
الٰہی خیر جان مبتلا کی

اڑا لائی ہے بو زلف دوتا کی
بلائیں کیوں نہ لیتے ہم صبا کی

نمود خط سے جانکاہی ہوئی کم
بڑھا کی رات اور حسرت گھٹا کی

جو لیتے ہو تو پہلو میں جگہ دو
یہ قیمت ہے دل درد آشنا کی

تڑپ کر رہ گیا اے آہ کوئی
نگاہ یار نے شاید خطا کی

موضوعی اصناف شاعری

اب موضوعی اور معنوی نقطۂ نگاہ سے بھی "کلام آہ" کا جائزہ لیں کہ آہ نے ان میں سے کن کن اصناف سخن سے تعرض کیا ہے:

حمد

"حمد" کے لغوی معنی تعریف کے ہیں، شعری اصطلاح میں حمد سے مراد وہ نظم ہے جس میں خالق کائنات کی تعریف و توصیف کی گئی ہو اور اس کی عظمت و قدرت اور ذات وصفات کا تذکرہ ہو، کبھی حمد مستقل لکھی جاتی ہے اور کبھی کسی دوسری صنف کی ابتدا میں یا سلسلۂ کلام میں بھی آتا ہے، مثلاً:

☆کلیات میر کا وہ نسخہ جس کو سنبل فراز نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ الفتوح لاہور سے شائع ہوا ہے، اس کا آغاز مستقل حمد سے ہوا ہے، جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

دل رفتہ جمال ہے اس ذوالجلال کا
مستجمع جمیع صفات و کمال کا

ادراک کو ہے ذات مقدس میں دخل کیا
ادھر نہیں گزار گمان و خیال کا

حیرت سے عارفوں کو نہیں راہ معرفت
حال اور کچھ ہے یاانہوں کے حال و قال کا

☆نظیر اکبر آبادی نے خالص حمد مخمس کی ہیئت میں لکھی:

یارب ہے تیری ذات کو دونوں جہاں میں برتری
ہے یاد تیرے فضل کو رسم خلائق پروری

دائم ہے خاص وعام پر لطف وعطا، حفظ آوری

کیا انسیاں، کیا طائراں، کیا وحش کیا جن وپری

پالے ہے سب کو ہر زماں تیرا کرم اور یاوری

☆ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے کلیات کی پہلی غزل حمد کے مطلع سے شروع ہوتی ہے:

ہوا حمد خدا میں دل جو مصروف رقم میرا

الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

بہت سے شعراء نے حمدیہ قصائد اور حمدیہ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔

آہؔ کے کلام میں مستقل حمد تو موجود نہیں ہے، لیکن دوسرے اصناف سخن کے ضمن میں حمدیہ اشعار ملتے ہیں، جن میں باری تعالیٰ کی وحدت وعظمت کا تذکرہ ہے، اور خودساختہ خداؤں پر کاری ضرب لگائی گئی ہے، وحدت انسانی کے حوالے سے مصنوعی امتیازات اور جھوٹی تفریقات سے بیزاری ظاہر کی گئی ہے، اور اس کو ارشاد رحمانی کے خلاف قرار دیا گیا ہے، کیونکہ پورے بزم انسانی کا صدر اور سارے چمنستان عالم کا مالی ایک ہے، اور باغ لگانے والے مالی کو اپنے چمن کے ہر پھول سے یکساں پیار ہوتا ہے:

اسی کی ذات واحد ہے قدیم و باقی و قائم

جو تھا پہلے ازل سے اور رہے گا اک وہی قائم

ملو سب سے محبت سے یہ ہے ارشاد رحمانی

اسی حق نے مزین کی ہے ساری بزم انسانی

مجوسی ویہودی مسلم وہندی ونصرانی

خراسانی و تاتاری وشامی وبدخشانی

لگایا ہے یہ سارا باغ عالم ایک مالی نے
تمہیں تفریق میں ڈالا ہے کس کوتہ خیالی نے

نعت

"نعت" کے لغوی معنٰی بھی مدح وتعریف ہی کے ہیں، البتہ اصطلاح میں نعت اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حضور ﷺ کی مدح وثنا کی گئی ہو، اور آپ کی عظمت شان، اور امتیازات وخصوصیات بیان کی گئی ہوں، نعت بھی کبھی مستقل طور پر لکھی جاتی ہے اور کبھی مختلف اصناف غزل، قصیدہ یا مثنوی کے سلسلے میں بھی شاعر نعت بیان کر سکتا ہے، مثلاً: کلیات میرؔ میں مستقل طور پر دو نعتیں موجود ہیں جن میں کچھ چیزوں کو چھوڑ کر باقی مرکزی خیالات بہت قیمتی ہیں، قدیم شعراء میں میرؔ کی نعت معنوی طور پر سب سے زیادہ باوزن معلوم ہوتی ہے، ان کی ایک نعت کے ابتدائی اشعار دیکھئے:

ہے حرف خامہ دل زدہ حسن قبول کا
یعنی خیال سر میں ہے نعت رسول کا

رہ پیروی میں اس کی کہ گام نخست میں
ظاہر اثر ہے مقصد دل کے وصول کا

وہ مقتدائے خلق جہاں اب نہیں ہوا
پہلے ہی تھا امام نفوس و عقول کا

دوسری نعت کافی طویل ہے، جو ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

جرم کی ہے شرم گینی یارسول
اور خاطر کی حزینی یارسول

کھینچوں ہوں نقصان دینی یارسول

تیری رحمت ہے یقینی یا رسول

رحمۃ للعالمینی یا رسول

ہم شفیع المذنبینی یارسول

☆ نظیر اکبر آبادی نے "عشق اللہ" کے عنوان سے مستقل نعت لکھی ہے۔

☆ غالب کے مطبوعہ دیوان میں نعت پاک کی صنف موجود نہیں ہے۔

☆ علامہ اقبال کی "بانگ درا" میں "حضور رسالت مآب میں" کے عنوان سے ایک نعتیہ کلام موجود ہے، جو انہوں نے عالم تصورات میں سرکار دو عالم ﷺ کے حضور پیش کیا ہے، یہ کلام دراصل اسی پیشی کی مختصر داستان ہے، اس میں حضور ﷺ کی ذات گرامی اور صفات و کمالات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

حضرت آہ نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں مستقل نعتیں لکھی ہیں، عربی نعت میں ۱۳/ اشعار اور فارسی میں ۲۶/ اشعار ہیں، فارسی نعت میں بھی تین اشعار عربی کے شامل ہیں، ان دونوں نعتوں میں آہ نے رسول اللہ ﷺ کے کمالات و خصوصیات، اور ذات رسالت مآب ﷺ سے اپنی شیفتگی اور محبت کے بیان میں فنی مہارت اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے اور اپنا جگر نکال کر رکھ دیا ہے، آہ کے عالمانہ تکلم اور عارفانہ والہانہ پن نے اس میں ایک مخصوص انفرادیت پیدا کر دی ہے، معرفت و یقین کے جس بلند مقام سے انہوں نے یہ نعتیں کہی ہیں وہ عام فنی شعراء کے لئے ممکن نہیں، ان میں سیرت طیبہ کے بڑے اہم نکات کی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً:

آہ کی نعتوں میں نکات سیرت

☆ حضور ﷺ کے روئے انور جیسا کوئی چہرہ کائنات میں پیدا نہیں ہوا۔

☆ شمس و قمر کائنات میں روشنی کا سرچشمہ ہیں، لیکن ان کو روشنی نور محمدیؐ سے حاصل

ہوتی ہے۔

☆عارفین کے قلب وروح کی غذا ذکر وفکر ومحبت رسول ہے۔

☆جس سینہ میں عشق رسول ﷺ کی آگ روشن ہو وہاں ظلمت باقی نہیں رہ سکتی۔

☆جس دل میں نبی خدا ﷺ کی محبت کا پودا اگتا ہے وہاں بہار ہی بہار ہوتی ہے، خزاں کا گذر نہیں ہو سکتا۔

☆اہل دل انوار مصطفےٰ ﷺ میں تجلیات الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

☆عشق اور جذب مصطفےٰ ﷺ کی آرزو پر عربی نعت ختم ہوتی ہے۔

☆فارسی نعت میں کچھ دیگر علمی حقائق ولطائف بھی ملتے ہیں مثلاً:

☆عظمتیں آپؐ کی نسبت سے سرخروئی حاصل کرتی ہیں، آپ کی رفعت شان گنبد نیلوفری کے لئے بھی قابل رشک ہے۔

☆آپؐ کی رسالت کا شہرہ زمین سے بالائے آسمان تک ہے۔

☆جس طرح بادل میں بارش کا خزانہ پوشیدہ ہے اسی طرح حضور ﷺ کی ذات طیبہ تمام فضائل وکمالات کی محور ہے۔

☆حور وپری کے چہروں میں حسن کی جھلک ملتی ہے تو آپؐ کی شخصیت حلم و بردباری کی آئینہ دار ہے۔

☆آپؐ فخر انبیا اور فخر اولیاء ہیں، آپؐ کا سکہ زمین سے ہفت فلک تک جاری ہے۔

☆ساری روئے زمین پر خوشبوؤں کی بہار آپ کے نفوس قدسیہ کا ثمرہ ہے، کہ ساری بزم کائنات آپ ہی کے طفیل سجائی گئی ہے۔

☆زمین آپ کے نقش پا سے فخر محسوس کرتی ہے، اور آسمان آپ کی قدمبوسی سے عزت حاصل کرتا ہے۔

☆ کائنات عالم میں آپ علم و معرفت کے بحر بیکراں اور ظلم و جہالت کے خلاف مثبت طاقتوں کا سرچشمہ ہیں، بازار علم میں آپ سے گرانمایہ کوئی چیز نہیں، آپ نے دنیا کو جس حکمت و دانشوری سے روشناش کیا اس کے سامنے اہل منطق کے معقولات ثانی کی بحث ایک طفلانہ شوشہ ہے۔

☆ آپ کی ذات عالی ہر نبی کے لئے منتہٰ مقصود رہی۔

☆ بندہ و خدا کے درمیان آپؐ ایک مضبوط رابطہ ہیں، اس رابطہ کے بغیر کوئی خدا تک نہ پہونچا ہے نہ پہونچے گا۔

☆ ذات محمدی ﷺ کا مثیل کوئی پیدا نہیں ہوا۔

☆ آپؐ کی پائگاہ عقل کل کی پرواز سے بھی بلند تر ہے۔

☆ آپؐ کے آستانہ کی غلامی شہنشاہوں کے لئے بھی قابل فخر ہے۔

☆ جس طرح نبوت آپؐ کی شخصیت پر ختم ہوگئی اسی طرح آپ کے غلاموں پر نیابت نبوت اور قیادت عالم ختم ہے۔

☆ آپؐ کی مثال پھول کی سی ہے، پھول سے کبھی کسی کو گزند نہیں پہونچ سکتی، اور آپؐ کے دشمن کانٹوں کی تمثیل رکھتے ہیں، خار بھلا کبھی پھولوں کی ہمسری کر سکتے ہیں۔

☆ ابر گریاں دراصل آپؐ کے آتش فراق میں تپ کر ٹپکنے والا قطرہ ہے۔

☆ آپؐ کے چار یار (خلفاء راشدینؓ) آپ کی عظمت بے انتہا کے نشان ہیں، جو آپؐ کی تربیت اور نظر کرم کے طفیل تاج قیادت سے سرفراز کئے گئے، افراد سازی کی ایسی کوئی مثال تاریخ انسانی میں موجود نہیں ہے۔

☆ اخیر میں آہ ناچار نے اپنی بھی درخواست لگادی ہے کہ میری بساط کیا جو حضور ﷺ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر سکوں، میرے جہاں پناہ! میرا حال آپ سے مخفی نہیں، آپ کی

الطاف و عنایات کا امیدوار ہوں[358]۔

یہ ذات رسالت مآب ﷺ کے وہ امتیازات و کمالات ہیں جن کو پیکر شعری میں وہی شاعر ڈھال سکتا ہے جو زبان و بیان کی سلیقہ مندی کے ساتھ علم و فن میں بھی کمال رکھتا ہو، اور محبت و معرفت کی دنیا کا بھی شناور ہو، آہ نے اپنی فارسی نعت ان اشعار پر ختم کی ہے:

گوہر ذات فریدت درۃ التاج الکرم
چار یارت راز لطفت بود تاج افسری

من چہ دانم تا بگویم وصف تو اے کان جود
لیک از بہر سعادت کردم ایں مدحت گری

حال زارم نیست پنہاں از تو اے ماوائے من
پس توقع دارد آہ از لطف جویم بنگری

نظم

نظم کے لغوی معنٰی " لڑی " کے ہیں، نظم شاعری کی وہ صنف ہے جس میں مقررہ عنوان کے تحت شاعر اپنے خیالات کو مسلسل اور مربوط انداز میں پیش کرتا ہے، جس کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے، چنانچہ غزل کے ماسوا جملہ اصناف سخن نظم ہی کہلاتے ہیں، گو کہ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ان کے نام الگ الگ ہوں، نظم کے لئے نہ موضوع کی پابندی ہے نہ کسی مخصوص ہیئت کی۔۔۔۔۔۔اسی طرح نظم کے تمام اشعار ایک ہی ردیف و قافیہ کے پابند نہیں ہوتے، یکساں بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف بھی، اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔

---

358 ۔حضرت آہ نے یہ لطائف و نکات شاعرانہ اشارات میں بیان کئے ہیں لیکن اگر آپ ان کی تفصیل پڑھنا چاہیں تو ملاحظہ کریں سیرت طیبہ ﷺ پر حقیر مرتب کی کتاب "مقام محمود" شائع کردہ مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منورواشریف۔

کہتے ہیں کہ نظم پر سب سے پہلے نظیرؔ اکبر آبادی نے طبع آزمائی کی، ان کے علاوہ نظم گو شعراء میں آزادؔ، حالیؔ، اسماعیل میرٹھی، چکبستؔ، سرورؔ جہان آبادی، علامہ اقبالؔ، جوشؔ، جگرؔ، وجدؔ اور نجم آفندی وغیرہ بہت زیادہ معروف ہوئے ہیں۔

۱۸۵۷ء کا دور اردو ادب کی تاریخ میں دور جدید کہلاتا ہے، ملک میں سیاسی انقلاب کے ساتھ ادبی انقلاب بھی آیا اور ادب میں زندگی سے تعلق رکھنے والے بہت سے موضوعات شامل ہوئے، یہ موضوعات جب نظم میں داخل ہوئے تو وہ نظم جدید کہلانے لگی، پھر آہستہ آہستہ اس کی بھی تین قسمیں ہو گئیں:

(۱) پابند نظم (۲) نظم معریٰ (۳) نظم آزاد۔

پابند نظم

"پابند نظم" سے مراد وہ نظم ہے جس میں قافیہ اور بحر دونوں کی پابندی کی گئی ہو، عہد قدیم میں پابند نظم ہی مروج تھی، بلکہ آج بھی سب سے زیادہ پابند نظم ہی کہی جاتی ہے، علامہ حالیؔ، علامہ اقبالؔ وغیرہ کی تمام نظمیں پابند نظم ہی کا سرمایہ ہیں، اقبالؔ کی نظم "جگنو" کے چند اشعار دیکھئے:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن کا

نظم معریٰ(Blank Verse)

معریٰ عاری سے مشتق ہے، اس کے معنیٰ ہیں خالی، یہ نظم چونکہ قافیہ سے عاری ہوتی ہے اس لئے اسے نظم معریٰ یا غیر مقفیٰ کہتے ہیں، البتہ بحر کی پابندی ضروری ہوتی ہے، اس نظم کا رواج یورپ میں رہا، یورپ سے جب یہ تحریک ہندوستان آئی تو اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی وغیرہ اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔

نمونہ:

اے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہوئے — مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہر اور لعل گویا

نظم آزاد(Free Verse)

"نظم آزاد" اس نظم کو کہتے ہیں جو قافیہ، بحر اور وزن کی پابندی سے آزاد ہو، اس کا کوئی مصرعہ طویل تو کوئی مختصر ہوتا ہے، البتہ شاعر بحر کی پابندی کو اس طرح ملحوظ رکھتا ہے، کہ ایک ہی بحر کے ارکان مصرعوں میں کم یا زیادہ استعمال کرتا ہے، مثلاً ایک بحر ہے:

فاعلن، فاعلن، فاعلن، فاعلن

اس بحر کا ایک رکن ہے "فاعلن "شاعر اپنی نظم کے کسی مصرعہ میں پوری بحر استعمال کرتا ہے اور کسی میں تین حصہ اور کسی میں ایک حصہ، اس سے نظم میں روانی اور آہنگ تو پیدا

ہو جاتا ہے لیکن جو ترنم پابند نظم میں ہے وہ آزاد نظم میں پیدا نہیں ہو سکتا، آزاد نظم میں شاعر ہیئت کو نہیں موضوع کو اہمیت دیتا ہے۔

ترقی پسند تحریک (۱۹۳۶ء) کے بعد معریٰ نظم کے مقابلے میں آزاد نظم کا رواج زیادہ ہوا، اس سلسلے میں کئی نام اہمیت کے حامل ہیں: -

ن-م-راشدؔ، میراجیؔ، فیضؔ، مخدومؔ، فراقؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، اخترؔ الایمان، اور ساحرؔ لدھیانوی وغیرہ، بطور نمونہ ن-م-راشدؔ کی آزاد نظم کا ایک حصہ پیش ہے:

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش ایک دیوار ظلم
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ عمارات قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دست غارت گر سے ہے[359]۔

حضرت آہؔ کی نظمیں عہد قدیم کی روایت کے مطابق پابند نظم کے زمرہ میں آتی ہیں، آہؔ نے ایک بھی آزاد یا معریٰ نظم نہیں کہی، البتہ انہوں نے اردو کو پابند نظموں کے خوبصورت نمونے دیئے ہیں، مثلاً:

---

[359] ۔مختصر تاریخ اردو ادب ص ۱۷۶- ۱۷۵۔

بھرا ہے یہ جو سودائے ہوس ایک ایک کے سر میں
پھنسا رکھا ہے جس نے کر کے حیراں ایک چکر میں
نہ آسائش سفر میں دے نہ دم لینے دے یہ گھر میں
قضائے ناگہانی سے نکل جائے گا دم بھر میں
گھڑی جب آنے والی آگئی سب بھول جائیں گے
دکھایا اس نے جب منہ ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے

کرو شکر اس خدا کا جس نے دی ہے تم کو یہ دولت
تغیر کے تسلسل میں یہاں کی ہے ہر اک حالت
نہیں رہنے کی یہ حالت نہیں ملنے کی یہ مہلت
غنیمت ہے ملی ہے جس قدر یہ زیست اور صحت
یہاں رہ کر وہاں کے واسطے بھی کام کچھ کر لو
بہت لمبا سفر ہے زاد کچھ تو باندھ کر دھر لو

(نظم: بے ثباتی عالم)

کون کہتا ہے جہاں میں بے سروساماں ہو تم
ساری دنیا ہے تمہاری خلق کے سلطاں ہو تم
اشرف المخلوقات بے شک صاحب ایماں ہو تم
یہ شرف کچھ کم نہیں کہ حامل قرآں ہو تم
اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

شرم کی جا ہے جو خادم تھے وہ آقا بن گئے

اور جو قطرہ سے بھی کمتر تھے وہ دریا بن گئے

جو تھے کتے در کے سب وہ شیر صحرا بن گئے

اور تم کیا تھے مگر افسوس اب کیا بن گئے

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

پھر دکھادو کچھ تماشا خنجر و شمشیر کا

سلسلہ کر دو الگ زنجیر سے زنجیر کا

تذکرہ تازہ کرو دنیا میں عالمگیر کا

چیر کر رکھ دو کلیجہ دشمن بے پیر کا

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

(نظم: انقلاب)

ہر چند ترک کار کی عادت نہیں مجھے

پر کیا کروں کہ صبر کی طاقت نہیں مجھے

ہوں مدعا طراز دل سوختہ کا میں

اظہار رنگ حسن طبیعت نہیں مجھے

بدلی ہوئی سی دیکھ رہا ہوں ہوا کو میں

کیا ایسے کارخانہ پہ حیرت نہیں مجھے

نظریں پھری ہوئی ہیں حریفوں کی ان دنوں

لیکن کسی سے پھر بھی عداوت نہیں مجھے

بدکیش بد زبان کو پہچانتا ہوں میں
روکوں زبان اس کی یہ قدرت نہیں مجھے

بے جرم و بے قصور میں ٹھہرا قصور وار
اس پر بھی دل ہے صاف کدورت نہیں مجھے

(منظوم استعفاء)

قصیدہ / منقبت

قصیدہ کے لغوی معنٰی " گاڑھے مغز" کے ہیں، اصطلاح میں یہ ایسے مجموعۂ کلام کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یا ہجو کی گئی ہو، ساتھ ہی اس میں پند و نصیحت کے مضامین، زمانہ کا شکوہ، اور مختلف احوال کا بیان وغیرہ بھی شامل ہو، اس میں شاندار، پر شکوہ اور وقیع و نادر الفاظ و مضامین کا استعمال کیا جاتا ہے، تشبیہات واستعارات اور صنائع وبدائع کا خاص اہتمام ہوتا ہے، زور بیان اور بلاغت قصیدہ کے لئے لازمی عنصر ہے، مضامین میں جدت وندرت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے اسی لئے اسے اصناف سخن میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغز سر کو حاصل ہوتی ہے لہذا اسے مغز سخن تصور کر کے قصیدہ کا نام دیا گیا۔۔۔ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ لفظ قصد سے مشتق ہے اور چونکہ یہ کسی اعلیٰ مقصد اور ارادے کے تحت لکھا جاتا ہے اس لئے اس کو قصیدہ کہا جاتا ہے[360]۔

قصیدہ عربی صنف ہے جو فارسی سے ہوکر اردو میں آئی ہے، اس کا مضمون طویل اور مسلسل ہوتا ہے، مضامین کے اعتبار سے قصیدہ کی چار قسمیں ہیں:

---

360 -اصناف سخن اور شعری ہیئتیں ص ۳۴ مؤلفہ شمیم احمد، ناشر انڈیا بک امپوریم بھوپال ۱۹۸۱ء۔

(۱) مدحیہ (۲) ہجویہ (۳) وعظیہ (۴) بیانیہ۔

قصیدہ چار ارکان پر مشتمل ہوتا ہے:

(۱) تشبیب، دوسرے لفظوں میں تمہید، جس میں، موسم بہار، اور سرشاری و سرمستی وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اس کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے، جس میں شاعر اپنی پوری فنی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

(۲) گریز: یعنی تمہید سے مدح یا ہجو کی جانب رجوع، تشبیب کے مقابلے میں گریز کے اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے۔

(۳) مدح یا ہجو: یہ قصیدہ کا تیسرا رکن ہے، ہجویہ قصائد کی تعداد مدحیہ کی بنسبت کم رہی ہے، یہ مذہبی اور درباری دونوں نوعیت کے ہوتے تھے، لیکن جب سے شاہی دربار ختم ہوئے، درباری قصیدے بھی ختم ہوگئے، اب صرف مذہبی نوعیت کے قصیدے باقی رہ گئے ہیں۔

(۴) دعا یا حسن طلب: یعنی ممدوح کے لئے دعا کرتے ہوئے انعام واکرام کی خواہش پیش کرنا، اور اگر ہجویہ قصائد ہوں تو بددعا کرنا۔

قصیدہ گوئی میں دکن میں نصرتیؔ کو اور شمالی ہند میں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ کو خصوصی شہرت واہمیت حاصل ہوئی۔

مرزا غالبؔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے وابستہ تھے، اس لئے بادشاہ کی شان میں ان کے بھی کئی قصیدے اور قطعات دیوان غالب میں موجود ہیں، ایک قطعہ کا پہلا شعر ہے:

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر

اے جہاں دار کرم شیوۂ بے شبہ وعدیل

ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

اے شہنشاہ آسماں اورنگ　　　اے جہاں دار آفتاب آثار

ایک قصیدہ کا عنوان ہے "مدح شاہ ظفر" اس کا پہلا شعر ہے:

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دراصل قصیدہ گوئی کے لئے دربار سے وابستگی اور مزاج میں انکسار اور کسی قدر خوشامد پسندی بھی ضروری ہے، جن شعراء کو یہ دونوں چیزیں میسر ہوئیں وہی لوگ کامیاب قصیدہ گو ہوئے، میرؔ کو کسی شاہی دربار سے خصوصی وابستگی میسر نہ ہو سکی، اقبالؔ کے دور میں بساط شہنشاہی سمٹ چکی تھی، بس چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹمٹمار ہی تھیں، اسی لئے ان کے یہاں قصیدہ کی صنف یا تو مفقود ہے یا بہت محدود۔۔۔

مذہبی قصائد

اس لئے اب صرف مذہبی قصائد ہی کی ایک شکل باقی رہ جاتی ہے، اس لحاظ سے اب اس میں اور منقبت میں کوئی خاص فرق نہیں رہ جاتا، منقبت بھی ائمۂ اطہار اور بزرگان دین کی شان ہی میں کہی جاتی ہے اور معنوی طور پر اس کی بھی بڑی اہمیت ہے، یہ بزرگان دین بھی مقام ومنصب کے اعتبار سے اپنی جگہ کسی بادشاہ سے کم نہیں ہوتے، اس معنٰی میں تمام وہ شعراء جنہوں نے ائمۂ اطہار، اولیاء اللہ یا مرشدان برحق کی شان میں عقیدت کے نذرانے پیش کئے ہیں بجا طور پر قصیدہ گو قرار پائیں گے۔۔۔

اس طرح میرؔ صاحب بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، گو ان کا غرور کسی شاہ کجکلاہ کے سامنے جھکنے پر آمادہ نہ ہو لیکن صحابہؓ اور اہل بیتؓ کی عظمتوں کو وہ قلب وروح کی گہرائیوں سے سلام پیش کرتے ہیں، حضرت علیؓ کی شان میں زوردار منقبتیں لکھی ہیں، ان کی ایک منقبت سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

جو معتقد نہیں ہے علیؑ کے کمال کا

ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا

رکھنا قدم پہ اس کے قدم کب ملک سے ہو

مخلوق آدمی نہ ہوا ایسی چال کا

توڑا بتوں کو دوش نبیؐ پر قدم کو رکھ

چھوڑا نہ نام کعبہ میں کفر و ضلال کا

دوسری منقبت مخمس کی ہیئت میں ہے، پہلا بند ہے:

ہادی علیؑ، رفیق علیؑ، رہنما علیؑ یاور علیؑ، محمد علیؑ، آشنا علیؑ

مرشد علیؑ، کفیل علیؑ، پیشوا علیؑ مقصد علیؑ، مراد علیؑ، مدعا علیؑ

جو کچھ کہو سوا پنے تو ہاں مرتضیٰ علیؑ

غالبؔ کے دیوان میں بھی منقبت کے عنوان سے کئی قصیدے موجود ہیں، مثلاً ایک عنوان ہے "منقبت حیدری" اس کا پہلا شعر یہ ہے:

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار

سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

حضرت آہؔ کے یہاں بھی اصطلاحی اعتبار سے درباری قصیدہ کی صنف موجود نہیں ہے، ساری زندگی مدرسہ یا خانقاہ کی بوریہ نشینی کرنے والے فقیر بے نوا کو دربار شاہی سے کیا واسطہ؟ ۔۔جس دور میں انہوں نے آنکھیں کھولیں پورا ملک انگریزی تگ و تاز کی لپیٹ میں تھا، شاہی سلطنت کی بساط لپٹ چکی تھی، اسلامی ہندوستان افسانۂ ماضی بن چکا تھا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی، جس میں وہ اپنی شاعری اور عمل سے پوری طرح شریک تھے، لیکن اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے چل بسے۔۔۔۔

البتہ ان کے کلام میں مرشد روحانی کی شان میں ایک قصیدہ موجودہ ہے، جو مذہبی ہونے کی بنیاد پر منقبت بھی کہلا سکتی ہے، خاص بات یہ ہے کہ اصطلاحی قصیدہ کے جن ارکان کا اوپر ذکر آیا ہے ان کو اس میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا گیا ہے، اس میں تمہید یا تشبیب، گریز، مدح اور حسن طلب سب کچھ موجود ہے، اس قصیدہ سے چند اشعار ملاحظہ کریں:

تشبیب یا تمہید

جناب مرشد کامل امام قطب ربانی
کلید باب عرفاں کاشف اسرار قرآنی

برنگ زلف قسمت میں جو آئی ہے پریشانی
ہے سودا سر کو میرے اور وحشت کی فراوانی

مرے پاؤں کو چل کر مل گیا قدرت کی جانب سے
کہ جیسے دست زاہد کو ملی ہے سبحہ گردانی

تبسم ریز کلیاں خندہ زن گلہائے صحرا ہیں
مری وحشت سے نالاں ہیں غزالان بیابانی

تماشائی مری دیوانگی کا سارا عالم ہے
ہر اک ہندی و افغانی خراسانی و ایرانی

ملایا خاک میں آزادیوں کو ہائے رے قسمت
جنوں ہر دم لئے پھرتا ہے مجھ کو مثل زندانی

تصور کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں خوشیاں
شکست رنگ عارض کی رہا کرتی ہے مہمانی

چھپائے سے کہیں چھپتا ہے یہ درد والم میرا
مری صورت سے ظاہر ہے مرے دل کی پریشانی

مری حسرت مرے ارماں ہوئے پامال غربت میں
غبار ایسا اڑا چہرے کا میرے رنگ نورانی

گریز

بحق مرشد برحق زہے قسمت جو ہو جائے
زمین قبر میری مورد الطاف رحمانی

مدح

نگاہ مرشد کامل ہے وجہ انبساط دل
نہیں تو میں کہاں بندہ کہاں یہ ذکر سلطانی

حسن طلب

دکھائی موت نے صورت جمایا یاس نے نقشہ
مدد کا وقت پہونچا المدد یا شیخ ربانی

غبار راہ ہوں اے آہؔ لیکن دل یہ کہتا ہے
جناب شیخ کے صدقہ میں ہوگی سیر روحانی

آہؔ کے سہرے

آہؔ نے (حقیقی شاہ کے بجائے ایک دن کے) نوشاہ کے لئے جو سہرے قلمبند کئے ہیں، ان میں کئی سہرے اصطلاحی قصیدہ کا رنگ و آہنگ رکھتے ہیں، مثال کے طور پر ان اشعار کی بندش

اور ترتیب دیکھئے:

بندھا نوشاہ کے سر سے زہے تقدیر سہرے کی
اچھوتی زلف کے ہمسر ہوئی توقیر سہرے کی

جو مالن گوندھ لائی سورۂ شمس و قمر پڑھ کر
تفوق چاند پر بھی لے گئی تنویر سہرے کی

کسی کا دل کھلا جاتا ہے جو غنچہ کی صورت میں
مسرت ہو رہی ہے آج دامن گیر سہرے کی

جو خدام ازل نے اِن کا خاکہ کھینچنا چاہا
تو بدلے کاکلوں کے کھنچ گئی تصویر سہرے کی

خوشا قسمت جو دل تھا مبتلا زلف مسلسل کا
اسی کے آج قدموں پر گری زنجیر سہرے کا

شمیم جاں فزا پھیلی معطر ہو گیا عالم
چلی دوش صبا پر جس گھڑی تاثیر سہرے کی

کہیں گل ہیں کہیں کلیاں کہیں تار شعاعی ہے
مسرت کا سراسر ہے سماں تصویر سہرے کی

خدا آباد رکھے دلہا دلہن کو ہمیشہ آہؔ
انہیں سہرا مبارک ہو ہمیں تحریر سہرے کی

مرثیہ

"مرثیہ" عربی زبان کے لفظ "رثا" سے لیا گیا ہے ، جس کے معنی ہیں بین کرنا، یعنی

کسی عزیز و قریب کی موت پر اظہار رنج و غم کرنا۔۔۔ اصطلاح میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی موت پر اظہار رنج و غم کیا جائے۔۔۔ دراصل مرثیہ قصیدہ ہی کی ایک قسم ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ قصیدہ میں زندہ شخصیات کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے اور مرثیہ میں گذرے ہوئے لوگوں کے اوصاف و کمالات بیان کئے جاتے ہیں، مرثیہ بنیادی طور پر غم انگیز ہوتا ہے، جبکہ قصیدہ طربیہ شاعری کی ایک قسم ہے اس میں زندگی کے امید افزا اشارے موجود ہوتے ہیں،۔۔۔۔۔

مرثیہ کا عمومی مفہوم بس اتنا ہی ہے۔۔۔۔

البتہ ایک خاص قسم جس نے مرثیہ کو شہرت و دوام، اعتبار و وقار اور غمگینی و بالیدگی عطا کی وہ ہے سیدنا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا مرثیہ، جس کو "کربلائی مرثیہ" بھی کہتے ہیں، میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اس میں خصوصی شہرت حاصل کی۔

مرثیہ کی اسی خاص قسم کو پیش نظر رکھ کر ماہرین ادب نے مرثیہ کے اجزاء طے کئے ہیں، جن کی پابندی ضروری تو نہیں لیکن اکثر مرثیہ نگار شعراء نے اس کا اہتمام کیا ہے، ادب کی کتابوں میں مرثیہ کے آٹھ (۸) اجزاء کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) چہرہ، یعنی تمہید (قصیدہ کی تشبیب کے قائم مقام) (۲) سراپا یعنی مرثیہ میں مذکور کرداروں کا تذکرہ، (۳) خیمہ سے رخصت (۴) میدان جنگ میں آمد (۵) رجز (۶) واقعات جنگ (۷) شہادت (۸) بین یا نوحہ[361]۔

یہ صرف کربلائی مرثیہ کے اجزاء ہیں، ہر مرثیہ کے نہیں، مرثیہ پر لکھی گئی دوسری کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرثیہ میں بنیادی اجزاء صرف دو ہیں:

---

[361] ۔روح انیس، ص ۱۶، سید مسعود حسین رضوی، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۴ء۔

(۱) میت کے اوصاف کا ذکر (۲) اوراظہار رنج وغم بالفاظ دیگر نوحہ۔

حضرت آہ کے مجموعۂ کلام میں کوئی کربلائی مرثیہ موجود نہیں ہے، البتہ مرثیہ اپنے عمومی مفہوم میں موجود ہے، اعزاء واقرباء اور احباب واہل تعلق کی وفات پر ان کے مرثیے اور نالہائے غم وفراق موجود ہیں، جن سے ان کی مرثیہ نگاری میں فنی مہارت اور ان کے کلام کی رنگارنگی ظاہر ہوتی ہے، چند نمونے پیش ہیں:

☆ آہ نے اپنی بہن کی وفات پر مسدس کی ہیئت میں ایک طویل اور انتہائی غم انگیز مرثیہ لکھا ہے جس کے چند بند پیش ہیں:

زخم جگر کے واسطے مرہم تمہیں تو تھیں
دل کی کلی کو قطرۂ شبنم تمہیں تو تھیں
لے دے کے اک جہان میں ہمدم تمہیں تو تھیں
راز و نیاز عشق کی محرم تمہیں تو تھیں
تم کیا گئیں جہاں سے مری راحتیں گئیں
اب بھی میں مرچکوں تو کہوں آفتیں گئیں

تجھ سے بہار گلشن ہستی تھی میری جان
آباد ایک دن یہی بستی تھی میری جان
کیا اتنے روزوں موت ترستی تھی میری جان
ایسی ہی جان کیا تیری سستی تھی میری جان
کس نے لحد سے تجھ کو ہم آغوش کر دیا
کس نے سدا کے واسطے روپوش کر دیا

منہ زرد ہونٹ خشک جگر خوں ہے مری جان

آنکھوں میں اشک دل میں قلق لب پہ ہے فغاں

جی چاہتا ہے ساتھ رکھوں اپنے نوحہ خواں

آفت اگر ہو ایک تو اس کو کروں بیاں

دکھ درد ہوں ہزار تو پھر کیا کرے کوئی

کن کن مصیبتوں کا مداوا کرے کوئی

کس درد کی زباں سے کہا ہے یہ مرثیہ

سب پیٹتے ہیں سر کو بلا ہے یہ مرثیہ

نالاں ہوا ہے جس نے سنا ہے یہ مرثیہ

خود میں نے آہ رو کے لکھا ہے یہ مرثیہ

خون جگر سے چاہئے لکھنا یہ واقعہ

ایسا ہے سانحہ یہ ہے ایسا یہ واقعہ

☆اسی طرح اپنے امیر کبیر دوست یوسف علی مرحوم کی جواں سال اور کنواری موت پر ایک دردناک مرثیہ تحریر فرمایا:

کچھ نہ دی ہائے موت نے مہلت

کام آئی نہ دولت و ثروت

ساری دنیا نظر میں ہے تاریک

چھپ گئی جب سے چاند کی صورت

ایک یوسف علی کے مرنے سے
مٹ گئی زندگی کی سب لذت
دل پہ بجلی گراتی ہے اکثر
یاد آکر وہ صورت وسیرت
دل کے ارمان رہ گئے دل میں
بیاہ تک کی نہ آسکی نوبت
خاک میں مل گئیں تمنائیں
رہ گیا حرف گریۂ حسرت

کلیات میں ان کے علاوہ مربی جلیل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، پیر طریق حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ اور شیخ محبوب علیؒ وغیرہ کی شخصیات پر بھی قیمتی مرثیے موجود ہیں۔

غزل

"غزل" اصناف سخن کی انتہائی قدیم ترین صنف ہے، غزل عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں کاتنا، عورتوں سے باتیں کرنا اور ان کے حسن وجمال کی تعریف کرنا وغیرہ، اصطلاح میں غزل اس صنف کو کہتے ہیں، جس میں عشقیہ مضامین کا بیان ہو، بعد میں اس کے موضوعات میں اضافہ ہوتا گیا اور اس میں فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، اور پند ونصائح کے مضامین بھی داخل ہوگئے۔۔۔۔

غزل سے متعلق گو کہ بعض نقادوں کے خیالات مختلف ہیں اور اس میں مضامین کے انتشار یا تنوع اور معنوی تسلسل کے فقدان کو لے کر کچھ لوگوں نے تنقیدیں کی ہیں، مثلاً کلیم

الدین احمد (پٹنہ) اس کو "نیم وحشی صنف" کہا کرتے تھے، جبکہ اس کے بالمقابل رشید احمد صدیقی اس کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیتے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ اردو شاعری کی سب سے قدیم اور سب سے مقبول ترین صنف ہے، یہی وجہ ہے کہ دبستان دکن، دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ اور دبستان عظیم آباد کے تقریباً ہر شاعر نے غزل پر توجہ دی اور اس کو اپنے اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔

غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے، جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں، دوسرے شعر سے غزل کے اشعار کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ مصرعۂ اولیٰ میں قافیہ کا استعمال یا اہتمام نہیں کیا جاتا اور تمام اشعار کے مصرعۂ ثانی میں قافیہ وردیف کی پابندی ہوتی ہے،

عام طور پر غزل میں ایک ہی مطلع ہوتا ہے، لیکن ایک سے زائد مطلع بھی ہوسکتے ہیں، مطلع اول کے بعد جو مطلع آتا ہے اسے حسن مطلع یا زیب مطلع کہا جاتا ہے، اگر کبھی غزل میں دو مطلعوں سے زیادہ مطلع آئیں تو انہیں بالترتیب مطلع ثانی اور مطلع ثالث وغیرہ کہا جاتا ہے، غزل میں اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ (۵) اور زیادہ سے پچیس (۲۵) ہوتی ہے، غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے، جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

غزل کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، کبھی شاعر ایک کے بجائے دو اشعار میں ایک خیال کو باندھتا ہے تو ایسے اشعار قطعہ بند اشعار کہلاتے ہیں، اور ان کی شناخت کے لئے شاعر کو شعر سے پہلے (ق) لکھنا لازمی ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ بات غزل کے مزاج کے خلاف ہے، حالانکہ عہد قدیم کے غزل گو شعراء نے ایسی غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں از مطلع تا مقطع ایک ہی خیال کو پیش کیا گیا ہے، اس کو غزل مسلسل کہتے ہیں، جس کی وکالت کلیم الدین احمد وغیرہ نے کی ہے، لیکن عہد وسطیٰ اور عہد آخر کے شعراء کی غزلوں کے اشعار میں تسلسل موجود نہیں ہے، اسی لئے عام طور پر نظم کی طرح غزل کا کوئی عنوان نہیں ہوتا، جیسا کہ دیوان غالب وغیرہ میں ہے، البتہ کبھی غزلوں میں فرق اور شناخت قائم کرنے کے لئے غزل ہی کا

کوئی مصرعہ عنوان کے طور پر لکھ دیا جاتا ہے، مگر وہ کوئی مرکزی خیال نہیں ہوتا، کلیات میرؔ وغیرہ میں اسی طرح ہے اور حضرت آہؔ نے بھی یہی روش اپنائی ہے، ان کی اکثر غزلوں پر کسی نہ کسی مصرعہ کے ذریعہ عنوان بندی کی گئی ہے اور کچھ غزلوں پر میں نے یہ رسم نبھائی ہے۔

غزل کے معاملے میں دکن کو اولیت حاصل ہے، حیدرآباد کے بانی محمد قلی قطب شاہؒ کو سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے، ان کے علاوہ ملاوجہی، غواصیؔ اور ابن نشاطی کے نام بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں، ملاوجہی ملک الشعراء کہلاتے ہیں، اسی طرح عادل شاہی دور کے شعراء میں نصرتیؔ، شاہیؔ، اور حسن شوقیؔ کو خاص مقام حاصل ہے، شمالی ہندوستان میں امیر خسروؔ کو سب سے پہلا شاعر مانا جاتا ہے، امیر خسروؔ کا عہد تیرہویں صدی کا درمیانی حصہ ہے، مؤرخین کے مطابق غزل کا آغاز اسی عہد میں ہوا، اور امیر خسروؔ نے ایسی غزلیں لکھیں جن میں فارسی اور اردو کے ملے جلے الفاظ تھے، اکثر کتابوں میں ان کی طرف یہ شعر منسوب کیا گیا ہے:

زحال مسکیں مکن تغافل دو رائے نیناں بنائے بتیاں
چوں تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہ لگائے چھتیاں

اس لحاظ سے شمال ہندوستان سے ہی غزل کا بنیادی آغاز مانا جائے گا، البتہ اردو شاعری یا غزل کا باقاعدہ آغاز شمالی ہندوستان میں ۱۷۰۰ء میں ولیؔ دکنی کی دہلی آمد سے ہوا، پھر دہلی کے اردو عہد کا آغاز ہوا، اس کے بعد دبستان لکھنؤ و عظیم آباد کا قیام عمل میں آیا۔۔۔

اس پورے عہد میں کسی دبستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا شاعر نہیں ہے جس نے غزل میں طبع آزمائی نہ کی ہو، غزل کی سادہ، سلیس اور شیریں زبان نے سب کو اپنا اسیر بنایا، غزل ہر دور کی محبوب ترین اور مقبول ترین صنف مانی گئی ہے، دبستان دہلی اور لکھنؤ کے شعراء میں میر تقی میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، اور ناسخؔ وغیرہ نے غزل میں عالمگیر شہرت حاصل کی، ادب کی زبان میں میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے، تمام شعراء نے ان کا لوہا مانا ہے، ناسخؔ، ذوقؔ اور غالبؔ جیسے بلند پرواز

شاعروں نے بھی مملکت غزل میں ان کی سلطانی کو تسلیم کیا ہے، ذوقؔ نے کہا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ اس طرح نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

غالبؔ اپنا تو عقیدہ ہے بقول ناسخؔ

آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میرؔ نہیں

میرؔ کی بہت سی غزلیں شاہکار ہیں، ایک نمونہ پیش ہے:

اشکوں آنکھوں میں کب نہیں آتا

لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن

جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونس ہجراں

سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش

گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ

بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم

پر سخن تا بلب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میر اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

آہ بحیثیت غزل گو شاعر۔فکری وفنی عناصر

حضرت آہ کی شاعری کا بڑا سرمایہ بھی غزل ہی ہے، غزل کے ماسوا دیگر اصناف شعری میں ان کا کلام بہت محدود ہے، غزل ہی ان کے فکر وفن کا اصل میدان ہے، انہوں نے اپنے خیالات اور فنی کوششوں سے اس صنف کو کافی مالا مال کیا ہے، ان کے مجموعۂ کلام میں غزلیات کی بڑی تعداد موجود ہے، جس میں مختلف بحور واوزان اور عروض وقوافی کے تجربات کئے گئے ہیں، مضامین کا سیل رواں ہے جو ان کے اشعار میں موجزن ہے، ان میں عشق مجازی بھی ہے اور عشق حقیقی بھی، نغمۂ وصال بھی ہے اور نالۂ فراق بھی، تمثیل حسن بھی ہے اور تصویر درد بھی، شکر رنجی بھی ہے اور شکوہ سنجی بھی، غم جاناں بھی اور غم دوراں بھی، گل وبلبل کی باتیں بھی ہیں اور تصوف واخلاقیات کے مضامین بھی وغیرہ۔

تفصیل سے بچتے ہوئے بہت اختصار کے ساتھ آہ کی شاعری کے کچھ فکری اور معنوی عناصر کے اشارات پیش کئے جاتے ہیں:

سادگی اور سبک روی

☆ آہ کی شاعری میں اکثر سادہ اور سبک الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور وہ روزمرہ بول چال کی زبان میں بڑے بڑے علمی حقائق بیان کر جاتے ہیں، ان کی غزلیں طویل بحروں میں بھی ہیں اور چھوٹی بحروں میں بھی:

یہ کیسے مست ہیں مستی میں بھی ہشیار رہتے ہیں
بہک کر بھی نہیں کہتے کبھی کچھ راز ساقی کا

زمیں کیا آسمان کیا لامکاں تک دیکھ آئیں گے
اڑا کر لے چلے گا جب ہمیں اعجاز ساقی کا

ملے سب خاک میں ارماں مٹی اے آہ یوں محفل
نہ وہ مے ہے نہ میکش ہیں نہ سوز و ساز ساقی کا

نہ وہ مے ہے نہ مینا ہے نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے
رہے گا میکدہ میں آہ کس پر ناز ساقی کا

اثر اتنا تو ہے نالوں میں وہ بت چونک اٹھتا ہے
پس دیوار کرتا ہوں کبھی جو آہ و شیون میں

نکل کر کوئے جاناں سے بیاباں میں نہ تھا تنہا
ہزاروں حسرتیں ہمدم رہیں صحرا کے دامن میں

اب چھوٹی بحر کے نمونے دیکھئے:

مکتب عشق کا تقاضا تھا — وہ جدھر ہم اُدھر گئے ہوتے
ضبط نالہ سے کام ہے ورنہ — آسماں تک شرر گئے ہوتے
ایک دو جام بھی اگر پیتے — شیخ صاحب سدھر گئے ہوتے

فکری اعتدال

☆ آہ ایک عالم دین ہیں، ان کا ذہنی سانچہ خالص مذہبی ہے اور صوفیانہ رجحانات ان

کے خون کے شریانوں میں پیوست ہیں، لیکن ان کے یہاں اعتدال اور توازن ہے، وہ جام شریعت اور سندان عشق کو ایک ساتھ برتنے کے قائل ہیں، شدت اور غلو دونوں ان کے یہاں قابل ملامت ہے اسی لئے وہ ایک طرف شیخ صاحب کو ایک دو جام پینے کی نصیحت کرتے ہیں تو دوسری جانب عاشق مضطر کو ضبط نالہ کی تلقین بھی کرتے ہیں:

ضبط نالہ سے کام ہے ورنہ
آسماں تک شرر گئے ہوتے

ایک دو جام بھی اگر پیتے
شیخ صاحب سدھر گئے ہوتے

آہ فرماتے ہیں کہ عشق میں جب درجۂ فنا حاصل ہو جاتا ہے تو من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے، پھر عاشقوں کے لئے "انا انا" کہنے کا جواز باقی نہیں رہ جاتا، اسی لئے ماضی میں علماء شریعت نے ایسے پروانوں کو تختۂ دار پر چڑھانے کا جو فتویٰ دیا تھا وہ منطقی اعتبار سے غلط نہیں تھا:

وہ ستم ہی کریں وفا نہ کریں — ہم کو لازم ہے کچھ گلہ نہ کریں
تیرے بندے انا انا نہ کریں — مفت میں دار پر چڑھا نہ کریں
مٹ گیا فرق تو و من کا جب — عشق والے انا انا نہ کریں
بندۂ عشق کی تمنا ہے — تیری جس میں نہ ہو رضا نہ کریں

☆ طالب کے دل میں جب عشق کی آگ بھڑکتی ہے تو اس کی بے قابو لپٹوں کو حد میں رکھنے کے لئے کسی مرشد کامل کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی توجہ باطن سے انبساط قلب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، محبوب کے ساتھ لذت حضوری حاصل ہوتی ہے، اور انسان کے قلب ونگاہ میں وہ قوت بیدار ہو جاتی ہے جس سے وہ کائنات عالم کا روحانی سیر اور مشاہدہ کر سکتا ہے:

نگاہ مرشد کامل ہے وجہ انبساط دل
نہیں تو میں کہاں بندہ کہاں یہ ذکر سلطانی

غبار راہ ہوں اے آہ لیکن دل یہ کہتا ہے
جناب شیخ کے صدقہ میں ہو گی سیر روحانی

☆ تنگ نظر واعظ کا دل آتش عشق کی حرارت سے خالی ہوتا ہے اس لئے اس کی نگاہ وسعت آفاق سے محروم رہتی ہے، اسے نہیں معلوم کہ اس نور لامکاں کے جلوے کائنات کے ہر منظر میں پائے جاتے ہیں اور ڈھونڈھنے والے ہر جگہ اسی نور کو تلاش کرتے ہیں:

جلوہ کا تیرے خاص مکاں ہو نہیں سکتا
کعبہ میں، کلیسا میں، کہاں ہو نہیں سکتا

واعظ کو کبھی عشق بتاں ہو نہیں سکتا
پتھر پہ کوئی رنگ عیاں ہو نہیں سکتا

عشق لافانی

☆ آہ کی نگاہ بڑی دوررس ہے، وہ عشق کو لافانی قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک کاروبار عشق بلبل و پروانے پر موقوف نہیں ہے، عشق مرتا نہیں ہے، زندگی دیتا ہے:

گل ہوئی شمع محبت نہ کبھی گل ہو گی
عشق بلبل پہ ہے موقوف نہ پروانے پر

بظاہر عاشق مر کر مٹی میں مل جاتا ہے لیکن وہ ساغر و صراحی اور خم و پیمانہ بنکر مرنے کے بعد بھی محبوب کے شوق دید میں گردش کرتا رہتا ہے، اس کے عشق کا خمیر مٹی میں مل کر اس کو جاوداں کر دیتا ہے اور رہتی دنیا تک لوگ تربت پر اس کے عشق کا طواف کرتے ہیں:

دل کو میخانہ بنا آنکھوں کو پیمانہ بنا

پاکبازوں کو پلا کر رند مستانہ بنا

عشق میں مر کر مری مٹی ٹھکانے لگ گئی

حلقۂ تربت زیارت گاہ جانا نہ بنا

بعد مرنے کے بھی قسمت میں مری گردش رہی

خم بنا، ساغر بنا، آخر کو پیمانہ بنا

کیوں بھٹکتے پھر رہے ہو در بدر اے آہؔ تم

کچھ تو سوچو کیوں دل آباد ویرانہ بنا

عشق دراصل بڑے چیلنجوں کا نام ہے، مبتلائے محبت ساری دنیا سے تنہا ہو جاتا ہے، عشق کی تاریخ ہمیشہ لہو کے بوند سے لکھی جاتی ہے:

عجب وہ دن تھے، عجب لطف کا زمانہ تھا

چمن میں گل تھے گلوں میں مرا فسانہ تھا

یہی طریق محبت ہے کیا زمانے میں

ہوا ہر ایک الگ جس سے دوستانہ تھا

کتاب عشق کے جس جس ورق کو دیکھا آہؔ

لہو کے بوند سے لکھا ہوا فسانہ تھا

عشق حقیقی

آہؔ جس شراب محبت کی بات کرتے ہیں وہ ایک خاص قسم کی شراب ہے، جس کو پینے سے انسان بہکتا نہیں سنبھلتا ہے، اور اس کی ایک کش سے زمین سے آسماں اور مکاں سے لامکاں

تک کی سیر ہو جاتی ہے، مگر افسوس اب نہ وہ میکدے باقی رہے اور نہ وہ میکش، صرف رسم باقی رہ گئی ہے:

قوت برقی رگوں میں عشق نے ایسی بھری
تیرے عاشق اڑ کے پہونچے عرش پر سچ ہے کہ جھوٹ

یہ کیسے مست ہیں مستی میں بھی ہشیار رہتے ہیں
بہک کر بھی نہیں کہتے کبھی کچھ راز ساقی کا

زمیں کیا آسمان کیا لامکاں تک دیکھ آئیں گے
اڑا کر لے چلے گا جب ہمیں اعجاز ساقی کا

ملے سب خاک میں ارماں مٹی اے آہ یوں محفل
نہ وہ مے ہے نہ میکش ہیں نہ سوز و ساز ساقی کا

نہ وہ مے ہے نہ مینا ہے نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے
رہے گا میکدہ میں آہ کس پر ناز ساقی کا

اور ہمیشہ کوئی چیز کب رہی ہے جو آج رہے گی، یہ دنیا فانی ہے، یہاں ہر وجود خطرات کے اندیشے سے گھرا ہوا ہے، اس لئے میکدہ کا باغ و بہار بھی مٹ جانے والی چیز ہے، ہر دور میں ہر میکدہ کا آخری انجام یہی ہوا ہے، رہے نام بس اللہ کا۔

فنا کا جام پی کر ایک دن سب ہونگے متوالے
رہے گا میکدہ میں تا بکے اعجاز ساقی کا

شکوہ محبوب

☆غزل گو شعراء کے یہاں محبوب کے شکووں کی جو روایت رہی ہے وہ آہ کے یہاں بھی قائم ہے، ان کو بھی اپنے محبوب سے بے التفاتی، وعدہ شکنی، ٹال مٹول، اور رقیبوں کی طرف ناجائز میلان وغیرہ کی بہت سی شکایات ہیں۔۔۔۔۔ جس طرح شمع پر پروانے ٹوٹتے ہیں، اسی طرح حسن وکمال پر یہ شعراء نچھاور ہوتے ہیں، اور حسن کے ہرجائی پن کا علم رکھنے کے باوجود اس سے اپنے لئے وفا کی امید رکھتے ہیں، اور خواہ وہ کتنا ہی ذلیل کرے گرد راہ بن کر بھی اس کی گلی میں رہنے کی آرزو رکھتے ہیں، یہاں تک کہ موت کے بعد بھی انہیں اپنے ہرجائی محبوب کی ایک نظر التفات کا انتظار رہتا ہے، اور غزل کی دنیا میں اس سے مردانہ غیرت وو قار پر بھی کوئی حرف نہیں آتا:

یہاں تک اسے مجھ سے ہے اجتناب
کہ تربت سے دامن بچا کر چلا

کہہ رہی ہے یہ اداسی رنگ کی　　　　دشمنوں میں رات وہ پیشک گیا

ملادے خاک میں مجھ کو مگر یہ یاد رہے
رہوں گا تیری گلی میں غبار کی صورت

میرے پہلو سے گئے دشمن کے گھر سچ ہے کہ جھوٹ
غیر کی خاطر رہی مد نظر سچ ہے کہ جھوٹ

آپ کی محفل کی رونق ایک میری ذات تھی
بزم میں اغیار کا کب تھا گذر سچ ہے کہ جھوٹ

کبھی معشوق کے رویہ سے انسان اتنا بددل اور مایوس ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا سے خود کو الگ تھلگ محسوس کرنے لگتا ہے:

تمہارے نام لیوا اس طرح کوچہ میں بیٹھے ہیں
لئے تصویر دل میں سر میں سودا آنکھ چلمن پر

یہ کیسی بے کسی ہے روتے روتے کھل گئی آخر
پتنگا تک نہیں آیا ہماری شمع مدفن پر

ہزار حیف کہ اس نے نہ مدعا سمجھا
مرا کلام ہے دشوار چیستاں کی طرح

امید وصل نے ثابت قدم رکھا مجھ کو
جمے ہیں در پہ ترے سنگ آستاں کی طرح

فراق دست حنائی میں آہ سینے سے
ٹپک رہے ہیں لہو چشم خونچکاں کی طرح

عاشق اس کے لئے کبھی رب کائنات کے حضور پیشی کی دھمکی بھی دیتا ہے، جس پر دو گواہ بھی موجود ہیں، بوئے لہو اور خون آلود مٹی، مگر ظالم کو پھر بھی کوئی خوف نہیں:

المختصر یہ حال ہے خانہ خراب کا
دل تک ہوا ہے سوز دروں سے کباب سرخ

انکار جور حشر میں ظالم کرے گا کیا
شاہد ہیں میرے خون کے دو بو تراب سرخ

عشق کا سود و زیاں

☆عشق و محبت کی آگ کتنی تباہ کن ہوتی ہے، اور اس کے نتیجے میں درد و غم اور رنج والم کی کیسی خونچکاں داستان تیار ہوتی ہے، آہؔ کے کلام میں اس کی بھرپور عکاسی ملتی ہے، عشق میں انسان کسی کام کا نہیں رہتا، مرزا غالبؔ نے کہا تھا:

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

آہؔ بھی یہی فرماتے ہیں:

کتاب عشق کے جس جس ورق کو دیکھا آہؔ
لہو کے بوند سے لکھا ہوا فسانہ تھا

ہوائے وصل میں اے آہؔ دل بھی کھو بیٹھے
متاع شوق کے ہر سود میں زیاں دیکھا

اے جنوں تیری بدولت تو ہوئی سیر نصیب
دائی رنج و الم دیکھا زمانہ دیکھا

عشق میں انسان سب کچھ محبوب کی ذات پر قربان کر دیتا ہے، غم ہو خوشی ہو سب کچھ محبوب کے حوالے سے آتا ہے:

کہتا ہے درد عشق کہ سر ہے برائے دوست
دل ہے برائے دوست جگر ہے برائے دوست

المختصر یہ حال ہے خانہ خراب کا
غم ہے الم ہے آہِ سحر ہے برائے دوست

دیتے نہیں ہیں جان کسی پر بھی آہ ہم
رکھتے ہیں ہم عزیز مگر ہے برائے دوست

المختصر یہ حال ہے خانہ خراب کا
دل تک ہوا ہے سوز دروں سے کباب سرخ

یہ آتش عشق کبھی ایسی عالمگیر ہوتی ہے کہ اس کی لپٹیں زمین سے آسمان تک پہونچ جاتی ہیں اور اس سیل رواں میں پہاڑ بھی تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں، لیکن معشوق کی گلی میں اس کا ایک دھارا بھی نہیں پہونچتا اور نہ اس کی فضا میں اس سے کوئی ارتعاش پیدا ہوتا ہے:

دھواں دل سے اٹھا چنگاریاں اڑتی ہیں عالم میں
زمیں کیا آسماں پر بھی شرارے ہی شرارے ہیں

لگائی عشق نے وہ آگ جس سے جل گیا عالم
کہیں ممکن ہے یہ سوزش بھلا کوئی شرر رکھے

اے فلک تجھ کو جلادیتے ہم

کیا کہیں دل کے شرارے نہ گئے

اشک سے بہہ گیا عالم سارا

تیرے کوچے میں یہ دھارے نہ گئے

یہ ایک لاعلاج بیماری ہے، دنیا کے حکیموں کے پاس اس کی کوئی دوا نہیں ہے:

وہ درد ہے پہلو میں وہ سوزش ہے جگر میں

دنیا میں دوا جس کی اطبا نہیں رکھتے

جس دل میں فقط درد ہوا ے آہ کسی کا

اس دل کی دوا حضرت عیسیٰ نہیں رکھتے

اس کا علاج دو وحدتوں کی یکجائی کے ماسوا کچھ نہیں ہے، بالفاظ دیگر ایسی فنا جو بقا کا نقطہ آغاز ثابت ہو:

میں ہوں بیمار چشم نرگس کا دوست میرے مری دوا نہ کریں

سودائے زلف کا یہی ٹھہرا ہے اک علاج

یا میرا سر نہیں رہے یا آستاں نہیں

مگر آہ غالب کی طرح اس کو ناکامی نہیں بلکہ کامیابی کا پیش خیمہ اور خسارہ کا نہیں بلکہ نفع کا سودا قرار دیتے ہیں، اس سے پیدا ہونے والے ضعف وناتوانی کو وہ عاشق کی محویت اور فکر ونظر کا ارتکاز کہتے ہیں، دراصل درد جب حد سے سوا ہو جاتا ہے تو اس سے شادمانی پیدا ہونے لگتی ہے:

کیسا ضرر ہمیں تو ہوا نفع عشق میں
دل دے کے لے لیا ہے ہزاروں خوشی سے ہم

ہماری ناتوانی کیا مبارک ناتوانی ہے
نگاہیں ہٹ نہیں سکتیں جمی ہیں روئے روشن پر

خوگر درد کو بے درد نہیں آتا چین
اک سکوں ہوتا ہے جب درد جگر ہوتا ہے

درد کی لذت کا یہ کرشمہ ہے
ہزار رنج میں بھی دل کو شادماں دیکھا

☆مصائب کا تسلسل آپ کے نزدیک دلیل کمال ہے، بڑے لوگ ہی آفات کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں:

یہ بھی ہے کمالوں کی مرے پختہ دلیل　　　افلاک کے تیروں کا نشانہ ہوں میں

☆تصور جاناں میں حواس باختگی ان کے فلسفہ میں باغ و بہار اور لالہ زار ہونے کی علامت ہے اور محبوب اگر قابل تقدیس ہو تو پھر سیپارۂ دل سیپارۂ قرآن بن جاتا ہے، جس دل میں تصویر جاناں نہیں وہ ایک خالی مکان اور ویران چمن ہے جہاں خزاں کا بسیرا ہے۔

تصویر کھینچ لی ہے رخ دل پسند کی
سیپارۂ دل آج سے قرآن ہو گیا

اچھی سے اچھی صورتیں اب دل میں رہتی ہیں

خالی یہ گھر پڑا تھا ، پرستان ہوگیا

☆محبوب کی حضوری کے دباؤ میں کبھی دل بیٹھنے لگتا ہے تو اس کو یہ ادب سے تعبیر کرتے ہیں:

رہا چین سے دل ترے ہاتھ میں یہ وحشی بہت باادب ہوگیا

☆محبت کی راہوں میں جان دے دینا بھی زندگی ہے اور مٹ جانا بھی کامیابی ہے:

کسی پر جان دے کے زیست پائی جو صورت تھی فنا کی ہے بقا کی

☆جام محبت کسی جام جمشید سے کم نہیں ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس میں چین و عرب سے لیکر ساری کائنات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ انسان کو وہ محبت حقیقی حاصل ہو جائے:

اک پیالے میں کھلی کل کائنات جام جم سے بڑھ کے مے کا جام ہے

ازل سے ایک صورت منتخب معلوم ہوتی ہے

کہ جس کی دیر و کعبہ میں طلب معلوم ہوتی ہے

کوئی آئینہ ہے یا جام جم یا شیشۂ دل ہے

کہ اس میں صورت چین و عرب معلوم ہوتی ہے

محبت بشرط اہلیت قابل ملامت نہیں

☆اسی لئے آہ خالص مذہبی شخصیت اور ایک معتبر عالم دین ہونے کے باوجود جرم محبت کو نا قابل ملامت قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ معشوق اس لائق ہو اور عاشق بھی اہلیت کا حامل ہو۔

حسینوں سے محبت فرض وواجب ہم نہیں کہتے

جوانی میں مگر ہاں مستحب معلوم ہوتی ہے

یہ صرف عاشق کی مجبوری نہیں بلکہ حسن کی توقیر بھی ہے، کیونکہ شمع اسی وقت شمع بنتی ہے جب اس کے گرد پروانے بھی موجود ہوں:

مانا کہ عشق میں مری تشہیر ہوگئی　　　　لیکن اسی سے حسن کی توقیر ہوگئی

عاشق کی سزا تختۂ دار نہیں ہے، بلکہ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے، محبت کرنا جرم نہیں ہے، جرم یہ ہے کہ محبت کے باوجود زندہ رہے، محبت نے اس کو مٹایا کیوں نہیں، گویا تختۂ دار پر جھوم جانے والے دیوانوں کا جرم محبت کرنا نہیں بلکہ محبت میں ناقص رہ جانا تھا:

عاشق کو جرم عشق میں کیوں قتل کردیا

حد سے سوا حضور یہ تعزیر ہوگئی

ہوتا کمال عشق تو مٹ جاتے سامنے

جیتے رہے فراق میں تقصیر ہوگئی

اس طرح آہ نے غزل کو گوناگوں خیالات افکار اور دلچسپ لطائف ونکات سے مالامال کیاہے، اور شاعری کو نئی عظمتوں سے روشناش کیاہے۔

کلام آہؔ میں علمی واخلاقی مضامین

یہاں بات تشنہ رہ جائے گی اگر آہؔ کی شاعری کے اس حصہ کا ذکر نہ کیا جائے جس میں تصوف، اخلاقیات، فنا وبقا، فلسفۂ موت وحیات، وغیرہ سے متعلق مسائل ومباحث کی ترجمانی کی گئی ہے:

شریعت وطریقت کا امتزاج

☆ آہؔ فطری طور پر ایک صوفی شاعر اور فلسفی عالم ہیں، ان کے یہاں زبان وادب کی چاشنی ہے مگر بے دینی نہیں، علم الٰہی کی روشنی ہے مگر خشک مزاجی نہیں، شریعت کی پابندی ہے مگر طریقت سے آگاہی بھی ہے۔

آہؔ ان علماء ظاہر سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جن کے باطن میں محبت ومعرفت کی حرارت نہیں ہے، جس دل میں محبت کی چنگاری نہیں وہ پتھر ہے، اسے ذوق عبادت بھی میسر ہونا مشکل ہے، اہل طریقت کے نزدیک سودائے محبت سے بہتر کوئی خضر طریق نہیں، دنیا میں ہر چیز چشم ظاہر سے ہی نظر نہیں آجاتی، بہت سی چیزوں کے لئے ادراک باطن کی بھی ضرورت پڑتی ہے، وہ بینائی کس کام کی جو جلوۂ یار بھی نہ دیکھ سکے؟، اور وہ آنکھیں کتنی مردہ ہیں جن میں درد فرقت کا سوتا خشک ہو چکا ہو؟:

واعظ کو کبھی عشق بتاں ہو نہیں سکتا　　　پتھر پہ کوئی رنگ عیاں ہو نہیں سکتا

چشم ظاہر نے ہمیں دونوں جہاں سے کھودیا
خط وخال نقش باطل پر مٹے جاتے ہیں آج

جلوۂ یار نہ دیکھے تو وہ بینائی کیا
درد فرقت سے نہ روئیں تو ہیں پتھر آنکھیں

جنون عشق کے صدقے مکاں سے لامکاں لایا
جو سودائے محبت تھا وہی خضر طریقت ہے
محبت اصل ایماں ہے نہ سمجھا ہم کو اے ناصح
ہم ارباب طریقت ہیں تو مامور شریعت ہے

پہلوئے عاشق میں جب وہ بت نہیں تو ناصحا
کیا کریں گے لے کے حوریں آسمانی آپ کی

اٹھادے پردۂ پندار پی لے جام وحدت کا
ذرا آ دیکھ کیا کیا اس میں ہیں لعل و گہر رکھے

بغیر شراب محبت کے دل کا دروازہ نہیں کھلتا

مگر یہ مجازی محبت کی شراب نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ حقیقی شراب محبت ہے جس سے رب کائنات کی معرفت حاصل ہوتی ہے، آفاق وانفس کا مشاہدہ اور کائنات کی روحانی سیر حاصل ہوتی ہے، معنوی اور روحانی فتوحات کے دروازے کھلتے ہیں، قلب وضمیر پر اسرار و معانی کا نزول ہوتا ہے:

محرم راز و نیاز خلوت توحید ہیں کاشف علم معانی ہم ہی کہلاتے ہیں آج

فیض روح القدس سے اے آہ میں ہوں مستفیض

میری نظمیں کاشف اسرار قرآں ہوگئیں

کھل گئے اسرار قدرت کے ہمارے سامنے

صورتیں نظروں میں ساری ماہ کنعاں ہوگئیں

درد محبت کی یہی وہ وراثت ہے جو آہ کو اپنے پرکھوں سے ملی ہے، اور ہر مرشد و رہنما نے یہ سوغات اپنے ماننے والوں میں تقسیم کی:

اک ٹیس ہوا کرتی ہے راتوں کو جگر میں

اک یاد چلی آتی ہے سوتے کو جگانے

فرمان دیا عشق کا ہر فرد نے ہم کو

استاد نے مرشد نے پیمبر نے خدا نے

فنا اور بقا

یہ وہ منزل ہے جہاں قدم رکھتے ہی انسان اپنی ہستی فراموش کر جاتا ہے:

مکتب عشق میں جس دن سے قدم رکھا آہ

اپنی ہستی بھی فراموش ہوئی جاتی ہے

محبت نے مٹایا آہ ایسا　　　　پتہ میرا نہ تربت کا نشاں ہے

خاک ہونے کا محبت سے ملا پروانہ

تیرا دیوانہ بس اب خاک بسر ہوتا ہے

پھر ایک بار مٹنے کے بعد دوبارہ فنا نہیں ہے، انسان زندۂ جاوید ہو جاتا ہے، یہ وہ نور ہے جسے نہ کوئی آگ جلا سکتی ہے اور نہ کوئی طاقت بجھا سکتی ہے:

مرمٹوں کو کیا مٹائے گا فلک   حشر تک ان کی کہانی جائے گی

جل چکا سوز محبت سے سراپا آہ جب

پھر بھلا اس نور کو کیوں کر ہراس نار ہو

فنا یہ ہے کہ دیدار محبوب کے سوا کوئی آرزو باقی نہ ہو اور اس کی مرضی کے سامنے اپنی کوئی مرضی نہ ہو، اسی کو اصطلاح میں راضی برضا اور شاکر بقضا کہتے ہیں:

تمنا حور کی ہم کو نہ کچھ ارمان جنت ہے

جہاں دیدار ہو تیرا وہیں عاشق کو راحت ہے

بندۂ عشق کی تمنا ہے

تیری جس میں نہ ہو رضا نہ کریں

تم مہربان ہو تو کوئی نا مہرباں نہیں

دشمن زمیں نہیں ہے عدو آسماں نہیں

ضبط تپ فراق ہمارا نہ پوچھئے

دل صاف جل گیا مگر اٹھا دھواں نہیں

بندۂ تسلیم کی اس کے سوا حسرت نہیں   سر جھکا ہو پائے قاتل پر کھنچی تلوار ہو

مکتب عشق کا تقاضا تھا   وہ جدھر ہم اُدھر گئے ہوتے

منظور اگر قتل ہے کیوں دیر ہے صاحب
سر دینے میں ہم عذر ذرا سا نہ کریں گے

ربط و حضوری

اس فنا اور خود فراموشی کے بعد جو ربط و حضوری حاصل ہوتی ہے وہ اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ نگاہ صرف ایک وجود پر مرکوز ہو جاتی ہے، اور اس ایک کے علاوہ کوئی دوسرا وجود نظر نہیں آتا، ہر تصویر میں اسے جلوۂ جاناں کی جھلک ملتی ہے، اور سالک بھٹک کر بھی منزل مقصود تک ہی پہونچتا ہے۔

وہ زلف جو ہے یاد ہمیں شام ازل کی
ہم سر میں کسی غیر کا سودا نہیں رکھتے

جب سے دل پر شوق ہے پامال تصور
آنکھوں میں بھی ہم غیر کا جلوہ نہیں رکھتے

سرشار کیا جام محبت نے کسی کے
اب ہم طلب ساغر و مینا نہیں رکھتے

غیر کی یاد جو کرتا ہوں کبھی بھولے سے

جلوۂ یار مرے پیش نظر ہوتا ہے

پائے تصور میں جب ایک حلقۂ زلف موجود ہو تو خیال غیر کی کیا گنجائش ہے:

پڑے ہیں حلقہائے زلف جو پائے تصور میں

خیال اغیار کا مستلزم دور و تسلسل ہے

اغیار کا عشق آہ ہمیں ہو نہیں سکتا

ہم دل کو گذر گاہ بنایا نہ کریں گے

محبت وفنا کے اس ارتکاز میں بظاہر پابندی محسوس ہوتی ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پابندی کے بعد انسان تمام غیر حقیقی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے:

اسلام کے پابند ہیں آزاد جہاں میں

بت خانہ نہیں رکھتے کلیسا نہیں رکھتے

یہی ارتکاز توحید کا خلاصہ ہے ،یہی وحدۃ الوجود ہے اور یہی صوفیا کے یہاں خلوت درانجمن بھی کہلاتی ہے:

قید تنہائی ہمارے حق میں اچھی ہوگئی

خلوت توحید میں سب سے جدا ہم ہوگئے

مزہ اے آہ جب سے خلوت توحید کا پایا

بھرے مجمع میں رہتے ہیں مگر سب سے کنارے ہیں

مرنے والے بھی خلوت توحید ہی کی جستجو میں کنج مرقد میں جاکر لیٹ جاتے ہیں:

مزے خلوت نشینی کے جو پائے مرنے والوں نے
اکیلے جا بسے سب چھوڑ کر وہ کنج مدفن میں

خدا تک پہونچنے کا اس سے بہتر کوئی راستہ ہے، ہر پہونچنے والے نے خدا کو اسی تنہائی سے پایا ہے، لوگ نہ معلوم رب کی تلاش میں کہاں کہاں سر گرداں رہتے ہیں، انسان تو انسان آفتاب وماہتاب بھی اسی جستجو میں محو سفر ہیں:

گردش میں آفتاب بھی ہے ماہتاب بھی
منزل کا تیری ملتا کسی کو نشاں نہیں

کعبے میں تم ملے نہ کلیسا میں تم ملے
روزالست سے تمہیں ڈھونڈھا کہاں نہیں

جلوہ کا تیرے خاص مکاں ہو نہیں سکتا
کعبہ میں، کلیسا میں، کہاں ہو نہیں سکتا

خدا باہر نہیں انسان کے اندر ہے، اسے اکیلے میں اپنے وجود میں تلاش کرنا چاہئے، اس کے لئے نہ طور کی ضرورت ہے اور نہ مسجد وکلیسا کی:

مجھ کو تصویر خیالی سے حضوری ہے مدام
طور پر جلوۂ جانانہ رہے یا نہ رہے

ہم تو بچپن سے ہم آغوش بتاں رہتے ہیں
فکر کیا دہر میں بت خانہ رہے یا نہ رہے

خودشناشی سے خداشناشی بھی حاصل ہوتی ہے، سب کو چھوڑنے کے بعد رب ملتا ہے،

جس طرح سیاہی پس کر آنکھوں کا سرمہ بنتی ہے، اسی طرح بندہ مٹ کر خدا تک پہونچتا ہے:

خاک ہو کر ہم سیہ کاروں کا ہوتا ہے عروج
سرمہ سا پس کر نگاہوں تک رسا ہم ہو گئے

سیہ کار ہوتا ہے پس کر عزیز　　　رہا آنکھ میں سرمہ جب ہو گیا

اس کے بعد پروردگار سے ایسا مضبوط رابطہ ہو جاتا ہے کہ درمیانی واسطوں کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے، اور بندہ خدا سے خود ہم کلام ہونے لگتا ہے:

رابطہ کامل ہے تو قاصد کی نہیں حاجت آہ
میری ہر سانس مقرر ہے خبر لانے پر

جذب کامل ہے تو رہتی ہے حضوری ہر دم
ربط والوں کے وہ خود پیش نظر ہوتا ہے

قیادت کے لئے نسبت ضروری ہے

ایسے ہی لوگ اصحاب نسبت کہلاتے ہیں، اور انہی کو انسانیت کی قیادت و پیشوائی زیب دیتی ہے:

جب شراب بے خودی ہم سیر ہو کر پی چکے
سالک راہ ہدیٰ کے پیشوا ہم ہو گئے

تھے وجود رابطی سے بھی ضعیف اے آہ ہم[362]

حامل بار امانت کیوں بھلا ہم ہوگئے

ورنہ محض دعویٰ عشق سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کی پشت پر ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو:

رقیبوں کو تمہارے عشق کا دعویٰ تو ہے لیکن

کہاں ہے وہ جو آہ نارسا کا سا جگر رکھے

انوار پاک کا نظر آنا محال ہے

آنکھوں پہ میکشوں کی پڑے ہیں حجاب سرخ

دبستان محبت کی سند رکھتا ہے دل میرا

یوں ہی کیا ہجر میں فریاد ادب آموز ہوتی ہے

آہ شرابا طہورا کے نشہ میں ایسے بے خود اور عشق و محبت کی آتش سوزاں میں جل بھن کر اس طرح راکھ ہو چکے تھے کہ دنیا کی تمام دلچسپیاں ان کے سامنے بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔

حسن پر اتنا غرور اچھا نہیں چار دن میں یہ جوانی جائے گی

آہ فکر آخرت اب چاہیے رائگاں ورنہ جوانی جائے گی

---

[362] وجود رابطی کی تشریح کلیات آہ میں وہاں کی گئی ہے جہاں یہ غزل موجود ہے۔

امارت سے مجھ کو سروکار ہے کیا　　　طبیعت ہی غربت کی پالی ہوئی ہے

میں آشنائے درد ہوں درد آشنا مرا　　　ناصح یہ راز بستہ کسی پر عیاں نہیں
مر مٹ چکے کسی کی محبت میں آہ ہم　　　ڈھونڈھے سے بھی تو ملتا ہمارا نشاں نہیں

آرزو، حسرت، تمنا، لذت سوز و گداز
سب ہمارے ساتھ زیر خاک پنہاں ہو گئیں

حیات و موت کا ہے جب ازل سے سلسلہ جاری
مرا ہے آج گر دشمن تو کل ہے دوست کی باری

یہاں آنے کی شادی اور چل دینے کا ماتم کیا
جو ہر انساں کو پیش آنی ہو اس تکلیف کا غم کیا

زندگی حسرتوں اور ناکامیوں کا نام ہے، رنج و غم آتے ہیں، امیدیں ٹوٹتی ہیں اور پوری ہوتی ہیں، مگر انہی حسرتوں کے شجر سے کامیابیاں تراشی جاسکتی ہیں:

غریق لجۂ آفت ہے عمر کی کشتی　　　ہمیشہ باد مخالف میں بادباں دیکھا

جیتے جی حسرت نہ نکلی کچھ دل ناشاد کی
ہو گیا واصل بحق تو ان کا کاشانہ بنا

جگ بیتی اور آپ بیتی

آہ کی شاعری میں جگ بیتی بھی ہے اور ان کی آپ بیتی بھی، اس آئینہ خانے میں ان کی زندگی کے سوز و ساز اور درد وداغ ابھر کر سامنے آتے ہیں، ان کا منظوم استعفانامہ سماجی زندگی میں ان کے ذاتی کرب کا آئینہ دار ہے:

نظریں پھری ہوئی ہیں حریفوں کی ان دنوں
لیکن کسی سے پھر بھی عداوت نہیں مجھے

مد نظر تھا درس خدا ہی علیم ہے
مقصود اس سے غیر کی ذلت نہیں مجھے

کرتا کمی سبق میں کسی کے خیال سے
بے شک یہ انکسار و مروت نہیں مجھے

نکل کر کوئے جاناں سے بیاباں میں نہ تھا تنہا
ہزاروں حسرتیں ہمدم رہیں صحرا کے دامن میں

جو غربت میں کبھی رویا تو ہنس کر بے کسی بولی
حقیقت میں وطن وہ ہے جہاں احباب رہتے ہیں

ذکر رہ جائے گا اس جور و ستم کا تیرے
آہ ناکام کا افسانہ رہے یا نہ رہے

لطائف حکمت

آہ کی شاعری میں حسن و عشق، گل وبلبل اور درد و غم کے ساتھ حکمت وفلسفہ کے دقائق اور لطیف نکات کا بھی خوبصورت امتزاج ملتا ہے، گو کہ اس کی مقدار کم ہے، لیکن جو بھی ہے بہت اہم ہے، اس کی بھی کچھ مثالیں پیش ہیں:

مقصد مرگ

☆ آہ نے فلسفہ موت پر ایک خوبصورت نکتہ پیش کیا ہے کہ موت ان کو اس لئے عزیز ہے کہ مرنے کے بعد کم از کم زیارت جاناں تو ہو گی، اس لئے کہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی:

مرتے ہیں اس امید میں دیکھیں گے تمہیں ہم
سنتے ہیں کوئی روک قیامت میں نہیں ہے

حیات بعد الموت

☆ انسان کا جسم مرنے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے، مگر اس کی روح جاوداں ہوتی ہے ،اللہ پاک اپنی خاص قدرت سے تمام اجزاء انسانی کو نئی ترکیب دے کر حیات بخشیں گے:

مٹی میں ملا کے جو بلایا سر محشر
لاشہ ترے بیمار کا تربت میں نہیں ہے

حرمت شراب

☆ حرمت شراب کی نازک اور لطیف توجیہ دیکھئے:

مری چھوڑی ہوئی بنت عنب تم کو ملی رندو
بڑی پیر مغاں نکلی یہی تو اس کی حرمت ہے

موت کے بعد بھی گردش

☆مر کر انسان مٹی میں مل جاتا ہے، پھر اسی مٹی سے ساغر و پیمانہ بنتے ہیں اس طرح عاشق مرنے کے بعد بھی روئے زمین پر گردش کرتا ہے، اور خانۂ معشوق کا طواف کرتا رہتا ہے:

بعد مرنے کے بھی قسمت میں مری گردش رہی
خم بنا، ساغر بنا، آخر کو پیمانہ بنا

مزار اندر مزار

☆جس شخص کی موت عشق میں ہوتی ہے، مرنے کے بعد بھی اس کا عشق زندہ رہتا ہے، اس کے نہاں خانۂ دل میں اس کے معشوق کی تصویر موجود ہوتی ہے، اس طرح مرنے والے عاشق کے مزار کے اندر بھی ایک مزار پوشیدہ ہوتا ہے:

مجھے جو دفن کیا رکھ کے دل کو سینے میں
بنی مزار میں اک اور مزار کی صورت

حق وفا

☆عاشق اپنی تمام حسرتوں اور آرزوؤں کے ساتھ مٹی میں دفن ہو جاتا ہے، لیکن کبھی معشوق کا اس مقام سے گذر ہوتا ہے تو غبار راہ کی صورت میں وہ اس کے پاؤں سے لپٹ جاتا ہے، اور زندگی کی مراد ناتمام مرنے کے بعد پوری ہو جاتی ہے:

خوشا نصیب کہ بعد فنا ہوا پابوس
ترے قدم سے ملا میں غبار کی صورت

قلب عاشق

☆کسی شاعر نے اپنے معشوق کو برسات کا مزہ لینے کے لئے اپنی آنکھوں میں آبیٹھنے کی دعوت دی تھی کہ یہاں سفیدی، سیاہی اور شفق اور ابر باراں سب کچھ موجود ہے، آہ نے اپنے دل کو لالہ زار قرار دیا ہے، کہ تصویر بتاں اور خون حسرت نے یہاں لالہ زار کا منظر پیدا کر دیا ہے، اس لئے شوق سیر چمن کی تسکین کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے دل سے بہتر کوئی لالہ زار نہیں:

ہوائے سیر چمن ہے تو دل میں آبیٹھو
بنا ہوا ہے یہ اک لالہ زار کی صورت

شمع مزار

☆مزار پر جلتی ہوئی شمع کو آہ سوز الفت کی نشانی قرار دیتے ہیں اور اگر باد صرصر کے جھونکوں میں کبھی یہ لو دھیمی پڑنے لگتی ہے تو اس نشانی کے مٹنے کا انہیں غم ہوتا ہے:

فنا کے بعد بھی باقی نشان سوز الفت ہے
حرارت سے دل عاشق کی روشن شمع تربت ہے

سوز الفت کی نشانی تھی فقط شمع مزار
دامن صرصر اسے بھی گل کئے جاتے ہیں آج

مٹ گیا سوز محبت کا اثر تربت سے
ورنہ افسوس نہ تھا شمع کے بجھ جانے پر

تربت کے پھول

☆تربت پر پڑے پھول تر و تازہ ہوں اور شمع جل رہی ہو تو یہ مرنے والے کی زندہ دلی کی علامت ہوتی ہے اور اگر پھول مرجھا جائیں اور شمع گل ہونے لگے تو یہ صاحب تربت کی افسردہ دلی کی دلیل ہے:

مری تربت پہ افسردہ دلی کا دیکھ لو نقشہ
کہ جتنے پھول ہیں مرجھائے ہیں جو شمع ہے گل ہے

دیوار عنصری

☆عناصر اربعہ کی دیواروں کے بیچ خون سے لبریز رگیں دراصل طیر روح کی بندشیں ہیں، جس دن قدرت کی طرف سے ان بندشوں کے ختم کرنے کا فیصلہ ہو گا اسی دن یہ طنابیں کھینچ دی جائیں گی:

اک طیر روح کے لئے یہ سب ہیں بندشیں
دیوار عنصری میں کھچی ہے طناب سرخ

صلح کل

☆دنیا میں حقیقی طور پر کوئی انسان صلح کل نہیں ہو سکتا کہ اس سے کسی کو اختلاف نہ ہو، یہ کوئی منافق ہی ہو سکتا ہے، جس کی گردن میں زنار بھی لٹک رہی ہو اور ہاتھ میں نمائشی تسبیح بھی گردش میں ہو:

صلح کل ہم ہو نہیں سکتے مگر اس شرط سے
ہاتھ میں سُبحہ ہو گردن میں پڑی زنار ہو

حقیقت زندگی

☆انسان کی ساری زندگی کی حقیقت ایک شعر میں بیان کردی ہے:

جوانی کی خوشی پیری کا غم مرنے کی جانکاہی

مری عمر دو روزہ کی فقط اتنی حقیقت ہے

حقیقت کائنات

☆یہ وسیع کائنات (جس کے کسی ایک جزو کی جملہ تفصیلات کا احاطہ بھی انسان کے لئے ممکن نہیں) خالق عالم کے صرف دو حرف کن کا کرشمہ ہے، اس سے ایک طرف پروردگار کی بے مثال قدرت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری جانب کائنات کی ایک انتہائی کمزور حقیقت سامنے آتی ہے، دو حرف سے وجود میں آنے والی شے دو حرف میں مٹ بھی سکتی ہے۔

ہوگئی دو حرف میں کل کائنات　　　　کن کی وسعت کو سمجھنا چاہئے

حسرت دیدار

☆موت کے وقت جس کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں، دراصل وہ حسرت دیدار کی ٹکٹکی ہے، جس سے آدمی دیدۂ عبرت نما بن جاتا ہے:

ٹکٹکی باندھے رہے ہم حسرت دیدار میں

جان دے کر دیدۂ عبرت نما ہم ہوگئے

کلام الٰہی کے آبگینے

☆آہ نے بہت سے سہرے لکھے ہیں، سہرا پھولوں کے مالا کو کہتے ہیں، مگر آہ نے گلاب وموتیا اور یاسمین ونسترن کے ساتھ کلام الٰہی کے آبگینے بھی ان میں جڑ دیئے ہیں، جن سے سہروں

میں حسن و معنویت اور شب دیجور میں بیاض صبح اور طرۂ زلف میں کہکشاں کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے:

کہیں گلاب کہیں موتیا کھلی دیکھی
طرح طرح کے ہیں پھول اور چمن چمن سہرا

زہے نصیب کہ لڑیاں ہیں پانچ سہرے میں
بنا ہے یمن و سعادت کا پنجتن سہرا

جو مالن گوندھ لائی سورۂ شمس و قمر پڑھ کر
تفوق چاند پر بھی لے گئی تنویر سہرے کی

سورۂ اخلاص پڑھ کر آہ نے سہرا کہا
اس لئے یہ بوئے اخلاص و وفا سہرے میں ہے

شب دیجور ہے یا زلف یا سنبل کا طرہ ہے
بیاض صبح ہے واللیل میں یا کہکشاں سہرا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کلیات آہ

(منتخب مجموعۂ کلام حضرت مولانا سید عبد الشکور آہؔ مظفر پوریؒ)

ترتیب و تحقیق

مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

(ابن نبیرۂ حضرت آہؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا عبد الشکور آہ مظفر پوریؒ بیسویں صدی کے عظیم شاعر اور بڑے عالم ربانی تھے، ان کا مجموعۂ کلام آج تک کاغذات کے دفینے میں مستور تھا، اور عجب نہیں کہ ان کا یہ کلام بھی ان کی دیگر علمی وادبی تحریرات کی طرح ضائع ہو جاتا، اس باب میں اس کا منتخب حصہ پیش کیا جاتا ہے۔
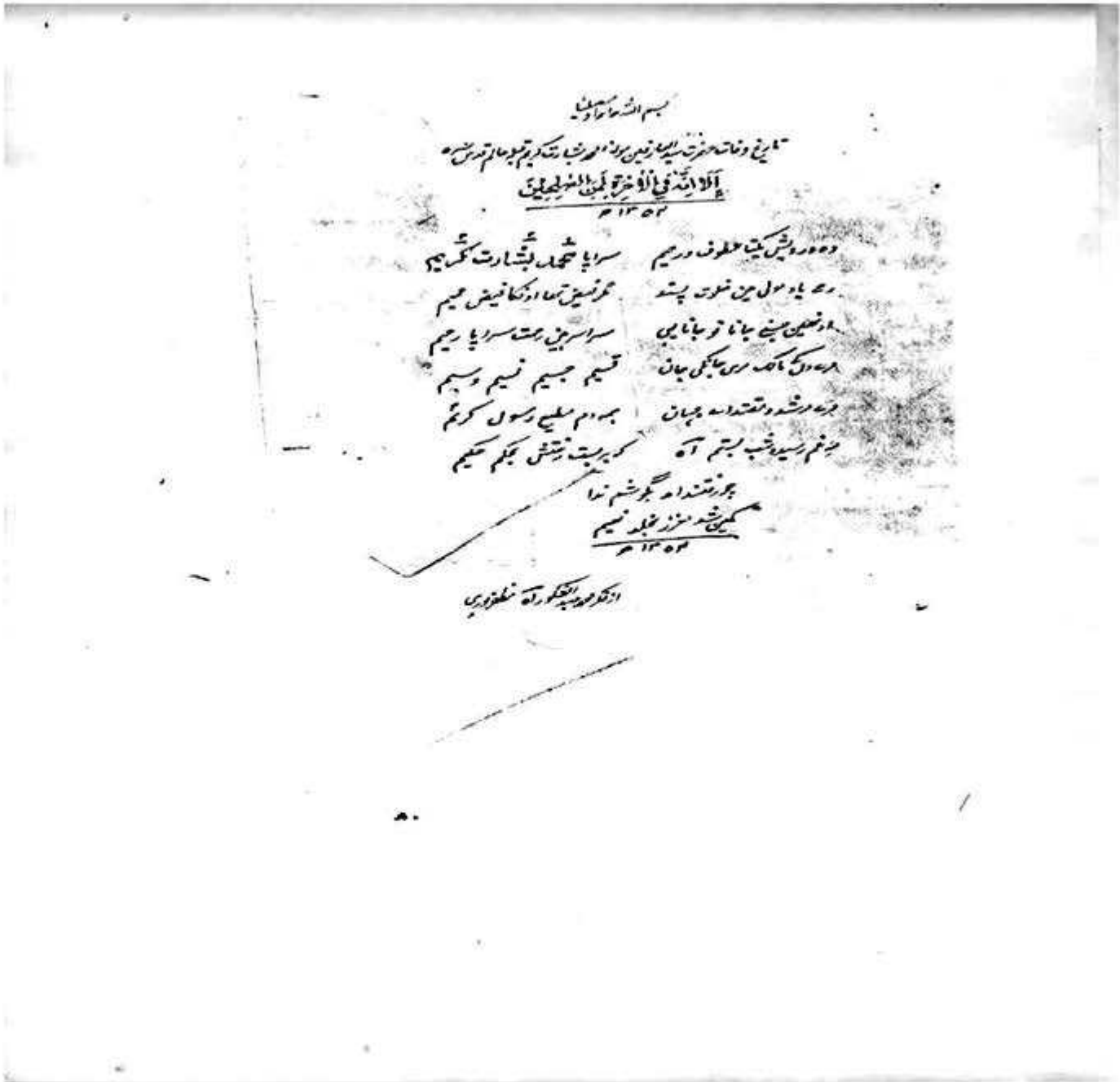
نعت پاک
بحضور سید الکونین، رسول الثقلین،
امام الاولین والآخرین، خاتم النبیین
حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ

(۱)

القصیدۃ العربیۃ

(نعت پاک بہ زبان عربی)

حان ان نثنی علیٰ خیرالوریٰ	الذی نارت بہ شمس الہدیٰ
مارأت عینانی وجہاً مثلہ	صبہ ایضاً کمثلی لن یرا
قد اری من نورہ یجلو القمر	بل رأیت الشمس ایضاً ہٰکذا
قوت قلبی ذکرہ بل فکرہ	رَوح روحی وصلہ واحسرتاہ
ماسواہ حول قلبی لم یدُر	سمعی مشتاق لذکر المصطفا
اعظمی ذابت بحرّ الاشتیاق	یا رسول اللہ یا روحی فدا
ارضہ یارب عندی جنۃ	لیت ربی ہذہ عجلتہا
من تلا آیاتہ مستیقناً	قد تخلی قلبہ عما سواہ
من یطع ہذا النبی مستخلصاً	خیر حیٌ عند ارباب الصفا
قد رأی واللہ انوار الالٰہ	من رأی انوارذاک المرتضیٰ
رب ھب لی عشقہٗ بل وصلہٗ	انت ربی انت من یعطی المنا
رب ھب لی قرب بطحاء النبی	بعد ما اعطیت قلبی جذبہا
آہ فاز الخیر من صلیٰ علیہ	فلذا اسلم و اصلی دائماً

(۲)

نعت پاک بہ زبان فارسی

اے کہ از نامت نمایاں جاہ و فخر سروری
رفت صیت خلق تو بالائے چرخ چنبری

روئے تو نور الہدیٰ بدر الدجیٰ شمس الضحیٰ
ذات تو در عُلو رشک گنبد نیلو فری

فضل تو در ذات پنہاں مثل باراں در سحاب
حلم از رویت جلی چوں حسن از حور و پری

سکۂ خلقت زدی بر ہفت ملک ہفت چرخ
حبذا اے وجہ فخر ہر ولی و ہر نبی

شد مرصع ذات تو از زیور عرفان حق
چوں معطر شد ہوا از طیب پاک عنبری

شد ز فیضت ماہ بر گردون دوں بدر منیر
مہر تاباں را میسر از رُخَت تابش گری

زانتقاش نقش پایت فخرہادارد زمیں

وز غبار راہوارت چرخ راایں برتری

انت یااہل المعالی صدر ارباب العلا

انت یا مولی الموالی فخر دین الاکبر

انت علام جلیل مکرم لاریب فیہ

انت بدرالعلم بل شمس السماء الاخضر

انت برق تخطف ابصار جمع الحاسدین

انت سیف للعدو الظالم المستنکر

اولیاء دہر را کے با تو باشد نسبتے

آں ہمہ اندر حضیض وتو باوج مہتری

مثل یوسف گر تو آئی بر سر بازار علم

خیزد از قبر کہن بقراط گردد مشتری

اے کہ ذاتت ہر نبی را منتج مقصود شد

او بود صغریٰ وتو کبریٰ بچندیں اکبری

بحث معقولات ثانی شوشۂ از علم تست

زانکہ تو آموز گار حکمت ودانشوری

تو وجود رابطی اندر میان ہر وجود[363]

در حقیقت عابد و معبود را واصل گری

ہست ناپیدا ثنایت بتکریر وجود

مرحبا اے مایۂ خوش وقتی و نیک اختری

سابع عرض شعیرہ نسبتے دارد بارض

ہم چنیں نسبت بہ تو دارد فلک در برتری

پایگاہت برتر از پرواز طیر عقل کل

زآستانت مفتخر شد قصر ترک و قیصری

بر وجودت ختم باشد جلوۂ حق اے نبی

بر غلامت ختم شد احیاء رسم رہبری

مرحبا اے پیشوائے اولیاء وانبیاء

مرحبا اے رونق آرائے سریر برتری

تو گل گلزار خوبی دشمنانت خارہا

خارہارا کے بود با گل مجال ہم سری

ابر گرید ز اشتیاقت بحر جوشد در فراق

اے دُر دُرج علا حقا کہ یکتا گوہری

---

[363] وجود رابطی کی تشریح غزل والے حصے میں آرہی ہے انشاء اللہ۔

از نسیم لطف خویت غنچہائے دل شگفت
وز نوال آل تو ناکام دریوزہ گری

گوہر ذات فریدت درۃ التاج الکرم
چار یارت راز لطفت بود تاج افسری

من چہ دانم تا بگویم وصف تو اے کان جود
لیک از بہر سعادت کردم ایں مدحت گری

حال زارم نیست پنہاں از تو اے ماوائے من
پس توقع دارد آہ از لطف جویم بنگری

نظمیں

(۳)

جہان بے بقا کی دوستو! ہر چیز فانی ہے
تنفس کی طرح ہر شے یہاں کی آنی جانی ہے
غرض ہونا یہاں کا اک نہ ہونے کی نشانی ہے
تمہی دیکھو! کہاں وہ شوکت نوشیر وانی ہے
نظر آتے ہیں جو نقشے یہ سارے مٹنے والے ہیں
اجل نے دھکے دے دے کر ہزاروں کو نکالے ہیں

اسی کی ذات واحد ہے قدیم و باقی و قائم
جو تھا پہلے ازل سے اور رہے گا اک وہی قائم
جہاں کے ظالم وسفاک وجابر منعم وناعم
شریف وخود پسند وبے نوااور زاہد وصائم
عزیز اور آشنا اغیار اور احباب جتنے ہیں
ذرا یہ بھی تو دیکھ ان سب میں تیرے دوست کتنے ہیں

بھرا ہے یہ جو سودائے ہوس ایک ایک کے سر میں
پھنسا رکھا ہے جس نے کر کے حیراں ایک چکر میں
نہ آسائش سفر میں دے نہ دم لینے دے یہ گھر میں
قضائے ناگہانی سے نکل جائے گا دم بھر میں
گھڑی جب آنے والی آگئی سب بھول جائیں گے
دکھایا جب منہ اس نے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے

کرو شکر اس خدا کا جس نے دی ہے تم کو یہ دولت
تغیر کے تسلسل میں یہاں کی ہے ہر اک حالت
نہیں رہنے کی یہ حالت نہیں ملنے کی یہ مہلت
غنیمت ہے ملی ہے جس قدر یہ زیست اور صحت
یہاں رہ کر وہاں کے واسطے بھی کام کچھ کر لو
بہت لمبا سفر ہے زاد کچھ تو باندھ کر دھر لو

کھنچا رہتا ہے اس کی طرف سے کیوں بے شعور اتنا
تجھے کیوں اپنی اس ہستی پہ رہتا ہے غرور اتنا

عبث تو ہو رہا ہے نشۂ دولت میں چور اتنا
خدا کے واسطے یاد خدا سے ہو نہ دور اتنا
کہ آخر کنج مرقد میں مقرر ہے تری منزل
یہی حالت اگر تیری رہی ہو گی بڑی مشکل

ہزاروں چل بسے عبرت سرائے دہر سے رو کر
بہت رونا پڑا ہے ان کو عمر بے بقا کھو کر
گزارا وقت عیش آرام سارا نیند میں سو کر
جو اٹھے خواب سے آخر تو اٹھے ناتواں ہو کر
کھلی آنکھیں تو پایا فرق ترکیب عناصر میں
نہ طاقت کچھ بدن میں ہے نہ قوت چشم باصر ہے

بری ہے اے عزیزو! فتنہ پردازی دل آزاری
بدی میں اور نیکی میں ہے فرق خواب و بیداری
حیات و موت کا ہے جب ازل سے سلسلہ جاری
مرا ہے آج گر دشمن تو کل ہے دوست کی باری

یہاں آنے کی شادی اور چل دینے کا ماتم کیا
جو ہر انساں کو پیش آئی ہو اس تکلیف کا غم کیا

ملو سب سے محبت سے یہ ہے ارشاد رحمانی
اسی حق نے مزین کی ہے ساری بزم انسانی

مجوسی و یہودی مسلم و ہندی و نصرانی
خراسانی و تاتاری و شامی و بدخشانی

لگایا ہے یہ سارا باغ عالم ایک مالی نے
تمہیں تفریق میں ڈالا ہے کس کوتہ خیالی نے

(۴)

انقلابی نظم

اے میرے پیر وجواں آگے بڑھو آگے بڑھو

تھام لو قومی نشاں آگے بڑھو آگے بڑھو

جلد اعداءِ وطن کا منہ عدم کو موڑ دو

کوہ بھی حائل اگر ہو بیچ میں تو توڑ دو

جو دکھائے آنکھ تم کو آنکھ اس کی پھوڑ دو

موت سے اغیار کے رشتے کو اٹھ کر جوڑ دو

اے میرے پیر وجواں آگے بڑھو آگے بڑھو

تم ہو مسلم قوم تم ہو تیغ و خنجر کے دھنی

سب تمہاری چشم کو کہتے ہیں برچھی کی انی[364]

تم ذرا بپھرو تو شیروں پر بھی چھائے مردنی

کیا تمہارے سامنے ہیں ارمنی و جرمنی

اے میرے پیر وجواں آگے بڑھو آگے بڑھو

---

[364] ۔نوک۔

ہے تمہارا ہر نقب آفاق میں خیبر شکن
چیر ڈالے تم نے آسانی سے شیروں کے دہن

اب ہو تم خاموش کیوں بیٹھے ہوئے اے جان من
ہاتھ میں شمشیر لے لو باندھ لو سر سے کفن

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

تم اٹھا لو ہاتھ میں پھر دوش خالدؓ کا علم
زور حیدرؓ کا دکھادو اور عثمانؓ کا خشم

تم کو ہے کس بات کا کھٹکا بتاؤ کیا ہے غم
ساری دنیا سے زیادہ ہو کسی سے کب ہو کم

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

شیر نر بھی کانپتے ہیں تم سے اے شیر نبرد
کاخ کسرےٰ کو مٹا کر کر دیا جب تم نے گرد

کیا تمہارے سامنے ہیں دشمنان روئے زرد
گرم جوشی تم کرو اغیار کی اب جلد سرد

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

تم اگر چاہو تو ہل جائے ابھی چرخ بریں
شق تمہارے حکم سے ہو ساری دنیا کی زمیں

ہو بپا آفت جہاں میں تم جو بگڑو اہل دیں

دیر کیا ہے کھینچ لو خنجر الٹ لو آستیں

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

کون کہتا ہے جہاں میں بے سر و ساماں ہو تم

ساری دنیا ہے تمہاری خلق کے سلطاں ہو تم

اشرف المخلوقات بے شک صاحب ایماں ہو تم

یہ شرف کچھ کم نہیں کہ حامل قرآں ہو تم

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

شرم کی جا ہے جو خادم تھے وہ آقا بن گئے [365]

اور جو قطرہ سے بھی کمتر تھے وہ دریا بن گئے

جو تھے کتے در کے سب وہ شیر صحرا بن گئے

اور تم کیا تھے مگر افسوس اب کیا بن گئے

اے میرے پیر و جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

پھر دکھا دو کچھ تماشا خنجر و شمشیر کا

سلسلہ کر دو الگ زنجیر سے زنجیر کا

---

[365] ۔اسلامی تاریخ کے عروج و زوال کی طرف اشارہ ہے۔

تذکرہ تازہ کرو دنیا میں عالمگیر کا

چیر کر رکھ دو کلیجہ دشمن بے پیر کا

اے میرے پیرو جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

ہاتھ میں لے لو ذرا اسپ جسارت کی لگام

پہلے سے بن جاؤ مل کر امت خیر الانام

برق بن کر گر پڑے اعداء پہ تیغ بے نیام

صفحۂ آفاق سے مٹ جائے ہر دشمن کا نام

اے میرے پیرو جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

توپ کے گولے چلیں تو کر دو سینے کو سپر

دیو اگر آگے بڑھیں تو ڈھیر کر دو مار کر

بات عاشق کی سنو دل سے مخاطب ہو ادھر

دشمن اسلام کی دنیا کرو زیر و زبر

اے میرے پیرو جواں آگے بڑھو آگے بڑھو

(۵)

منظوم استعفاء

ہر چند ترک کار کی عادت نہیں مجھے
پر کیا کروں کہ صبر کی طاقت نہیں مجھے

ہوں مدعا طراز دل سوختہ کا میں
اظہار رنگ حسن طبیعت نہیں مجھے

بدلی ہوئی سی دیکھ رہا ہوں ہوا کو میں
کیا ایسے کارخانہ پہ حیرت نہیں مجھے

نظریں پھری ہوئی ہیں حریفوں کی ان دنوں
لیکن کسی سے پھر بھی عداوت نہیں مجھے

بدکیش[366] بدزبان کو پہچانتا ہوں میں
روکوں زبان اس کی یہ قدرت نہیں مجھے

بے جرم و بے قصور میں ٹھہرا قصوروار
اس پر بھی دل ہے صاف کدورت نہیں مجھے

---

366 ۔بے دین، بدخو۔

مد نظر تھا درس خدا ہی علیم ہے
مقصود اس سے غیر کی ذلت نہیں مجھے
کرتا کمی سبق میں کسی کے خیال سے
بے شک یہ انکسار و مروت نہیں مجھے
کھلنا جو بالقویٰ تھا وہ بالفعل ہو گیا[367]
پردہ دری کی اس کی ضرورت نہیں مجھے
دیکھا گیا نہ جب فلک کینہ ساز سے
بدلا وہ رنگ دور کہ راحت نہیں مجھے
آخر نفاق و بغض و حسد کا ہوا ظہور
آئی نظر نجات کی صورت نہیں مجھے
وجہ معاش سے مجھے ہونا پڑا الگ
حاصل اگرچہ دولت و ثروت نہیں مجھے
ختم کلام چاہئے اے آہ خستہ دل
بے سود تو پسند طوالت نہیں مجھے

---

367 ۔ کسی کام کے کرنے کی صلاحیت رکھنا بالقویٰ ہے اور اس کام کو انجام دینا بالفعل ہے۔

سہرے
اور
تہنیتی نظمیں

فسانۂ درد

بحضور مرشد کامل امام قطب ربانیؒ

جناب مرشد کامل امام قطب ربانی

کلید باب عرفاں کاشف اسرار قرآنی

برنگ زلف قسمت میں جو آئی ہے پریشانی

ہے سودا سر کو میرے اور وحشت کی فراوانی

مرے پاؤں کو چل کر مل گیا قدرت کی جانب سے

کہ جیسے دست زاہد کو ملی ہے سبحہ گردانی[368]

تبسم ریز کلیاں خندہ زن گلہائے صحرا ہیں

مری وحشت سے نالاں ہیں غزالان بیابانی[369]

تماشائی مری دیوانگی کا سارا عالم ہے

ہر اک ہندی وافغانی خراسانی وایرانی

---

368 ۔ تسبیح پڑھنا۔مالا جپنا۔

369۔غزالاں غزال کی جمع ہے، جنگلی ہرن ہے۔

ملایا خاک میں آزادیوں کو ہائے رے قسمت
جنوں ہر دم لئے پھرتا ہے مجھ کو مثل زندانی[370]

تصور کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں خوشیاں
شکست رنگ عارض کی رہا کرتی ہے مہمانی

نہ کچھ وجہ تسلی ہے نہ سامان مسرت ہے
نصیب اپنے کہاں ایسے کہ حاصل ہو تن آسانی

چھپائے سے کہیں چھپتا ہے یہ درد والم میرا
مری صورت سے ظاہر ہے مرے دل کی پریشانی

مری حسرت مرے ارماں ہوئے پامال غربت میں
غبار ایسا اڑا چہرے کا میرے رنگ نورانی

ہوئی برباد میری چار دیوار عناصر تک[371]
کلیجہ ہو گیا پک پک کے میرا مثل بریانی

نحافت جائے گی میری یہ جان ناتواں لیکر[372]
چڑھا جاتا ہے بام اوج پر اب ضعف جسمانی[373]

---

370 ۔قیدی، گرفتار شدہ مجرم۔

371 ۔معروف تصور کے مطابق انسان کی تخلیق چار بنیادی اجزاء سے عمل میں آئی: پانی، ہوا، آگ اور مٹی، مراد یہ ہے کہ سارا وجود ڈھل کر رہ گیا۔

372 ۔نحافت: کمزوری، لاغری، دبلا پن۔

بحق مرشد برحق زہے قسمت جو ہو جائے

زمین قبر میری مورد الطاف رحمانی

نگاہ مرشد کامل ہے وجہ انبساط دل

نہیں تو میں کہاں بندہ کہاں یہ ذکر سلطانی[374]

دکھائی موت نے صورت جمایا یاس نے نقشہ

مدد کا وقت پہونچا المدد یا شیخ ربانی

غبار راہ ہوں اے آہ لیکن دل یہ کہتا ہے

جناب شیخ کے صدقہ میں ہو گی سیر روحانی

---

373 ۔بام اوج: اونچا بالاخانہ، مقام رفعت و عروج۔

374 ۔صوفیاء کی اصطلاح کے مطابق ذکر سلطانی میں کائنات کی ہر چیز ذکر خداوندی میں زمزمہ سنج محسوس ہوتی ہے۔

(۷)

نامۂ محبت

اے سراپا محبت و خوبی　　گوہر بحر حسن و محبوبی

شمع محفل سکون پروانہ　　رنگ گل اور بوئے مستانہ

محرم راز و جان آہ حزیں　　مرہم زخم دل جگر کی مکیں

تم سلامت رہو ہزار برس　　باکرامت رہو ہزار برس

تیسرا خط یہ نظم کرتا ہوں　　فسخ آنے کا عزم کرتا ہوں

کچھ تو بیمار وناتواں ہوں میں　　بیکسی میں پڑا یہاں ہوں میں

رات بھر آہ آہ کرتا ہوں　　اپنی حالت تباہ کرتا ہوں

کون پوچھے کہ دل بہل جائے　　کون روئے جو دم نکل جائے

اس پہ ہیں کچھ ضرورتیں ایسی　　کشمکش کی ہیں صورتیں ایسی

جن سے موقع نہیں ہے آنے کا　　رنگ بدلا ہے یوں زمانے کا

بس کہ آنا محال ہے مجھ کو　　باعث صد ملال ہے مجھ کو

گذریں گی مدتیں کئی دن کی　　رات کٹتی ہے جیسے کمسن کی

پھر ملیں گے اگر خدا چاہے　　ہم وہ چاہیں جو دل رہا چاہے

آہ کب تک یہ خامہ فرسائی

کر دعا اور سلام شیدائی[375]

---

375 ۔حضرت آہ کی ڈائری میں رفیقۂ حیات کے نام ایسے کئی منظوم خطوط موجود ہیں، یہاں بطور نمونہ صرف ایک خط شامل کیا گیا ہے۔

(۸)

سہرا

یہ تابش رخ روشن پہ ضو فگن سہرا
کمال حسن کا وہ مہر اور کرن سہرا

ادا ادا میں دکھاتا ہے بانکپن سہرا
بنا ہے قافلہ دل کا راہزن سہرا

ہے انبساط کا باعث جبین روشن پر
نہیں تو چاند کے ٹکڑے پہ ہو گہن سہرا

کہیں گلاب کہیں موتیا کھلی دیکھی
طرح طرح کے ہیں پھول اور چمن سہرا

زہے نصیب کہ لڑیاں ہیں پانچ سہرے میں
بنا ہے یمن و سعادت کا پنجتن سہرا

چڑھا جو سر تو نکالا ہے پاؤں چادر سے
وہ دیکھو چوم رہا ہے لب و دہن سہرا

خدا کا فضل ہو دولہا دولہن رہیں آباد
دعا پہ ختم کروائے حسنؔ حسن سہرا[376]

[376] ۔حضرت آہؔ نے بہت سے سہرے لکھے، ان میں سے کچھ ڈائری میں محفوظ رہ گئے ہیں، بعض سہروں میں نشاندہی ہے کہ یہ کس کے لئے لکھے گئے ہیں، اور اکثر بے نشان ہیں، لیکن قرائن اور لب ولہجہ کی معنویت سے کچھ تعینات کئے جاسکتے ہیں، اس لحاظ سے یہ سہرا غالباً حضرت آہؔ نے اپنے بڑے صاحبزادے (جو محل اولیٰ سے تھے) قطب الہند حضرت مولانا حکیم سید احمد حسن منورویؒ (ولادت ۱۹۰۱ء، متوفی ۱۹۶۷ء مزار مبارک منوروا شریف سستی پور) کے لئے لکھا تھا، جو اس حقیر مرتب کے جد امجد ہیں، مقطع میں آہؔ کی جگہ پر حسن کی تکرار، یمن وسعادت اور کائنات کے گل بوٹوں کی خوبصورتی کا ذکر غالباً اسی مناسبت سے ہے۔

حضرت مولانا حکیم احمد حسن کی ولادت شہر مظفرپور میں ہوئی، آپ کی دو شادیاں تھیں:

☆ پہلی شادی (تقریباً ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء) مرحومہ جمیلہ خاتون (م ۲۰۰۶ء) سے مظفرپور میں ہوئی اور اسی موقعہ پر یہ سہرا لکھا گیا۔

☆ اور دوسری شادی (تقریباً ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء) لادھ کپسیا (موجودہ ضلع سستی پور) میں محترمہ جمیلہ خاتونؒ (متوفیہ فروری ۲۰۰۸ء مطابق محرم الحرام ۱۴۲۹ھ) بنت جہانگیر عرف جہانی مرحوم سے ہوئی، جب کہ آپ کے والد ماجد حیات ہی سے تھے، البتہ بعد مکانی تھا، آپ کے مختصر حالات باب دوم میں گذر چکے ہیں، تفصیلی حالات پر مستقل کتاب آئے گی انشاء اللہ۔

(۹)

سہرا

بہ تقریب شادی ماسٹر سید محمود حسن مظفر پوریؒ

(صاحبزادۂ خورد حضرت آہؔ)[377]

ایسا چمن کا رنگ نہ ایسے چمن کے پھول

اے غنچۂ مسرت و باغ حسن کے پھول
تم پر نثار لعل و گہر اور چمن کے پھول

سہرے میں گوندھتے نہیں طرز کہن کے پھول
کلیاں دلوں کی ہیں تو ہیں در عدن کے پھول

طرہ ہے امتیاز کا دستار میں تری
سہرے میں سارے پھول ہیں باغ سخن کے پھول

---

[377] یہ حضرت آہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، اور دوسرے محل سے ہیں، اس سہرے کو خود حضرت آہؔ نے ان کے لئے نامزد فرمایا ہے، یہ سہرا بھی ان کی پہلی شادی کے موقعہ کا ہے، اس کے بعد ماسٹر صاحب مرحوم کی دو شادیاں والد ماجد کی وفات کے بعد ہوئیں۔۔۔۔ ان کے حالات بھی باب دوم میں آچکے ہیں۔

نظریں ٹکی ہیں تار شعاعی میں اس طرح

سہرے میں جس طرح سے لگے ہوں کرن کے پھول

حوروں نے آج سہرا سنایا کہ واہ واہ

ہنس ہنس کے گل رخوں نے کھلائے دہن کے پھول

دولہا ہے گل عذار تو دلہن بھی گل بدن

گل پیرہن یہی ہیں یہی پیرہن کے پھول

اللہ رے برکتیں تری قدرت کے ہم نثار

سہرے میں جمع ہو گئے سارے زمن کے پھول

اے آفتاب حسن شہ بزم انبساط

رونق وطن کو تم سے ہو تم ہو وطن کے پھول

سہرا جناب آہ نے کیا خوب لکھدیا

باغ جہاں میں کھل گئے فرض وسنن کے پھول

(۱۰)

کس نگاہ شوخ و چنچل کی ادا سہرے میں ہے
ہر لڑی پھولوں کی طرفہ ماجرا سہرے میں ہے[378]

کیا بتائیں ہم خوشی کی بات کیا سہرے میں ہے
مژدۂ عیش و نوید جانفزا سہرے میں ہے

مصحف روئے مسیحا جو چھپا سہرے میں ہے
آج بیمار محبت کی دوا سہرے میں ہے

دل کو پل میں چھین لے عالم کو کر دے جو شہید
آج وہ کافر نگاہ فتنہ زا سہرے میں ہے

حسرت و شوق و تمنا آرزو و اشتیاق
چھپ چھپا کر ہم رکاب مدعا سہرے میں ہے

سورۂ اخلاص پڑھ کر آہ نے سہرا کہا
اس لئے یہ بوئے اخلاص و وفا سہرے میں ہے

---

[378] ۔طرفہ ماجرا: انوکھا واقعہ، تعجب کی بات۔

(۱۱)

بندھا نوشاہ کے سر سے زہے تقدیر سہرے کی
اچھوتی زلف کے ہمسر ہوئی توقیر سہرے کی
جو مالن گوندھ لائی سورۂ شمس و قمر پڑھ کر
تفوق چاند پر بھی لے گئی تنویر سہرے کی[379]
کسی کا دل کھلا جاتا ہے جو غنچہ کی صورت میں
مسرت ہو رہی ہے آج دامن گیر سہرے کی
جو خدام ازل نے اِن کا خاکہ کھینچنا چاہا
تو بدلے کاکلوں کے کھنچ گئی تصویر سہرے کی[380]
خوشا قسمت جو دل تھا مبتلا زلف مسلسل کا
اسی کے آج قدموں پر گری زنجیر سہرے کا
شمیم جاں فزا پھیلی معطر ہو گیا عالم
چلی دوش صبا پر جس گھڑی تاثیر سہرے کی

---

379 ۔تفوق: برتری۔

380 ۔کاکل: زلف، گیسو، لٹ۔

کہیں گل ہیں کہیں کلیاں کہیں تار شعاعی ہے[381]

مسرت کا سراسر ہے سماں تصویر سہرے کی

خدا آباد رکھے دلہا دلہن کو ہمیشہ آہ

انہیں سہرا مبارک ہو ہمیں تحریر سہرے کی

(۱۲)

شعاع حسن کا ہے یہ کمال سہرے میں

امنڈ آیا ہے رخ کا جمال سہرے میں

نہیں ہے تل تہ رخسار روئے زیبا میں

لئے ہے ہاتھ میں قرآں ہلال سہرے میں

نگہ کے تار میں ہیں پتلیاں بجائے گہر

بندھا ہے رشتۂ جاں سے خیال سہرے میں

کسی کے راز کے مانند چھپ نہیں سکتا

خوشی کا شوق کا ارماں کا حال سہرے میں

خدنگ ناز سے بچ کر کہاں چلے ہو تم[382]

---

[381] -تار شعاعی: روشنی کی کرن۔

[382] -خدنگ: چھوٹا تیر۔

بچھا ہوا ہے محبت کا جال سہرے میں

نظر ٹکی ہے کرن کے عوض میں عالم کی

خوشی سے غنچۂ دل ہے نڈھال سہرے میں

اِدھر ہے موج مسرت اُدھر حیا چھائی

یہاں طلب ہے وہاں قیل و قال سہرے میں

تمہیں یہ ساعت میمون اب مبارک ہو

علی الدوام رہے نیک فال سہرے میں [383]

قلم کو روک کے آہ بس یہی کہدو

ہو بارش کرم ذوالجلال سہرے میں

---

383 ۔ علی الدوام: ہمیشہ

(۱۳)

گل تر ہے مرا نوشہ بہار بے خزاں سہرا

رخ انور کے صدقہ میں ہوا ہے ضوفشاں سہرا
نہیں تو بات سچ یہ ہے کہاں چہرا کہاں سہرا

مبارک ہو تمہیں امرین کا عالی مکاں سہرا[384]
بندھے اسلام کا سہرا ابھی ہو جاوداں سہرا

گلستان ارم سے گوندھ لایا باغباں سہرا[385]
مرے نوشہ کا سہرا ہے بہار بے خزاں سہرا

شمیم جاں فزا پھیلی معطر ہو گیا عالم
گل رخسار سے مل کر ہوا جب گل فشاں سہرا

یہ رفعت دیکھ کر چکرا نہ جائے آسماں کیونکر
کہ عالی حوصلہ کے سر پہ ہے جلوہ کناں سہرا

بنا نور نظر تار شعاعی جب کہ سہرے کا
ہوا ہے چشم بینا میں سراپا پتلیاں سہرا

---

384 ۔امرین: لازوال۔

385 ۔ارم: شداد کی بنوائی ہوئی جنت، مجازاً بہشت کے معنی میں۔

زہے قسمت خوشا طالع کہ لڑیاں پانچ ہی ٹھہریں

ولائے پنجتن رکھے نہ کیوں کر ہر زماں سہرا

شب دیجور ہے یا زلف یا سنبل کا طرہ ہے[386]

بیاض صبح ہے واللیل میں یا کہکشاں سہرا[387]

گلوں نے آہ افشا کر دیا راز مسرت کو

نہ ہوتا خندہ گل گر نہ ہوتا راز داں سہرا

---

386 ۔شب دیجور: تاریک رات،۔ ☆طرہ: چوٹی، پھندنا جو پگڑی کے اوپر لگاتے ہیں۔

387 ۔کہکشاں: ستاروں کا جمگھٹ، بہت سے چھوٹے چھوٹے ستاروں کی دھار جو اندھیری رات میں سڑک کی مانند آسمان پر دور تک نظر آتی ہے۔

مرثیے
اور
وفیات

(۱۴)

مرثیۂ محبوب

کیوں آسماں نے مجھ کو ستایا یہ کیا کیا

کیوں تم کو زیر خاک سلایا یہ کیا کیا

فرقت کی لذتوں کو چکھایا یہ کیا کیا

کیوں کمسنی میں مجھ کو رلایا یہ کیا کیا

کب کی عداوتوں کا لیا انتقام آج

مجھ کو دیا جو مژدۂ یاس دوام آج

کیوں بیٹھے بیٹھے درپئے آزار ہو گیا

کیوں ناروا ستم کا روادار ہو گیا

کیوں دشمن سکون دل زار ہو گیا

کیوں رنج و غم گلے کا مرے ہار ہو گیا

کیوں آفتوں میں مجھ کو پھنسایا ہے آہ آہ

کیوں دن فراق کا یہ دکھایا ہے آہ آہ

زخم جگر کے واسطے مرہم تمہیں تو تھیں
دل کی کلی کو قطرۂ شبنم تمہیں تو تھیں
لے دے کے اک جہان میں ہمدم تمہیں تو تھیں
راز و نیاز عشق کی محرم تمہیں تو تھیں
تم کیا گئیں جہاں سے مری راحتیں گئیں
اب بھی میں مر چکوں تو کہوں آفتیں گئیں

تجھ سے بہار گلشن ہستی تھی میری جان
آباد ایک دن یہی بستی تھی میری جان
کیا اتنے روزوں موت ترستی تھی میری جان
ایسی ہی جان کیا تیری سستی تھی میری جان
کس نے لحد سے تجھ کو ہم آغوش کر دیا
کس نے سدا کے واسطے روپوش کر دیا

اب کون ہے کہ جس کی محبت پہ ناز ہو
اب کون ہے جو محرم اسرار و راز ہو

اب کون ہے کہ جس سے حصول نیاز ہو
اب کون ہے جہاں میں مجھے جس پہ ناز ہو

اب کون ہے کلیجہ سے مجھ کو لگائے کون
ہو میرے سر میں درد تو آنسو بہائے کون

چھاتی کا پیٹنا ہے کبھی سر کا کوٹنا
مرنا تمہارا مجھ پہ ہے بجلی کا ٹوٹنا

لائے گا رنگ میرے مقدر کا پھوٹنا
پیغام مرگ کیوں نہ ہو سنگت کا چھوٹنا

مجھ کو بھی یہ زمین چھپالے گی ایک دن
دنیا سے دیکھنا کہ بلالے گی ایک دن

آئی تھی عمر کیا ابھی جانا نہ تھا تمہیں
پیک اجل کے فقروں میں آنا نہ تھا تمہیں

میرا ابھی پاس چاہئے تھا یا نہ تھا تمہیں
بیڑا ابھی سفر کا اٹھانا نہ تھا تمہیں

تعجیل کیا تھی بھائی کا سہرا تو دیکھتیں
شادی میں دھوم دھام کا جلسہ تو دیکھتیں

مانا ہیں خلد میں تمہیں عافیتیں ہزار
مانا کہ زیر حکم ہیں حوران گل عذار
مانا نظر فروز تمنا ہے سبزہ زار
مانا کہ دل فریب ہے لطف گل و بہار
لازم تھا چھوڑنا مجھے تنہا تمہیں کہو
آخر وفا ہے نام اسی کا تمہیں کہو

سوز دروں نے مجھ کو جلا کے کیا ہے خاک
اڑتے ہیں شعلے دل سے تو اوروں پہ ہے تپاک
دامن کی طرح سینہ بھی اپنا ہے چاک چاک
دیکھیں تو رحم کرتا ہے کب تک خدائے پاک
فصل خزاں میں بھی مجھے سودا کا جوش ہے
اک بے خودی سی ہے نہ خرد ہے نہ ہوش ہے

منہ زرد ہونٹ خشک جگر خوں ہے مری جان

آنکھوں میں اشک دل میں قلق لب پہ ہے فغاں

جی چاہتا ہے ساتھ رکھوں اپنے نوحہ خواں

آفت اگر ہو ایک تو اس کو کروں بیاں

دکھ درد ہوں ہزار تو پھر کیا کرے کوئی

کن کن مصیبتوں کا مداوا کرے کوئی

تم تو مزے میں ہو رہیں جا کے مکین خلد[388]

بھائی ہوئی ہے تم کو بہت سرزمین خلد

حاضر ہے دست بستہ ہر اک مہ جبین خلد

مجھ کو بھی کاش گھر کوئی ملتا قرین خلد[389]

پیاری تمہارے ساتھ میں اوقات کاٹتا

دن کاٹتا وہیں پہ وہیں رات کاٹتا

---

388 ۔مکین خلد: جنت کا باشی۔

389 ۔قرین: نزدیک، نظیر، مشابہ۔

کس درد کی زباں سے کہا ہے یہ مرثیہ
سب پیٹتے ہیں سر کو بلا ہے یہ مرثیہ

نالاں ہوا ہے جس نے سنا ہے یہ مرثیہ
خود میں نے آہ رو کے لکھا ہے یہ مرثیہ

خون جگر سے چاہئے لکھنا یہ واقعہ
ایسا ہے سانحہ یہ ہے ایسا یہ واقعہ[390]

---

[390] -یہ مرثیہ حضرت آہ نے غالباً اپنی بہن کے انتقال پر لکھا تھا جن سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔

(۱۵)

محبوب بے نشان

تھا مری تقدیر میں لکھا جو غم

چل بسا وہ دل ربا سوئے ارم

سال رحلت آہ جب یاد آگیا

منہ سے نکلا میرے ہائے رنج و غم (۱۳۱۵ھ)

(۱۶)

قطعات تاریخ وفات

زوجۂ مولانا مختار احمد مرحوم

امرأ هيفاء جسماً نادره

التى كانت لبعل خاتره

اذ قضت فكرت فى ارخ لها

فاتىٰ بشرىٰ لها من مغفرة (۱۳۲۵ھ)

(۱۷)

تاریخ وفات یوسف علی مرحوم

کچھ نہ دی ہائے موت نے مہلت
کام آئی نہ دولت و ثروت

ساری دنیا نظر میں ہے تاریک
چھپ گئی جب سے چاند کی صورت

ایک یوسف علی کے مرنے سے
مٹ گئی زندگی کی سب لذت

دل پہ بجلی گراتی ہے اکثر
یاد آکر وہ صورت وسیرت

دل کے ارمان رہ گئے دل میں
بیاہ تک کی نہ آسکی نوبت

خاک میں مل گئیں تمنائیں
رہ گیا حرف گریۂ حسرت

آہ لکھ یہ دعائیہ تاریخ
مرا یوسف ہو زینت جنت (۱۳۳۸ھ)

(۱۸)

قطعات تاریخ وفات

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

رحلت استاذی۔ شیخ الہند مولوی محمود الحسنؒ ۔(۱۳۳۹ھ)

کیف لااصلی بنار الہم اذ لم یبق لی
من شیوخ اوعطوف ذی صلاح او کریم
مات قطب الوقت شیخ الہند محمود الحسن
قیل لی ــبا روحہ فازت بجنات نعیم

۱۳۳۹ھ

(۱۹)

دیگر

نالہا بگذشت از چرخ بریں
ز انتقال حامی دین متیں
از سر دل سال رحلت گفت آہ
مات محمود الحسن موت الیقین (۱۳۳۹ھ) [391]

---

391 ۔حضرت شیخ الہند دارالعلوم دیوبند کے اولین طالب علم ہیں، آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے تلمیذ رشید اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ ارشد ہیں، سینکڑوں اکابر علماء اور محدثین کے استاذ اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین ہوئے، اشاعت علوم نبوت کے ساتھ حریت وطن اور احیاء

(۲۰)

تاریخ طباعت دیوان حضرت شاہ حامد حسین حامدؒ

سابق سجادہ نشیں درگاہ حضرت شاہ ارزاں قدس سرہ[392]

خلافت کے لئے آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، تحریک ریشمی رومال آپ کی بے پناہ سیاسی بصیرت اور دینی حمیت کی عکاس ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جمعیۃ علماء ہند وغیرہ متعدد اہم ملی وتاریخی اداروں اور تحریکات کی بنیادیں آپ کے دست فیض کی مرہون منت ہیں، آپ نے اپنے وقت میں ملک وملت کے لئے جو ہمہ گیر اور ہمہ جہت کارنامے انجام دیئے ان کی مثال نہ آپ کے معاصر دور میں ملتی ہے، اور نہ آپ کے بعد۔۔۔

حضرت آہ مظفرپوریؒ کے والد ماجد حضرت مولانا نصیر الدین نصر مظفرپوری حضرت شیخ الہندؒ کے ان کمالات وامتیازات سے واقف اور آپ کے بے انتہا مداح تھے، ان کی خواہش تھی کہ ان کے فرزند کچھ عرصہ آپ کی زیر تربیت رہیں، مولانا عبدالشکور آہ کانپور میں حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے مدرسہ میں زیر تعلیم تھے، اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں پایۂ کمال تک پہونچ چکے تھے، لیکن والد ماجد کی خواہش پر وہ دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اور حضرت شیخ الہندؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، حضرت آہ اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ جن اساتذہ سے متاثر ہوئے ان میں حضرت شیخ الہندؒ سر فہرست تھے، آپ اکثر ان کے ذکر میں رطب اللسان رہتے تھے۔

392- سید شاہ حامد حسین حامدؒ کی شخصیت ادبی اعتبار سے اپنے عہد میں ممتاز تھی، داغ دہلوی سے تلمذ رکھتے تھے، ان کا پورا دیوان عشق ومحبت سے لبریز ہے، سلاست وفصاحت کا دریا ہے، عشق ومحبت کا نمونہ دیکھئے:

کیا کام دے گا جس کو فقط ہو خدا سے عشق — ہوگی نجات کیا جو نہ ہو مصطفےٰ سے عشق

حب نبی نہیں ہے تو کہاں ہے خدا سے عشق — کچھ ہو طلب خدا کی تو کر مصطفےٰ سے عشق

غزل کے علاوہ نعت ومنقبت اور مرثیہ نگاری میں بھی کمال رکھتے تھے، ان کے مرثیہ کا ایک شعر:

ملے گی نہ محشر میں کیوں کر نجات — کہ حامد شریک عزا ہوگیا

ان کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:

یہ گنہگار محبت ہے خدا شاہد ہے — ابتدا ہی سے دل اس کفر کو ایماں سمجھا

آپ کے کلام میں بڑی حد تک حضرت آہ کے طرز اور فکر کی جھلک معلوم ہوتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے حضرت آہ سے بھی علمی استفادے کئے تھے، ان کے بھائی مولانا سید شاہ عاشق حسین عاشقؔ (جو ان کے بعد درگاہ شاہ ارزاں کے سجادہ نشیں

شعر بھی خوب طباعت بھی خوب
کیوں نہ ہو اہل سخن کو محبوب
شاہ ارزاں کا اسے فیض کہوں
مصرع تنگ میں ندرت مصحوب

ہوئے) تو باقاعدہ حضرت آہؔ کے شاگرد ہی تھے، انہوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تعلیم حاصل کی تھی، انہی قریبی تعلقات نے دیوان حامدؔ پر حضرت آہؔ سے وہ کلام لکھوایا جو اوپر درج ہے۔

شاہ حامد حسین حامدؔ نہ صرف ایک صاحب دیوان شاعر تھے، بلکہ وہ ایک ادب نواز شخصیت کے بھی مالک تھے، انہوں نے پٹنہ میں مشاعروں کی روایت اور ادبی ماحول کو باقی رکھنے میں نمایاں خدمات انجام دیں، وہ ہر ماہ پٹنہ میں ایک ادبی مجلس اور سال میں کوئی بڑا مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس میں ہندوستان کے تمام ممتاز شعراء مدعو ہوتے تھے۔۔۔۔اسی سلسلے میں ۱۸/رجب المرجب ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹/اپریل ۱۹۱۹ء میں منعقد ہونے والا وہ عظیم الشان مشاعرہ آج بھی تاریخ کے اوراق میں اپنی اہمیت وافادیت اور انفرادیت کے لئے یاد کیا جاتا ہے، جس میں دہلی سے داغؔ دہلوی کے داماد سائلؔ دہلوی اور لکھنؤ سے عزیزؔ لکھنوی نے شرکت کی تھی، دبستان عظیم آباد کی تاریخ میں حامدؔ عظیم آبادی کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔۔

آپ درگاہ شاہ ارزانی (سلطان گنج پٹنہ) کے گیارہویں سجادہ نشیں تھے، حضرت شاہ حیدر علیؒ کے وصال کے بعد ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں صرف پندرہ (۱۵) سال کی عمر میں آپ منصب سجادگی پر فائز ہوئے، آپ کی تاریخ پیدائش ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء کی ہے، وفات ۱۱/جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷ء میں ہوئی، نماز جنازہ حضرت مولانا سید شاہ صبیح الحق عمادی سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ نے پڑھائی۔۔۔۔

آپ کا دیوان پہلی بار ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا، اور اسی میں حضرت آہؔ کا یہ کلام بھی ہم رشتہ تھا، افسوس اس کے دوسرے ایڈیشن میں مرتبین نے اس قدر وقیع کلام کو محض تاریخ طباعت بدل جانے کی بناپر حذف کردیا، خدابخش لائبریری پٹنہ میں اس دیوان کا بھی دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن تلاش بسیار کے باوجود کہیں نہیں مل سکا۔

آپ کا ایک اور مختصر مجموعہ کلام "کلام حامد" کے نام سے شائع شدہ ہے جس کو سید شاہ نبی حسن قادری چشتی خادم آستانہ قطبیہ محلہ شاہ ارزاں نے مرتب کیا ہے، اور بزم صوفیہ ارزانیہ کلکتہ نے شائع کیا ہے، شاہ حامدؔ کے یہ حالات اسی کلام حامدؔ کے مقدمہ سے لئے گئے ہیں، میں شکر گذار ہوں صاحب سجادہ درگاہ شاہ ارزاں جناب شاہ انظار حسین صاحب زید مجدہم کا کہ انہوں نے اس نایاب نسخہ کی فوٹو کاپی ہمیں فراہم کی، جناب انظار حسین صاحب مولانا عاشق حسین عاشقؔ صاحب کے صاحبزادہ اور درگاہ شاہ ارزاں کے موجودہ سجادہ نشیں ہیں۔

(کلام حامد ص ۱ تا ۱۰ ۔ مرتبہ سید شاہ نبی حسن ناشر بزم صوفیہ ارزانیہ کلکتہ)

اور بحروں کا تو کہنا کیا ہے

سطح دریا پہ درر، نظم اسلوب

راز الفت کے درید ہ پردے

جس سے ہو بنت عنب بھی محجوب

عشق کو صبر سے جتلایا ہے

گویا عاشق ہے سراپا ایوبؑ

وصف دیواں سے زبانیں قاصر

جھوٹ کہنا ہے سراسر معیوب

آہ مداح نے لکھدی تاریخ

ازدل داد کلام مرغوب (۱۳۳۹ھ)

(۲۱)

شیخ محبوب علی مرحوم

حیف صد حیف آنکہ بُد مشہور در آفاقہا
با مروت بے ریا کان عطا بحر سخا

روز عاشورہ پدید او بست سامان سفر
سایۂ لطف اتم ہیہات شد از ماجدا

جملہ افتادند از رنج والم در شور و شین
شد زمین و آسماں ہم چوں زمین کربلا

چوں ز بے ہوشی بہ ہوش آمد دل صد چاک من
جستجوئے سال رحلت کردم از بہر بقا

ہاتف غیبی بگفت اے آہ بنویس ایں چنیں
در جوار خلد محبوب علی جلوا نما (۱۳۴۷ھ)

خوابگاہ شیخ محبوب علی بعد از فنا ۱۹۲۸ء

(۲۲)

تاریخ وفات حضرت سید العارفین

مولانا شاہ محمد بشارت کریم قبلۂ عالم قدس سرہٗ

<u>اَلَااِنَّہٗ فِی الْآخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِین</u> (۱۳۵۴ھ)

وہ درویش یکتا عطوف ورحیم
سراپا محمد بشارت کریم

رہے یاد مولیٰ میں خلوت پسند
مگر فیض تھا ان کا فیض عمیم

انہیں جس نے جانا تو جانا یہی
سراسر ہیں رحمت سراپا رحیم

مرے دل کے مالک مری جاں کی جاں
قسیمٌ جسیمٌ نسیمٌ وسیمٌ

مرے مرشد و مقتدائے جہاں
ہمہ دم مطیع رسول کریمؐ

مہ غم رسید وشب بستم آہ
کہ بربست رخت بحکم حکیم

چو رفتند آمد بگوشم ندا

مکیں شد معزز بخلد نعیم[393] (۱۳۵۴ھ)

[393] ۔حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی ؒ کا سانحۂ وفات ۱۹ / محرم ۱۳۵۴ھ روز چہار شنبہ گذار کر بیسویں محرم کی شب قریب دو بجے پیش آیا، آہ۔

حضرت آہؔ مظفرپوری باوجودیکہ آپ کے ہم عصر اور ہم درس تھے، اور مظفرپور سے لیکر کانپور تک دونوں کی تعلیم کا زمانہ ساتھ ساتھ گذرا تھا، حضرت آہؔ کے والد ماجد حضرت مولانا نصیر الدین نصرؔ دونوں کے مربی اور سرپرست تھے، مظفرپور کے زمانۂ تعلیم سے ہی حضرت آہؔ کے گھر حضرت گڑھولوی کی آمدورفت تھی، اتنی طویل معاصرانہ رفاقت اور بے تکلفی کے باوجود حضرت آہؔ حضرت گڑھولوی ؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اس سے جہاں حضرت گڑھولوی ؒ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے تو وہیں دوسری طرف حضرت آہؔ کی بے نفسی، سادہ دلی اور جذبۂ خدا طلبی کا بھی ثبوت ملتا ہے، واقعی دونوں قران السعدین تھے۔

(۲۳)

تاریخ وفات مولانا شاہ وارث حسن چشتیؒ

الٰہی یہ کیسا ہے رنج و محن
جگر ٹکڑے ٹکڑے ہے دل میں جلن

کہیں کوئی درویش کیا چل بسا
اندھیرا ہوا جس سے سارا زمن

غلط ہو الٰہی جو افواہ ہے
کہ مرشد نہیں زیر چرخ کہن

بہر حال ہے جب کہ جانا ضرور
تو دنیا کہاں کی کہاں کا چمن

کروں فکر عقبیٰ کہ کچھ کام آئے
نہیں تو ہے بے سود شعر و سخن

دعا میں یہ کہتا ہے آہ حزیں
خدا سے ملیں شاہ وارث حسن[394] (۱۹۳۶ء)

---

[394] -مولانا شاہ وارث حسن چشتی جہان آبادیؒ کے حالات پیچھے گذر چکے ہیں۔

(۲۴)

تاریخ وفات شیدا عظیم آبادی

چل بسے اے آہ شیدا زیر خاک
غم سے سینہ ہو رہا ہے چاک چاک

تھے محبان علی سے لاکلام
تھا مگر شعر و سخن میں انہماک

ناک تھے گو وہ عظیم آباد کی
مفلسی سے حال تھا افسوس ناک

مجھ کو جب تاریخ کا آیا خیال
لکھ نہ سکتا تھا کہ تھا غم سے تپاک

ناگہاں غیبی ندا آنے لگی
آہ لکھ دو۔ تربت شیدا ہے پاک (۱۳۵۵ھ)

(۸ / جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ)

(۲۵)

تاریخ وفات شرف النساء بنت محمد مصطفٰے

بزیر خاک چوں جائے نہاں یافت

شہید ایں حیات جاوداں یافت

۱۳۵۵ھ

---

(۲۶)

ماتم آہ

یہ کس کا سوگ ہے جو چین دم بھرا نہیں سکتا

کلیجہ یوں دھڑکتا ہے کہ تھاما جا نہیں سکتا

جناب آہ ہے ہے چل بسے دنیائے فانی سے

انیس غمزدہ کو عیش کوئی بھا نہیں سکتا

(۲۷)

تاریخ وفات آہ۔

کھل رہا ہے مجھ پہ راز لا الٰہ
دیکھ کر جاتے ہوؤں کو آہ آہ[395]

فاضل و فاضل گر و نکتہ شناش
بے عدیل و واقف اسرار راہ[396]

نیک طینت با مروت بے ریا
علم میں یکتا عمل کے بادشاہ

---

[395] -(لایتجاوز عن ھذہ) یہ پوری نظم حضرت آہؔ کی ڈائری میں انہی کے خط میں موجود ہے، اور نظم کے عنوان کے ساتھ بین القوسین میں یہ خط کشیدہ جملہ بھی مرقوم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آہؔ نے خود اپنے لئے بھی تاریخ وفات لکھی تھی اور مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے لکھی، اس سے ان کے استحضار آخرت اور پروردگار سے ملنے کے شوق و آرزو کا پتہ چلتا ہے، انہوں نے اپنی زندگی کے آخری چند سال مسلسل موت کے انتظار (مراقبہ) میں گذارے، اور وفات سے قبل ہی انہوں نے موت کا لبادہ اوڑھ لیا، بقول فانی بدایونی

؎ تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

البتہ ان تواریخ میں آپ کا انتقال نہیں ہوا (العلم عند اللہ) بلکہ آپ کی وفات ۱۸ /رجب المرجب ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۷ /جون ۱۹۴۶ء کو ہوئی، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

[396] -بے عدیل: بے نظیر، بے مثال۔

بحر توحید خدا میں غوطہ زن

گوہر معنیٰ گزیں شام و پگاہ[397]

کون! یعنی مولوی عبد الشکور

تھا تخلص شاعروں میں جن کا آہ

نام تاریخی تھا ظفر احسن (۱۲۹۹ھ)

ربط تھا قطب زماں سے دل سے چاہ

التزام خامشی رکھتے مگر

راز بستہ کھولدیتے گاہ گاہ

جس گھڑی ہونے لگا ان کا وصال

آسماں پر چھا گیا ابر سیاہ

لکھ گئے ہیں آہ تاریخ وفات

خاک میں ملکر ملیں گے حق سے واہ[398] (۱۳۶۱ھ)

---

397 -پگاہ: صبح،

398 -(نوٹ) اگر مصرعہ تاریخ اس طرح ہو: خاک میں مل کر ملے ہیں حق سے واہ (۱۳۴۶ف) تو ہجری کے بجائے فصلی تاریخ بن جائے گی۔ آہ۔

یہ نظم اور اگلی نظم دراصل حضرت آہ کا شخصی کوائف نامہ ہے جس میں ان کی ولادت سے لیکر وفات تک کا ذکر ہے، زندگی کی تلخیوں کے بھی اشارے ہیں اور ان کے علم وکمال کا بھی تذکرہ ہے، جو شعر وادب کی دنیا میں معیوب نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ پھر ان کو کیا خبر تھی کہ یہ شخصی ڈائری کبھی منظر عام پر بھی آئے گی، ان کا مزاج شہرت سے گریز کا تھا، وہ شاعری برائے خود کلامی وخود شناشی کے قائل تھے۔

(۲۸)

دیگر

تاریخ وفات آہ

آہ بیکس کو بڑے رہبر ملے

مل گئی راہ اور پیغمبر ملے

کلفتیں کیا کیا اٹھائیں زیست میں

جو ملے ظالم جفا پرور ملے

دن کٹے افکار میں شب کو مگر

اک حسیں سے خواب میں اکثر ملے

کہدیا لبیک آئی جب اجل

ہر ملک بن کے کرم گستر ملے

کیا عجب کوئی کہے جو بعد مرگ

حق سے یہ یوں خاک میں مل کر ملے[399] — (۱۳۵۰ھ)

---

[399] — (نوٹ) لیکن اگر مصرعہ تاریخ اس طرح بن جائے — حق سے وہ یوں خاک میں مل کر ملے — (۱۳۴۶ف) تو ہجری کے بجائے فصلی تاریخ بن جائے گی۔ آہ۔

رباعیات

(۲۹)

خمریات

مدت سے ہے تجھ پر بدگمانی ساقی
مستوں سے ہے بے جا لن ترانی ساقی

صدقے میں جوانی کے کرم ہو تیرا
دے دے کوئی جام ارغوانی ساقی[400]

بدلی ہے فضائے آسمانی ساقی
ہر نخل کی ہے پوشاک دھانی ساقی

گل جام بکف ہیں اور نشیلی آنکھیں
لٹ جائے نہ توبہ کی جوانی ساقی

پر کیف ہے سنتا جا کہانی ساقی
مستی میں کٹی ہے زندگانی ساقی

---

400 -جام ارغوانی: سرخ اور نارنجی رنگ کا جام، پیالہ، گلاس۔

بھر بھر کے دیئے جا جام گلگوں مجھ کو[401]
کم ہو تو ملا دے تھوڑا پانی ساقی

مشکل ہے ہماری زندگانی ساقی
الفت میں مٹی سب لن ترانی ساقی
آنکھوں میں جو آنسو ہیں تو دل میں ہے تپش
ہوتی ہے جوانی آگ پانی ساقی

بادل کی گرج ہے زندگانی ساقی
بجلی کی چمک ہے نوجوانی ساقی
لمحے ہیں یہی پینے پلانے کے چند
لا جلد شراب شادمانی ساقی

یہ بھی ہے کوئی اچھی نشانی ساقی
آنکھوں میں نہ ہو رنگ ارغوانی ساقی

401 ۔گلگوں: گلاب کی طرح سرخ رنگ کا۔

عاشق کو پلانی تھی شراب مستی
غیروں میں لٹادی کیوں جوانی ساقی

برباد نہ کر تو زندگانی ساقی
ہو نزع میں کچھ تو مہربانی ساقی

زمزم کی طرح مجھ کو پلادے دو گھونٹ
بوتل میں جو ہے وہ لال پانی ساقی

مل جائے جو حور آسمانی ساقی
پیری میں ہو لطف نوجوانی ساقی

مستی میں شراب شوق مل جائے اگر
چلتا رہے جام ارغوانی ساقی

(۳۰)

آنکھوں کا ہماری کوئی نقشہ دیکھے
پھوٹے ہوئے چشموں کا تماشا دیکھے

موجوں کے تھپیڑوں سے جو پا جائے
بہتا ہوا صحرا میں وہ دریا دیکھے

بیمار کا تیرے کوئی جینا دیکھے
خوں نابۂ دل ہر وقت پینا دیکھے

امید وصال اور نزع کا عالم آہ
انگشت بدنداں ہو جو بینا دیکھے

ساقی کی جو آنکھوں کا کرشما دیکھے
چلتے ہوئے جادو کا تماشا دیکھے

مستی میں چھلک جائے جو ساغر کوئی
ہر قطرہ میں عرفان کا دریا دیکھے

کس طرح کہوں فخر زمانہ ہوں میں
مجموعۂ فن دیکھو یگانہ ہوں میں

یہ بھی ہے کمالوں کی مرے پختہ دلیل
افلاک کے تیروں کا نشانہ ہوں میں

کیونکر نہ کہوں غربت وطن ہے اے آہ
جب اہل وطن کو سوئے ظن ہے اے آہ
کانٹے کی طرح مجھ کو نکالا صد حیف
اعداء کو مبارک یہ چمن ہے اے آہ

(۳۱)

عاقل نہ خرد مند نہ فرزانہ ہے[402]
ہر شمع جمال کا جو پروانہ ہے
کس طرح سے سمجھائیں دل وحشی کو
میخانۂ الفت کا یہ دیوانہ ہے

خوش بخت ہے جو عقل سے بیگانہ ہے
پہلو میں مرے ہاتھ میں پیمانہ ہے
اس دور میں عاقل کو سکوں کیوں کر ہو
گردش میں ہے تسبیح کا جو دانہ ہے

----

402 ۔فرزانہ: عقلمند، دانا۔

جو داغ دکھائے اسے داغ سمجھو
رخسار پہ خط آئے تو باغ سمجھو

ہر بات کا انجام اگر سوچو تم
پروانہ رخ کو بس چراغ سمجھو

جس روز طبیعت مری بیکل ہو گی
بس سامنے رکھے ہوئی بوتل ہو گی

اس سے بھی اگر دل کو نہ ہو گی تسکیں
پہلو میں میرے ہاتھ میں کوپل ہو گی

----

(۳۲)

ق

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
علم و فن میں یگانہ ہیں ہم لوگ

چٹکیوں میں اڑادیں دشمن کو
توپ کے پیش دہانہ ہیں ہم لوگ

غزلیات

(۳۳)

جلوہ کا تیرے خاص مکاں ہو نہیں سکتا

جلوہ کا تیرے خاص مکاں ہو نہیں سکتا
کعبہ میں، کلیسا میں، کہاں ہو نہیں سکتا

راز دل بیتاب نہاں ہو نہیں سکتا
ہمدرد اگر ضبط فغاں ہو نہیں سکتا

واعظ کو کبھی عشق بتاں ہو نہیں سکتا
پتھر پہ کوئی رنگ عیاں ہو نہیں سکتا

پوچھا تھا کہ ملنا مری جاں ہو نہیں سکتا
شرما کے یہ فرمایا کہ ہاں ہو نہیں سکتا

نالہ نہ کریں ہجر میں انصاف سے کہدو
بیمار سے جب ضبط فغاں ہو نہیں سکتا

پہلو میں نہ آؤ تو تمنا نہ کریں ہم
ہم سے تو یہ اے جان جہاں ہو نہیں سکتا

بسمل ہوا جاتا ہے مرا طائر دل کیوں
ابرو پہ تو قاتل کا گماں ہو نہیں سکتا

اس عشق تبہ کار سے دونوں ہوئے رسوا
الفت کا کبھی راز نہاں ہو نہیں سکتا

دود دل پر سوز سے جلتا ہے زمانہ
اے آہ ہمیں چین یہاں ہو نہیں سکتا

(۳۴)

دل کو میخانہ بنا

دل کو میخانہ بنا آنکھوں کو پیمانہ بنا[403]

پاکبازوں کو پلا کر رند مستانہ بنا

خلوت توحید میں تو سب کو بیگانہ بنا

پہلے تو خود شمع بن پھر اسکو پروانہ بنا

عشق میں مر کر مری مٹی ٹھکانے لگ گئی

حلقۂ تربت زیارت گاہ جانانہ بنا

جیتے جی حسرت نہ نکلی کچھ دل ناشاد کی

ہو گیا واصل بحق تو ان کا کاشانہ بنا[404]

حسن والوں کی شکایت یہ تو میرا منہ نہیں

جب انہیں کے بادۂ الفت سے دیوانہ بنا

---

403 - یہ مصرعہ حضرت آہ کی ڈائری میں ایک دوسری طرح بھی منقول ہے:

ظرف جب لبریز ہو جائے تو خمخانہ بنا

404 - حضرت آہ کی ڈائری میں یہ شعر اس طرح بھی نقل کیا گیا ہے:

جیتے جی حسرت نکلتی یہ کہاں تقدیر تھی

بعد مرنے کے کفن کا جوڑا شاہانہ بنا

بعد مرنے کے بھی قسمت میں مری گردش رہی

خم بنا ، ساغر بنا ، آخر کو پیمانہ بنا[405]

دولہا دولہن میں محبت اس قدر ہے ان دنوں

گویا دیوانی بنی ہے اور دیوانہ بنا

اپنے شوہر کو کہاں لیکر چلی ہے وہ حسیں

دور کوہ قاف پر کوئی نیا خانہ بنا[406]

کیوں بھٹکتے پھر رہے ہو در بدر اے آہؔ تم[407]

کچھ تو سوچو کیوں دل آباد ویرانہ بنا[408]

---

405 ۔خم: شراب کا مٹکا۔

406 ۔کوہ قاف: ایک پہاڑ جو ایشیائے کوچک کے شمال میں واقع ہے، اردو میں اس کا استعمال ایسے مقام کے لئے ہوتا ہے جہاں آدمی کا گذر نہ ہو سکے، نہایت دشوار گذار اور سنسان علاقہ۔

407 ۔حضرت آہؔ کی ڈائری میں یہ مصرعہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اس طرح بھی موجود ہے:

آہؔ کس کی جستجو ہے، کیوں ہوئے خانہ خراب

408 ۔اس غزل کے تحت اور بھی کئی اشعار تھے جن کو صاحب کلام نے خود قلمزد کر دیا ہے اس لئے ان اشعار کو شامل نہیں کیا گیا۔

(۳۵)

عجب وہ دن تھے

(تاریخ رقم: ۱۸/اگست ۸ ۱۹۹ء)

عجب وہ دن تھے، عجب لطف کا زمانہ تھا
چمن میں گل تھے گلوں میں مرا فسانہ تھا

کسی کے حسن کا چرچا جو غائبانہ تھا
تو میرے عشق پہ حیرت زدہ زمانہ تھا

خدا ہی جانے کہ کیا ذکر غائبانہ تھا
کہ بحر فکر میں ڈوبا ہوا زمانہ تھا

چمن میں گل تھے نہ بلبل کا آشیانہ تھا
قفس سے چھوٹے تو بدلا ہوا زمانہ تھا

جکڑلو زلف گرہ گیر میں بتو! دل کو
سیاہ بخت کا ہر فعل مشرکانہ تھا

یہی طریق محبت ہے کیا زمانے میں
ہوا ہر ایک الگ جس سے دوستانہ تھا

ہجوم یاس والم نے کیا ہے دیوانہ
نہیں تو سر تھا مرا تیرا آستانہ تھا

بلایا خفیہ ہمیں بزم راز میں اپنی

قسم بکعبۂ رب موت کا بہانہ تھا

نگاہ جس پہ پڑی ہو گیا وہ متوالا

نظر کے بھیس میں گویا شراب خانہ تھا

بتوں سے دل نہ لگاتا تو کوئی کیا کرتا

جنون عشق میں اس کا کہاں ٹھکانہ تھا

جگر کے ٹکڑے اڑے دل بھی پاش پاش ہوا

تمہارے تیر نظر کا غضب نشانہ تھا[409]

یہی تھی خیر کی صورت دل حزیں کے لئے

جہاں میں سب سے کنارے ترا یگانہ تھا

تمہارے جور کے صدقے نہ جاتے غیر کے گھر

کرم جو کرنا تھا حاضر غریب خانہ تھا

جناب شیخ کے بھی منہ لگی ہے بنت عنب[410]

ہر اک پہ بند ہوا جو شراب خانہ تھا

کتاب عشق کے جس جس ورق کو دیکھا آہ

لہو کے بوند سے لکھا ہوا فسانہ تھا

---

409 -بیاض میں یہ مصرعہ اس طرح بھی موجود ہے: ع مرا ہی سینہ ترے تیر کا نشانہ تھا

410 -بنت عنب: انگوری شراب

(۳۶)

عجب آگ دل میں لگا کر چلا

اُدھر کوئی صورت دکھا کر چلا
اِدھر دل پہ بجلی گرا کر چلا

سراپا وہ شعلہ بنا کر چلا
عجب آگ دل میں لگا کر چلا

قیامت کی چالیں چلیں قبر پر
مٹایا بھی اور پھر جلا کر چلا

یہاں تک اسے مجھ سے ہے اجتناب
کہ تربت سے دامن بچا کر چلا

لحد میں وہ نقشہ ہے پیشِ نظر
جو دنیا کو رستہ بتا کر چلا

جو دینا ہے مولیٰ تو دے دے مجھے
گدا تیرے در کا دعا کر چلا

فدا جان کر دی ترے حکم پر
کہ جیسے شہِ کربلا کر چلا

ہوئی بزم ساقی کی سنسان آہ

کوئی مست جب پی پلا کر چلا

(۳۷)

بہک کر بھی نہیں کہتے کبھی کچھ راز ساقی کا

شراب معرفت پی کر بنا دمساز ساقی کا[411]

گھٹے اغیار نظروں میں بڑھا اعزاز ساقی کا

تلاش جام و ساغر نے کیا ہمراز ساقی کا

نہیں تو ہم کہاں اور نت نیا انداز ساقی کا

سر محفل ہوا ہے جب عدو ہمراز ساقی کا

کسی کو کیا پڑی ہے جو اٹھائے ناز ساقی کا

فنا کا جام پی کر ایک دن سب ہونگے متوالے

رہے گا میکدہ میں تا بکے اعجاز ساقی کا

بچی ہو گی بھلا کب شیخ سے بنت عنب کوئی

رہا ہے مدتوں تک تاک میں ہمراز ساقی کا

---

[411] دمساز: دوست، راز دار۔

حوالے کر دیا دل کو چھپا کر کاسۂ سر میں[412]

کبھی بڑھتا ہوا دیکھا جو دستِ آز ساقی کا[413]

جوانی لٹ گئی سونی پڑی ہے زیست کی محفل

نہ وہ ہم ہیں نہ وہ مے ہے نہ دستِ ناز ساقی کا

ہوئیں مخمور آنکھیں یا ملے ہیں جامِ جم مجھ کو[414]

انہی دونوں پیالوں میں کھلا ہے راز ساقی کا

جوانی کا نشہ مستانہ چالیں ہاتھ میں ساغر

رہا محفل میں شب بھر کچھ عجب انداز ساقی کا

چھپا تا نشۂ الفت مگر آنسو نکل آئے

سرشکِ چشم میرا ہو گیا غماز ساقی کا[415]

یہ کیسے مست ہیں مستی میں بھی ہشیار رہتے ہیں

بہک کر بھی نہیں کہتے کبھی کچھ راز ساقی کا

زمیں کیا آسماں کیا لامکاں تک دیکھ آئیں گے

اڑا کر لے چلے گا جب ہمیں اعجاز ساقی کا

---

412 ۔کاسۂ سر: سر کا پیالہ، کھوپڑی۔

413 ۔دستِ آز: لالچ کا ہاتھ۔

414 ۔جامِ جم: وہ روایتی پیالہ جس میں جمشید تمام حالات کا عکس دیکھ لیتا تھا۔

415 ۔سرشکِ چشم: آنکھ کے آنسو۔

ملے سب خاک میں ارماں مٹی اے آہ یوں محفل
نہ وہ مے ہے نہ میکش ہیں نہ سوز و ساز ساقی کا

نہ وہ مے ہے نہ مینا ہے نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے[416]
رہے گا میکدہ میں آہ کس پر ناز ساقی کا

---

416 ۔* مینا: شراب کا بوتل، صراحی۔☆ساغر: جام۔

(۳۸)

کچھ پتہ راہ کا نہ منزل کا

یہ اشارہ ہے چشم قاتل کا
پھر تماشا ہو رقص بسمل کا[417]

ہے یہ انجام حرص باطل کا
آج رونا پڑا ہمیں دل کا

جان لیوا ہے مدعا دل کا
دل ہے احساں شناش قاتل کا

غم دشمن میں جب کوئی ہلکا
جام لبریز ہو گیا دل کا

یہ تقاضا ہے دیدۂ و دل کا
نہ رہے فرق بحر و ساحل کا

طالب دید کو نہ جھڑکیں اب
رد نہ کیجے سوال سائل کا

---

417 ۔ رقص بسمل: ذبح کئے ہوئے جانور کا تڑپنا پھڑکنا۔

کیا کریں چاہ ہم حسینوں کی

ہِل چکے دانت بال بھی تِلکا

ہم ازل سے ستم نواز رہے

جور بے حد شعار قاتل کا

تل سے نکھری صباحت حسن اور[418]

حال ضد سے کھلا مقابل کا

عشق نے مجھ کو دق کیا کیا کیا

خون تھوکا مرض ہوا سِل کا

زلف پر خم میں دل نہ الجھانا

ہے یہ سودا خیال باطل کا

نالہ روکا تو اشک امنڈ آئے

اشک روکا تو شور اٹھا دل کا

وعدۂ وصل لے لیا ان سے

کر لیا کام تھا جو مشکل کا

کس کی آمد کے منتظر ہو تم

کیوں نرالا ہے رنگ محفل کا

---

418 صباحت: نکھار گوراپن۔

دام گیسو کی قید خوب ہوئی
اک ٹھکانہ تو ہو گیا دل کا

خوں کی ندیاں بہیں دل سے
چل گیا وار چشم قاتل کا

منزل عشق پر خطر ہے دیکھے تھے
لٹ نہ جائے یہ قافلہ دل کا

نالہ کیسا ہے اور فغاں کیسی
کچھ کہو بھی تو ماجرا دل کا

جام توحید پی کے ہوں سرشار
مٹ گیا فرق حق و باطل کا

خوب کنویں جھکائے الفت
ہم ہیں اور نقشہ چاہ بابل کا[419]

دیکھتے ہی مجھے بگڑتے ہو
سن تو لو مدعا مرے دل کا

تیر و پیکاں جو ہیں مرے مہماں[420]
ہیں تواضع کو ابلہ دل کا[421]

---

[419] -چاہ بابل: شہر بابل کا ایک کنواں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ہاروت ماروت دونوں فرشتے وہاں قید ہیں۔
[420] -پیکاں: نیزے کی نوک۔

دردو غم جزو ہیں حقیقت کے

غیر ممکن ہے فصل داخل کا[422]

جل بجھی آہ آرزو میری

ہو گیا خاک حوصلہ دل کا

---

[421] -ابلہ: نادان۔

[422]- یعنی کسی شے کو اس کی حقیقت سے جدا کرنا ممکن نہیں۔

(۳۹)

خالی یہ گھر پڑا تھا پرستان ہو گیا

خالی یہ گھر پڑا تھا پرستان ہو گیا

آئے نظر کے سامنے احسان ہو گیا
دل میں اگر سما گئے ایمان ہو گیا

کس کو خبر ہے کس کا وہ مہمان ہو گیا
دیر و حرم میں ڈھونڈ کے حیران ہو گیا

پوچھوں گا حشر میں ستم ناروا کو میں
تیرا جو سامنا کہیں اے جان ہو گیا

دیکھی جھلک جو خواب میں ایک سرو ناز کی
عالم مری نگاہ میں سنسان ہو گیا

روز فراق گھر سے نکلتا نہیں مرے
عاشق کے دل کا یہ بھی کیا ارمان ہو گیا

دل کا لہو نکل پڑا آنکھوں کی راہ سے
فصاد زخم دل ترا پیکان ہو گیا[423]

---

423 -☆فصاد: رگوں پر نشتر چلانے والا، جراح☆پیکان: نیزے کی نوک، برچھی یا بھالے کی انی۔

تصویر کھینچ لی ہے رخ دل پسند کی

سیپارۂ دل آج سے قرآن ہو گیا

راز و نیاز عشق سے واقف نہیں ہیں دوست

جس کو سنایا حال وہ حیران ہو گیا

دھبے ہمارے خون کے دامن پہ رہ گئے

الزام قتل سے وہ پریشان ہو گیا

جو انتہاء عشق تھی مجھ کو ہوئی نصیب

یعنی ہزار جان سے قربان ہو گیا

اَن بَن ہوئی عدو سے تو مجھ سے وہ مل گئے

اللہ کی طرف سے یہ سامان ہو گیا

اچھی سے اچھی صورتیں اب دل میں رہتی ہیں

خالی یہ گھر پڑا تھا ، پرستان ہو گیا[424]

آئے اگر وہ پاس تو تسکین ہو گئی

جانے لگے تو قلب کو ہیجان ہو گیا

غصہ میں رخ پہ زلف کسی کی بکھر گئی

میرے سبب سے کوئی پریشان ہو گیا

---

[424] -پرستان: پریوں کا ملک، پریوں کے رہنے کی جگہ۔

آنچل ہٹا ہے وصل میں رخ سے زہے نصیب
شاید وفا کے عہد کا قران ہو گیا

رکتے نہیں ہیں نالے دل ناصبور کے[425]
تھمتا نہیں جو اشکوں کا طوفان ہو گیا

بچپن کے بعد آہ چراتے نہ آنکھ وہ
لیکن شباب آکے نگہبان ہو گیا

---

[425] ۔ناصبور: بے صبر، بے قرار، مضطرب۔

(۴۰)

نگاہوں کا ملنا غضب ہوگیا

اُدھر کوئی رخصت طلب ہو گیا
اِدھر آہ میں جاں بلب ہو گیا

الٰہی یہ کیسا غضب ہو گیا
وہ مجھ سے خفا بے سبب ہو گیا

بکھر آئیں زلفیں جو رخسار پر
گہن لگ گیا، روز شب ہو گیا

رہا چین سے دل ترے ہاتھ میں
یہ وحشی بہت با ادب ہو گیا

نہ پوچھو مرے زہد و تقویٰ کا حال
یہ سب نذر بنت عنب ہو گیا

سیہ کار ہوتا ہے پس کر عزیز
رہا آنکھ میں سرمہ جب ہو گیا

مرا دل چرا کر وہ کہنے لگے
کہاں گم ہوا اور کب ہو گیا

کہا کان میں میں نے ان سے جو کچھ

کہا ہنس کے "تو بے ادب ہو گیا

ادا نے کیا ذبح ارمان کو بھی

شب وصل میں جاں بلب ہو گیا

قیامت کا صدمہ جگر ریش ریش[426]

فقط دل لگا کر یہ سب ہو گیا

مرا دل ترے تیر دونوں ہیں خوش

ہر اک کو ہر اک منتخب ہو گیا

ہوا وصل قسمت سے بعد وصال

گزر ان کا مدفن پہ جب ہو گیا

پڑھی حضرت آہ نے وہ غزل

کہ تحسیں سے شور و شغب ہو گیا

---

[426] ۔ریش: زخم، زخمی کرنے والا، اردو میں اس کا استعمال صرف مرکبات میں ہوتا ہے۔

(۴۱)

وار کرکے میرا قاتل تھک گیا

وہ اُدھر دیتا ہوا چشمک گیا[427]

پیچھے پیچھے یہ دل زیرک گیا

وار کر کے میرا قاتل تھک گیا

خود بخود سر اس کے قدموں تک گیا

بھیس میں دشمن کے ہم ان سے ملے

جھک گئے وہ بھی عدو بھی جھک گیا

کون جانے کس نے الٹی تھی نقاب

ہاں مگر ان کا ہمیں پر شک گیا

لٹ لٹا کر آرہا ہوں بزم سے

مال کیا پہلو سے تو دل تک گیا

کہہ رہی ہے یہ اداسی رنگ کی

دشمنوں میں رات وہ بیٹھک گیا

427 -چشمک: رنجش، مخالفت، آنکھ مارنا۔

پردہ داری عشق کی آساں نہیں
ضبط سوزش سے کلیجہ پک گیا

کون سمجھا وصل کیا ہے ہجر کیا
بیخودی میں آہ سب کچھ بک گیا

(۴۲)

وطن چھوٹ گیا

مرنے والے سے ترے ہائے وطن چھوٹ گیا
کس مپرسی میں اٹھی لاش۔کفن چھوٹ گیا

وقت شانہ جو گرا غنچۂ دل چوٹی سے[428]
زلف بل کھانے لگی سانپ کا من چھوٹ گیا

429

طالب ہجر کو کیا کوئی کرے گا ناکام
یہ ستم تجھ سے بھی اے چرخ کہن چھوٹ گیا[430]

روز جاتے تھے تری بزم میں لے کے امید
ناامیدی ہوئی رہبر۔وہ چلن چھوٹ گیا

جیتے جی حسرت وارماں نے نہ چھوڑا دامن
مل گئے خاک میں ہر رنج و محن چھوٹ گیا[431]

---

428 ۔شانہ: کنگھی۔

429 ۔سانپ کا من: سانپ کا مہرہ، سانپ کا منکا جس کی بابت مشہور ہے کہ اندھیری رات میں سانپ اسے اگل کر اس کی روشنی میں گھومتا پھرتا ہے اور جس کے ہاتھ لگ جائے اسے خوشحال بنا دیتا ہے۔

430 ۔چرخ کہن: بوڑھا آسمان۔

431 ۔محن: تکلیفیں، بلائیں۔

چمن حسن کے بلبل تھے ازل سے ہم آہ
جور صیاد سے آخر وہ چمن چھوٹ گیا[432]

ق

آہ محرومی قسمت سے وطن چھوٹ گیا
دوست سب چھوٹ گئے رشتہ ہر ایک ٹوٹ گیا

432 -☆جور: ظلم☆صیاد: شکاری۔

(۴۳)

پیہ گوں نے نہالم کے دل سوئے آسماں دیکھا

بہت سے ماہ وشوں کو جہاں تہاں دیکھا
ترستی آنکھ نے لیکن وہ پی۔ کہاں دیکھا[433]

کھلی جو آنکھ تو عالم کا یہ سماں دیکھا
زمیں سے تا بفلک حسن جان جاں دیکھا

بدن کو چین نہ دل ہی کو شادماں دیکھا
ہجوم درد میں کیا کیا نہ الاماں دیکھا

ہزار ظلم سہے لب پہ اف نہ لائے ہم
ہمارا حوصلہ بھی تم نے جان جاں دیکھا

دل و جگر کو الگ رکھ دیا تری خاطر
کبھی نہ جاتے ہوئے گھر میں میہماں دیکھا

حجاب حسن میں چھپ کے بنا لیا مشتاق
ہوائے دید میں ہر پیر کو جواں دیکھا[434]

---

433 ۔پی: پیارا، معشوق۔

434 ۔ہوائے دید: دیکھنے کی تمنا۔

شب فراق نہ آرام سے بسر کرتی

تمہارے عاشق گمنام کا نشاں دیکھا

پھری نگاہ جو ظالم کی کارگر ہو کے

ہجوم یاس میں بسمل کو نیم جاں دیکھا

کمال درد کی لذت کا یہ کرشمہ ہے

ہزار رنج میں بھی دل کو شادماں دیکھا

لگا کے تیر نمک پاشیاں جو کیں دل پر

دہان زخم کو لذت سے تر زباں دیکھا

سمجھ میں آگئی ناکامی مقدر بھی

شب فراق جو نالوں کو رائگاں دیکھا

غریق لجۂ آفت ہے عمر کی کشتی[435]

ہمیشہ باد مخالف میں بادباں دیکھا[436]

ہوائے وصل میں اے آہ دل بھی کھو بیٹھے

متاع شوق کے ہر سود میں زیاں دیکھا[437]

---

435 لجہ: دریا، بھنور، منجدھار☆لجۂ آفت: سخت مصیبت۔

436 باد مخالف: طوفان، آندھی☆بادباں: مستول، وہ کپڑا جو کشتی کی رفتار تیز کرنے اور اس کا رخ موڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

437 ☆سود: نفع☆زیاں: نقصان۔

(۴۴)

دیکھنا پھر جو سر حشر تماشا ہوگا

جب لب بام مرا انجمن آراء ہو گا[438]

کوئی بے ہوش کوئی محو تماشا ہو گا

جس گھڑی دل میں خیال رخ زیبا ہو گا

خود بخود سامنے وہ چاند سا چہرا ہو گا

تیغ ابرو پہ ترے قتل کا دعوا ہو گا

اور گواہی کو یہی خون کا دھبا ہو گا

آپ ہونگے وہ عدو ہو گا یہ بندہ ہو گا

دیکھنا پھر جو سر حشر تماشا ہو گا

کیا قیامت ہے کہ دشمن سے ملا کرتے ہو

ہم بلائیں تو فقط وعدۂ فردا ہو گا

کوئی کیا جانے عدو سے ہیں مراسم کیا کیا

ہاں مگر راہ میں ملتے ہوئے دیکھا ہو گا

---

438 ۔لب بام: محل یا چھت کا کنارہ۔

کھینچ لیں گے تری تصویر تصور میں ہم

دل پہ نقشہ ہمہ دم حسن ازل کا ہو گا

فطرتی حسن پھر اس پر سے جوانی کی نکھار

بن سنور جاؤ تو سونے پہ سہاگا ہو گا[439]

حشر کہتے ہیں کسے، ہول قیامت کیا ہے[440]

وہ تو اک فتنۂ قامت کا سراپا ہو گا

ہچکچاتے ہوئے سہمے ہوئے آئے ہیں وہ

بات مطلب کی سنیں گے تو اچنبھا ہو گا

چیر کر پھینک نہ دو آہؔ دل وحشی کو

نہ یہ ہو گا نہ کسی زلف کا سودا ہو گا

(تاریخ تحریر: ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء)

---

439 - بیاض آہ کے حاشیہ میں ثمر کے تخلص کے ساتھ یہ شعر اس طرح ہے: ؎ ایک دن ہی مری خاطر سے سنور کر دیکھو
حسن بڑھ جائے گا سونے پہ سہاگا ہو گا

☆ سونے پر سہاگا: ایک مثل ہے، یعنی نفع پر نفع، خوبی پر خوبی، بہتری پر بہتری۔

440 - ہول: خوف۔ دہشت۔

(۴۵)

کوچۂ یار سے شور نکلا دیکھا

آتشیں رخ پہ ترے تل کا ٹھکانہ دیکھا[441]

قائم النار پہ بارود کا دانہ دیکھا[442]

دل پہ دزدیدہ نگاہوں کی عنایت دیکھی

طرفۃ العین میں پہلو سے روانہ دیکھا[443]

اے جنوں تیری بدولت تو ہوئی سیر نصیب

دائمی رنج و الم دیکھا زمانہ دیکھا

اٹھ گیا آنکھ سے جس دم من وتو کا پردہ

اپنے بیگانے کو بھی ہم نے یگانہ دیکھا

قیدی زلف غم ہجر سے آزاد کہاں

رنج سودائے محبت میں شبانہ دیکھا[444]

---

441 ۔آتشیں رخ: آگ کی طرح دہکتا رخسار☆تل: خال، سیاہ نقطہ، کاجل کا نقطہ، وہ نقطہ جہاں سورج کی کرنیں آتشی شیشے میں سے گذر کر جمع ہوتی ہیں۔

442 ۔قائم النار: آگ پر ٹھہرنے والا۔

443 ۔طرفۃ العین: پلک جھپکتے، ذرا سی دیر میں، آن کی آن میں۔

444 ۔شبانہ: رات کے وقت۔

کب بھلا شوق ستم تجھ کو مری جاں نہ رہا
کب ترے تیر کا دل کو نہ نشانہ دیکھا

دل ترے حسن پہ قرباں تو جگر تجھ پہ نثار
جان سے تجھ پہ فدا سارا زمانہ دیکھا

امتحاں جب کبھی عاشق کا کیا قاتل نے
سرخ رو ہم ہوئے جوڑا بھی شہانہ دیکھا

ہے جو رفتار قیامت تو غضب ہیں تیور
دل کو پامال تو سینہ کو نشانہ دیکھا

بیڑیاں پاؤں میں زلفوں کی پڑی ہیں جب سے
کوچۂ یار سے دشوار نکلنا دیکھا

گردش چرخ سے اے آہ کہاں چین نصیب
ہر گھڑی دور میں تسبیح کا دانہ دیکھا

پ

(۴۶)

دل جگر کیا چاہئے فرمائیں آپ

کیا ستم ہے غیر پہ مٹ جائیں آپ
مرمٹوں کو ٹھوکریں کھلوائیں آپ

میرا شکوہ کیوں زباں پر لائیں آپ
روبرو غیروں کے کچھ کہلائیں آپ

ہے حباب آسا ہماری زندگی[445]
دشمنوں میں شوق سے مل جائیں آپ

بے وفائی کس نے کی کس نے وفا
خود ہی اس کا فیصلہ فرمائیں آپ

ابر رحمت ہے ہمارے واسطے
جس قدر تیر ستم برسائیں آپ

---

[445] حباب آسا: پانی کے بلبلے کی طرح ناپائدار۔

کیا زمانہ ہو گیا ہے منقلب[446]
بے وفا کو باوفا ٹھہرائیں آپ

رشک موسیٰ میں بنوں گھر رشک طور
میرے گھر جلوہ اگر فرمائیں آپ

بے خودی نے کھودیا سارا وقار
ورنہ مجھ سے اور قسم کھلوائیں آپ

کوئی ارماں خاک نکلے وصل میں
جب حیا کو ساتھ لیکر آئیں آپ

دونوں عالم ہوں تہ و بالا ابھی
حسن بے پردہ اگر دکھلائیں آپ

رات دن سینہ سپر رہتا ہوں میں
مشق ناوک افگنی فرمائیں آپ

آپ ہیں لطف بہار زندگی
عاشقوں پر جب کرم فرمائیں آپ

داغ دل کی دیکھنی ہو گر بہار
خانۂ دل میں مرے آجائیں آپ

---

[446] منقلب: الٹنے والا، الٹا ہوا۔

خون ناحق رنگ لائے گا ضرور
پیکر دل کو حنا بنوائیں آپ

بعد مرنے کے تو کچھ آنسو بچھے
شبنمی چادر اڑھاتے جائیں آپ

غیر نے پٹی پڑھائی آپ کو
ورنہ اپنے قول سے پھر جائیں آپ

روح روحی جان قلبی آپ ہیں
آپ ہی ہیں داہنے اور بائیں آپ

کون سی مشکل ہے جو آساں نہ ہو
ہجر کی شب آہ کیوں گھبرائیں آپ

ت

(۴۷)

غم ہے الم ہے آہ سحر ہے برائے دوست

کہتا ہے درد عشق کہ سر ہے برائے دوست
دل ہے برائے دوست جگر ہے برائے دوست

وعدہ ہوا ہے دید کا ان سے جو حشر میں
وا چشم شوق آٹھوں پہر ہے برائے دوست

بے وجہ ہم نہ آئے نہ بے وجہ ہم چلے
کرتے ہیں جو سفر وہ سفر ہے برائے دوست

جچتا ہے وہ نگاہ میں اور ہوتا ہے عزیز
جو جھیلتا خوف و خطر ہے برائے دوست

المختصر یہ حال ہے خانہ خراب کا
غم ہے الم ہے آہِ سحر ہے برائے دوست

احباب ہم سے چھٹنے کا ہر گز نہ غم کریں
درپیش اب تو ہم کو سفر ہے برائے دوست

دیتے نہیں ہیں جان کسی پر بھی آہ ہم
رکھتے ہیں ہم عزیز مگر ہے برائے دوست

(۴۸)

اک بت خرد سال کی صورت

آہ آشفتہ حال کی صورت

ہے سراپا ملال کی صورت[447]

دل پہ بیٹھی ہے خال کی صورت

عرش پر ہے ہلال کی صورت

ان کے جب جب خیال کی صورت

دل نے چاہی وصال کی صورت

ہجر میں خط و خال کی صورت

ہو رہی ہے وبال کی صورت

جان پر کھیل کے اسے پایا

تھی یہی انتقال کی صورت

زہد و تقویٰ ہوا ہوا میرا

دیکھ کر اک چھنال کی صورت[448]

---

447 ۔آشفتہ حال: پریشان حال، خستہ حال۔

448 ۔چھنال: فاحشہ عورت، چالاک، عیار، بے حیا۔

اک سر مو نہیں ہے فرق اس میں

چوٹیاں ہیں وبال کی صورت

آسماں نے جو چپیں رکھا ہے

شش جہت ہے وبال کی صورت

چشم وابرو کو ہم سمجھتے ہیں

کشتی مے ہلال کی صورت

یہ نہ پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ہوں سراپا سوال کی صورت

کیوں تمنا کریں ہم ان سے کچھ

نہ رہی جب وصال کی صورت

بے کفن لاش پھینک دی میری

مجھ کو سمجھا اگال کی صورت[449]

محو حیرت ہیں دیکھنے والے

خالق ذوالجلال کی صورت

ضبط الفت میں دیکھتے ہیں آہ

رنج بے حد ملال کی صورت

---

449 - اگال: پان کی پیک، اگلی ہوئی چیز۔

(۴۹)

نظر جو آتی ہے فصل بہار کی صورت

کسی کی یاد میں وہ اختیار کی صورت
مدام جس سے رہے وصل یار کی صورت

چڑھا ہے عشق جو سر پر بخار کی صورت
چھپی ہے آگ بدن میں چنار کی صورت[450]

جو سختیوں میں چھپی وصل یار کی صورت
مری نظر میں خزاں ہے بہار کی صورت

جمال یار نے سکہ جمالیا جب سے
رہی نہ دل پہ کوئی اختیار کی صورت

مجھے جو دفن کیا رکھ کے دل کو سینے میں
بنی مزار میں اک اور مزار کی صورت

خوشا نصیب کہ بعد فنا ہوا پا بوس
ترے قدم سے ملا میں غبار کی صورت

---

450 -چنار: ایک بے ثمر درخت جس کی پتیاں انسان کے پنجے کی طرح ہوتی ہیں، کشمیر میں یہ درخت بکثرت پایا جاتا ہے۔

تمہارے عہد پہ کس طرح سے یقیں آئے
مٹا چکے ہو خود ہی اعتبار کی صورت

کسی کی زلف سیہ کا کیا جو نظارا
تمام شب پھری آنکھوں میں مار کی صورت

ہماری آبلہ پائی کو پوچھتے کیا ہو
غبار چبھتے ہیں اب نوک خار کی صورت

ہوائے سیر چمن ہے تو دل میں آبیٹھو
بنا ہوا ہے یہ اک لالہ زار کی صورت

ملادے خاک میں مجھ کو مگر یہ یاد رہے
رہوں گا تیری گلی میں غبار کی صورت

ہوا ہو ابر ہو ساقی ہو جام ہوے ہو
بہار جب ہے کہ یوں ہو بہار کی صورت

تری نگاہ کا جادو جو چل گیا مجھ پر
رہی نہ ضبط کی قدرت قرار کی صورت

مدد کا وقت ہے اے بے کسی محبت کی
نہ دل ہے پاس نہ صبر و قرار کی صورت

کسی کی حسرت دیدار کا اشارہ ہے
کھڑا رہوں ہمہ تن انتظار کی صورت

نہ تم سے چھٹتے نہ ہم ہجر آشنا ہوتے
نہ حال ہوتا غریب الدیار کی صورت

رہیں گے محو تماشا پس فنا اے آہ
نظر جب آئے گی پروردگار کی صورت

ٹ

(۵۰)

ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں یہ خبر سچ ہے کہ جھوٹ

میرے پہلو سے گئے دشمن کے گھر سچ ہے کہ جھوٹ
غیر کی خاطر رہی مد نظر سچ ہے کہ جھوٹ

یہ جو پائی ہے خبر اے نامہ بر سچ ہے کہ جھوٹ
وہ ستمگر آ گیا ہے راہ پر سچ ہے کہ جھوٹ

بے حجابانہ تم آئے بام پر سچ ہے کہ جھوٹ
حسن سے عالم ہوا زیر و زبر سچ ہے کہ جھوٹ

کہہ رہے ہیں خط عنادل کیا کریں گے سیر گل[451]
باغیوں کا پہرہ ہے گلزار پر سچ ہے کہ جھوٹ

ناتوانی ، بعد منزل ، راہ کی گم گشتگی
ہیں یہ تینوں سدرہ اے ہم سفر سچ ہے کہ جھوٹ[452]

451۔عنادل: عندلیب کی جمع، بلبلیں۔

452 ۔سدرہ: راستہ کی رکاوٹ۔

پوچھتے ہیں نامہ بر سے ہم کو جھوٹا جان کر

جو لکھی ہے حالت زخم جگر سچ ہے کہ جھوٹ

بادۂ مستی کا آنکھوں میں بھرا ہے کیوں خمار

ہاں کہیں ڈھلتی رہی ہے رات بھر سچ ہے کہ جھوٹ

میری آنکھوں میں رہو گر دل میں آسکتے نہیں

یہ تو ہیں چودہ طبق کے دونوں گھر سچ ہے کہ جھوٹ[453]

زلف ناگن کو لگایا ہاتھ کس نے آپ کی

ایسے موذی کو کیا ہے ہم نے سر سچ ہے کہ جھوٹ

قوت برقی رگوں میں عشق نے ایسی بھری

تیرے عاشق اڑ کے پہونچے عرش پر سچ ہے کہ جھوٹ

ہم صفیرو! یوں تو ہیں ہر کام میں دشواریاں[454]

رسم الفت ہے مگر دشوار تر سچ ہے کہ جھوٹ

گر گیا شیشہ نظر سے پڑ گیا جب اس میں بال

جان دی کس نے خطر رخسار پر سچ ہے کہ جھوٹ

---

453 ۔چودہ طبق: سات طبقے زمین کے اور سات طبقے آسمان کے۔

454 ۔ہم صفیر: دوست، ہمدم، ہم آواز۔

انقلاب دہر نے کھودی وفا کی قدر سب
چاہتے ہیں یہ حسیں عاشق سے زر سچ ہے کہ جھوٹ
آہ پیری میں جوانی کے مزے کچھ یاد ہیں
گل رخوں میں عمر ہوتی تھی بسر سچ ہے کہ جھوٹ

دیگر

چشم و دل میں تھا ہمارا ہی گذر سچ ہے کہ جھوٹ
تھے ہمیں ہم آپ کو شام و سحر سچ ہے کہ جھوٹ
تھے جو تم کمسن تو اپنے چین سے کٹتے تھے دن
یہ جفا پہلے نہ تھی بیداد گر سچ ہے کہ جھوٹ
ذکر بھی میرا تھا لب پر دل میں میری یاد بھی
وصل کے پیغام بھی تھے بیشتر سچ ہے کہ جھوٹ
آپ کی محفل کی رونق ایک میری ذات تھی
بزم میں اغیار کا کب تھا گذر سچ ہے کہ جھوٹ
شوخیاں برق تجلی سے نہ تھیں کم آپ کی
یوں نہ مجھ سے لن ترانی تھی مگر سچ ہے کہ جھوٹ[455]

---

455 ۔لن ترانی: انانیت، تعلی، شیخی۔

گیسوؤ و رخ کا نظارا تھا میسر صبح و شام

رات دن تم ملتے تھے جی کھول کر سچ ہے کہ جھوٹ

چاند سی صورت تمہاری رہتی تھی پیش نظر

تھی نہ کوئی شب اندھیری میرے گھر سچ ہے کہ جھوٹ

آخرش بدلا زمانہ رنگ لایا آسمان

پھیر لی تم نے محبت کی نظر سچ ہے کہ جھوٹ

اب کہاں تم اور کہاں ہم وصل کی صورت کہاں

آہ و نالے ہو رہے ہیں بے اثر سچ ہے کہ جھوٹ

شاق تھی جس کی جدائی ہوں وہی ناکام آہ

ساتھ رہتے تھے تمھیں آٹھوں پہر سچ ہے کہ جھوٹ

ج

(۵۱)

اے فلک ہم دامن فریاد پھیلاتے ہیں آج

داغ دل زخم جگر کی سیر فرماتے ہیں آج
مرہم زنگار بن کر وہ چلے آتے ہیں آج[456]

بن کے سودائی تری زلفوں کو سلجھاتے ہیں آج
ہم سے دیوانے ہی تو ہشیار کہلاتے ہیں آج

ہاں سنبھل ہوشیار تیرا جور دکھلاتے ہیں آج
اے فلک ہم دامن فریاد پھیلاتے ہیں آج

آہ کس شوخ ستمگر کے خیال آتے ہیں آج
ہجر کی شب گدگدا کر جو رلا جاتے ہیں آج

محرم راز و نیاز عشق عالم سوز ہوں
میرے نالوں سے مرے دشمن جلے جاتے ہیں آج

سر میں سودا دل میں وحشت اور لب محو فغاں
حضرت ناصح کسے آ آ کے سمجھاتے ہیں آج

---

456 ۔مرہم زنگار: ایک خاص قسم کا سبز رنگ کا مرہم۔

آرہا ہے کس عروس معنیٔ نو کا خیال
ہم جو آغوش تصور اپنا وا پاتے ہیں آج

چشم ظاہر نے ہمیں دونوں جہاں سے کھو دیا
خط و خال نقش باطل پر مٹے جاتے ہیں آج

حضرت دل آپ کی پہلے تو یہ عادت نہ تھی
جس حسیں کو دیکھتے ہیں بس پھسل جاتے ہیں آج

میری وحشت کا وبال ارماں پہ میرے پڑ گیا
رہتے رہتے گوشۂ دل میں وہ گھبراتے ہیں آج

منچلے تھے ہم جوانی میں نہ تھی پروائے دل
اڑ گیا طوطا جو ہاتھوں کا تو پچھتاتے ہیں آج

شیخ صاحب کر رہے تھے دخت رز کی تاک جھانک
کھل گیا ہے راز رندون پر تو شرماتے ہیں آج

دست رنگیں و کف پائے حنائی کے خیال[457]
ہجر میں آ آ کے ہم کو خون رلواتے ہیں آج

داغہائے عشق سے دل بن گیا وہ لالہ زار
سیر کو جس کی حسینان جہاں آتے ہیں آج

---

457 ۔ کف پائے حنائی: محبوب کا تلوا جس پہ مہندی لگی ہو۔

محرم راز و نیاز خلوت توحید ہیں
کاشف علم معانی ہم ہی کہلاتے ہیں آج

اڑ گیا گم ہو گیا یا وہ نگاہیں لے گئیں
کیا ہوا کیوں دل کو پہلو میں نہیں پاتے ہیں آج

سخت جانوں پر قضا کا بس چلے ممکن نہیں
ہاں جو تم کہدو کہ تو مر جا تو مر جاتے ہیں آج

کل جو دشمن کے بہانے سے بلایا آپ کو
کون سی یہ بات تھی جو مجھ سے جھنجھلاتے ہیں آج

مجھ سے بیمار محبت کا نہیں ممکن علاج
حضرت عیسیٰ عبث تکلیف فرماتے ہیں آج

ہیں ہمیں مست خراباتی ہمیں پیر مغاں[458]
جام و ساغر میں ہمیں تو جلوہ دکھلاتے ہیں آج

سوز الفت کی نشانی تھی فقط شمع مزار
دامن صرصر اسے بھی گل کیے جاتے ہیں آج[459]

---

458 -☆خراباتی: شراب خوار، جواری☆پیر مغاں: مخدوم، شراب بیچنے والا۔

459 -صرصر: آندھی، باد تند۔

شوخی رنگ طبیعت نے مٹایا ہے وقار
راستے میں ٹوک کر ہم گالیاں کھاتے ہیں آج
محرم اسرار سے یہ بے رخی پہلے نہ تھی
آہ ہم کو دیکھ کر وہ راہ کتراتے ہیں آج

چ

(۵۲)

یوں مصور یار کی تصویر کھینچ

یاس کا ایما ید تدبیر کھینچ
آس کا حکم آہ پر تاثیر کھینچ

مغز اڑا جاتا ہے بک بک سے تری
واعظا اتنی نہ تو تقریر کھینچ

چار دیوار عناصر سے الگ
دل لگا کر نقشۂ تعمیر کھینچ

دل پھنسانا زلف میں گر ہے خطا
دار پر مجھ کو پئے تعزیر کھینچ

دیر کیوں ہے عاشقوں کے قتل میں
جلد کر ظالم میاں شمشیر کھینچ

ساقیا دے دے اچھوتی مے مجھے
دخت زر کا جامۂ توقیر کھینچ

ہے یہی مرحوم دل کی یادگار
میرے پہلو سے نہ ظالم تیر کھینچ

ہاں سنادے نام اس کا وقت ذبح
او جفا پرور ذرا تکبیر کھینچ

مونس و ہمدم بنالے قبر کا
لوح دل پر یار کی تصویر کھینچ

آہ و نالے کا ابھی ہو فیصلہ
تیغ ابرو اوبت بے پیر کھینچ

ح

(۵۳)

جمے ہیں در پہ ترے سنگ آستاں کی طرح

تلاش یار میں چکر ہے آسماں کی طرح
مکیں جو دور ہے ویراں ہے دل مکاں کی طرح

رقیب سے کرو باتیں نہ راز داں کی طرح
جلاؤ ہم کو نہ تم شمع بے زباں کی طرح

ٹپک پڑے مرے آنسو جو یاد افشاں میں[460]
زمیں پہ تارے نظر آئے آسماں کی طرح

ہمارا نالۂ پر درد سن کے فرمایا
اسی حزیں کی ہے آواز ناتواں کی طرح

عدو نہ آئیں کہیں خانۂ محبت میں
متاع شوق نہ لٹ جائے کارواں کی طرح

---

460 -افشاں: سونے چاندی کا برادہ، مقیش کی باریک کترن جو خوبصورتی کے لئے عورتیں بالوں پر چھڑکتی یا ماتھے پر چنتی ہیں۔

جو بے نقاب کبھی اپنے بام سے اترے
زمیں پہ چاند نکل آیا آسماں کی طرح

تپ فراق میں شعلے بھڑک اٹھے سر سے
تمام رات رہے ہم چراغ داں کی طرح

مشام زلف کو سونگھا کہ سانپ نے سونگھا
بلا کی نیند ہے مسموم ناتواں کی طرح

ہزار حیف کہ اس نے نہ مدعا سمجھا
مرا کلام ہے دشوار چیستاں کی طرح[461]

امید وصل نے ثابت قدم رکھا مجھ کو
جمے ہیں در پہ ترے سنگ آستاں کی طرح

لگا لگا کے عدو نے ملا لیا ان کو
جلا بجھا کے رکھا ہم کو شمعداں کی طرح

ہجوم اشک سے آنکھیں ہیں ڈبڈبائی ہوئی
روانہ صبر و تحمل ہے کارواں کی طرح

تری نگاہ کے پیکاں چبھے جو سینے میں
دل و جگر میں رہے عرش آشیاں کی طرح[462]

---

461 -چیستاں: معمہ، پہیلی۔

فراق دست حنائی میں آہ سینے سے
ٹپک رہے ہیں لہو چشم خونچکاں کی طرح[463]

خ

(۵۴)

مانند آفتاب ہوا ماہتاب سرخ

غصہ کا یہ اثر ہے کہ رنگ شباب سرخ
کیوں ہو رہا ہے آج رخ ماہتاب سرخ

خون و جگر بنے ہیں شراب و کباب سرخ
نازل شب فراق میں کیا کیا عذاب سرخ

اک طیر روح کے لئے یہ سب ہیں بند شیں
دیوار عنصری میں کھچی ہے طناب سرخ[464]

سودائے عشق نے ہمیں کیسا کیا تباہ
منہ زرد ہو رہا ہے تو چشم پُر آب سرخ

---

462 ۔عرش آشیاں: عرش پر گھر بنانے والا شخص۔

463 ۔خونچکاں: جس سے خون ٹپک رہا ہو۔

464 ۔☆طیر: پرندہ۔☆طناب: رسی، خیمہ کی رسی۔

کچھ رنگ مل رہا ہے جو رخسار یار سے
پھولا نہیں سماتا چمن میں گلاب سرخ

اب تو جناب شیخ بھی ہیں رند و پاکباز
خاطر سے دختِ زر کی لگایا خضاب سرخ

انوار پاک کا نظر آنا محال ہے
آنکھوں پہ میکشوں کی پڑے ہیں حجاب سرخ

المختصر یہ حال ہے خانہ خراب کا
دل تک ہوا ہے سوز دروں سے کباب سرخ

کس بے گُنہ کے قتل پہ رویا فلک لہو
مقتل کی ہو رہی ہے سراسر تراب سرخ

آنکھوں میں لال لال یہ ڈورے نہیں مری
بیت الصنم میں کھینچ رہی ہے طناب سرخ[465]

ایما ہمارے قتل کا کرتے ہیں بار بار
لب سرخ آنکھ سرخ رخ لاجواب سرخ

حسن قدم نے جلوہ جو اپنا دکھا دیا
غیرت سے ہو گیا ہے رخ آفتاب سرخ

---

465 - بیت الصنم: بت خانہ، خانہ محبوب۔

اس سیم تن نے سرخ جو محرم پہن لئے
دریا کے پاٹ پر نظر آئے حباب سرخ[466]

اخلاق خوب ہیں تو ہے انسان سرخرو
کہلائے لال رکھے اگر پر خراب سرخ

انکار جور حشر میں ظالم کرے گا کیا
شاہد ہیں میرے خون کے دو بوتراب سرخ

پیغام وصل ہم نے جو بھیجا رقیب سے
غصہ سے ہو گیا وہ بت لاجواب سرخ

سوز و گداز ہجر کی شب کا نہ پوچھ تو
دل کے غبار اٹھ کے بنے ہیں سحاب سرخ[467]

اک لالہ رو کے عشق نے ہم کو کیا شہید[468]
دینا کفن میں آہ ہمارے ثیاب سرخ

---

466 ۔حباب: پانی کا بلبلہ۔

467 ۔سحاب: بادل، ابر، گھٹا۔

468 ۔لالہ رو: سرخ چہرہ والا، دلبر، معشوق۔

ر

(۵۵)

عشق بلبل پہ ہے موقوف نہ پروانے پر

وصل اس کا جو ہے موقوف قضا آنے پر
جان آمادہ ہے قالب سے نکل جانے پر

رنگ بدلا تری محفل کا ترے آنے پر
شمع جلتے ہی جلانے لگے پروانے پر

انتہا ہوگئی اب تو ستم ایجادی کی
خاک تک ڈالنے آئے نہ وہ دیوانے پر

سر میں سودا جو ہے تیرا تو اسیری میں بھی
دل ہے آمادہ تری زلف کے سلجھانے پر

گل ہوئی شمع محبت نہ کبھی گل ہوگی
عشق بلبل پہ ہے موقوف نہ پروانے پر

روز پڑتی ہیں مرے دل پہ نگاہیں ان کی
آہوئے چینی اتر آئے ہیں ویرانے پر[469]

---

469 - آہوئے چینی: رسائی سے بالا دنیا میں رہنے والا معشوق۔

آپ کے آگے حقیقت دل پر شوق کی کیا

آپ تشریف تو لائیں مرے کاشانے پر

مٹ گیا سوز محبت کا اثر تربت سے

ورنہ افسوس نہ تھا شمع کے بجھ جانے پر

جس سے امید وفا تھی وہی قاتل ٹھہرا

کیا بھروسہ کریں اس دور میں بیگانے پر

چل گئی جان تمنا پہ حیا کی تلوار

خون حسرت کا رہا آپ کے شرمانے پر

تاک میں ہے دل پر خون کی وہ چشم میگوں[470]

آنکھ للچائی ہوئی پڑتی ہے پیمانے پر

پڑ گئے جان کے لالے تو کہاں دل کی خیر

تل گیا ہے وہ حسیں اب تو ستم ڈھانے پر

رابطہ کامل ہے تو قاصد کی نہیں حاجت آہ

میری ہر سانس مقرر ہے خبر لانے پر

---

470 ۔ چشم میگوں: خمار آلود آنکھ۔

(۵۶)

قدم رکھو تو بسم اللہ کہہ کر میرے مدفن پر

تجلی طور کی دیکھی کسی کے روئے روشن پر
گری اک حسن کی بجلی مری ہستی کے خرمن پر[471]

ہمیشہ مہر والفت کی نظر رہتی ہے دشمن پر
فقط میرے لئے پردہ لگایا تم نے چلمن پر[472]

کہیں برق بلا شاید گری تھی دشت ایمن پر[473]
نہ چھوڑا ایک تنکا تک مری شاخ نشیمن پر

اڑا کر لے گیا ہے کون میرے طائر دل کو
مجھے کچھ شبہ سا ہوتا ہے چشم سامری فن پر[474]

ہماری ناتوانی کیا مبارک ناتوانی ہے
نگاہیں ہٹ نہیں سکتیں جمی ہیں روئے روشن پر

---

471 ۔خرمن: کھلیان، انبار۔

472 ۔چلمن: چق، تیلیوں کا بنا ہوا پردہ۔

473 ۔دشت ایمن: محفوظ جنگل، مبارک بیابان۔☆برق بلا: مصیبت کی بجلی۔

474 ۔چشم سامری فن: جادوئی صفات والی آنکھ، ایسی آنکھ جس کا سامنا کرتے ہی انسان یکگونہ سحر کا شکار ہو جائے۔

تمہارے نام لیوا اس طرح کوچہ میں بیٹھے ہیں

لئے تصویر دل میں سر میں سودا آنکھ چلمن پر

ہوا سے ہوش اڑتے ہیں گھٹا سے دم بھی گھٹتا ہے

بہارے کشی اب کے اٹھا رکھی ہے ساون پر[475]

یہ کیسی بے کسی ہے روتے روتے گھل گئی آخر

پتنگا تک نہیں آیا ہماری شمع مدفن پر

مرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے جب یہ سنا میں نے[476]

مرے پھولوں کی محفل میں نظر تھی ان کی دشمن پر

نگاہ گرم کی چوٹیں نہ سنبھلیں شیشۂ دل سے

کہ نازک آبگینے ٹوٹ ہی جاتے ہیں گلخن پر[477]

اِدھر اے آہ میری بے کسی ہے میرے ماتم میں

اُدھر حسرت کھڑی سر پیٹتی ہے میرے مدفن پر

(۳ / اکتوبر ۳۶ء)

---

475 ۔ساون: بکرمی سال کا چوتھا مہینہ، برسات کا موسم (عموماً ۱۵ / جولائی سے ۱۵ / اگست تک)

476 ۔ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے: یعنی حواس باختہ ہو گیا، حیران رہ گیا۔

477 ۔ گلخن: تنور، بھٹی، چولہا۔

(۵۷)

کس نے چڑھائے پھول ہمارے مزار پر

دل تو دیا تھا آہ کسی اعتبار پر
کس کو خبر تھی ہونگے ستم جاں نثار پر

آتا جو رحم ان کو مرے انتظار پر
کرتے کرم ضرور وہ امیدوار پر

میت کہے نہ کوئی رہیں شاخسار پر[478]
کیا کیا عنایتیں ہیں تری جاں نثار پر

رکھتا ہوں آگ عشق کی دل میں دبی ہوئی
حاجت نہیں ہے شمع کی میرے مزار پر

دو چار آنکھیں کیا ہوئیں دل کو اڑا لیا
ان دو کبوتروں نے لگائے یہ چار پر

ہیں داغ دل جو شعلے کسی شمع حسن کے
ترجیح میرے سینے کو ہے لالہ زار پر

---

478 ۔شاخسار: بہت سی ٹہنیوں والا، درختوں کا جھنڈ۔☆اس شعر میں قرآن پاک کی اس آیت کریمہ کی طرف تلمیح ہے: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (البقرۃ :۱۵۴)یعنی جو لوگ راہ خدا میں شہید ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن عام لوگوں کو اس کی خبر نہیں۔

رخ سے ہٹاؤ کالوں کو آئینہ رکھ کے تم
شاہ حلب کا قبضہ ہو ملک تتار پر[479]

جل بجھ کے خاک شمع بھی آخر کو ہو گئی
پروانے جس پہ کرتے تھے شب کو نثار پر

ظاہر تجلیات الٰہی ہیں بعد مرگ
اک ہن برس رہا ہے ہمارے مزار پر[480]

تاخیر شام صبح قیامت سے کم نہیں
آنکھیں بچھی ہیں راہ شب انتظار پر

تار نفس ہم اپنا انہی سے لگا نہ لیں
ہر دم پیام جاری رہے ایک تار پر

ممکن نہیں دعاء دلی کارگر نہ ہو
لبیک کی صدا ہے ہماری پکار پر

بلبل چمن سے دور کہاں تک اٹھائے رنج
یا رب ترا کرم ہو غریب الدیار پر[481]

---

479 ۔ایک قسم کی تلمیح ہے، یعنی رخ سے زلفیں ہٹاؤ کہ چہرہ کا حسن دیکھنے کا موقعہ ملے۔

480 ۔ہن: دولت، مال وزر، دکن کے ایک قدیم سکہ کا نام۔

481 ۔غریب الدیار: مسافر، پردیسی، بے وطن۔

پہلو میں ہم کسی کا جو ارمان لے چلے
حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر

رسوا نہ ہوتے عشق میں اے آہ ہم کبھی
قابو نہیں مگر دل بے اختیار پر

(۵۸)

مسیحا بن کے رکھ دو ہاتھ میرے دل کی دھڑکن پر

نظر جب پڑگئی صیاد کی شاخ نشیمن پر
عنادل گر پڑے بے ہوش ہو کر گل کے دامن پر

کسی کی جان جاتی ہے تمہاری چشم پر فن پر
کسی کا دم نکلتا ہے تمہاری بانکی چتون پر[482]

شہید عشق متوالے ہیں تیرے کیا خبر ان کو
کہ ان کا خون دامن پر ہے یا قاتل کی گردن پر

شب فرقت تمہارے ہاتھ ہے صبر و سکوں میرا
مسیحا بن کے رکھ دو ہاتھ میرے دل کی دھڑکن پر

مرے مرنے کا غم کس کو نہیں ہو گا زمانے میں
اِدھر حسرت اُدھر وہ بے کسی روتی ہے مدفن پر

ہزاروں حسرتیں پامال ہیں رفتار جاناں سے
ہزاروں دل ہوئے جاتے ہیں قرباں ایک چتون پر

---

[482] -بانکی چتون: نگاہ ناز، شوخ نگاہ۔

ترے بچپن کی شوخی نے غضب ڈھایا ستم توڑا

کہیں پٹکا کہیں دل کو جلایا شمع روشن پر

نظر سے جب نظر ملتی ہے دل میں آگ لگتی ہے

نہ ڈالو آنکھ دیوانو! کبھی چقماق روشن پر[483]

نتیجہ ہے یہی اے آہ ظالم کی محبت کا

کبھی اس کو ترس آیا نہ نالے پر نہ شیون پر[484]

483-چقماق: ایک پتھر جس سے آگ نکلتی ہے۔

484 -شیون: نالہ و فریاد، واویلا۔

م

(۵۹)

شاکی نہیں فراق کے اب تو کسی سے ہم

یاد شب وصال میں گزرے خودی سے ہم
شاکی نہیں فراق کے اب تو کسی سے ہم[485]

آیا شباب سوز محبت کے ساتھ ساتھ
بے وقت مر رہے ہیں تپ موسمی سے ہم[486]

شاید ازل کا وعدہ فراموش ہو گیا
رکھتے ہیں ساز باز جو حور و پری سے ہم

خلوت میں آئینہ تری توحید کا رہا
رہتے ہیں رونما بھی الگ بھی سبھی سے ہم

کوئی ہمارے درد کا کیوں کر ہو چارہ ساز
اسرار عشق کہتے نہیں جب کسی سے ہم

---

485 ۔شاکی: شکوہ کرنے والا۔

486 ۔تپ موسمی: موسمی بخار، حرارت۔

ہم ہیں شہید ناز گماں موت کا کہاں
ڈرتے نہیں قضا سے نگہ کی چھری سے ہم

ڈالا ہے تفرقہ فلک کینہ ساز نے
گل ہے چمن سے دور وطن کی گلی سے ہم

آخر ہوئے ہیں پھنس کے زمانے میں سب خراب
زاہد سے حور ، شیخ سے مے اور پری سے ہم

کیسا ضرر ہمیں تو ہوا نفع عشق میں
دل دے کے لے لیا ہے ہزاروں خوشی سے ہم

الفت کا راز آہ کھلا بھی تو کب کھلا
مر مٹ چکے گذر گئے جب اپنے جی سے ہم

(٦٠)

قطعہ

یہی خیال تھا عہد وفا کریں گے ہم
کسی کے عشق میں مر کے جیا کریں گے ہم
نگاہ غور سے دیکھا تو یہ نظر آیا
عذاب حال میں نہ دل مبتلا کریں گے ہم

ن

(۶۱)

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہے بلبل نشیمن میں

کسی مالیدہ لب کا رنگ آیا ہے جو سوسن میں[487]
گھٹائیں دیکھ کر حسرت سے رو دیتی ہیں ساون میں

کھلے عارض یہ کس آئینہ رو کے آج گلشن میں[488]
شجر سکتے میں ہیں خاموش ہے بلبل نشیمن میں

مزے خلوت نشینی کے جو پائے مرنے والوں نے
اکیلے جا بسے سب چھوڑ کر وہ کنج مدفن میں[489]

ہوائے سیر گل ہی باعث رنج و محن ٹھہری
جوانی سے بہت اچھے تھے ہم اپنے لڑکپن میں

کشش ان کو نہ لائی پھر کوئی لائے کہاں ممکن
نہ یہ طاقت ہے موٹر میں نہ اتنا زور انجن میں

---

487 ۔مالیدہ: نرم و ملائم، ملا ہوا۔ ☆ سوسن: آسمانی رنگ کا ایک پھول جسے شعراء زبان سے تشبیہ دیتے ہیں۔

488 ۔عارض: رخسار، چہرہ۔

489 ۔کنج: گوشہ۔

اثر اتنا تو ہے نالوں میں وہ بت چونک اٹھتا ہے
پس دیوار کرتا ہوں کبھی جو آہ و شیون میں

نکل کر کوئے جاناں سے بیاباں میں نہ تھا تنہا
ہزاروں حسرتیں ہمدم رہیں صحرا کے دامن میں

نہ تڑپے گا ترا بسمل جھجکتا قتل سے کیوں ہے
جکڑ دے دست و بازو کو ذرا زنجیر آہن میں[490]

شباب آیا ہے جب سے میرے پہلو میں نہیں آتے
جوانی سے مرے حق میں وہ اچھے تھے لڑکپن میں

خدا کا شکر ہے اتنا اثر دکھلایا نالوں نے
مرے خط کا جواب آنے لگا اب طرز احسن میں

کلیجہ چور ہوتا ہے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں
انہیں بیٹھا ہوا جب دیکھتا ہوں بزم دشمن میں

جناب آہؔ اب تو متقی و پارسا نکلے
یہی حضرت گئے تھے دخت رز سے ملنے لندن میں

---

[490] ۔ آہن: لوہا۔

(۶۲)

جسے کہتے ہیں بحر عشق اس کے دو کنارے ہیں

کھُبیں آنکھوں میں جن کی صورتیں آنکھوں کے تارے ہیں
تمنائیں وہی دل کی، وہی ارمان سارے ہیں

ہمارے جینے مرنے کے فقط دو ہی سہارے ہیں
امید وصل ہے یا تیغ ابرو کے اشارے ہیں

رقیب روسیہ اللہ کے ایسے سنوارے ہیں
تمہاری بزم میں بیٹھے ہیں اور شکوے ہمارے ہیں

چبھیں دل میں جو نشتر کی طرح ناوک تمہارے ہیں
رگ جاں کو جو تڑپا دیں وہ آنکھوں کے اشارے ہیں

نہ شبنم کے کہیں قطرے نہ اخگر دیکھے عالم میں[491]
جلے دل کے پھپھولے ہیں کچھ آہوں کے شرارے ہیں[492]

شب وعدہ وہ آتے ہیں نہ جانے منہ سے کیا نکلے
یہ دل حسرت کا مارا ہے ہم ارمانوں کے مارے ہیں

---

491 -اخگر: چنگاری، انگارا، اس کی جمع اخگراں آتی ہے۔

492 -پھپھولہ: چھالہ، آبلہ۔☆شرارہ: چنگاری۔

یہ کیا ممکن نہ ہوتا شیشہ دل چور سینے میں
نگاہیں گرم پڑتی ہیں عدو سے جو اشارے ہیں

کسی کی یاد میں آنسو مچلتے ہیں جو دامن
پر وہ سب ٹکڑے جگر کے ہیں وہ سب آنکھوں کے تارے ہیں

وہی جو دلنشیں ہیں چٹکیاں لیتے ہیں رہ رہ کر
نگاہ ناز نے یہ کس غضب کے تیر مارے ہیں

عجب انداز ہیں ان قہر آلودہ نگاہوں کے
کہیں تو ذبح کرتے ہیں کہیں کچھ اور اشارے ہیں

دھواں دل سے اٹھا چنگاریاں اڑتی ہیں عالم میں
زمیں کیا آسماں پر بھی شرارے ہی شرارے ہیں

مزہ اے آہؔ جب سے خلوت توحید کا پایا
بھرے مجمع میں رہتے ہیں مگر سب سے کنارے ہیں

(۶۳)

بہت سی خوبیاں تھیں اس جواں میں

دھواں دل سے اٹھے آہ وفغاں میں
لگادیں آگ ساتوں آسماں میں

کسی کو کیا خبر ہے اس جہاں میں
ہیں مضمر راز کیا کیا کن فکاں میں[493]

خزاں پہونچی بہار گلستاں میں
ہوئی بے چین بلبل آشیاں میں

تمہارے رخ سے آنکھیں پھیر لیں ہم
نہیں یہ تاب جان ناتواں میں

تری منت مسیحا میں نہ کرتا
دوائے دل اگر ملتی دکاں میں

رہین منت صیاد ہیں ہم
قفس رکھا ہمارا گلستاں میں

493 ۔کن فکاں: دنیا، مخلوقات، کائنات۔

کھلی ہی رہ گئی چشم فلک بھی
تمہیں دیکھا جو بزم دشمناں میں

جھکیں ابرو تو سیدھے تیر نکلیں
عجب انداز ہے ٹیڑھی کماں میں

جو کھائیں گالیاں شیریں لبوں کی
لپٹ کر رہ گئے شکوے زباں میں

اٹھا جب پی پلا کر مست کوئی
اداسی چھا گئی مے کی دکاں میں

پپیہوں نے بڑھائی میری وحشت[494]
جنون افزا اثر تھا پی کہاں میں[495]

غریب و غمزدہ ناکام وشیدا
نہیں مجھ سا زمین و آسماں میں

جہاں ہمدم نہ ہو کوئی کسی کا
رہیں اے آہ کیوں ایسے مکاں میں

---

[494] -پپیہا: زرد رنگ کا ایک خوش آواز پرندہ جو پی پی کی صدا لگاتا ہے۔

[495] -پی کہاں: پپیہے کی آواز۔

(۶۴)

مثال شمع ہجر یار میں روتے ہیں جلتے ہیں

رقیب روسیہ کو ساتھ لیکر جب نکلتے ہیں
دل عاشق پہ کیا کیا حسرتوں کے تیر چلتے ہیں

مرے دشمن نہیں معلوم کیا کیا زہر اگلتے ہیں
کہ ہر ہر بات پر اب مجھ سے وہ تیور بدلتے ہیں

ابھی تو نو گرفتار بلا ہیں اور یہ عالم ہے
ہمارے طفل اشک چشم دامن میں مچلتے ہیں[496]

ہزاروں جور ہوں لاکھوں ستم ہوں سب سہیں گے ہم
کہیں معشوق کے کوچہ سے عاشق بھی نکلتے ہیں

کسی کی بے وفائی میں بھی اک شان وفا دیکھی
جنازے پر نہ آئے تو کف افسوس ملتے ہیں

ہمارے دیدہ و دل کی حقیقت دیکھتے جاؤ
کہیں چشمے ابلتے ہیں کہیں شعلے نکلتے ہیں

---

496 ۔ طفل اشک: آنسو۔

بتائیں ہجر ہم کیوں کر دکھائیں درد کیا اپنا
ہمارے گھر وہ آتے ہیں تو کل نقشے بدلتے ہیں

مرے آنسو کو تم قطرے نہ سمجھو صرف پانی کے
یہ تیزاب محبت ہیں اسی سے دل پگھلتے ہیں

ہوا ہوں جب سے سودائی کسی کی چشم و گیسو کا
گھٹا غم کی ہے آنکھوں میں سنپولے دل میں پلتے ہیں[497]

محبت ہم سمجھتے ہیں تری طرز عداوت کو
جگہ دیتے ہیں پہلو میں جو تیرے تیر چلتے ہیں

بہت سچ ہے کہ آخر خون ناحق رنگ لاتا ہے
حنا کے بدلے اب تو وہ ہمارا خون ملتے ہیں

جو دیکھا ہے انہیں اغیار سے سرگوشیاں کرتے
پشیماں ہو کے کیا کیا بات کے پہلو بدلتے ہیں

شب فرقت نہ پوچھو آہ چشم زار کا عالم
تن بسمل میں دو چشمے ہیں جو ہر دم ابلتے ہیں

---

497 ۔سنپولہ: سانپ کا بچہ۔

(٦٥)

عید کا کچھ نہ ملا ہم کو مزا عید کے دن

ناروا جور کو رکھتے ہو روا عید کے دن

غیر سے کرتے ہو تم میرا گلا عید کے دن

مجھ سے وہ عہد شکن جب نہ ملا عید کے دن

عید کا خاک ملے مجھ کو مزا عید کے دن

آگئی یاد جو فرقت کی بلا عید کے دن

عید کا کچھ نہ ملا ہم کو مزا عید کے دن

کر دیا عشق و مسرت نے کچھ ایسا بے ہوش

ہم کو ان سے ہوئی امید وفا عید کے دن

جذب دل کھینچ کے لایا ہے اِدھر یاد رہے

مجھ پہ کچھ آپ کا احساں نہ ہوا عید کے دن

مجھ کو بھی لوگ کہا کرتے ہیں اب تو قبلہ

جب سے ہر سال وہ بت آنے لگا عید کے دن

شمع سوزاں کی طرح رشک جلاتا ہے مجھے[498]

آپ غیروں سے جو کرتے ہیں وفا عید کے دن

---

498 - شمع سوزاں: جلتی ہوئی شمع۔

مجھ کو دکھلا کے وہ دشمن سے گلے ملتے ہیں
اللہ اللہ یہ جفا ایسی جفا عید کے دن

صدقۂ فطر میں دشمن کو نکالو گھر سے
تاکہ بیمار کی ہو دور بلا عید کے دن

بوئے گل نافۂ مشکیں کی حقیقت دیکھوں[499]
کھول دو زلف معنبر کو ذرا عید کے دن

شاد باش اے دل بے تاب وہ خود آتے ہیں
رنگ لائی ہے یہ تاثیر دعا عید کے دن

ایک وہ بھی ہیں کہ ملتا ہے زمانہ ان سے
ایک میں ہوں کوئی مجھ سے نہ ملا عید کے دن

تیرے زلفوں کی تصور میں بلائیں لے کر
اپنے سر مول لیا رنج و بلا عید کے دن

حق پرستوں کی نشانی یہی دیکھی اے آہؔ
یاد آتا ہے بہت ان کو خدا عید کے دن

---

499 -نافۂ مشک: مشک کی تھیلی، ایک خاص ہرن کے پیٹ کی تھیلی جو خوشبودار ہوتی ہے۔

(٦٦)

[illegible] آنکھیں

بے مروت ہیں جفاجو ہیں ستمگر آنکھیں[500]
خون کرتی ہیں یہ عاشق کا بدل کر آنکھیں

کتنی پر کیف ہیں متوالی ہیں دلبر آنکھیں[501]
گویا چلتی ہیں چڑھا کے کئی ساغر آنکھیں

جز ترے اور کسی پر نہ پڑیں گر آنکھیں
حشر تک کیوں نہ رہیں طاہر واطہر آنکھیں

دین و دنیا کو تو کرتی ہیں مسخر آنکھیں
یا الٰہی یہ ولی ہیں کہ پیمبر آنکھیں

نہ بنیں وادی الفت میں جو رہبر آنکھیں
چشم حق بیں کی نظر میں ہیں وہ دو بھر آنکھیں

حسن رخسار نہ دیکھیں تو کہاں چین آئے
ایک مدت سے تماشے کی ہیں خوگر آنکھیں

---

500 - جفاجو: ظالم، معشوق۔☆ ستمگر: ظالم۔

501 - متوالی: مست، مدہوش، مخمور۔ نشہ میں چور

جلوۂ یار نہ دیکھے تو وہ بینائی کیا
درد فرقت سے نہ روئیں تو ہیں پتھر آنکھیں

جس کو دیکھا وہ ہوا آپ ہی کا دیوانہ
سحر کرتی ہیں کہ اعجاز سراسر آنکھیں

دیکھ کر حسن گلو سوز تردد ہے یہی[502]
دل تصدق ہو کہاں اور کہاں پر آنکھیں

تیری نظروں نے کیا مجھ کو کچھ ایسا زخمی
ہر رگ جاں میں مرے ہو گئیں ستر آنکھیں

ہوں شہید نگہ ناز ترا اے قاتل
رہتی ہیں خون تمنا سے مری تر آنکھیں

میں بھی ہوں وہ بھی ہیں سینہ بھی ہے دیکھوں تو سہی
مشق ناوک فگنی کرتی ہیں کیونکر آنکھیں

نگہ ناز سے اے آہ کیا جس نے شہید
یہی کافر ہیں یہی ہیں وہ ستمگر آنکھیں

---

502 ۔ گلو سوز: نہایت میٹھی اور لذیذ۔

ق

ان سے جو پوچھا کہ درپردہ ہے الفت کس کی
ان دنوں رہتی ہیں کیوں آٹھ پہر تر آنکھیں

آرزو کس کی ہے ارماں تمہیں کس کا ہے
منتظر کس کی رہا کرتی ہیں شب بھر آنکھیں

سن کے پہلے وہ بگڑنے لگے آخر یہ کیا
آہ قابو سے ہوئی جاتی ہیں باہر آنکھیں

دل میں آبیٹھی ہے جب سے وہ خیالی صورت
ڈھونڈھتی پھرتی ہیں اس کو مری گھر گھر آنکھیں

بے کلی دل کی جو فرقت میں سوا رہتی ہے
چین سے سوتی نہیں ہیں مری شب بھر آنکھیں[503]

---

[503] -اس کلام پر حضرت آہ نے اپنی ڈائری میں ایک نوٹ چڑھایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کلام ان کی زندگی میں ہی اس قدر مقبول اور مشہور ہوا کہ یہ موسیقی اور رند خرابات کی محفلوں میں اور فونوگراف کے سازوں پر بھی سنا جانے لگا تھا، مگر اتنے خوبصورت کلام کے بے جا استعمال پر ان کو افسوس تھا، آہ کا احساس یہ ہے کہ یہ کلام ان کی مجلس کے بعض نامحرم واردین کی بدولت خراباتیوں تک پہونچا، اور یہ نغمۂ فقیر عشرت کدوں میں گونجنے لگا۔

(۶۷)

جنون اور وحشت کے مارے ہوئے ہیں

کسی کی محبت کے مارے ہوئے ہیں
محبت میں آفت کے مارے ہوئے ہیں

لحد میں نکیرین ہم کو نہ چھیڑیں[504]
مسافر ہیں غربت کے مارے ہوئے ہیں

سبب کوچہ گردی کا ہم سے نہ پوچھو
جنون اور وحشت کے مارے ہوئے ہیں

کبھی وصل کی ہم تمنا نہ کرتے
کریں کیا کہ حسرت کے مارے ہوئے ہیں

لگاتے نہ ہم دل کسی بے وفا سے
مگر آہ قسمت کے مارے ہوئے ہیں

---

504 ۔ نکیرین: منکر نکیر، مردہ سے سوال وجواب کرنے والے دو فرشتے۔

(۶۸)

حقیقت میں وطن وہ ہے جہاں احباب رہتے ہیں

شب فرقت جو عاشق ہیں بہت بے تاب رہتے ہیں
تڑپتے ہیں مثال ماہی بے آب رہتے ہیں

حسینوں نے اڑایا رنگ شاید طائر دل کا
یوں ہی کیا ان حنائی ہاتھوں میں سرخ آب رہتے ہیں

مرا دل ہو کہ مہندی پس کے بھی شاداب رہتے ہیں
جبھی تو اس حنائی ہاتھ میں سرخاب رہتے ہیں[505]

تصور چٹکیاں لیتا ہے اک مہرو کا پہلو میں
ہمیشہ بستر غم پر شب مہتاب رہتے ہیں[506]

کمال حسن سے عالم مسخر ہو گیا سارا
تمہارے ناز برداروں میں شیخ و شاب رہتے ہیں[507]

تمہاری بزم سے اے جاں عدو نکلا نہ ہم پہونچے
کھلے کب آمد و شد کے لئے ابواب رہتے ہیں

---

505 ۔سرخاب: ایک آبی پرندہ، سرخ رنگ کا پانی۔

506 ۔شب مہتاب: چاندنی رات۔

507 ۔شیخ وشاب: بوڑھا اور جوان۔

جو غربت میں کبھی رویا تو ہنس کر بے کسی بولی
حقیقت میں وطن وہ ہے جہاں احباب رہتے ہیں

لگی ہے آگ دل میں تو جگر بھی پانی پانی ہے
تپ فرقت ہے اور ہم دیدۂ پر آب رہتے ہیں

نکل آئیں جو بوندیں آنسوؤں کی ابر نیساں تھیں[508]
مرے دامن میں ہر دم گوہر نایاب رہتے ہیں

تکلف بر طرف ساقی میں متوالا ہوں متوالا
بجا کب بے خودی شوق میں آداب رہتے ہیں

نگہ کو ناز کو ابرو کو کس کس کو کہیں دشمن
ہمارے قتل کے کیا ایک دو اسباب رہتے ہیں

نہیں کی ہم نہیں سنتے ہجوم شوق و ارماں میں
انہیں بے خواب رکھتے ہیں جو ہم بے خواب رہتے ہیں

اسیران قفس کے ایک دن آنسو نہیں گرتے
کبھی دامن پہ موتی ہیں کبھی سرخ آب رہتے ہیں

---

508 -ابر نیساں: شمسی مہینہ نیساں (جو ستمبر کے مطابق ہوتا ہے) میں برسنے والا بادل، مشہور ہے کہ اس سے سیپ میں موتی، کیلے میں کافور، بانس میں بنسلوچن اور سانپ میں زہر بنتا ہے۔

مسیحا جبکہ لکھتا ہے حنائی ہاتھ سے نسخہ

تو اس میں شاخ مرجاں دانۂ عناب رہتے ہیں[509]

جو ہوتے ہو خفا ہم سے تو دشمن ساتھ لگتا ہے

نہال آرزو اغیار کے شاداب رہتے ہیں[510]

ہوا ہے کیا یہ کیسا درد ہے جو کچھ نہیں کہتے

جناب آہ روتے جاتے ہیں بے تاب رہتے ہیں

امید وصل نے کیسی دکھائی آہ مایوسی

کہ ہم پینے کو ہر دم ساغر زہر آب رہتے ہیں[511]

---

509 - ☆مرجان: مونگا، چھوٹا موتی۔ ☆عناب: ولایتی بیر جو نہایت سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔

510 - نہال: تازہ پودا۔

511 - زہر آب: جس پانی میں زہر ملا ہوا ہو۔

(٦٩)

لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

تیری بیداد کا گلہ نہ کریں
توجو مل جائے لب کو وا نہ کریں

ہم سے ملنے میں وہ بہانہ کریں
عذر اغیار سے ذرا نہ کریں

وہ ستم ہی کریں وفا نہ کریں
ہم کو لازم ہے کچھ گلہ نہ کریں

تیرے بندے انا انا نہ کریں
مفت میں دار پر چڑھا نہ کریں[512]

ہے تواضع یہی یہی تسلیم
سر کو سجدہ سے ہم جدا نہ کریں

مجھ کو تیر نگاہ سے مارو
دیکھنا یہ کہیں خطا نہ کریں

---

[512] -انا انا: ایک تلمیح، حضرت منصورؒ محویت کے عالم میں انا الحق بول پڑے تھے، جو ان کے سولی پر چڑھائے جانے کا سبب بنا۔

ہم سراپا سوال وارماں ہیں
گرچہ کچھ عرض مدعا نہ کریں

مٹ گیا فرق تو و من کا جب
عشق والے انا انا نہ کریں

بات بگڑی ہوئی نہیں بنتی
عذر بیجا میں لب ہلا نہ کریں

دل کے دینے میں عذر کس کو ہے
ہاں مگر لیکے وہ دغا نہ کریں

سخت دشوار ہے ترا ملنا
رہنمائی جو رہنما نہ کریں

کچھ تو بسمل کی آرزو نکلے
دل پہ وہ شوق سے نشانہ کریں

خون دل ہی میں ہاتھ رنگ نہ لیں
ایسی ویسی حنا ملا نہ کریں

بندۂ عشق کی تمنا ہے
تیری جس میں نہ ہو رضا نہ کریں

میں ہوں بیمار چشمِ نرگس کا[513]

دوست میرے مری دوا نہ کریں

مصحف رخ، عدو تماشائی

نور نامہ ہمیں پڑھا نہ کریں

چشم ناوک کا یہ اشارا ہے

تیر ہم کھائیں اف ذرا نہ کریں

آہ پہلو میں درد رکھتے ہیں

تا بکے نالہ و بکا نہ کریں

513 ۔ چشم نرگس: نرگس ایک پھول ہے جسے شعراء آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں، مجازاً یہ محبوب کی مست آنکھوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷۰)

یا میرا سر نہیں رہے یا آستاں نہیں

اشکوں کا کب فراق میں سیل رواں نہیں[514]
اس بحر میں حباب ساکب آسماں نہیں

جب وہ فروغ بزم مرا میہماں نہیں
کچھ دل میں حوصلہ نہیں روح رواں نہیں

سودائے زلف کا یہی ٹھہرا ہے اک علاج
یا میرا سر نہیں رہے یا آستاں نہیں

گردش میں آفتاب بھی ہے ماہتاب بھی
منزل کا تیری ملتا کسی کو نشاں نہیں

بیداد کا تمہاری یہ ادنیٰ ثبوت ہے[515]
کس دن اڑائیں تم نے مری دھجیاں نہیں

اک شور دیر و کعبہ میں کیوں ہے شب وصال
وقت جرس نہیں ہے یہ وقت اذاں نہیں

---

514 ۔سیل رواں: زوردار سیلاب۔

515 ۔بیداد: ظلم، ناانصافی۔

جو ہیں شہید ناز وہ ہیں سب سے بے نیاز
اک مست زندہ دل ہیں قضا کا گماں نہیں

ہم کو قرار ہے نہ انہی کو قرار ہے
راحت کسی کو آہ نہ آسماں نہیں

مقطع پڑھوں اک اور کہ ہو حسب حال آہ
بزم سخن ہے دوست ہیں دشمن یہاں نہیں

(۱۷)

میں آشنائے درد ہوں درد آشنا مرا

کس دن ترا خیال ہمیں جان جاں نہیں
گذری وہ کون رات کہ آہ و فغاں نہیں

تم مہربان ہو تو کوئی نامہرباں نہیں
دشمن زمیں نہیں ہے عدو آسماں نہیں

ناصح نہ پوچھ مجھ سے مرے رنج و یاس کو
خاطر جو ہو ملول تو ممکن بیاں نہیں

آنکھیں لڑا کے ان سے ہوا سینہ پاش پاش
کھائی وہ چوٹ جس کا تھا وہم و گماں نہیں

آیا خیال جب کبھی تصویر یار کا
ایسے خموش ہم ہوئے گویا زباں نہیں

ضبط تپ فراق ہمارا نہ پوچھئے
دل صاف جل گیا مگر اٹھا دھواں نہیں

اٹھے تو تلملائے جو بیٹھے تو غش ہوئے
مارے ہوؤں کو ہجر کے تاب و تواں نہیں

کعبے میں تم ملے نہ کلیسا میں تم ملے
روزِ الست سے تمہیں ڈھونڈھا کہاں نہیں

چونکے ہیں کچھ وہ آہ دلِ ناصبور سے
نالے شبِ فراق مرے رائگاں نہیں

آئی جو یاد تیری تو آنسو نکل پڑے
اٹھا جو درد دل میں تو رکتی فغاں نہیں

میں آشنائے درد ہوں درد آشنا مرا
ناصح یہ رازِ بستہ کسی پر عیاں نہیں

مر مٹ چکے کسی کی محبت میں آہ ہم
ڈھونڈھے سے بھی تو ملتا ہمارا نشاں نہیں

(۷۲)

مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہوگئیں

ایک ہی صورت سے کتنی شکل انساں ہو گئیں
قدرتیں اللہ کی کیا کیا نمایاں ہو گئیں

میں نے پوچھا حسرتیں پوری مری جاں ہو گئیں
قتل کر کے مسکرائے اور کہا ہاں ہو گئیں

جب جوانی کی امنگیں دل میں مہماں ہو گئیں
راحتیں سب میزبانی میں پریشاں ہو گئیں

یہ نہ پوچھو کس ادا پر جانیں قرباں ہو گئیں
جتنی باتیں ہیں سبھی تو دشمن جاں ہو گئیں

جو کیا وعدہ اسے ایفا کیا ہم نے ضرور
جتنی باتیں منہ سے نکلیں عہد و پیماں ہو گئیں

کیا کریں گے اب عنادل سیر گلہائے چمن
گرمی آہ و فغاں سے خشک کلیاں ہو گئیں

آرزو، حسرت، تمنا، لذت سوز و گداز
سب ہمارے ساتھ زیر خاک پنہاں ہو گئیں

جب نہ کوئی آرزو تھی چین تھا آرام تھا
حسرتیں پہلو میں آکر دشمن جاں ہو گئیں

حسرت دیدار ہے اک بحر خوبی کی مجھے
روتے روتے میری آنکھیں رشک طوفاں ہو گئیں

کھل گئے اسرار قدرت کے ہمارے سامنے
صورتیں نظروں میں ساری ماہ کنعاں ہو گئیں[516]

ٹیس ہے پہلو میں اور دل میں کھٹک لا انتہا
یا الٰہی یہ نگاہیں کس کی پیکاں ہو گئیں

فیض روح القدس سے اے آہ میں ہوں مستفیض[517]
میری نظمیں کاشف اسرار قرآں ہو گئیں

---

516 ماہ کنعاں: کنعاں کا چاند، حضرت یوسفؑ کی طرف اشارہ ہے، شام کے صوبہ فلسطین کو کنعان کہتے ہیں، جہاں حضرت یوسفؑ کی ولادت ہوئی تھی۔

517 روح القدس: حضرت جبرئیلؑ کا لقب ہے، پاک روح، نیز خدا کی اس پاک روح کو بھی روح القدس کہتے ہیں جو حضرت مریم میں پھونکی گئی تھی جس سے حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔

و

(۷۳)

سر جھکا ہو بیٹھے قتل پر کھنچی تلوار ہو

دل کا گاہک جان کا دشمن نہ تو اے یار ہو
خون ناحق کا کہیں کوئی نہ دعویدار ہو

ہاتھ میں خنجر لئے وہ ابروئے خمدار ہو[518]
ٹکٹکی باندھے ہوئی یہ حسرت دیدار ہو

صورت زیبا کسی کی جب مری غمخوار ہو
گوشۂ تربت مرا کیوں تنگ ہو یا تار ہو

تم حسینوں میں حسیں ہو یا گل گلزار ہو
مبتلا سے جب کھٹک رکھو تو نوک خار ہو

یا الٰہی پھر مرے دل پر نگاہ یار ہو
انتظار وصل میں جینا مجھے دشوار ہو

---

518 ۔ خمدار: ٹیڑھا ترچھا، جھکا ہوا۔

وہ جمال حق نما ہو جائے گر پر تو فگن[519]

چشم بینا ہو ہماری ذات پر انوار ہو

صلح کل ہم ہو نہیں سکتے مگر اس شرط سے

ہاتھ میں سُبحہ ہو گردن میں پڑی زنار ہو[520]

تم جو دزدیدہ نگاہوں سے کبھی دیکھو مجھے

ناوک دلدوز سینہ کیا جگر کے پار ہو

تم سراپا ناز ہو ہم ہیں سراپا آرزو

کشمکش ہے کس طرح سے وصل آخر کار ہو

جیتے جی میں ہو رہا ہوں غرق اشک انفعال[521]

تا نہ میری لاش دوش اقربا پر بار ہو

تیرہ بختی نے دکھایا آہ یہ روز سیاہ[522]

یہ دل پر نور اور قیدی زلف یار ہو

---

519 -پر تو فگن: سایہ فگن۔

520 -☆سبحہ : تسبیح ،مالا۔☆زنار : جنیو ،وہ تاگا جو ہندو گلے اور بغل کے درمیان اور یہودی ،مجوسی اور عیسائی کمر میں باندھتے ہیں۔

521 -اشک انفعال: گہرے تاثر پر نکلنے والا آنسو۔

522 -تیرہ بختی: بد نصیبی۔

دیگر

بانی جور و جفا ہو باعث آزار ہو

بے وفا ہو خود غرض ہو کس طرح کے یار ہو

اُس طرف ناوک دلدوز کی بوچھار ہو

اس طرف زخم جگر پر مرہم زنگار ہو[523]

ناامیدی یاس حسرت مونس و غمخوار ہو

فرط غم سے مبتلا کی کیوں نہ حالت زار ہو

یہ جزائے شرط ہے دل لو جگر لو جان لو

جو کہ چاہو لو مگر جب وصل پر تیار ہو

بندۂ تسلیم کی اس کے سوا حسرت نہیں

سر جھکا ہو پائے قاتل پر کھنچی تلوار ہو

ہستی افلاک کیا دوزخ پکارے الاماں

سوزش دل سے فغاں میری جو آتشبار ہو[524]

جل چکا سوز محبت سے سراپا آہ جب

پھر بھلا اس نور کو کیوں کر ہراس نار ہو[525]

---

523 ۔مرہم زنگار: ایک خاص قسم کا مرہم جو سبز رنگ کا ہوتا ہے۔

524 ۔آتشبار: آگ برسانے والا۔

ی

(۲۷)

بزم دل محشر خاموش ہوئی جاتی ہے

اس کی رحمت جو خطاپوش ہوئی جاتی ہے
فرد اعمال فراموش ہوئی جاتی ہے

ہر ادا شرم سے روپوش ہوئی جاتی ہے
حسرت وصل ہم آغوش ہوئی جاتی ہے

داغہائے دل پر خوں جو ابھر آئے ہیں
قبر عشاق کی گلپوش ہوئی جاتی ہے

روز پیتی ہے لہو عاشق وارفتہ کا[526]
تیغ ابروبڑی مے نوش ہوئی جاتی ہے

بے خودی میں کوئی حسرت ہے نہ ہنگامۂ شوق
بزم دل محشر خاموش ہوئی جاتی ہے

---

525 ۔ہراس نار: جہنم کا خوف۔

526 ۔وارفتہ: بے خود، بے قابو۔

خوب ہوتا ہے کہ سر کٹتے چلے جاتے ہیں
لاش بسمل کی سبکدوش ہوئی جاتی ہے

کیسی رفتار ہے مجھ کو نہیں کرتے پامال
حسرت دل تہ پاپوش ہوئی جاتی ہے

کیا غضب ہے مرا وعدہ کرو دشمن سے وفا
طرفہ بیداد ستم کوش ہوئی جاتی ہے

ایک وعدہ پہ ہوں سو جان سے قرباں اے جان
کاہش ہجر فراموش ہوئی جاتی ہے[527]

آہٹ ان کے اِدھر آنے کی جو پاتے ہیں
سمع اپنی ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

بے پئے کی ہے جوانی میں وہ مستی چھائی
ہر ادا آپ سے مدہوش ہوئی جاتی ہے

تیری آنکھوں کا اشارہ کہ جگر ہی ہو شار
دل کی ہمت کہ ہم آغوش ہوئی جاتی ہے

مکتب عشق میں جس دن سے قدم رکھا آہ
اپنی ہستی بھی فراموش ہوئی جاتی ہے

---

[527] ۔کاہش: تکلیف، صدمہ۔

(۷۵)

دل بھی مشتاق ہے جگر بھی ہے

میری آہوں میں کچھ اثر بھی ہے
او ستمگر تجھے خبر بھی ہے

خط ورخ پر کسی کی زلف آئی
ابر میں ہالہ بھی قمر بھی ہے

تیرا روگی نہیں ہوا اچھا
لب پہ ہے آہ چشم تر بھی ہے

لے کے دل کس ادا سے کہتے ہیں
آپ کے پاس نقد زر بھی نہیں

پھینکتا جا اِدھر بھی تیر افگن
دل بھی مشتاق ہے جگر بھی ہے

خط وعارض سے محو حیرت ہوں
ایک جا شام بھی ہے سحر بھی ہے

تیرے دندان ولب کو کیا کہئے
حقۂ لعل بھی گہر بھی ہے[528]

---

[528] حقہ: ڈبیہ جس میں جواہرات رکھے جاتے ہیں۔

آہ دونوں جلے محبت میں

ہے اِدھر سوز تو اُدھر بھی ہے

(۷۶)

کون جانے ترا میخانہ رہے یا نہ رہے

چشم مخمور کا دیوانہ رہے یا نہ رہے

خیر ساقی کی ہو مستانہ رہے یا نہ رہے

وصل کی شب دل دیوانہ رہے یا نہ رہے

سامنے شمع کے پروانہ رہے یا نہ رہے

ساقیا اتنی پلا دے کہ نہ آئے پھر ہوش

کون جانے ترا میخانہ رہے یا نہ رہے

مجھ کو تصویر خیالی سے حضوری ہے مدام

طور پر جلوۂ جانانہ رہے یا نہ رہے

ہم تو بچپن سے ہم آغوش بتاں رہتے ہیں

فکر کیا دہر میں بت خانہ رہے یا نہ رہے

جل چکا سوز محبت سے تو پروانہ رہی

خاک ہو کر مرا کاشانہ رہے یا نہ رہے

تم جو مل جاؤ کسی چیز کی پروا کیسی
وصل میں ساغر و پیمانہ رہے یا نہ رہے

ذکر رہ جائے گا اس جور و ستم کا تیرے
آہ ناکام کا افسانہ رہے یا نہ رہے

(۷۷)

جو ضبط میں لذت ہے شکایت میں نہیں ہے

عاشق تپش عشق سے راحت میں نہیں ہے
وہ کیسی اذیت ہے جو فرقت میں نہیں ہے

بسمل نے دم نزع ترے تیر کو چوما
بوسوں میں جو لذت ہے وہ شربت میں نہیں ہے

دیدار کی حسرت میں چلی جان حزیں تک
انجام سوا اس کے محبت میں نہیں ہے

ہم کیا کہیں بیداد و مصیبت کو کسی سے
جو ضبط میں لذت ہے شکایت میں نہیں ہے

مرتے ہیں اس امید میں دیکھیں گے تمہیں ہم
سنتے ہیں کوئی روک قیامت میں نہیں ہے

مٹی میں ملا کے جو بلایا سر محشر
لاشہ ترے بیمار کا تربت میں نہیں ہے

صدمے وہ اٹھائے کہ مٹے حوصلے دل کے
اگلی سی امنگ آہ طبیعت میں نہیں ہے

(۷۸)

جو سودائے محبت تھا وہی خضر طریقت ہے

شکست رنگ عارض باعث افشائے الفت ہے
سرشک چشم گویا بزم میں سر حقیقت ہے[529]

ہمارے ان کے نبھنے کی بھلا اب کون صورت ہے
انہیں شکوہ ہمارا ہے ہمیں ان کی شکایت ہے

فلک بیداد گر شورش زمین عشق سے پیدا
نہ تاب ضبط نالہ ہے نہ امید سماعت ہے

گل عارض کا بلبل ، شمع محفل کا ہوں پروانہ
اُدھر لطف فغاں دل کو اِدھر سوزش میں لذت ہے

جنون عشق کے صدقے مکاں سے لامکاں لایا
جو سودائے محبت تھا وہی خضر طریقت ہے[530]

---

529 ۔ سرشک: آنسو، قطرہ۔

530 ۔ خضر طریقت: رہبر، رہنما۔

یہ حسن خط و عارض عارضی احکام رکھتے ہیں
کبھی برق تپاں ہے اور کبھی گلزار جنت ہے

ستم پرور جفا جو سے کوئی اتنا تو پوچھ آئے
کسی کا دل دُکھانا فرض ہے واجب ہے سنت ہے

مری چھوڑی ہوئی بنت عنب تم کو ملی رندو
بڑی پیر مغاں نکلی یہی تو اس کی حرمت ہے

برنگ بو رہے آغوش گل میں آہ بچپن سے
مگر اب تو دل ناکام ہے یا خار حسرت ہے

پڑھو اے آہ پھر مطلع چلے اب دور مینائی[531]
ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے اچھی صحبت ہے

دیگر

شب فرقت کسی کی یاد آنی وجہ راحت ہے
تصور چہرۂ زیبا کا قرآں کی تلاوت ہے

فنا کے بعد بھی باقی نشان سوز الفت ہے
حرارت سے دل عاشق کی روشن شمع تربت ہے

---

[531] ۔دور مینائی: شراب کا دور۔

تمنا حور کی ہم کو نہ کچھ ارمان جنت ہے
جہاں دیدار ہو تیرا وہیں عاشق کو راحت ہے

ترے تیر نظر کو ہم جگہ دیتے ہیں آنکھوں میں
ہجوم یاس وارماں سے جو دل کی تنگ وسعت ہے

جنازہ پر ہمارے جمع ہیں کل مونس و ہمدم
اِدھر ہے بے کسی غم میں اُدھر ماتم میں حسرت ہے

حسیں دل مجھ سے مانگیں میں نہ دوں یہ ہو نہیں سکتا
ازل سے حامل ناز و ادا میری طبیعت ہے

ہماری آرزوئیں صَرف اعداء آپ کرتے ہیں
کسی کا مال اور کوئی مزے لوٹے-قیامت ہے

مرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے جب یہ سنا میں نے[532]
کہ وہ بت بزم دشمن میں برابر گرم صحبت ہے

جوانی کی خوشی پیری کا غم مرنے کی جانکاہی[533]
مری عمر دو روزہ کی فقط اتنی حقیقت ہے

---

532 -طوطے اڑنا: سخت بد حواس ہونا۔

533 -جانکاہی: محنت، مشقت، تکلیف۔

محبت اصل ایماں ہے نہ سمجھا ہم کو اے ناصح

ہم ارباب طریقت ہیں تو مامور شریعت ہے

کبھی ہم بھی وطن میں تھے بہت اچھے چمن میں تھے

نہ تھا کچھ غم خبر کیا تھی کہ آگے قید غربت ہے

خیالی صورتیں اچھی سے اچھی دیکھ لیتے ہیں

مگر ارمان جس کا ہے وہ کوئی اور صورت ہے

نظر کیا پھر گئی ان کی زمانہ پھر گیا ہم سے

جدا دل ہے جگر ہے جاں ہے چین و راحت ہے

مری جاں اب نہ رؤو آہ کو مرتا ہے مرنے دو

دعا سے یاد رکھنا آخری اتنی وصیت ہے

(۷۹)

نہ پائی گرد نالوں نے اثر کی

کسی کو کیا خبر درد جگر کی
تڑپ کر آہ ہم نے شب بسر کی

چھری کھاتے جو دزدیدہ نظر کی
نکلتی حسرتیں خستہ جگر کی

ہوئی صبح قیامت وصل کی شب
کشاکش میں نقاب رخ جو سر کی

اسیران قفس کو پوچھتا کون
خبر صیاد نے لی بال وپر کی

کرے گی صبح وصلت ذبح کیوں کر
تھکی ماندی ادا ہے رات بھر کی

نشیلی آنکھ مستانہ ادائیں
قیامت شوخیاں ترچھی نظر کی

کوئی بسمل کوئی گھائل پڑا ہے
خبر لیں دل کی یا اپنے جگر کی

چرالیں دل یہ دزدیدہ نگاہیں
مگر اچھی نہیں چوری نظر کی

تڑپتا ہی رہا بسمل ہمیشہ
پڑی تلوار اوچھی چارہ گر کی[534]

نگاہ ناز سے دیکھا ہمیں جب
اشاروں میں بلائیں لیں نظر کی

شب فرقت کی طولانی نہ پوچھو[535]
قیامت آہ ہمدم ہے سحر کی

---

534 ۔اوچھی: نامناسب، نازیبا، ٹیڑھی، ترچھی۔ ☆ چارہ گر: تدبیر کرنے والا، مشکل کو آسان کرنے والا۔

535 ۔طولانی: درازی۔

(۸۰)

آسماں تک شرر گئے ہوتے

تیر دل میں اتر گئے ہوتے
دیکھنے والے تر گئے ہوتے

تم اگر قبر پر گئے ہوتے
مرنے والے تو تر گئے ہوتے

مکتب عشق کا تقاضا تھا
وہ جدھر ہم اُدھر گئے ہوتے

توڑ کر تختہ ہم نکل آتے
تم اگر قبر پر گئے ہوتے

ضبط نالہ سے کام ہے ورنہ
آسماں تک شرر گئے ہوتے

ایک دو جام بھی اگر پیتے
شیخ صاحب سدھر گئے ہوتے

مرتے دم حسرتیں نکلتیں آہ
وہ جو آکر ٹھہر گئے ہوتے

(۸۱)

بہت غمناک میری داستاں ہے

نہ نالہ ہے نہ فریاد و فغاں ہے
زباں پر ایک لفظِ پی کہاں ہے

یہ دل پروانہ ہے وہ شمع جاں ہے
جلانے کو فقط لو درمیاں ہے

سرشک چشم ہے دل ناتواں ہے
شب فرقت مگر ضبط فغاں ہے

سنا ہے آج قاتل مہرباں ہے
سر مقتل ہمارا امتحاں ہے

نہ پوچھو تم مرے دل کا ٹھکانہ ہے
خدا جانے ستم دیدہ کہاں ہے

بتا قاصد انہیں کے ہیں یہ الفاظ
جھجک سے تو تری کچھ اور عیاں ہے

سکوں کیسا کہاں کا صبر دل کو

ترا لوٹا ہوا یہ خانماں ہے[536]

چلا جھرمٹ میں ارمانوں کے یہ دل

ترے کوچہ میں شاید امتحاں ہے

نہ پوچھیں راز حسن و عشق احباب

خموشی میں مری سب کا بیاں ہے

مرا دل ہو کہ تیرا تیر ہر ایک

علیٰ قدر مراتب خوں چکاں ہے

جلا ہوں حسن عالم سوز سے میں

مرا جو ذرہ ہے برق تپاں ہے

ارے تم جا، نہ ہو غماز میرا

سرشک چشم تو تو رازداں ہے

نکالیں حسرتیں کیا وصل کی شب

ادب مانع نزاکت پاسباں ہے

محبت نے مٹایا آہ ایسا

پتہ میرا نہ تربت کا نشاں ہے[537]

---

[536]۔ خانماں: گھر، مال و متاع۔

(۸۲)

کُن کی وسعت کو سمجھنا چاہئے

طاق ابرو کا اشارا چاہئے
بندگی میں سر جھکانا چاہئے

دل میں عاشق کے بھی آنا چاہئے
اپنے گھر میں بھی اجالا چاہئے

تیغ و خنجر دل پہ کھانا چاہئے
عاشقی کا لطف اٹھانا چاہئے

تُل گیا ہے تیغ ابرو کھینچ کر
آگئی کس کس کی دیکھا چاہئے

ہم ذبیح تیغ ابرو ہو چکے
مرغ بسمل سا تڑپنا چاہئے

ہو گئی دو حرف میں کل کائنات
کن کی وسعت کو سمجھنا چاہئے

جان دینی آہ کچھ مشکل نہیں
پیاری آنکھوں کا اشارا چاہئے

---

537 ۔بیاض میں اس غزل کے اوپر بھگونی لکھا ہوا ہے، غالباً بھگونی (نزد تاجپور ضلع سستی پور بہار) میں کسی طرحی مشاعرہ کے موقعہ پر یہ غزل کہی گئی۔

(۸۳)

قابل تعظیم ہے اٹھتی جوانی آپ کی

چڑھ رہی ہے اب جوانی پر جوانی آپ کی
ہے امنگوں پر مراد و کامرانی آپ کی

کیوں نہ ٹھہرے باعث شہرت جوانی آپ کی
ہو رہی ہیں کل ادائیں مست جانی آپ کی

مر گیا میں ہجر میں اور آپ آئے تک نہیں
دیکھ لی میں نے بھی حضرت مہربانی آپ کی

شوق کہتا ہے کہ چل اور دل یہ کہتا ہے کہ تھم
ہو گئی اس کشمکش میں پاسبانی آپ کی

پہلوئے عاشق میں جب وہ بت نہیں تو ناصحا
کیا کریں گے لے کے حوریں آسمانی آپ کی

آہ فرقت میں مریں اور آپ غیروں میں رہیں
واہ صاحب دیکھ لی الفت زبانی آپ کی

(۸۴)

دیکھو تو ہم اس ہجر میں کیا کیا نہ کریں گے

الفت کے کسی راز کو افشا نہ کریں گے
مر جائیں گے لیکن تمہیں رسوا نہ کریں گے

قائم ہیں اسی عہد پہ ہم روز ازل سے
اغیار کو تیرے کبھی چاہا نہ کریں گے

جس دل میں رہے درد فقط آپ کا اے جان
اس دل کی دوا آ کے مسیحا نہ کریں گے

منظور اگر قتل ہے کیوں دیر ہے صاحب
سر دینے میں ہم عذر ذرا سا نہ کریں گے

اغیار کا عشق آہ ہمیں ہو نہیں سکتا
ہم دل کو گذر گاہ بنایا نہ کریں گے

(۸۵)

ستم ہر رات ہوتے ہیں جفا ہر روز ہوتی ہے

امید زیست کیا دل میں تپش ہر روز ہوتی ہے
جو ہوتی ہے محبت کی بلا جاں سوز ہوتی ہے

کبھی بھولے سے مجھ کو خواب میں صورت جو دکھلائی
گلے مل مل کے دشمن سے معافی روز ہوتی ہے

ادا کی تیغ کھنچتی ہے ستم کے تیر چلتے ہیں
نگاہ قہر آلودہ بھی کیا دلدوز ہوتی ہے

بلایا بھی تو بزم غیر میں مجھ کو بلایا ہے
تلافی بھی ستم کی آہ کیا جاں سوز ہوتی ہے

نکل کر بیٹھ جانا ہے کرشمہ نارسائی کا
فغاں میری جو ہوتی ہے وہ غم اندوز ہوتی ہے

دبستان محبت کی سند رکھتا ہے دل میرا
یوں ہی کیا ہجر میں فریاد ادب آموز ہوتی ہے

غضب کی ٹیس ہوتی ہے ٹپک پڑتے ہیں آنسو بھی
یہ کس کی یاد فرقت میں مری دل سوز ہوتی ہے

جوانی کی امنگیں پیٹ کر سر رونے لگتی ہیں

بلائے یاد گیسو آ کے جب فیروز ہوتی ہے[538]

گرفتار محبت کا نہیں غمخوار ہے کوئی

مگر بے تابی دل ہی فقط دل سوز ہوتی ہے

جو دل ہی چوٹ کھا جائے تو آہ آنسو نہیں تھمتے

جو ہوتی ہے لگی دل کی وہ تسکیں سوز ہوتی ہے

---

538 ۔فیروز: ظفریاب، فتح مند، کامیاب۔

(۸۶)

ایسی پردرد آہ کس کی ہے

آج دل پر نگاہ کس کی ہے
یہ چھری بے پناہ کس کی ہے

مرحبا آفریں محبت کو
یاد شام و پگاہ کس کی ہے[539]

ٹکڑے ٹکڑے دل و جگر ہو نگے
سنبھلو سنبھلو یہ چاہ کس کی ہے

خون ناحق کیا ہے کس کس کا
چشم مے گوں گواہ کس کی ہے

میرے نالوں کو سن کے وہ بولے
ایسی پر درد آہ کس کی ہے

دیکھ کر خواب محو حیرت ہوں
شکل یہ حسب خواہ کس کی ہے

---

539 -پگاہ— صبح، سحر۔

ہائے بے چین رہتے ہو کیوں تم
سچ بتاؤ کہ چاہ کس کی ہے

رنگ لائی حنا قیامت میں
خون کس کا گواہ کس کی ہے

دشت غربت میں کیوں پڑے ہو آہ
بڑھ کے دیکھو وہ راہ کس کی ہے

(۸۷)

دل کے شرارے نہ گئے

آہ ہم قید کے مارے نہ گئے
ولولے دل کے ہمارے نہ گئے

یہ شباب اور غضب کی شوخی
اب بھی بچپن کے طرارے نہ گئے[540]

اے فلک تجھ کو جلادیتے ہم
کیا کہیں دل کے شرارے نہ گئے

ٹکٹکی باندھ کے دیکھا ہم کو
ہجر کی شب یہ ستارے نہ گئے

کرلیا وصل کا وعدہ لیکن
غیر سے ان کے اشارے نہ گئے

اشک سے بہہ گیا عالم سارا
تیرے کوچے میں یہ دھارے نہ گئے

کر دیا نذر دل وجاں لیکن
ناروا جور تمہارے نہ گئے

---

540 ۔طرارہ: چوکڑی، جست، چلبلا پن، چھلانگ۔

یہ بھی تقدیر کی خوبی ہے آہ

ان کے کوچہ سے گذارے نہ گئے

(۸۸)

ہائے اک نا آشنا کے آشنا ہم ہوگئے

کیا کہیں ہم کیوں گرفتار بلا ہم ہوگئے

خط و گیسو میں الجھ کر نارسا ہم ہوگئے

کچھ نہ دیکھا کچھ نہ سمجھے مبتلا ہم ہوگئے

ہائے اک نا آشنا کے آشنا ہم ہوگئے

پاک تھے عقل ہیولانی سے تو تھے عقل کل

کیا عجب جو شاہد قالوا بلیٰ ہم ہوگئے[541]

---

541 - عقل ہیولانی: ہیولی یونانی زبان میں ہر چیز کے مادہ اور اصل کو کہتے ہیں، اور فلاسفہ کے یہاں ہیولی عقل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ہیولائے اول ان کے نزدیک جوہر اول اور عقل اول کو کہتے ہیں، ان کے خیال میں کائنات کی اصل عقول عشرہ ہیں جن کو رب کائنات نے بالترتیب سب سے پہلے پیدا فرمایا۔۔۔

عقل ہیولانی: سے مراد معقولات کے فہم وادراک کی بالکل ابتدائی درجہ کی صلاحیت جس میں انسان قوت عمل سے محروم ہو، جیسا کہ عہد طفولیت میں ہوتا ہے، جہاں صرف تصور ہی تصور ہوتا ہے تصدیق اور عمل کا کوئی خاکہ موجود نہیں ہوتا (التعریفات ص ۴۹ ج ۱ المؤلف : علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني (المتوفى : 816ھ)۔۔۔۔اس منزل سے پہلے انسان ہر تمیز واختیار سے ماوراء ہوتا ہے، اور بے اختیار اپنے خالق کی مرضی کا پابند ہوتا ہے، بظاہر عقل وفہم سے محروم لیکن سراپا اطاعت ہونا ہی بندہ کی اصل فطرت اور سب سے بڑی دانشمندی ہے، اور اسی کی بدولت انسان رب کائنات کی زیارت کا متحمل ہوا اور قالوا بلی کا مشاہد بنا، ورنہ کیا معلوم مادی عقل کی آمیزش کے بعد (خدا نخواستہ) انکار کی جسارت کر بیٹھتا۔۔۔

جل گیا سوز دروں سے جب حجاب آرزو
پردہ دار عشق بے چون وچرا ہم ہو گئے

عرض وجوہر سے مبرا ہیں منزہ جنس سے
مٹ گیا داغ تشخص باصفا ہم ہو گئے

ٹکٹکی باندھے رہے ہم حسرت دیدار میں
جان دے کر دیدۂ عبرت نما ہم ہو گئے

کیا اشارہ ہو ہماری ہستی موہوم پر
انگلیاں کیوں کر اٹھیں جب باخدا ہم ہو گئے

خاک ہو کر ہم سیہ کاروں کا ہوتا ہے عروج
سرمہ سا پس کر نگاہوں تک رسا ہم ہو گئے

بلبل باغ قدم پروانۂ شمع جمال
ضبط نالہ، سوز دل سے کیا سے کیا ہم ہو گئے

نیز اس شعر میں یہ معنیٰ بھی پوشیدہ ہے کہ جب تک انسان اپنی اصل سے باخبر نہ ہو اپنے بارے میں خوش گمان ہوتا ہے، لیکن پردۂ حقیقت کھلنے کے بعد ساری خوش فہمیاں ہوا ہو جاتی ہیں، انسان اگر عہد الست کا خیال کرے تو اپنے کو حد درجہ پابند سلاسل محسوس کرے گا، اور اس تصور سے غافل ہو جائے تو خواہشات نفس کا اسیر بن کر رہ جائے گا۔۔۔

اس شعر میں عشق کی معنویت کی طرف بھی اشارہ ہے، معروف تصور کے مطابق روز الست میں ہر جوڑے کو ساتھ کھڑا کیا گیا تھا، عجب نہیں ہمارا عشق یوم الست میں شرکت کی علامت ہو، اور عشق ایسی بلائے بے درماں ہے، کہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد بڑی سے بڑی عقل وذہانت بھی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔

قید تنہائی ہمارے حق میں اچھی ہوگئی
خلوت توحید میں سب سے جدا ہم ہوگئے

جب شراب بے خودی ہم سیر ہو کر پی چکے
سالک راہ ہدیٰ کے پیشوا ہم ہوگئے

تھے وجود رابطی سے بھی ضعیف اے آہ ہم[542]
حامل بار امانت کیوں بھلا ہم ہوگئے

---

542 -وجود رابطی: فلاسفہ کی اصطلاح میں دو چیزوں کے درمیان ایسا وجودی رشتہ جو محض دونوں کے درمیان رابطے کا کام دے لیکن اس کا اپنا کوئی مستقل مفہوم نہ ہو، وجود رابطی کہلاتا ہے، یہ وجود کا سب سے کمزور درجہ ہے:

والثاني وجوده لغيره بان يكون رابطأبين الموضوع والمحمول وغير مستقل بالمفهومية ويسمىٰ وجوداً رابطياً

(موسوعہ کشاف اصطلاحات الفنون ج ۲ ص ۱۷۷۰ علامہ محمد اعلی تھانویؒ ط مکتبہ لبنان بیروت ۱۹۹۶ء)

صوفیا اور اہل معرفت کے نزدیک انسانی وجود محض وجود باری کی معرفت کا ذریعہ ہے، وجود باری کے انکشاف کے بعد وجود انسانی کالعدم ہو جاتا ہے، اسی کو بعض صوفیاء وحدۃ الوجود سے بھی تعبیر کرتے ہیں، مشہور صوفی بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے: علم توحید وجود الٰہی کے ماسوا ہر وجود کی نفی کرتا ہے۔

(التعريفات ص ٨٣ ج ١ المؤلف : علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني (المتوفى : 816هـ)

غرض انسانی وجود انتہائی کمزور ہے جس کو صحیح معنیٰ میں وجود کہنا بھی مشکل ہے، جس کے ہر سمت میں فنا ہی فنا ہے، اس قدر کمزور وجود کو بار امانت کی ذمہ داری دینا اللہ پاک کا کتنا بڑا انعام ہے۔

(۸۹)

کیا تم لب اعجاز مسیحا نہیں رکھتے

کیا تم لب اعجاز مسیحا نہیں رکھتے

اس دور میں ہم طبع شگفتہ نہیں رکھتے
پامال حوادث ہیں کہ دنیا نہیں رکھتے

بسمل تری بیداد کا شکوہ نہیں رکھتے
مر کر بھی کبھی خون کا دعوا نہیں رکھتے

پہلو میں جو ہم درد تمہارا نہیں رکھتے
جینے کا شب ہجر سہارا نہیں رکھتے

مرنے کی تمنا ہے نہ جینے کی ہوس ہے
ممکن کے لوازم تو ہم اصلا نہیں رکھتے

جلوہ وہ قیامت کا دکھایا ہے کسی نے
جو پردہ نشیں تھے وہ بھی پردہ نہیں رکھتے

وہ درد ہے پہلو میں وہ سوزش ہے جگر میں
دنیا میں دوا جس کی اطبا نہیں رکھتے

وہ زلف جو ہے یاد ہمیں شام ازل کی

ہم سر میں کسی غیر کا سودا نہیں رکھتے

کیوں چھیڑ ہے زخموں سے مرے نوک مژہ کو[543]

جب مرہم زنگار کا پھایا نہیں رکھتے

منزل گہہ مقصود بہت دور ہے لیکن

اس رہ کے مسافر کوئی خطرا نہیں رکھتے

جب سے دل پر شوق ہے پامال تصور

آنکھوں میں بھی ہم غیر کا جلوا نہیں رکھتے

اسلام کے پابند ہیں آزاد جہاں میں

بت خانہ نہیں رکھتے کلیسا نہیں رکھتے

سرشار کیا جام محبت نے کسی کے

اب ہم طلب ساغر و مینا نہیں رکھتے

کھلتے نہیں اسرار محبت کے تمہاری

ہمراز تمہارے لب گویا نہیں رکھتے

کانٹوں کی تواضع کو ہیں پانی کے پیالے

ہم دشت نورد آبلۂ پا نہیں رکھتے

جس دل میں فقط درد ہوا ے آہ کسی کا

543 ۔مژہ: پلک۔

اس دل کی دوا حضرت عیسیٰ نہیں رکھتے

(۹۰)

جلتی ہے قضا دوڑی مسیحا کو بلانے

آتے ہو شب وعدہ فقط ہم کو ستانے
اغیار کی تصویر جو لاتے ہو دکھانے

کہتا ہے مرا حال جو کوئی کبھی ان سے
کہتے ہیں سنے ہم نے بہت ایسے فسانے

اک وصل میں سو بار مزے موت کے آئے
مارا کبھی شوخی نے کبھی ان کی حیا نے

آئے ہو عیادت کو تو کیوں کوس رہے ہو
یٰسین پڑھو بیٹھ کے میت کے سرہانے

اک ٹیس ہوا کرتی ہے راتوں کو جگر میں
اک یاد چلی آتی ہے سوتے کو جگانے

آنسو نہ تھمے ہائے شب ہجر ہمارے
سونے نہ دیا آہ نے نالے نے بکانے

اغیار سے ملنے کی تو سو راہ نکالی
ظالم نے ہمیں ٹال دیا کر کے بہانے

جاتا تو ہے قاصد لئے پیغام وفا کا
دیکھیں وہ جفاکار بھی مانے کہ نہ مانے

فرمان دیا عشق کا ہر فرد نے ہم کو
استاد نے مرشد نے پیمبر نے خدا نے

سنتے ہیں وہ فریاد و فغاں کان لگا کر
اتنا تو دکھایا ہے اثر میری دعا نے

شیرازۂ دل آہ مرا یوں بکھر گیا
جیسے کہ ہوں بکھرے ہوئے تسبیح کے دانے

(۹۱)

رفتہ رفتہ تری رفتار قیامت ہوگی

جس کو اس شوخ ستمگر سے محبت ہو گی
ہجر کا رنگ قیامت کی مصیبت ہو گی

آہؔ غمگین پہ جب اللہ کی رحمت ہو گی
خود بخود پہلو میں وہ چاند سی صورت ہو گی

اپنے وعدہ سے مکرنا نہیں اچھا صاحب
ایسی باتوں سے تمہیں جھوٹ کی عادت ہو گی

وہ نہ آئے تو نہ آئیں عیادت کو میری
ہاں یہی نا دل رنجور کو حسرت ہو گی

جو لگائی ہے رقیبوں نے اسے کہہ ڈالو
دور ہو جائے گی جو دل میں کدورت ہو گی

آہؔ کو حشر میں کافی ہے سہارا ان کا
ساری امت کے لیے جن کی شفاعت ہو گی

(۱۹۱۶ء میں یہ کلام بزم سخن میں شائع ہوا)

(۹۲)

حور کے دامن میں چھانی جائے گی

جب خوشامد سے نہ مانی جائے گی

دوسری تدبیر ٹھانی جائے گی

مر مٹوں کو کیا مٹائے گا فلک

حشر تک ان کی کہانی جائے گی

بت چلے جاتے ہیں کعبہ کی طرف

آج منت کس کی مانی جائے گی

حسن پر اتنا غرور اچھا نہیں

چار دن میں یہ جوانی جائے گی

دست قاتل میں دکھائے گی بہار

خون میں مہندی جو سانی جائے گی

سن کے فرقت کی مصیبت یہ کہا

قبر تک یہ نوحہ خوانی جائے گی

ضعف کا میرے نہیں ممکن علاج

جان لے کر ناتوانی جائے گی

آہ فکر آخرت اب چاہیئے
رائگاں ورنہ جوانی جائے گی (یہ کلام بھی شائع شدہ ہے)

(۹۴)

خداوند عالم کی عنایت پر نظر رکھے

رہ الفت میں لازم ہے قدم کو سوچ کر رکھے
یہ وادی پر خطر ہے اس میں ہیں لاکھوں ضرر رکھے

اٹھا دیں دشمنوں کو ہم کو پہلو میں بٹھالیں وہ
شب فرقت ہماری آہ گر کچھ بھی اثر رکھے

لگائی عشق نے وہ آگ جس سے جل گیا عالم
کہیں ممکن ہے یہ سوزش بھلا کوئی شرر رکھے

برستے ہیں ترے تیر نگہ لاکھوں میں حیراں ہوں
اکیلا دل جو رکھے تو کہاں رکھے کدھر رکھے

اٹھادے پردۂ پندار پی لے جام وحدت کا
ذرا آ دیکھ کیا کیا اس میں ہیں لعل و گہر رکھے

رقیبوں کو تمہارے عشق کا دعویٰ تو ہے لیکن
کہاں ہے وہ جو آہ نارسا کا سا جگر رکھے

(۹۴)

اک سکوں ہوتا ہے جب درد جگر ہوتا ہے

آہ و نالے کا ہمارے یہ اثر ہوتا ہے
آگ لگتی ہے ہر اک زیر و زبر ہوتا ہے

ناوک ناز کا تیرے یہی گھر ہوتا ہے
میرا دل ہوتا ہے یا میرا جگر ہوتا ہے

آنکھ کی خیر منائیں کہ خبر لیں دل کی
دور خا آپ کا ہر تیر نظر ہوتا ہے

خوگر درد کو بے درد نہیں آتا چین
اک سکوں ہوتا ہے جب درد جگر ہوتا ہے

مہر طلعت کی وفا میں ہے ستم بھی شامل[544]
رات کو آتا ہے تو شور سحر ہوتا ہے

ادب آموز محبت ہیں ہماری آنکھیں
فرش ہوتی ہیں مقابل وہ اگر ہوتا ہے

غیر کی یاد جو کرتا ہوں کبھی بھولے سے
جلوۂ یار مرے پیش نظر ہوتا ہے

---

544 ۔مہر طلعت: حسین خوبصورت، سورج جیسی شکل والا، محبوب و معشوق۔

یاد میں اس کی نکلتا ہے جو خونابہ دل[545]

قطرۂ اشک مرا لعل و گہر ہوتا ہے

خاک ہونے کا محبت سے ملا پروانہ

تیرا دیوانہ بس اب خاک بسر ہوتا ہے

چونک کر پوچھتے ہیں باعث شیون میرا

رائگاں نالے نہیں ہوتے اثر ہوتا ہے

لاابالی ہے ازل سے ہی طبیعت میری

جو حسیں ہوتا ہے منظور نظر ہوتا ہے

جذب کامل ہے تو رہتی ہے حضوری ہر دم

ربط والوں کے وہ خود پیش نظر ہوتا ہے

چاہتا ہوں کہ رکھوں دل میں ترا تیر نظر

کیا کروں آہ یہی سینہ سپر ہوتا ہے

---

[545] خونابہ: خالص خون۔

(۹۵)

بیقراری بیکلی عالی ہوئی ہے

کرم کر تری شان عالی ہوئی ہے

مری اب بہت خستہ حالی ہوئی ہے

مرے دل کی جب پائمالی ہوئی ہے

کفِ پائے جاناں میں لالی ہوئی ہے

اُدھر شکل زیبا نرالی ہوئی ہے

طبیعت اِدھر لا ابالی ہوئی ہے

جھکی جس طرف ہو گئے لاکھوں بسمل

نظر تیری فوجِ کمالی ہوئی ہے

تری عینِ حکمت کو دیکھا ہے ہم نے

طبیعت تھی رازی غزالی ہوئی ہے[546]

---

[546] -☆رازی: امام فخر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عمر الرازیؒ (ولادت: ۵۴۴ھ م ۱۱۵۰ء — وفات: ۶۰۶ھ م ۱۲۱۰ء) امام رازیؒ گو کہ ہر فن میں ید طولیٰ حاصل تھا، چنانچہ تفسیر، حدیث، اصول فقہ، علم کلام مختلف فنون میں آپ کی بے نظیر تصنیفات موجود ہیں، لیکن ان پر عقلیات کا غلبہ تھا، جن کی جھلک ان کی تصانیف میں واضح طور پر موجود ہے۔

☆غزالی: حجۃ الاسلام ابو حامد امام محمد بن محمد الغزالیؒ (ولادت: ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء — وفات: ۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء) امام غزالیؒ کا رجحان پہلے فلاسفہ کی طرف تھا لیکن بعد میں تصوف و علم الاخلاق کے امام ہوئے، اور فلاسفہ کے رد میں تہافت الفلاسفہ اور مقاصد الفلاسفہ جیسی اہم کتابیں تحریر فرمائیں۔۔۔

قیامت سے پہلے اسے دیکھتے ہیں
مقدم مقدم پہ تالی ہوئی ہے[547]

کوئی ماہرو بے نقاب آ گیا کیا
اندھیری جو تھی رات اجالی ہوئی ہے

گیا تھا یہ دل ان کو مہندی لگانے
اسی چال سے پائمالی ہوئی ہے

ستاتی ہے مجھ کو یہ آکر ہمیشہ
شب ہجران کی جگالی ہوئی ہے[548]

ازل میں جو صورت کہ دیکھی تھی ہم نے
وہی آج دل میں خیالی ہوئی ہے

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ان کی طبیعت پر پہلے رازی یعنی تعقل پسندی کا غلبہ تھا لیکن اب غزالی یعنی تصوف وروحانیت اور علم الاخلاق کے وہ اسیر ہو چکے ہیں۔

547 ۔مقدم وتالی: منطق کی اصطلاح میں جن مقدمات کی ترکیب سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں ان میں مقدمۂ اول کو مقدم اور دوسرے کو تالی کہتے ہیں، شاعر حیران ہے کہ قیامت تو محبوب کی آمد سے برپا ہوتی ہے، یہاں قیامت سے قبل ہی ان کی آمد مقدم وتالی کے اصول کے خلاف ہے۔۔۔۔۔۔اس اصطلاح کے استعمال سے شعر کافی معنیٰ خیز ہو گیا ہے: محبوب کا سراپا قیامت خیز بھی ہے، زندگی میں اس سے وصل کی امید بھی نہیں ہے، قیامت کے دن ہی شاید اس کی زیارت ہو سکے ، پھر اچانک اس کی حیرت انگیز عنایت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

548 ۔جگالی: جانوروں کا اپنے معدے سے چارہ کو منہ میں نکال کر دوبارہ چبانا۔

امارت سے مجھ کو سروکار ہے کیا

طبیعت ہی غربت کی پالی ہوئی ہے

کہاں جاتی آکر رہی میرے گھر میں

شب غم عدو کی نکالی ہوئی ہے

نہ لو آہ سے لن ترانی کی ہرگز[549]

تمہاری ادا دیکھی بھالی ہوئی ہے

549 ۔لن ترانی: خودستائی، شیخی، تعلی، ڈینگ بازی، اس میں اگلے مصرعہ "تمہاری ادا دیکھی بھالی ہوئی ہے" سے لن ترانی کی معنویت اور بڑھ گئی ہے۔

(۹۶)

عشق کیا ہے موت کا پیغام ہے

شہرۂ حسن و محبت عام ہے
اک ہمارا اور تمہارا نام ہے

یہ کسی کے عشق کا انجام ہے
دور ہم سے چین ہے آرام ہے

چاہ دل میں لب پہ تیرا نام ہے
دیر و کعبہ سے ہمیں کیا کام ہے

ساقیا آ جا کہ وقت شام ہے
میکدہ ہے دخت زر ہے جام ہے

اب نگاہ لطف ہو یا قہر ہو
ہم کو تو بس بندگی سے کام ہے

کیوں نہ فرقت میں مزے آئیں ہمیں
دل ہمارا خوگر آلام ہے

دل کے بدلے سینکڑوں غم مل گئے
لوگ کہتے تھے برا انجام ہے

مصحف رخسار پر زلفیں نہیں

کفر کے نیچے چھپا اسلام ہے

منہ لگایا خود جناب شیخ نے

دختر زر تو مفت میں بدنام ہے

اک پیالے میں کھلی کل کائنات

جام جم سے بڑھ کے مے کا جام ہے

جب جبیں دیکھیں تو زلفیں دیکھ لیں

صبح کے کچھ بعد ہی تو شام ہے

ہم ازل سے جس کے متوالے بنے

وہ نگاہ مست مے آشام ہے

فال نکلی خط و عارض دیکھ کر

کفر میں گھیرا ہوا اسلام ہے

مصحف رخ صید گاہ دل ہوا

خال کا دانہ ہے خط کا دام ہے[550]

کون ہوتا واقف اسرار عشق

یہ سرشک چشم ہی نمام ہے[551]

---

550 ۔خال: تل۔ خط: مرد کے چہرہ پر نیا نکلنے والا سبزہ۔

ہو چکا تم پر ازل میں جو نثار
وہ یہی آہ حزیں گمنام ہیں

---

551 ۔نمام: چغل خور، مخبر۔

(۹۷)

تمہاری یگانگی بے سبب معلوم ہوتی ہے

تہ کاکل جبین یار جب معلوم ہوتی ہے[552]

حبش کے سایہ میں شکل حلب معلوم ہوتی ہے[553]

ازل سے ایک صورت منتخب معلوم ہوتی ہے

کہ جس کی دیر وکعبہ میں طلب معلوم ہوتی ہے

زمانہ اس پہ شیدا عالم اس کا ہو گیا بسمل

ادا بانکی کڑی چتون غضب معلوم ہوتی ہے

کسی کے سامنے رہتا ہے نقشہ یاس وحسرت کا

کسی کی صورت عیش وطرب معلوم ہوتی ہے

کوئی آئینہ ہے یا جام جم یا شیشۂ دل ہے

کہ اس میں صورت چین وعرب معلوم ہوتی ہے

---

552 ۔کاکل: سر کے آگے بڑے بڑے لٹکے ہوئے بال، زلف، گیسو، لٹ۔☆ جبین: پیشانی۔

553 ۔حبش: افریقہ کا ایک ملک، ایتھوپیا، یہاں کے لوگوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔☆ حلب: ملک شام کا مشہور اور مبارک شہر ، کہتے ہیں کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام دودھ دوہ کر غریبوں میں تقسیم فرماتے تھے، اسی لئے یہ حلب کے نام سے مشہور ہو گیا، اس خطہ کے لوگ انتہائی خوبصورت اور صحت مند ہوتے ہیں (معجم البلدان ج ۲ ص ۱۰۱ المؤلف : شهاب الدين أبو عبد الله ياقوت بن عبد الله الحموي (المتوفى : 626هـ)

لپٹ کر دست وپا سے کر دیا بے دست وپا ان کو

یہ بازاری حنا تو بے ادب معلوم ہوتی ہے

کسی کی زلف کا سودا ہوا ہے جان کا گاہک

بڑی الجھن ہمیں فرقت کی شب معلوم ہوتی ہے

تمہاری نذر سب کچھ کر چکے جب تنگدستی میں

بڑی وسعت ہمارے دل میں اب معلوم ہوتی ہے

حسینوں سے محبت فرض وواجب ہم نہیں کہتے

جوانی میں مگر ہاں مستحب معلوم ہوتی ہے

ترے کوچے میں جا بیٹھیں نکلنا سخت مشکل ہے

یہ حسرت بھی زمیں بوس ادب معلوم ہوتی ہے

جناب شیخ کو بھی کر لیا ہے اپنا دیوانہ

پرانی بد چلن بنت عنب معلوم ہوتی ہے

نظارہ اس کے رخ کا چاہتے ہو آہ گھر بیٹھے

قیامت کی تمہاری یہ طلب معلوم ہوتی ہے

(۹۸)

ہم سر حشر تماشا کرتے

تم لب بام نہ آیا کرتے
سارے عالم کو نہ شیدا کرتے

وا جو آغوش تمنا کرتے
ان کو پہلو ہی میں دیکھا کرتے

دیکھ کر ان کو نہ شکوا کرتے
ہم سر حشر تماشا کرتے

تم تو وعدہ نہیں ایفا کرتے
پھر بھلا حوصلہ ہے کیا کرتے

دل کے ارماں چھپائے نہ گئے
ورنہ تم اور مجھے رسوا کرتے

تیغ ابرو کے دکھادو جوہر
یوں تو بسمل نہیں تڑپا کرتے

خود سنبھلتے کہ بچاتے دل کو
ہدف تیر تھے کیا کیا کرتے

حشر میں بھی نہ ملا وہ قاتل

کس پہ ہم خون کا دعوا کرتے

اپنے دل میں جو پاتے ہم

دیر و کعبہ میں نہ ڈھونڈھا کرتے

جذب دل کھینچ کے لائے گا انہیں

خود نہیں آتے تو اچھا کرتے

خود غرض کاش نہ ہوتے یہ حسیں

چاہنے والوں کو چاہا کرتے

ہوتی قسمت جو ہماری اچھی

وہ ہمیں ہم انہیں دیکھا کرتے

کون سی بات تھی آتے جاتے

اپنے بیمار کو اچھا کرتے

تم جو قاتل ہو تو بسمل ہیں ہم

کیوں نہیں کام قضا کا کرتے

وعدۂ وصل سے انکار نہ کر

جھوٹ قسمیں نہیں کھایا کرتے

ان کی تصویر جو مل جاتی آہ

ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کرتے

(۹۹)

نظر بند محبت ہے اسیر دام کاکل ہے

شب فرقت جو عاشق کو خیال زلف و کاکل ہے
فغاں ہے آہ ہے نالے ہیں اشکوں کا تسلسل ہے

گلوں میں رنگ باقی ہے نہ اب فریاد بلبل ہے
تمہارے حسن کا شہرہ ہمارے عشق کا غل ہے

خیال گیسو و افشاں میں کچھ ایسا توغل ہے[554]
کہ قطروں سے مرے آنسو کے تازہ برگ سنبل ہے

ہوئیں مخمور آنکھیں نشۂ الفت سے جب میری
نہ شوق جام و ساغر ہے نہ ارمان گل و مل ہے[555]

ستم کا جور کا بیداد کا شکوہ نہیں کرتے
ہماری یہ خموشی ہے ہمارا یہ تحمل ہے

جوانی آ دھمک پہونچی لڑکپن ہو چلا رخصت
مزاج یار بگڑا ہے زمانے کا تداخل ہے

---

554 ۔توغل: لگن اور دھن

555 ۔مل: شراب

ہوا ہوں مست و بے خود میں کسی کی یاد میں ایسا

مؤذن کی صدا کانوں میں میرے شور قلقل ہے[556]

پڑے ہیں حلقہائے زلف جو پائے تصور میں

خیال اغیار کا مستلزم دور و تسلسل ہے[557]

مری تربت پہ افسردہ دلی کا دیکھ لو نقشہ

کہ جتنے پھول ہیں مرجھائے ہیں جو شمع ہے گل ہے

نہ مخبر ہے نہ شاہد ہے کراما کاتبیں کوئی[558]

تو کیوں کر مان لیں ہم جو لکھا ہے راست بالکل ہے

ازل سے آشنا ہوں اور کہو نا آشنا مجھ کو

غضب کا یہ تغافل ہے قیامت کا تجاہل ہے

---

556 ۔ قلقل: صراحی یا بوتل سے پانی یا شراب نکلنے کی آواز۔

557 ۔عام اصطلاح میں دور و تسلسل کے معنٰی کسی چیز کے بار بار پیش آنے کے ہیں، جو مذموم نہیں محمود ہے مثلاً شراب کا دور چلنا، کسی سبق کو بار بار پڑھنا وغیرہ، مگر یہاں دور و تسلسل منطقی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے جو کسی چیز کو نا ممکن بتانے کے لئے بولا جاتا ہے، منطق کی اصطلاح میں اگر کسی دلیل میں دور یا تسلسل پیدا ہو جائے تو دلیل باطل قرار پاتی ہے، اگر دعوٰی کے ثبوت کے لئے ایسی دلیل دی جائے جس کا کوئی ایک جزو بھی خود دعوٰی کے ثبوت پر موقوف ہو تو یہ دور ہے اور اگر ہر دلیل کسی دوسری دلیل کی محتاج ہو اور سلسلہ لامتناہی ہو تو یہ تسلسل ہے اور منطق کی اصطلاح میں یہ دونوں ناقابل قبول اور ناممکن ہیں، شاعر کا مقصد یہ ہے کہ جب خیال محبوب کی زنجیر ایک بار پاؤں میں پڑ چکی اب کسی اور کا خیال آنا ناممکن ہے، صاحب کلام کو چونکہ علوم نقلیہ و عقلیہ پر بڑی دسترس حاصل تھی اس لئے وہ ان فنون کی مدد سے اپنی شاعری کی معنویت میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

558 ۔کراماکاتبین: انسانی اعمال کا ریکارڈ تیار کرنے والے فرشتے۔

کسی کی یاد میں اے آہ یہ عقدہ کھلا مجھ پر
کہ مانع وصل سے حسرت ہے ارماں ہے تغافل ہے

(۱۰۰)

مریض عشق پہ رحمت خدا کی

کھنچی تلوار اس کافر ادا کی
الٰہی خیر جان مبتلا کی

ترا دیوانہ کہلایا تپا کی
جدھر نکلا اُدھر انگلی اٹھا کی

اڑا لائی ہے بو زلف دوتا کی[559]
بلائیں کیوں نہ لیتے ہم صبا کی

نمود خط سے جانکاہی ہوئی کم
بڑھا کی رات اور حسرت گھٹا کی

جو لیتے ہو تو پہلو میں جگہ دو
یہ قیمت ہے دل درد آشنا کی

کسی پر جان دے کے زیست پائی
جو صورت تھی فنا کی ہے بقا کی

شہید تیغ ابرو ہو چکے ہم
ہمیں حاجت نہیں قبلہ نما کی

---

559 -زلف دوتا: زلف کا وہ حصہ جو سر سے باہر جھانک رہا ہو، جس میں بلا کی کاٹ ہو اور حسن مستور کا غماز ہو۔

بھری ہے اس میں بوئے عشق کیا کیا
مرا دل اک کلی ہے موتیا کی

مرا دل کر دیا برباد لے کر
ستم پیشہ جفا جو نے دغا کی

نکلتی وصل میں حسرت بھلا کیا
رہی شب بھر نگہبانی حیا کی

ہمارے درد کو وہ جھوٹ سمجھے
ہمیں رسوا کیا کہہ کر تپا کی

جنوں افزا ہے بالوں کی سفیدی
گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

نہ ہو عاشق کو جب دیدار تیرا
حقیقت کچھ نہیں روز جزا کی

تڑپ کر رہ گیا اے آہ کوئی
نگاہ یار نے شاید خطا کی

(۱۰۱)

حسن سے سوا حضور یہ تعزیر ہوگئی

میرے خلاف جب مری تقدیر ہوگئی
الٹی ہر اک وصل کی تدبیر ہوگئی

دل میں بتوں کے عشق کی تعمیر ہوگئی
آنکھوں میں نقش کفر کی تصویر ہوگئی

مانا کہ عشق میں مری تشہیر ہوگئی
لیکن اسی سے حسن کی توقیر ہوگئی

سودا ہوا جو زلف کی تاثیر ہوگئی
دیوانگی کی پاؤں میں زنجیر ہوگئی

ہوتا کمال عشق تو مٹ جاتے سامنے
جیتے رہے فراق میں تقصیر ہوگئی

آیا خیال جب کبھی راز و نیاز کا
آنکھوں کے سامنے تری تصویر ہوگئی

کھینچا انہیں تو اور بھی مجھ سے وہ کھنچ گئے
الٹی ہماری وصل کی تدبیر ہوگئی

دیکھے مگر کسی سے کبھی کچھ نہ کہہ سکے
گونگے کے خواب کی یہی تعبیر ہوگئی

خالی گیا نہ وار کبھی تیغ ناز کا
عشرت کی رات موت کی تصویر ہوگئی

سمجھے گا کوئی خاک حسینوں کا مدعا
جب بات ان کی جادوئی تقریر ہوگئی

بے تابیوں کو میری نہ سمجھے گا بوالہوس
سیماب و برق سے مری تعمیر ہوگئی[560]

عاشق کو جرم عشق میں کیوں قتل کردیا
حد سے سوا حضور یہ تعزیر ہوگئی

آیا جو خط تو سینہ ہوا آہ چاک چاک
تحریر ان کی صورت شمشیر ہوگئی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

560 ۔سیماب: پارہ۔
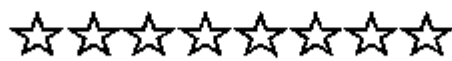
اس کتاب میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے

(۱)القرآن الکریم

(۲)ترجمہ شیخ الہندؒ

حدیث وشروح حدیث

(۳) الجامع الصحيح سنن الترمذي،المؤلف:محمد بن عيسى أبو عيسى الترمذي السلمي الناشر : دار إحياء التراث العربي– بيروت تحقيق :أحمد محمد شاكر وآخرون عدد الأجزاء : 5

(۴)مسند الإمام أحمد بن حنبل،المؤلف:أبوعبدالله أحمدبن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفى : 241هـ)المحقق:شعيب الأرنؤوط–عادل مرشد ، وآخرون إشراف:دعبد الله بن عبدالمحسن التركي الناشر:مؤسسةالرسالة الطبعة: الأولى ،1421 هـ – 2001 م .

(۵) المصنف- المؤلف : أبو بكر بن أبي شيبة،عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (المتوفى : 235هـ)

(۶) السنن الكبرى،المؤلف : أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (المتوفى : 303هـ)

(۷)المعجم الكبير،المؤلف : سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطيراللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (المتوفى : 360هـ)

(۸)جامع الأصول في أحاديث الرسول،المؤلف : مجد الدين أبو السعادات المبارك بن محمد الجزري ابن الأثير (المتوفى : 606هـ)تحقيق :عبد

القادرالأرنؤوط الناشر : مكتبة الحلواني – مطبعة الملاح– مكتبة دار البيان الطبعة الأولى.

(٩) جامع بيان العلم وفضله لابن عبدالبر .

(١٠) إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة المؤلف : أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل البوصيري المُتَوَفَّى هجرية.

(١١) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد،المؤلف:نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي (المتوفى : 807هـ)الناشر:دار الفكر، بيروت – 1412 هـ عدد الأجزاء : 10

(١٢)البدر المنير في تخريج الأحاديث والأثار الواقعة في الشرح الكبير ،المؤلف : ابن الملقن سراج الدين أبو حفص عمر بن علي بن أحمد الشافعي المصري (المتوفى : 804هـ)المحقق : مصطفى أبو الغيط و عبدالله بن سليمان وياسر بن كمال الناشر : دار الهجرة للنشر والتوزيع – الرياض–السعوديةالطبعة : الاولى ، 1425هـ–2004م عدد الأجزاء : 9

(١٣)فتح الباري بشرح صحيح البخاري مصدر الكتاب : موقع الإسلام المؤلف : أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلاني (المتوفى : 852هـ)

(١٤)مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح المؤلف : الملا علي القاري ، علي بن سلطان محمد (المتوفى : 1014هـ)المصدر : موقع المشكاة الإسلامية.

فقہ وفتاویٰ

(١٥)الاختيار لتعليل المختارالمؤلف : عبد الله بن محمود بن مودود

الموصلي الحنفي دار النشر : دار الكتب العلمية – بيروت / لبنان – 1426 هـــ – 2005 م الطبعة : الثالثة تحقيق : عبد اللطيف محمد عبد الرحمن عدد الأجزاء / 5 .

(١٦) حاشية رد المختار على الدر المختار شرح تنوير الأبصار فقه أبو حنيفة ابن عابدين.الناشر دار الفكر للطباعة والنشر.سنة النشر 1421هـــ – 2000م.مكان النشر بيروت.عدد الأجزاء 8.

(١٧)المحيط البرهاني المؤلف : محمود بن أحمد بن الصدر الشهيد النجاري برهان الدين مازه المحقق:الناشر : دار إحياء التراث العربي الطبعة :عدد الأجزاء : 11.

(١٨)درر الحكام شرح غرر الأحكام ج المؤلف : محمد بن فراموز الشهير بمنلا خسرو (المتوفى : 885هـــ)مصدر الكتاب : موقع الإسلام

(١٩)تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشِّلْبِيِّ المؤلف : عثمان بن علي بن محجن البارعي ، فخر الدين الزيلعي الحنفي (المتوفى : 743 هـــ)الحاشية : شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (المتوفى : 1021 هـــ)الناشر : المطبعة الكبرى الأميرية – بولاق ، القاهرة الطبعة : الأولى ، 1313 هـــ

(٢٠)المحيط البرهاني المؤلف : محمود بن أحمد بن الصدر الشهيد النجاري برهان الدين مازه المحقق:الناشر : دار إحياء التراث العربي الطبعة :عدد الأجزاء : 11.

(٢١)الاشباه والنظائر لابن نجيم الحنفى.

(٢٢)تنزيه الرحمن عن شائبة الكذب والنقصان مصنفہ حضرت

مولانا احمد حسن کانپوری، شائع کردہ: دارالعلوم کانپور، مطبوعہ: مطبع عزیزی کانپور ۱۳۰۷ھ۔

(۲۳) مجموعۃ الفتاویٰ، حضرت مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی طبع دوم

(۲۴) فتاویٰ عزیزیہ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔

(۲۵) قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز" مرتبہ اختر امام عادل قاسمی

تصوف واخلاق

(۲۶) کرامات رزاقیہ، نواب محمد خاں شاجہاں پوری، مطبع مرقع عالم ہردوئی ۱۳۱۹ھ)

(۲۷) رسالہ "وحدۃ الوجود وشہود الحق فی کل موجود" ملک العلماء بحرالعلوم علامہ عبدالعلی (ولادت ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء –وفات ۱۲/رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۳/اگست ۱۸۱۰ء) عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔

یہ رسالہ حضرت مولانا زید ابوالحسن فاروقی مجددی دہلوی کے اردو ترجمہ اور حاشیہ کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوا، اس کی دوسری اشاعت حضرت شاہ ابوالخیر اکیڈمی دہلی سے ہوئی، اشاعت مئی ۱۹۷۱ء۔

(۲۸) جنۃ الانوار: مرتبہ حضرت مولانا محمد ادریس ذکا گڑھولوی طبع اول جولائی ۱۹۷۲ء، طبع ثالث ۲۰۱۴ء۔

(۲۹) وادی الفت، مطبوعہ مطبع شاجہانی واقع بھوپال (رسائل تصوف کا مجموعہ)

تذکرہ وتاریخ

(۳۰) موسوعۃ کشاف اصطلاحات الفنون علامہ محمد علی التھانوی ط مکتبہ لبنان بیروت ۱۹۹۶ء۔

(۳۱)التعريفات ،المؤلف : علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني (المتوفى : 816هـ)

(۳۲)معجم البلدان المؤلف : شهاب الدين أبو عبد الله ياقوت بن عبد الله الحموي (المتوفى : 626هـ)

(۳۳)الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام "المسمیٰ بنزهة الخواطروبهجة المسامع والنواظر، مرتبہ:حضرت مولانا عبدالحی الحسنی لکھنوی (م ۱۳۴۱ھ) مطبوعہ دارابن حزم بیروت ۱۴۲۰ھ م ۱۹۹۹ء)

(۳۴) سیرت مولانا محمد علی مونگیری (مرتبہ حضرت مولانا سید محمد الحسنی) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناشر مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۰ء)

(۳۵)مکتوب حضرت مولانا سید نصیر الدین احمد نصرؔ (قلمی)

(۳۶)تذکرہ حضرت سید (عبدالرزاق بے کمر) صاحب بانسوی، مرتبہ محمد رضا انصاری مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۶ء۔

(۳۷)ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ،مصنفہ:حضرت علامہ مناظر احسن گیلانی، مکتبہ الحق جوگیشوری ممبئی، مئی ۲۰۰۷ء۔

(۳۸)مظفرپور علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز-جناب حامد علی خان صاحب۔

(۳۹)حیات مجاہد، مرتبہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مطبع ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۳ء حیدرآباد۔

(۴۰)جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ، مؤلفہ مولانا حفیظ الرحمن واصف مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی۔

(۴۱)تذکرۂ حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی مصنفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

(۴۲)ترجمۂ مشاہدۂ حافظی مناقب حافظیہ، مولانا ہادی علی خان سیتاپوری مطبوعہ۔

(۴۳)تعلیم الانساب، مرتبہ حضرت مولانا مفتی سہول احمد عثمانیؒ۔

(۴۴) شہر ادب کانپور، مرتبہ :ڈاکٹر سید سعید احمد مطبوعہ سید اینڈ سید (پبلیشرز) کراچی ۲۰۰۱ء۔ مقام اشاعت: شاہراہ سعدی، کلفٹن، بلاک ۲ کراچی پاکستان۔

یہ دراصل پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے ، جس پر کراچی یونیورسیٹی نے مصنف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔کتاب کے مصنف کا آبائی تعلق کانپور سے ہے ، والد کا نام حافظ سید محمد حسین مرحوم ہے،صاحب کتاب ایک معتبر محقق ہیں،ان کی کئی تحقیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۴۵)شب چراغ از نثار احمد علوی ناشر کاکوری اکیڈمی ناظم آباد کراچی ۱۹۸۲ء

(۴۶)تاریخ کانپور از سید اشتیاق اظہر ناشر "کانپور اکیڈمی" کراچی ۱۹۸۷ء۔

(۴۷)اشرف السوانح –خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۴۰۳ھ۔

(۴۸)خاتمۃ السوانح –خواجہ عزیزالحسن مجذوب۔

(۴۹)سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ مرتبہ مولانا سید محمد الحسنیؒ مطبوعہ لکھنؤ

(۵۰)سوانح قاسمی مصنفہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مطبوعہ دیوبند۔

(۵۱)ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۹، جلد: ۱۰۰، ذی الحجہ ۱۴۳۷ ہجری مطابق ستمبر ۲۰۱۶ء۔

(۵۲)درس حیات مرتبہ مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ، ناشر مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ گیا طبع دوم ۱۴۳۱ھ م ۲۰۱۰ء۔

(۵۳)سہ ماہی دعوت حق ربیع الاول ۱۴۲۷ھ ناشر جامعہ ربانی ۔

(۵۴) الجمعیۃ۔ خصوصی شمارہ "جمعیۃ علماء نمبر" ج ۸ شمارہ ۴۳، ۱۹۹۵ء۔

(۵۵) مقامات خیر مؤلفہ حضرت علامہ شاہ زید ابوالحسن فاروقی مجددیؒ ناشر شاہ ابوالخیر اکیڈمی چتلی قبر دہلی، مطبوعہ ۱۴۳۱ھ م ۲۰۱۰ء۔

(۵۶) مختصر حالات نقشبندیہ مجددیہ ومظہریہ مرتبہ حضرت مولانا سید شاہ حکیم حاجی احمد حسن منورویؒ شائع کردہ: خانقاہ منورواشریف، طبع جدید۔

(۵۷) حیات عبدالرحمنؒ، مرتبہ جناب مولوی وصی احمد شمسی صاحب، ناشر: انجمن تعمیر ملت روپس پور دربھنگہ طبع ۲۰۱۲ء۔

(۵۸) بہار مدرسہ بورڈ۔ تاریخ وتجزیہ، مرتبہ: مولانا مفتی ثناء الہدیٰ صاحب قاسمی مدظلہ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

(۵۹) حیات وارث مرتبہ مولوی مرزا محمد منعم بیگ صاحب وارثی فتح پوری ناشر زبیری بک ڈپو آستانہ روڈ دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی، مصنف مرحوم حاجی وارث علی صاحبؒ کے خادموں میں تھے، انہوں نے اس کتاب میں اکثر واقعات دیکھے ہوئے لکھے ہیں اور کچھ دیکھنے والوں سے سنے ہوئے بھی ہیں۔

(۶۰) مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیرالدین مفتاحیؒ مفتی دارالعلوم دیوبند ناشر دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند، ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء۔

(۶۱) اشرف السوانح مرتبہ خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ ومولانا عبدالحق صاحبؒ، ناشر ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۲۷ھ

(۶۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند مرتبہ مولانا سید محبوب علی رضویؒ ناشر المیزان، لاہور پاکستان

(۶۳) کالج میگزین۔ صدیق فیض عام انٹر کالج کانپور ۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۷ء

(۶۴)اعیان وطن - آثارات پھلواری شریف—مرتبہ مولاناسید شاہ حکیم محمد شعیب نیرؒناشر دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ)

(۶۵) مجموعۂ فوائد عثمانی ص مرتبہ سید محمد اکبر علی دہلوی ناشر: خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ میاں والی، مطبوعہ دارالکتاب لاہور ۲۰۱۷ء)

(۶۶)رسالہ الشمس صد سالہ اشاعت مضمون پروفیسر سید عزیز احمد سابق پرنسپل اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی پٹنہ، شائع کردہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ نومبر ۲۰۱۲ء)

(۶۷)- تاریخ فرشتہ مصنفہ محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ عبدالحی خواجہ ناشر: المیزان لاہور ط ۲۰۰۸ء۔

(۶۸) محی الملۃ(مرتبہ حضرت مولاناشاہ عون احمد قادریؒ)مقدمہ حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ۔

(۶۹)الدر المنثور فی تراجم اہل الصاد قفور مرتبہ مولاناعبدالرحیم صادق پوری)

(۷۰) جریدہ "الواقعۃ" کراچی، شمارہ (5 / 6) شوال، ذیقعدہ 1433ھ / ستمبر، اکتوبر 2012

(۷۱)تاریخ دعوت وعزیمت مرتبہ حضرت مولاناسید ابوالحسن علی ندویؒ

(۷۲)اخبار الاخیار حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒناشر ادبی دنیامٹیا محل دہلی۔

(۷۳)تذکرۃ الکرام مولاناشاہ ابوالحیوٰۃ پھلواروی ؒمطبوعہ لکھنؤ۔

(۷۴)- مقدمہ بستان الاکرام (سید محمد اسد علی خورشید) ترجمہ تذکرۃ الکرام ص x مولاناشاہ ابوالحیوٰۃ القادریؒ، ناشر دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

(۷۵)ایک قلمی کاپی (سرگذشت حضرت مولانا منظور احمدؒ، پروہی)اس کی فوٹوکاپی آپ کے اہل خانہ (پروہی، ضلع مدھوبنی بہار) سے حاصل کی گئی۔

زبان وادب

(۷۶)ڈکٹر کلیم احمد عاجزؔ (پٹنہ) کا مجموعۂ کلام "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" مطبوعہ طوبیٰ پبلیشر حیدر آباد ۱۹۹۶ء۔

(۷۷)کلیات اقبال ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۷ء۔

(۷۸)مختصر تاریخ اردو ادب اور اصناف شعری، مؤلفہ ڈاکٹر سیدہ زہرہ بیگم، ناشر: بوستان اشہر حیدر آباد ۲۰۰۵ء۔

(۷۹)اردو شاعری کا فنی ارتقا ،ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۴۴۱ ، طبع عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی ۱۹۹۸ء۔

(۸۰)دکنی رباعیات ، مؤلفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ،ناشر: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۶۶ء۔

(۸۱)اصناف سخن اور شعری ہیئتیں ،مؤلفہ شمیم احمد ،ناشر انڈیا بک امپوریم بھوپال ۱۹۸۱ء۔

(۸۲)روح انیس، سید مسعود حسین رضوی، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۴ء۔

(۸۳)کلام حامد مرتبہ سید شاہ نبی حسن ناشر بزم صوفیہ ارزانیہ کلکتہ۔

(۸۴)جدید تاریخ ادب اردو ص ۶ مصنفہ ڈاکٹر آصف اختر ناشر جاوید بک سینٹر پٹنہ ۲۰۱۰ء۔

(۸۵)شادؔ عظیم آبادی ص ۵ ، ۶ مرتبہ انجم فاطمی شائع کردہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۲۰۰۶ء۔

(۸۶) مثنوی توبہ نو- آہ سیتاپوری، یہ ۱۱۲ صفحات کی کتاب ہے، کتابکدہ والکیشور روڈ

ممبئی ۲ سے شائع ہوئی ہے۔

(۸۷)فیروزاللغات مرتبہ الحاج فیروز احمدؒ شائع کردہ فیروز سنز پرائیوٹ لیمیٹڈ لاہور

ویب سائٹس

(۸۸) اسکالرڈاٹ ضیائے طیبہ ویب سائٹ۔

(۸۹)ویب سائٹ دارالعلوم دیوبند

(۹۰)ویب سائٹ مظاہر علوم سہارن پور

(۹۱)ویب سائٹ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جیسے حرف آگہی میں آفتاب وماہتاب

معروف شاعروادیب جناب مولانا قاری طارق بن ثاقب صاحب القاسمی

بانی ومہتمم معہد ترتیل القرآن، ارریہ بہار

آج کیوں رقص قلم ہنگامہ درآغوش ہے
بربط افکار پر کیوں نغمۂ پر جوش ہے
کیوں شعوروآگہی پھر آج منظر کوش ہے
ایک آئینہ ہے گویا جو قدم بردوش ہے

اُف رے افتاد طبیعت ہائے رے ذوق سلیم
عطر بیزی تکلم ، مستی باد شمیم

نابغہ ہستی پہ تجھ کو شعر کہنے کی مجال
پہلے کر طارقؔ تو اپنی جرأت وہمت بحال
شعر کہنا تو نہیں تیرے لئے ہرگز محال
دے اگر آمد کی کیفیت جو رب ذوالجلال

جس کے بارے میں لکھادے جو وہ چاہے بے گماں
بس وہی سلطان عالم ہے قلم پر حکمراں

آہ کے بارے میں لکھنا صاحبو! آساں نہیں
انکے شعروں میں جو کیفیت ہے وہ پنہاں نہیں
جس کو حاصل اس جہاں میں دولت احساں نہیں
وہ بھلا سمجھے گا کیا جو صاحب عرفاں نہیں

اپنے افکار جہاں گیری میں ان کی شخصیت
حشر تک کرتی رہے گی اس جہاں میں سلطنت

نظم ہو، قطعات ہوں، یا ہو غزل کا بانکپن
ہے رباعی سے نمایاں جوہر رنگ سخن
میر کا، غالب کا، یا اقبال کا ہو فکر و فن
آپ سے روشن ہو جیسے ان بڑوں کی انجمن

منضبط بنیاد پر ہے آپ کے فن کا نظام
آپ کا ہر شعر ہے گویا کہ اک نقش دوام

آپ اک فیاض اور حاتم صفت استاد تھے
تشنگان فکر و فن سیر اب تھے آباد تھے
روح کی تابندگی سے گویا کہ دل شاد تھے
آپ خلاق معانی تھے ہنر ایجاد تھے

آپ دنیائے بلاغت کے تھے فنکار عظیم
اور تکلم میں فصاحت کے تھے گویا اک کلیم

شعر گوئی کے ذریعہ ناشر حسنات ہیں
اور افکار حسیں سے قاسم خیرات ہیں
نسبت اجداد سے بھی صاحب برکات ہیں
یعنی اپنی ذات میں خود رب کے انعامات ہیں

ظاہر و باطن میں بھی ہے آپ کا اونچا مقام
آپ کی شخصیت کا ہے عمدہ بہت ہی ہر نظام

ہو نہیں سکتا کہ سب ہوں آپ سے ناآشنا
معتبر استاذ فن تھے اس کا بھی چرچا رہا
آپ سے برپا رہا ہے علم و فن کا غلغلہ
شعر گوئی پر ہی کرتے آپ کیسے اکتفا

آپ پر حاوی رہے ہر حال میں دینی علوم
آپ جن کے نگہباں ہیں بالخصوص وبالعموم

آپ کے شعروں کو پڑھنے سے ملے دل کو سرور
ظلمتوں میں جس طرح ہیں آپ اک مینار نور
روکش ناز تغزل ، واقف فن بحور
نازش طرز تکلم ، فخر اوراک وشعور

آپ کا طرز نگارش زندہ وتابندہ ہے
اور اسلوب و روش آئینۂ آئندہ ہے

آہ کا مد مقابل کوئی تھا کہ یا نہ تھا؟
معرکہ آرائی کو ہم ان کی جانیں کیا بھلا؟
پڑھ کے ہم اشعار ان کے بس یہ کہدیں برملا
منفرد تھے سب سے وہ اشعار کہنے میں سنا!

دستگاہ تام رکھتے تھے سبھی اصناف پر
اور نظر گہری تھی شعروں کے سبھی اوصاف پر

ان کے پڑپوتے مگر اختر امام عادل جو ہیں
فاضل دیوبند اور مفتی کامل جو ہیں
صاحب تصنیف بھی ہیں عالم وفاضل جو ہیں
داعی دین محمدؐ، ذاکر و شاغل جو ہیں

اپنے دادا پر لکھی ہے معتبر ایسی کتاب
جیسے حرف آگہی میں آفتاب و ماہتاب

یہ کتاب

یہ کتاب عام تصور سوانح سے ہٹ کر خالص علمی اور تاریخی بنیادوں پر لکھی گئی ہے اور اس کو ایک تحقیقی دستاویز کے طور پر مرتب کیا گیا ہے یہ ایک علمی وادبی دفینہ ہے جو برسوں کی محنت وریاضت کے بعد سامنے آیا ہے۔

یہ کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ پوری جماعت کی اور ایک خاندان کی نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ ہے، یہ نظر وفکر کے مختلف دبستانوں کا ایک کہکشاں ہے اور تعلیم وتربیت کے بیش قیمت تجربات وہدایات کا مرقع ہے، یہ شاعر کا دیوان بھی ہے اور تعمیر شخصیت کا نگار خانہ بھی۔۔۔۔ اس میں زبان وادب کی علمی وفنی بحثیں بھی ہیں، اور تاریخی تحلیل وتجزیہ بھی، اس کتاب میں بہت سے علمی اور تاریخی تضادات کے قابل قبول حل بھی پیش کئے گئے ہیں۔

یہ کوئی کراماتی کتاب نہیں ہے، جس میں مافوق الادراک واقعات جمع کئے گئے ہوں، بلکہ پوری کتاب میں صاحب تذکرہ کی ایک بھی کرامت ذکر نہیں کی گئی ہے ہاں ان کی سب سے بڑی کرامت راہ حق پر ان کی شدید استقامت اور رضائے الٰہی کے لئے ان کی بے نظیر فنائیت اور عبدیت ہے جو قابل رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

(مصنف کے "حروف اولین" سے اقتباس)

Designed & Printed at : HS Offset Printers Mob : 9811122540